افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

العنکبوت ۲۹ — الزُّمر ۳۹

تدبرِ قرآن

جلد ششم

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

تفاسیر

سورۂ عنکبوت (۲۹) — تا — سورۂ زمر (۳۹)

امین احسن اصلاحی

فاران فاؤنڈیشن

لاہور — پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

طبعِ اوّل

الحمد للہ تدبرِ قرآن جلد پنجم[1] طباعت کے لیے پریس کے حوالہ کی جا رہی ہے۔ توقع ہے کہ ان شاء اللہ کتاب بہت جلد قدر دانوں تک پہنچ جائے گی۔ بعض وجوہ سے، جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے اس کتاب کی طباعت و اشاعت کا سابق انتظام بدلنا پڑا جس کے سبب سے اس کی اشاعت میں کچھ تاخیر ہوئی جو قدر دانوں کے لیے باعث تشویش ہوئی لیکن امید ہے کہ یہ تاخیر باعث خیر و برکت ہوگی۔ اس تاخیر سے یہ فائدہ اٹھایا گیا ہے کہ کاپیاں نہایت احتیاط سے دوبارہ پڑھی گئی ہیں جس سے غلطیوں کا احتمال بہت کم رہ گیا ہے۔

یہ جلد سورۂ زمر پر تمام ہوئی ہے اور میں بفضلِ خدا سورۂ مجادلہ پر اس وقت کام کر رہا ہوں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ جلد ششم[2] سے زیادہ کا مواد تیار ہے۔ اب یہ بات طے ہے کہ کتاب آٹھ جلدوں میں تمام ہوگی۔ آخری حصہ کی سورتوں میں زبان اور نظام کی مشکلیں زیادہ ہیں اور میرا ارادہ یہی ہے کہ بحث و نظر کا جو معیار اب تک رہا ہے وہی آخر تک قائم رکھنے کی کوشش کی جائے۔ قطع نظر اس سے کہ کتاب کے مؤلف کو اس خدمت کے لیے کتنی فرصت نصیب ہوتی ہے۔

اصحابِ علم کی طرف سے اس ناچیز خدمت کی جو پذیرائی ہوئی ہے وہ میری توقعات سے بہت زیادہ ہے۔ میں اس کے لیے اپنے رب ہی کا شکر گزار ہوں اور اس سے ملتجی ہوں کہ وہ آگے کے کام میں بھی میرے ذہن اور قلم کو جادۂ حق پر استوار رکھے اور اس کتاب کو خلق کے لیے نافع اور میرے لیے ذریعہ نجات بنائے۔ میں نے اس کتاب میں اپنے استاذ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی سپرد کردہ امانت ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری دلی آرزو یہ ہے کہ رب کریم مجھے اس کوشش میں کامیابی عطا فرمائے۔ اس سے زیادہ میں کسی چیز کا بھی متمنی و مدعی نہیں ہوں۔

---

[1] ترتیبِ نو ــــــ جلد ششم

[2] ترتیبِ نو ــــــ جلد ہفتم

کتاب کی ظاہری خوبیوں میں اگر کوئی کمی یا بیشی ہوئی ہے تو اس کا تعلق کلیۃً خاور صاحب سلّمہٗ سے ہے۔ اگر وہ کوئی اضافہ کر سکے تو ان کے حسنِ ذوق اور سلیقۂ کار سے یہی توقع ہے۔ اور اگر نہیں کر سکے ہیں تو میرے نزدیک وہ سزاوارِ ملامت ہرگز نہیں ہیں۔ اس کوچے میں وہ بالکل نووارد ہیں۔ محض میری محبت اور استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کے افکار سے والہانہ عقیدت کی بنا پر انھوں نے یہ بارِ گراں اپنے سر پر اٹھا لیا ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے یہ کام آسان بنا دے۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

رحمان آباد۔ ضلع شیخوپورہ

۱۶/ دسمبر ۱۹۷۷ء

۵۔ محرم الحرام ۱۳۹۰ھ

تدبّرِ قرآن

۲۹

العنکبوت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

اس سورہ کا آغاز ان لوگوں کو مخاطب کرکے ہوا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے جرم میں ستائے جا رہے تھے۔ خاص کر نوجوان اور غلام، سورہ کے نزول کے دور میں، اپنے باپوں اور آقاؤں کے ہاتھوں بڑی سخت آزمائش کے دور سے گزر رہے تھے۔ قدرتی طور پر اس صورتِ حال نے کمزور ارادے کے لوگوں کے اندر بہت سے سوالات قرآن اور رسولؐ کی صداقت سے متعلق پیدا کر دیے۔ جن کا بر موقع جواب دیا جانا ضروری ہوا۔ تاکہ مظلوموں اور کمزوروں کی ہمت افزائی بھی ہو اور جو لوگ خدا کی ڈھیل کو اپنی فتح سمجھ کر ظلم و ستم میں بالکل بے باک ہونے جا رہے تھے ان کو بھی تنبیہ ہو۔

حالات کے تقاضے سے اس میں ہجرت کی طرف بھی اشارات ہیں اور مظلوم مسلمانوں کو یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ انھیں بہر حال ظلم کے آگے سپر نہیں ڈالنی چاہیے۔ اگر حق کی خاطر انھیں اپنے وطن کو چھوڑنا پڑ جائے تو اس کے لیے بھی انھیں تیار رہنا چاہیے۔ نہ خدا کی زمین تنگ ہے اور نہ اس کے خزانۂ رزق میں کمی ہے۔ جو لوگ خدا کی راہ میں ہجرت کریں گے خدا ان کے لیے خود اپنا دامنِ رحمت پھیلائے گا اور ان کی ساری ضروریات کا کفیل ہوگا۔

پچھلی سورہ میں اہل کتاب کی مخالفت کی طرف بعض اشارات گزرے ہیں۔ اس سورہ میں ان کی مخالفت کھل کر سامنے آگئی ہے اس وجہ سے مسلمانوں کو یہ رہنمائی بھی دی گئی ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ بحث میں ان کو کیا روش اختیار کرنی چاہیے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۷) اس حقیقت کی طرف اشارہ کہ حق کی راہ میں آزمائشیں لازماً پیش آتی ہیں۔ یہی پہلے بھی ہوا ہے اور یہی آئندہ بھی ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ سنت ہے۔ اسی سے مومن و منافق میں امتیاز ہوتا ہے۔ البتہ آج جن لوگوں کو اللہ نے ڈھیل دے رکھی ہے وہ اس بات کو یاد رکھیں کہ وہ خدا کی گرفت سے باہر نہیں نکل سکتے اور جو لوگ ظلم و ستم کا ہدف بنے ہوئے ہیں وہ یہ یقین رکھیں کہ آج ایمان کی راہ میں جو دکھ وہ جھیل رہے ہیں ان سے کہیں بڑھ کر وہ اس کا صلہ پانے والے ہیں۔

(۸-۱۳) والدین اور بزرگوں کی اطاعت کے حدود کی وضاحت کہ ان کی اطاعت خدا کی اطاعت کے تحت

ہے اس وجہ سے اگر کسی کے ماں باپ اس سے خدا کی نافرمانی کا مطالبہ کریں تو اس معاملے میں ان کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ خدا کے ہاں کوئی دوسرے کے اعمال کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ ہر شخص کو اپنے اعمال کی جوابدہی خود کرنی ہے۔

(۱۴-۴۰) حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور مدین، عاد، ثمود، قارون، فرعون اور ہامان کے واقعات کی طرف اجمالی اشارہ جس سے مقصود انہی باتوں کو تاریخ کی روشنی میں مدلل کرنا ہے جو تمہید میں مذکور ہوئی ہیں۔ یعنی

— حق کی راہ میں امتحان کے مراحل سے گزرنا اللہ تعالیٰ کی ایک مقرر کردہ سنت ہے۔

— حق کے مقابل میں رشتوں، قرابتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ سب سے بڑا حق اللہ کا ہے۔

— جو لوگ اللہ کے بندوں اور بندیوں کو فتنوں میں ڈالتے ہیں وہ خدا کی گرفت سے باہر نہیں جا سکتے۔

(۴۱-۴۵) ان لوگوں کے زور و اثر کی تمثیل جو دوسرے سہاروں کے بل پر خدا کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کی تمام سعی و تدبیر کی مثال مکڑی کے جالے کی ہے جس سے زیادہ کمزور اور بے بنیاد تعمیر کوئی بھی نہیں ہے۔ ان کے مزعومہ شرکا، و شفعا کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں ہے بلکہ ایک غایت و حکمت کے ساتھ خدا نے اس کو بنایا ہے اور وہ غایت و حکمت ایک دن لازماً ظہور میں آئے گی۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ تم تمام مخالفتوں سے بے پروا ہو کر لوگوں کو اللہ کی کتاب سناؤ اور نماز کا اہتمام کرو۔ اسی نماز کے اندر اہل ایمان کے لیے تمام شرور و آفات سے امان اور یہی طاقت کا اصلی خزانہ ہے۔

(۴۶-۵۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر اہل کتاب کے بعض اعتراضات کا جواب۔ ان کے ساتھ بحث میں مسلمانوں کو جو روش اختیار کرنی چاہیے اس کی ہدایت۔ اچھے اہل کتاب کی تحسین۔ جو لوگ کسی معجزہ کا مطالبہ کر رہے تھے ان کو جواب۔

(۵۳-۵۵) عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت ہے اس کی وضاحت۔

(۵۶-۶۰) جو مسلمان ایمان لانے کے جرم میں کفار کے ہاتھوں ستائے جا رہے تھے ان کو ہجرت کی ہدایت اور دنیا و آخرت دونوں میں ان کو فوز و فلاح کی بشارت۔

(۶۱-۶۹) خاتمۂ سورہ جس میں خود مشرکین کے مسلمات سے ان پر توحید کے باب میں حجت قائم کی گئی ہے اور ساتھ ہی ان کو ملامت کی گئی ہے کہ اس سرزمین میں تمہیں امن و رفاہیت تو خدا کے حرم کی بدولت حاصل ہوئی لیکن تم خدا کی نعمت کی ناشکری کر رہے ہو اور عین خدا کے حرم میں بیٹھ کر اپنے خود تراشیدہ معبودوں کے گن گا رہے ہو۔ ان کی اس ناشکری کا جو انجام ان کے سامنے آنے والا ہے اس کا بیان اور اہلِ حق کو خدا کی مدد و نصرت کی بشارت جو اس تاریک ماحول میں حق کا نور پھیلانے کے لیے جد و جہد کر رہے تھے۔

سُوْرَةُ الْعَنْكَبُوْتِ (۲۹)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيَاتُهَا ۶۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۝۱ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝۲ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۴ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ ؕ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۵ وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝۶ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۷ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۸ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ ۝۹ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ

آیات ۱-۳

فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۖ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ
مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۖ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ
صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰﴾ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ
الْمُنٰفِقِيْنَ ﴿۱۱﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا
وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۖ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۖ
اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۫
وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع ۱۳ ۱۳

ترجمۂ آیات ۱-۱۳

یہ الٓمّٓ ہے۔ کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ محض یہ کہہ دینے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہیں جائیں گے؟ اور ہم نے تو ان لوگوں کو بھی آزمایا جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ سو اللہ ان لوگوں کو ممیّز کرے گا جو سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی ممیّز کر کے رہے گا۔ ۱-۳

کیا جو لوگ برائیوں کا ارتکاب کر رہے ہیں وہ گمان رکھتے ہیں کہ ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں گے! بہت ہی برا فیصلہ ہے جو وہ کر رہے ہیں! جو اللہ کی ملاقات کا متوقع ہے وہ اطمینان رکھے کہ اللہ کا مقرر کردہ وقت ضرور آ کے رہے گا اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور جو ہماری راہ میں جدوجہد کر رہا ہے تو وہ اپنے ہی فائدے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ اللہ عالم والوں سے بے نیاز ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے تو ہم ان کی برائیاں ان پر سے جھاڑ دیں گے اور ان کو ان کے عمل کا بہترین بدلہ دیں گے۔ ۴-۷

اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی۔ اور اگر وہ تجھ

پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا، جس کے بارے میں تجھے کوئی علم نہیں، تو ان کی بات نہ مان۔ میری ہی طرف تم سب کی واپسی ہے تو جو کچھ تم کرتے رہے ہو میں اس سے تمھیں آگاہ کروں گا اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے تو ہم ان کو صالحین کے زمرہ میں داخل کریں گے۔ ۸-۹

اور لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے لیکن جب اللہ کی راہ میں انھیں دکھ پہنچتا ہے تو وہ لوگوں کے پہنچائے ہوئے دکھ کو خدا کے عذاب کے مانند قرار دے بیٹھتے ہیں اور اگر تمھارے رب کی طرف سے کوئی مدد ظاہر ہو گی تو کہیں گے کہ ہم تو آپ لوگوں کے ساتھ تھے۔ کیا لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ اس سے اچھی طرح باخبر نہیں ہے! اور اللہ ایمان والوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا اور منافقوں کو بھی ممیز کر کے رہے گا۔ ۱۰-۱۱

اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہماری راہ پر چلتے رہو، ہم تمھارے گناہوں کا بوجھ اٹھا لیں گے۔ حالانکہ وہ ان کے گناہوں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں بنیں گے۔ وہ بالکل جھوٹے ہیں۔ اور یہ لوگ اپنے گناہ لادے ہوئے ہوں گے اور اپنے گناہوں کے ساتھ کچھ اور بوجھ بھی۔ اور جو افتراء وہ کر رہے ہیں قیامت کے دن اس کی بابت ان سے پرسش ہونی ہے۔ ۱۲-۱۳

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓ ؕ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (۱-۲)

'الٓمّٓ'، اس سورہ کا نام ہے۔ اس کی تحقیق سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔

راہِ حق میں آزمائشیں لازماً پیش آتی ہیں

'اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ الاٰیۃ'، بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے لیکن اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو مکہ کی پرمحن زندگی سے گھبرا اٹھے تھے۔ بعض لوگ اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن ان کو اس راہ کی

صعوبتوں کا اندازہ نہیں تھا۔ ان کو گمان تھا کہ جب انھوں نے نیکی کی راہ میں قدم رکھا ہے تو راہ ہموار ملے گی اور وہ ٹھنڈی سڑک سے منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ ان لوگوں کو جب کفار کے ہاتھوں زہرہ گداز مصائب سے سابقہ پیش آیا تو ان کے قدم ہل گئے اور اس طرح کے حالات میں خام ذہن کے لوگوں کو جس طرح کے شبہات لاحق ہوتے ہیں ان کے ذہنوں میں بھی اسی قسم کے شبہات پیدا ہونے لگے۔ مثلاً یہ کہ اگر یہ اللہ کا راستہ ہے تو یہ اتنا دشوار گزار کیوں ہے؟ اگر اس کی دعوت دینے والے اللہ کے رسول ہیں تو ان پر ایمان لانا اتنا جان جوکھم کا کام کیوں ہے؟ ہم جب اللہ کے کام کے لیے اٹھے ہیں تو ہم دین کی خدمت کر رہے ہیں، پھر ہماری راہ میں یہ رکاوٹیں اور یہ اڑنگے کیوں ڈال دیے گئے ہیں! اس طرح کے سوالات کا پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ راہِ حق اور اس کے تقاضوں سے اچھی طرح آشنا نہیں تھے اور نہایت آسانی سے نفاق کے فتنہ میں مبتلا ہو سکتے تھے۔ اس سورہ میں سب سے پہلے انہی لوگوں کی بیماری کی طرف توجہ فرمائی گئی۔ ارشاد ہوا کہ اگر لوگوں نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ وہ ایمان کا دعویٰ کریں گے اور مجرد ان کے اس دعوے کی بنا پر ان کا نام مومنین صادقین کے رجسٹر میں درج ہو جائے گا، ان کے کھرے کھوٹے ہونے کی کوئی جانچ نہیں ہوگی، تو یہ انھوں نے نہایت غلط سمجھا تھا۔

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (۳)

یہ اللہ تعالیٰ نے نہایت مؤکد الفاظ میں اپنی اس سنت کی یاد دہانی فرمائی جس سے ان لوگوں کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے جو ایمان و اسلام کا دعویٰ لے کر اٹھتے ہیں۔ فرمایا کہ ان لوگوں سے پہلے جو لوگ یہ دعویٰ لے کر اٹھے ہم نے ان کو بھی آزمائشوں میں ڈال کر ان کا امتحان کیا، اسی طرح ان کا بھی امتحان کریں گے۔ یہ اشارہ پچھلے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی طرف ہے۔ 'فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ' یعنی اگر یہ امتحان نہ ہو تو آخر یہ کس طرح ثابت ہوگا کہ کون اپنے دعوے میں سچا ہے، کون جھوٹا ہے۔ اس وجہ سے اللہ لازماً راست بازوں اور جھوٹے مدعیوں میں امتیاز کرے گا۔ 'عَلِمَ' یہاں ممیز و معین کرنے کے معنی میں ہے۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے اور صیغہ یہاں وہ استعمال ہوا ہے جو تاکید کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک مقررہ سنت ہے اس وجہ سے یہ کسی کو ناگوار ہو یا گوارا بہرحال اس امتحان سے ہر ایک کو گزرنا ہے۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے علم کا تعلق ہے وہ ہر چیز کو محیط ہے۔ وہ ہر ایک کے باطن سے اچھی طرح باخبر ہے کہ کون مخلص ہے اور کون منافق، لیکن وہ لوگوں کے ساتھ جزا و سزا کا معاملہ مجرد اپنے علم کی بنیاد پر نہیں کرتا بلکہ لوگوں کے عمل کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس وجہ سے وہ ہر ایک کو امتحان میں ڈال کر پرکھتا ہے اور اسی امتحان سے ہر ایک کے مدارج معین ہوتے ہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۴)

شریروں کو تنبیہ

ایمان کا دعوےٰ کرنے والوں کو تنبیہ کرنے کے بعد یہ ان لوگوں کو بھی متنبہ فرما دیا جو کمزور مسلمانوں کو ظلم و ستم کا ہدف بنائے ہوئے تھے۔ فرمایا اگر ان لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یہ اسی طرح ظلم و ستم کرنے کے لیے چھوڑے رکھے جائیں گے اور کبھی ہماری گرفت میں نہیں آئیں گے تو ان کا یہ گمان بالکل غلط ہے۔ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ اگرچہ لفظاً عام ہے لیکن اشارہ انہی ناہنجار لوگوں کی طرف ہے جو بے بس مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے تھے اور خدا کی ڈھیل سے شہ پاکر دن پر دن دلیر ہوتے جا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ خدا اسی طرح ان کو ڈھیل دیے رکھے گا تو وہ بڑی سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

'سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ' یعنی ان کا یہ فیصلہ خدا کے بارے میں نہایت برا فیصلہ ہے۔ خدا کو اگر انھوں نے کمزور سمجھا ہے کہ وہ ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا جب بھی ان کا یہ فیصلہ نہایت برا ہے اور اگر انھوں نے اپنی ان تمام ستم رانیوں پر اس کو راضی اور اس معاملے سے بالکل بے تعلق و بے پروا سمجھ رکھا ہے جب بھی ان کا یہ فیصلہ نہایت غلط اور نہایت بُرا ہے۔

مَنۡ کَانَ یَرۡجُوۡا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ ؕ وَ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ (۵)

مظلوم مسلمانوں کو تسلی

یہ مظلوم مسلمانوں کو تسلی دی ہے کہ بہر حال تمھیں ہر کام آخرت کی امید پر کرنا ہے اور اگر تم یہ امید رکھتے ہو تو اطمینان رکھو کہ اللہ نے اس کے لیے جو مدت ٹھہرا رکھی ہے وہ لازماً پوری ہو کے رہے گی، ایک دن تم اپنے رب سے ملو گے اور اس دن تم اپنی ہر اس محنت و زحمت کا صلہ پاؤ گے جو اس کی خاطر تم نے جھیلی ہو گی۔ خدا سمیع و علیم ہے۔ کوئی چیز اس کے احاطۂ علم سے باہر نہیں ہے۔ تمھاری سرفروشیاں بھی اس کے علم میں ہوں گی اور تمھارے دشمنوں کی ستم رانیاں بھی اس کے سامنے ہوں گی۔

وَ مَنۡ جَاہَدَ فَاِنَّمَا یُجَاہِدُ لِنَفۡسِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَغَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ (۶)

ایک برمحل موقع آگاہی

یہ متنبہ فرمایا ہے کہ جو شخص ایمان لاتا اور اس راہ میں مشقتیں اٹھاتا ہے وہ یاد رکھے کہ وہ اپنا ہی مستقبل سنوارتا اور اپنا ہی گھر بھرتا ہے، وہ خدا اور اس کے دین پر کوئی احسان نہیں کرتا۔ اس وجہ سے اسے اس بات سے دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے کہ اسے کوئی مصیبت پیش آئی۔ اگر اسے کوئی مصیبت پیش آئی تو خدا کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ تمام عالم سے مستغنی ہے۔ البتہ لوگ اس کے محتاج ہیں اس وجہ سے خدا کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی بھی جو کوئی دیتا ہے وہ درحقیقت اپنے ہی نفع کے لیے دیتا ہے، اس سے خدا کو کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ یہاں یہ حقیقت اچھی طرح ملحوظ رہے کہ دنیا کی طرح دین بھی خدا کے کام آنے والی کوئی چیز نہیں ہے بلکہ بندوں ہی کے کام آنے والی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ راستہ انسان ہی کی سعادت کے لیے مقرر فرمایا ہے۔ جس طرح ایک کسان اپنے کھیت میں مشقت کرتا ہے تو وہ اپنے ہی لیے کرتا ہے، کسی دوسرے کے لیے نہیں کرتا اسی طرح انسان دین کی راہ میں چل کر اپنی ہی منزلیں طے کرتا ہے۔ خدا کی منزل نہیں طے کرتا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ (۷)

اہل ایمان کے ساتھ اللہ کا معاملہ

قرینہ دلیل ہے کہ لفظ 'سَيِّئَاتُ' یہاں صغائر یعنی چھوٹے گناہوں کے مفہوم میں ہے ۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر صاحب ایمان وعمل کے ساتھ یہ معاملہ کرنے والا ہے کہ اس کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے وہ درگزر فرمائے گا اور اس نے جو نیک اعمال کیے ہوں گے ان کا وہ اُن سے کہیں بڑھ کر صلہ دے گا ۔ مطلب یہ ہے کہ جب بندوں کے ساتھ خدا کا معاملہ یہ ہے کہ ہر ایک اپنے ہر چھوٹے بڑے عمل کا صلہ پانے والا ہے تو پھر اس کے دل میں یہ وسوسہ کیوں پیدا ہو کہ اس نے خدا کی راہ میں کوئی تکلیف جھیلی تو یہ اس نے اللہ اور اس کے دین پر کوئی احسان کیا!

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ۖ وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ۚ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۸)

باپ ماں کے حقوق خدا کے حقوق کے تحت ہیں

اوپر کی آیات میں جس آزمائش کا ذکر ہوا ہے اس میں ایک بڑا حصہ اس آزمائش کا بھی تھا جو اسلام لانے والے نوجوانوں کو اپنے کافر باپوں اور سرپرستوں کے ہاتھوں پیش آئی ۔ باپ ماں کے حقوق چونکہ ہر دین میں مسلّم رہے ہیں اس وجہ سے اس حق سے باپوں نے بسا اوقات بہت غلط فائدہ اٹھایا ہے کہ اپنے حق کے نام پر انھوں نے اپنی اولاد کو خدا کے حقوق سے روکنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں انھوں نے ظلم وستم سے بھی دریغ نہیں کیا ہے ۔ اس کی مثالیں ہر دعوتِ حق کی تاریخ میں موجود ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جو کچھ ان کے باپ کے ہاتھوں گزری اس کی تفصیل اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہے حضرت موسیٰ کی دعوت کے دور میں نوجوانوں کو جن حالات سے سابقہ پیش آیا ان کی طرف بھی پچھلی سورتوں میں اشارے گزر چکے ہیں ۔ یہی صورتِ حال ان نوجوانوں کو بھی پیش آئی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ۔ وہ بھی اسلام لانے کے جرم میں اپنے باپوں اور سرپرستوں کے ظلم وستم کے ہدف بن گئے ۔ اس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہوا کہ اس باب میں نوجوانوں کو واضح ہدایت دے دی جائے کہ والدین اگر ان کے دین کے معاملے میں مداخلت کریں تو انھیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے ۔ فرمایا کہ ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ نیک سلوک کی ہدایت کی ہے اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی اس کو فرمائی ہے کہ اگر وہ تجھ پر اس بات کے لیے دباؤ ڈالیں کہ تو کسی چیز کو بے دلیل میرا شریک ٹھہرا تو اس معاملے میں ان کی اطاعت نہ کیجیو ۔ 'توصیۃ' یہاں ہدایت دینے کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں یہ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے ۔ اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ قرآن نے اس کو یہاں تمام مذاہب اور تمام انبیاء کی مسلّم تعلیم کی حیثیت سے پیش کیا ہے ۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ تورات، انجیل اور زبور سب میں والدین کی اطاعت کو خدا کی اطاعت کے تحت جگہ دی گئی ہے ۔ والدین کو جو حق اولاد پر ملا ہے وہ خدا ہی کا عطا کردہ ہے اس وجہ سے ان کو یہ

حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اولاد کو خدا کے حقوق سے روکیں اور جب والدین کو یہ حق حاصل نہیں ہے، جن کا حق خدا کے حق کے بعد سب سے بڑا ہے تو پھر دوسروں کے لیے اس حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ اسلام میں قانون ہے کہ لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ' خالق کے حکم کے خلاف کسی مخلوق کی اطاعت بھی جائز نہیں۔

شرک ایک بے دلیل چیز ہے

'مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ' یہ شرک کی نفی کی دلیل ہے جو قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ 'علم' کے معنی دلیل و برہان کے ہیں جہاں تک ایک خدا کا تعلق ہے وہ تو ایک بدیہی حقیقت ہے جس کو ایک مشرک بھی بہرحال مانتا ہے۔ رہے دوسرے اس کے شریک تو ان کی دلیل پیش کرنا ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جو ان کو شریکِ خدا ٹھہراتے ہیں اور جب تک ان کے حق میں کوئی دلیل نہ ہو کسی عاقل کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ ان کو خدائی میں شریک کر کے ان کی غلامی کا قلادہ بھی اپنی گردن میں ڈال لے۔

تنبیہ اور تسلی دونوں

'اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ' میں تسلی بھی ہے اور تنبیہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ سب کی واپسی میری ہی طرف ہونی ہے کوئی اور مرجع و ماویٰ بننے والا نہیں ہے تو میں سب کو ان کے اعمال سے باخبر کروں گا۔ باخبر کرنے سے مراد ظاہر ہے کہ اعمال کی جزا اور سزا دینے کے ہیں۔ یعنی آج جو لوگ میرے بندوں کو میری راہ سے روکنے کے لیے ان پر ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں ان کی کرتوتیں بھی میں ان کے سامنے رکھوں گا اور میرے جو بندے میری راہ میں استقامت دکھائیں گے ان کی جانبازیوں کا انعام بھی ان کو بھرپور دوں گا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ (۹)

اوپر کی آیت میں نمایاں پہلو تنبیہ کا تھا اس آیت میں تسلی کے پہلو کا صریح الفاظ میں ذکر فرما دیا۔ 'اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ' یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی جو لوگ اپنے دشمنوں کی تمام دشمنی کے علی الرغم ایمان و عمل صالح پر قائم و استوار رہیں گے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کو ہم بلاشبہ زمرۂ صالحین میں داخل کریں گے۔ زمرۂ صالحین سے مراد اللہ کے ان خالص و مخلص بندوں کا گروہ ہے جن کو اس دنیا کی مختلف آزمائشوں سے گزار کر اللہ تعالیٰ آخرت کی ابدی بادشاہی کے لیے منتخب فرما رہا ہے۔ اس گروہ میں ہر مدعی کے لیے جگہ نہیں ہے۔ اس میں صرف وہی لوگ بار پائیں گے جو اپنے آپ کو امتحان کی کسوٹیوں پر کھرا ثابت کریں گے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَئِنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ (۱۰)

ایمان کے مدعیوں کو تنبیہ

یہ ایمان کے مدعیوں کا ذکر فرمایا کہ یہ لوگ ایمان کا دعویٰ کرنے کو تو کر بیٹھے لیکن جب اس راہ کی آزمائشوں سے سابقہ پیش آیا ہے تو وہ لوگوں کی پہنچائی ہوئی اذیت سے اس طرح گھبرا اٹھے ہیں جس طرح خدا کے عذاب سے ڈرنا اور گھبرانا چاہیے۔ حالانکہ اس دنیا میں جو دکھ بھی پہنچے گا بہر حال وہ چند روزہ ہے۔ برعکس اس کے خدا جس عذاب میں پکڑنے والا ہے وہ ابدی ہے۔ اس وجہ سے حق کی خاطر اس دنیا میں بڑی سے بڑی مصیبت جھیل لینا بھی آسان ہے بمقابلہ اس کے کہ اس سے مرعوب ہو کر آدمی اپنے آپ کو ابدی عذاب کا سزاوار بنا لے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت جاری ہے اس کے تحت ہر شخص کو بہر حال دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ یا تو وہ حق کا راستہ انتخاب کرے اور پھر پوری پامردی کے ساتھ خلق کی بے مہری بلکہ اس کے ظلم و ستم کا مقابلہ کرے اور اگر اس کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تو پھر باطل کے ساتھ چلے اور آخرت میں ابدی خسران سے دوچار ہو۔ ان دو کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے۔

یہاں یہ چیز بھی قابلِ توجہ ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں آدمی کو جو دکھ پہنچے ہیں ان کو 'فتنہ' یعنی آزمائش سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ ان کی حیثیت بہر حال ایک آزمائش سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ پیش آئے گا اس کو عذاب سے تعبیر فرمایا اس لیے کہ وہ درحقیقت عذاب ہوگا جس سے مفر کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

'وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ'۔ یعنی اس وقت تو آزمائشوں نے ان کے قدم ہلا دیے ہیں اور یہ دشمنانِ حق کے ہم نوا بن بیٹھے ہیں لیکن کل جب خدا کی مدد و نصرت کے آثار ظاہر ہوں گے تو یہ بڑے دعوے کے ساتھ کہیں گے کہ ہم نے بھی اس حق کی خاطر بڑی قربانیاں دی ہیں اس راہ میں ہم کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔

'اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ'۔ فرمایا کہ یہ دعویٰ تو اس کے آگے کارگر ہو سکتا ہے جو دلوں کے بھیدوں سے بے خبر ہو۔ جس پر سارا ظاہر و باطن آشکارا ہو اس پر یہ فریب کیا چلے گا!

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ (۱۱)

مطلب یہ ہے کہ جب اس طرح مخلصین کے ساتھ منافقین بھی ملے ہوئے ہیں تو اللہ ان کو اسی طرح چھوٹے نہیں رکھے گا بلکہ وہ ان دونوں کو چھانٹ کر الگ الگ کرے گا۔ 'اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' سے یہاں مومنین مخلصین مراد ہیں۔ اس لیے کہ اس کے مقابل میں منافقین کا ذکر ہے جن کا کردار اوپر والی آیت میں یہ بیان ہوا ہے کہ وہ ایمان کے مدعی تو بن بیٹھے ہیں لیکن اس راہ میں چوٹ کھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہ بات بصیغۂ تاکید بیان ہوئی ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ فرق و امتیاز اللہ تعالیٰ کی صفات کا لازمی تقاضا ہے، اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ بات اس کے عدل کے منافی ہوگی۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا اتَّبِعُوا سَبِيلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطَايَاكُمْ ۖ وَمَا هُمْ بِحَامِلِينَ مِنْ خَطَايَاهُمْ مِنْ شَيْءٍ ۖ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَعَ أَثْقَالِهِمْ ۖ وَلَيُسْأَلُنَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَمَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ (۱۲-۱۳)

بزرگوں کی غلط منطق

'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا' اگرچہ باعتبار لفظ عام ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ کفار ہیں جن کی اولاد یا دوسرے زیردست افراد اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ یہ لوگ اپنے زیردستوں کو اسلام سے پھیرنے کے لیے ان پر جبر و ظلم بھی کرتے اور یہ اخلاقی دباؤ بھی ڈالتے کہ ہم نیک و بد اور خیر و شر کو تم سے زیادہ سمجھنے اور پرکھنے والے ہیں۔ اس وجہ سے تم ہمارے طریقے پر چلتے رہو، اگر ہمارا طریقہ غلط ہوا تو اس کا عذاب ثواب ہماری گردن پر ہے، تم اس کی ذمہ داری سے بری ہو، تمھارا بوجھ ہم اٹھالیں گے۔ یہ منطق بزرگوں، سرپرستوں والوں، استادوں، پیروں اور لیڈروں کی طرف سے، اپنے چھوٹوں کے مقابل میں، پہلے بھی ہمیشہ استعمال کی گئی ہے اور اب بھی استعمال کی جاتی ہے اور بسا اوقات یہ مؤثر بھی ہوتی ہے۔ ایک خاص حد تک اس کی تاثیر ایک امر فطری ہے اور اس میں چنداں ہرج بھی نہیں ہے۔ لیکن دین کا معاملہ نہایت اہم ہے۔ اس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے اس کے اپنے کندھوں پر ڈالی ہے۔ اس معاملے میں بے سوچے سمجھے نہ کسی کی تقلید جائز ہے اور نہ کسی کو اپنی تقلید پر مجبور کرنا جائز ہے۔ خدا کے ہاں کوئی بھی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بن سکے گا۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرَىٰ یہاں اسی حقیقت کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ اپنے زیردستوں کو یہ اطمینان دلا رہے ہیں کہ وہ ان کے بوجھ اٹھالیں گے وہ بڑی غلط فہمی میں ہیں اور بالکل جھوٹا اطمینان دلا رہے ہیں۔ قیامت کے دن ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ یہ اپنے گناہوں کے بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہوں گے اور ان لوگوں کے بوجھوں سے بھی ان کو حصہ بٹانا پڑے گا جو ان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہوں گے۔

'عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ' سے مراد وہ بدعتیں ہیں جو ایجاد تو انھوں نے خود کیں لیکن ان کو منسوب اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں اور ان کی حمایت میں اتنا غلو ہے کہ دوسروں کو بھی ان پر مجبور کرتے ہیں اور ان کے عذاب و ثواب کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ فرمایا کہ ان سب کی بابت قیامت کے دن ان سے پرسش ہوتی ہے۔

۲- آگے کا مضمون- آیات ۱۴-۴۰

اوپر کی آیات میں تین باتیں مذکور ہوئی ہیں۔

ایک یہ کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اٹھتے ہیں وہ ٹھنڈی سڑک سے منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ جاتے بلکہ ان کو اس راہ میں بہت سے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے، ان سے گزرے بغیر اللہ تعالیٰ کے

ہاں کسی کو صادقین و مخلصین کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔

دوسری یہ کہ دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر شخص خود مسئول و ذمہ دار ہے، کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بن سکے گا اس وجہ سے اس عذر پر تکیہ کرنا کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس نے کوئی بے راہروی دوسرے کے دباؤ سے اختیار کی، خواہ یہ دباؤ اخلاقی ہو یا مادی۔

تیسری یہ کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حق پرست بندوں کو مختلف قسم کی مصیبتوں میں مبتلا کر کے ان کو حق سے پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو ایک خاص حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل تو ملتی ہے لیکن اس ڈھیل سے اگر ان کا طغیان بڑھ جاتا ہے تو وہ لازماً اللہ تعالیٰ کے قانون کی گرفت میں آتے ہیں اور جب اس کی گرفت میں آجاتے ہیں تو پھر ان کے لیے کوئی مفر باقی نہیں رہتا۔

آگے کی آیات میں انہی حقائق کو حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخالفین و مکذبین کے احوال و واقعات سے مبرہن کیا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ۭ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۵﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۭ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ۭ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿۱۹﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ

الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰهُ یُنْشِئُ النَّشْاَةَ الْاٰخِرَةَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ
قَدِیْرٌ ۚ ﴿۲۰﴾ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَرْحَمُ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَ اِلَیْهِ
تُقْلَبُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَ مَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا فِی السَّمَآءِ ؗ
وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ۠ ﴿۲۲﴾ وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا
بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ لِقَآىٕهٖۤ اُولٰٓىٕكَ یَىٕسُوْا مِنْ رَّحْمَتِیْ وَ اُولٰٓىٕكَ
لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۲۳﴾ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوا
اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ
لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَ قَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ
مَّوَدَّةَ بَیْنِكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُ
بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّ یَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ؗ وَّ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَ مَا
لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ﴿۲۵﴾ فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَ قَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ
اِلٰى رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۶﴾ وَ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ
وَ یَعْقُوْبَ وَ جَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَ الْكِتٰبَ وَ اٰتَیْنٰهُ اَجْرَهٗ
فِی الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۲۷﴾ وَ لُوْطًا اِذْ قَالَ
لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ؗ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ
مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾ اَىٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ ۙ۬
وَ تَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ ؕ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ
قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۲۹﴾ قَالَ

ع ۲ ۹ ۱۴

وقف لازم

ع ۳ ۸ ۱۵

رَبِّ انْصُرْنِیْ عَلَی الْقَوْمِ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۳۰﴾ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِیْمَ
بِالْبُشْرٰی ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ ۚ اِنَّ اَهْلَهَا
كَانُوْا ظٰلِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ اِنَّ فِیْهَا لُوْطًا ؕ قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ
فِیْهَا ۫ لَنُنَجِّیَنَّهٗ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۫ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ ﴿۳۲﴾
وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا
وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ ۫ اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ
كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓی اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْیَةِ رِجْزًا
مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰیَةًۢ
بَیِّنَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ۙ فَقَالَ
یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ
مُفْسِدِیْنَ ﴿۳۶﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ
دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ﴿۳۷﴾ ۙ وَعَادًا وَّثَمُوْدَا۠ وَقَدْ تَّبَیَّنَ لَكُمْ مِّنْ
مَّسٰكِنِهِمْ ۫ وَزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِیْلِ
وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ ﴿۳۸﴾ ۙ وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۫ وَلَقَدْ
جَآءَهُمْ مُّوْسٰی بِالْبَیِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِی الْاَرْضِ وَمَا كَانُوْا
سٰبِقِیْنَ ﴿۳۹﴾ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِ
حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّیْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا
بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ

كَانُوٓا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿٤٠﴾

اور ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تو وہ ان کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار سال رہا۔ تو ان کو طوفان نے آپکڑا اور وہ اپنی جانوں پر خود ظلم ڈھانے والے بنے۔ پس ہم نے اس کو اور کشتی والوں کو نجات دی اور اس واقعہ کو دنیا والوں کے لیے ایک عظیم نشانی بنایا۔ ۱۴-۱۵

ترجمۂ آیات ۱۴-۴۰

اور ابراہیم کو بھی رسول بنا کر بھیجا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر جانو۔ تم اللہ کے سوا بس بتوں کی پوجا کر رہے ہو اور بہتان گھڑ رہے ہو۔ جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو یہ تمھارے لیے رزق پر کوئی اختیار نہیں رکھتے تو اللہ ہی کے پاس رزق کے طالب بنو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کے شکر گزار رہو۔ اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۱۶-۱۷

اور اگر تم جھٹلاؤ گے تو یاد رکھو کہ تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں نے جھٹلایا اور رسول پر واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ ۱۸

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ کس طرح اللہ خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کا اعادہ کر دیتا ہے۔ بے شک یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ ان سے کہو، زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ کس طرح اللہ نے خلق کا آغاز کیا اور پھر اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور جس پر چاہے گا رحم کرے گا اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اور نہ تم زمین میں خدا کے قابو سے باہر نکل سکو گے اور نہ آسمان میں اور تمھارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی کارساز ہے اور نہ کوئی مددگار۔ اور جن لوگوں

نے اللہ کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا تو وہی لوگ ہیں جو میری رحمت سے محروم ہوئے اور وہی لوگ ہیں جن کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ۱۹-۲۳

تو اس کی قوم کا جواب صرف یہ ہوا کہ انھوں نے کہا کہ اس کو قتل کر دو یا جلا دو۔ تو اللہ نے اس کو آگ سے نجات دی بے شک اس کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ ۲۴

اور اس نے کہا تم نے اللہ کے سوا جو بُت بنائے ہیں، تمھاری آپس کی دوستی بس دنیا کی زندگی تک ہے۔ پھر قیامت کے دن تم میں سے ہر ایک دوسرے کا انکار کرے گا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا اور تمھارا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور تمھارا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ ۲۵

پس لوط نے اس کی تصدیق کی اور کہا، میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ بے شک وہی عزیز و حکیم ہے۔ ۲۶

اور ہم نے اس کو عطا کیے اسحاق اور یعقوب اور اس کی ذرّیت میں نبوّت اور کتاب کا سلسلہ جاری کیا۔ اور ہم نے اس کا صلہ اس کو دنیا میں بھی دیا اور وہ آخرت میں بھی نیکوکاروں کے زمرے میں سے ہوگا۔ ۲۷

اور لوط کو بھی ہم نے رسول بنایا۔ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ ایک کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو۔ تم سے پہلے دنیا میں کسی قوم نے بھی اس کا ارتکاب نہیں کیا! کیا تم مردوں سے شہوت رانی کرتے اور فطرت کی راہ مارتے ہو! اور اپنی مجلسوں میں بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو! تو اس کی قوم کا جواب صرف یہ ہوا کہ وہ بولے کہ اگر تم

سچے ہو تو ہمارے اوپر اللہ کا عذاب لاؤ! ۲۸-۲۹

اس نے دعا کی، اے رب! اس مفسد قوم کے مقابل میں میری مدد کر۔ اور جب ہمارے فرستادے ابراہیم کے پاس خوش خبری لے کر آئے، انھوں نے کہا، ہم اس بستی والوں کو ہلاک کر دینے والے ہیں۔ اس کے باشندے بڑے ہی ناہنجار ہیں! اس نے کہا، اس میں تو لوط بھی ہے! انھوں نے جواب دیا کہ جو اس میں ہیں ہم ان کو خوب جانتے ہیں۔ ہم اس کو اور اس کے متعلقین کو بچا لیں گے مگر اس کی بیوی کو، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہو گی۔ ۳۰-۳۲

اور جب یوں ہوا کہ آئے ہمارے فرستادے لُوط کے پاس تو وہ ان سے آزردہ اور دل تنگ ہوا اور وہ بولے کہ تم نہ کوئی اندیشہ کرو، نہ غم، ہم تم کو اور تمھارے متعلقین کو بچا لیں گے بجز تمھاری بیوی کے، وہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہو گی۔ ہم اس بستی والوں پر، ان کی نافرمانیوں کی پاداش میں، آسمان سے ایک آفت اتارنے والے ہیں! اور ہم نے اس کی ایک واضح نشانی باقی رکھی ان لوگوں کے لیے جو سوچنا سمجھنا چاہیں۔ ۳۳-۳۵

اور ہم نے مدین والوں کے پاس ان کے بھائی شعیب کو بھیجا تو اس نے دعوت دی، اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو اور یوم آخرت کے منتظر رہو اور زمین میں فساد مچانے والے بن کر نہ بڑھو۔ تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا تو ان کو زلزلہ نے آ پکڑا۔ پس وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ ۳۶-۳۷

اور عاد اور ثمود کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا۔ اور تم پر ان کی بستیوں کے نشان واضح ہیں۔ اور شیطان نے ان کے مشاغل ان کی نگاہوں میں کھبا دیے اور اس طرح ان کو صحیح راہ سے روک دیا، حالانکہ وہ بڑے ہی ہوشیار لوگ تھے۔ ۳۸

اور قارون و فرعون اور ہامان کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا اور موسیٰ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے ملک میں گھمنڈ کیا اور وہ ہمارے قابو سے باہر نکل جانے والے نہ بن سکے۔ ۳۹

پس ہم نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے گناہ کی پاداش میں پکڑا۔ ان میں سے بعض پر ہم نے گرد باد کا طوفان بھیجا۔ اور ان میں سے بعض کو کڑک نے آپکڑا، اور ان میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا اور ان میں سے بعض کو ہم نے غرق کر دیا اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ ۴۰

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ۖ فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ (۱۴)

حضرت نوحؑ کا طویل امتحان

حضرت نوح علیہ السلام کی ساڑھے نو سو سال عمر کا ذکر صرف اسی سورہ میں آیا ہے۔ عمر کی یہ تصریح اس سورہ کے عمود کے تقاضے سے ہوئی ہے۔ اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ جو لوگ حق کی راہ اختیار کریں ان کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ وہ جلدی سے، بغیر کوئی زحمت و مشقت جھیلے، منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے بلکہ انھیں ایک طویل مدت تک آزمائشوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی حقیقت کو مبرہن کرنے کے لیے یہاں حضرت نوحؑ کی عمر کا حوالہ دیا کہ انھیں اپنی قوم کے ساتھ ایک طویل مدت تک کشمکش کرنی پڑی تب کہیں جا کر وہ اللہ تعالیٰ کے امتحان میں سرخرو اور اپنے فرض سے فارغ ہوئے۔

حضرت نوحؑ کے زمانہ میں عمروں کا اوسط

حضرت نوح علیہ السلام کی جو عمر یہاں مذکور ہوئی ہے بالکل تورات کے بیان کے مطابق ہے۔ تورات میں ہے:

"اور طوفان کے بعد نوح ساڑھے تین برس اور جیتا رہا اور نوح کی کل عمر ساڑھے نو سو برس کی ہوئی، تب اس نے وفات پائی۔" (پیدائش: ۹-۲۸-۲۹)

تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں عمروں کا اوسط آج کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ حضرت نوحؑ کے والد کی عمر سات سو ستتر برس کی ہوئی۔ ان کے دادا کی عمر نو سو انہتر برس مذکور ہے۔ اسی طرح ان کے

دوسرے اجداد میں سے کسی کی عمر نو سو باسٹھ برس مذکور ہے اور کسی کی آٹھ سو پچانوے برس۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوحؑ کی یہ عمر اس دور کی اوسط عمر کے بالکل مطابق ہے۔ اس عہد کی کوئی مدوّن تاریخ موجود نہیں ہے۔ صرف تورات ہی کے ذریعہ سے کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ تورات کے ان بیانات کی تکذیب کی جائے ـــــ یہ امر بھی یہاں ملحوظ رہے کہ اس عہد میں جب کہ ہماری یہ زمین ابھی آباد ہو رہی تھی اور تمدن و معیشت کے وہ مفاسد ظہور میں نہیں آئے تھے جو اب زندگی کے ہر شعبے پر چھا گئے ہیں، اگر عمروں کا اوسط زیادہ رہا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے بلکہ یہ عین حکمتِ الٰہی اور فطرتِ انسانی کے تقاضوں کے مطابق ہے۔

'فَاَخَذَهُمُ الطُّوْفَانُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ' اس ٹکڑے سے تمہید میں بیان کردہ دوسری حقیقت کی تائید ہوئی کہ ہر چند اللہ تعالیٰ اعدائے حق کو ڈھیل تو دیتا ہے لیکن اس ڈھیل کی ایک حد ہوتی ہے جس کے بعد وہ ان کو ضرور پکڑتا ہے اور یہ پکڑنا ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہوتا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنتے ہیں اس لیے کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو چکی ہوتی ہے۔ سنتِ الٰہی کے مطابق جس طرح اہلِ حق کا کامیابی کی منزل پر پہنچنے سے پہلے امتحان ضروری ہے اسی طرح اہلِ باطل پر عذاب سے پہلے ان پر اتمامِ حجت لازمی ہے۔

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَصْحٰبَ السَّفِيْنَةِ وَجَعَلْنٰهَا اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۱۵)

امتحان کے بعد حضرت نوحؑ اور ان

یعنی اتنی طویل کشمکش اور آزمائش کے بعد وہ مرحلہ آیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو نجات دی اور اس واقعہ کو دنیا والوں کے لیے ایک عظیم نشانی بنایا جس کے آئینہ میں اہلِ حق اور اہلِ باطل دونوں اپنے اپنے انجام دیکھ سکتے ہیں۔

ضمیر کا مرجع پورا واقعہ ہے

'وَجَعَلْنٰهَا' میں ضمیر کا مرجع کوئی معین لفظ نہیں ہے بلکہ وہ پورا واقعہ ہے جو اوپر بیان ہوا۔ عربی میں ضمیروں کے استعمال کا یہ طریقہ معروف ہے' اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

حضرت نوحؑ کے اس واقعہ میں اس بات کی دلیل بھی موجود ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ دین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کی طرف سے کوئی دوسرا جواب دہی نہ کر سکے گا۔ اگر اس کی کوئی گنجائش ہوتی تو حضرت نوحؑ اپنے بیٹے کو خدا کی پکڑ سے ضرور بچا لیتے لیکن جب حضرت نوحؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر اپنے بیٹے کے کچھ کام نہ آسکے تو تا بہ دیگراں چہ رسد۔

وَاِبْرٰهِيْمَ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ط ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۶)

حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اور ان کا امتحان

یعنی جس طرح ہم نے نوحؑ کو رسول بنا کر بھیجا تھا اسی طرح ابراہیمؑ کو بھی اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اس نے بھی اپنی قوم کو دعوت دی کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس کے غضب سے ڈرو۔ اس کے غضب

سے ڈرو، یعنی اس کی بندگی میں دوسروں کو شریک کرکے اس کے غضب کو دعوت نہ دو۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ تنبیہ کا کلمہ ہے۔ یعنی یہ بہترین نصیحت اور بہترین موعظت ہے جو میں بالکل وقت پر تمھیں پہنچا رہا ہوں بشرطیکہ تم اس کو سمجھو اور اس کی قدر کرو۔

اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۱۷)

یعنی اپنے جن معبودوں کو تم شریک خدا سمجھ کر پوج رہے ہو ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے، یہ محض بت اور تھان اور استھان ہیں۔ وَتَخْلُقُوْنَ اِفْكًا یعنی تمھارا یہ دعویٰ کہ خدا نے ان کو اپنی خدائی میں شریک بنایا ہے محض ایک بہتان ہے جو تم خدا پر لگا رہے ہو۔ نہ خدا نے کہیں یہ فرمایا ہے کہ اس نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے اور نہ تمھارے پاس اس کے حق میں کوئی دلیل ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ یعنی اگر تمھارا یہ گمان ہے کہ رزق و فضل پر تمھارے ان دیوتاؤں کا کوئی اختیار ہے تو یہ محض تمھارا وہم ہے ان کو تمھارے رزق پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ہر چیز خدا ہی کے اختیار میں ہے تو اگر تم رزق و فضل کے طالب ہو تو خدا ہی کی طرف رجوع کرو اور اسی سے مانگو۔

وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ یعنی تمھاری عبادت و شکر گزاری کا اصل حقدار وہی ہے جس کے اختیار میں سب کچھ ہے اور جو تمھیں سب کچھ دیتا ہے تو اس کے حق میں دوسروں کو شریک کرکے اس کی ناشکری نہ کرو۔

وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ یعنی مرنے کے بعد تم اٹھائے جاؤ گے اور تمھاری پیشی اسی کے سامنے ہونے والی ہے۔ اس دن تمھارے یہ اصنام و اوثان تمھارے کچھ کام آنے والے نہیں بنیں گے۔

وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (۱۸)

یہ نہایت سخت الفاظ میں تنبیہ ہے کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی اور میری تکذیب پر اڑے رہے تو یاد رکھو کہ تم سے پہلے بھی بہت سی قوموں نے اپنے اپنے رسولوں کو جھٹلایا تو جو انجام ان کا ہوا اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہو۔

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ یعنی رسول کے اوپر ذمہ داری صرف واضح طور پر اللہ کی بات پہنچا دینے کی ہوتی ہے۔ وہ فرض میں نے ادا کر دیا۔ اب ذمہ داری تمھاری ہے۔ اب جو پرسش ہوگی وہ تم سے ہوگی۔ اب مجھ سے یہ پرسش نہیں ہوگی، کہ تم نے ہدایت کی راہ کیوں نہیں اختیار کی!

اَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللّٰهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۱۹)

چند آیات بطور تضمین

یہ اور اس کے بعد کی آیات، آیت ۲۳ تک، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی طرح کی تضمین ہے جس کی متعدد مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات جب قیامت کے ذکر تک پہنچی تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے قیامت کے دلائل کا حوالہ دے کر حضرت ابراہیم کی بات کو مکمل اور کلام کو بالکل مطابق حال بنا دیا۔

اَوَلَمْ یَرَوْا کَیْفَ یُبْدِئُ اللّٰہُ الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُہٗ۔ یعنی اگر انھیں مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے میں کوئی شک ہے تو کیا انھوں نے اس کائنات میں اس حقیقت کا مشاہدہ نہیں کیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ چیزوں کو پیدا کرتا ہے، پھر ان کو فنا کرتا ہے اور پھر دوبارہ ان کا اعادہ کر دیتا ہے۔ یہ اسی دلیل کی طرف اشارہ ہے جو مختلف اسلوبوں سے، متعدد مقامات میں پیچھے گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب زمین کو بالکل خشک و بے آب و گیاہ کر دینے کے بعد اس کو ازسرِنو سرسبز و شاداب کر دینے میں خدا کو کوئی مشکل نہیں پیش آرہی تو لوگوں کے مرکھپ جانے کے بعد ان کو دوبارہ زندہ کر دینے میں اس کو کیوں مشکل پیش آئے گی۔

اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ۔ یعنی اس کو مستبعد اور بعید از امکان نہ خیال کرو۔ جس خدا نے ہر چیز کو عدم سے وجود بخشا اور جو برابر اپنی اس قدرت کا اس کائنات میں مشاہدہ کرا رہا ہے اس کے لیے تمھیں دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا نہایت سہل ہے۔

قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ ثُمَّ اللّٰہُ یُنْشِئُ النَّشْاَۃَ الْاٰخِرَۃَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۲۰)

دنیا کے مظاہر پر صحیح نقطۂ نظر سے غور کرنے کی دعوت

یہ اس دنیا کے مظاہر پر صحیح نقطۂ نگاہ سے غور کرنے کی دعوت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا کے نظام کو اس طرح چلا رہا ہے کہ یہ تمام حقائق کی تعلیم کے لیے خود اپنے وجود کے اندر ایک مکمل تربیت گاہ ہے — توحید، قیامت اور جزا و سزا کے لیے باہر سے دلیل ڈھونڈھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس دنیا کے شب و روز کے مشاہدات میں ان میں سے ہر چیز کی شہادت موجود ہے۔ فرمایا کہ اس زمین میں چلو پھرو اور غور کی نگاہ سے دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کس طرح خلق کا آغاز فرماتا ہے اور پھر اس کو فنا کر کے اس کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرتا ہے۔ ایک قوم کو وہ وجود بخشتا ہے اور پھر اس کو مٹا کر اس کی جگہ دوسری قوم کو لاتا ہے۔ رات کے بعد دن نمودار کرتا ہے، خزاں کے بعد بہار آجاتی ہے۔ یہ سارے مشاہدات وہ اسی لیے کرا رہا ہے کہ انسان مرنے کے بعد کی زندگی کو بعید از امکان نہ تصور کرے بلکہ اپنے روزمرہ کے مشاہدات کی روشنی میں یقین رکھے کہ جس خالق کی قدرت کے یہ کرشمے وہ ہر روز اور ہر آن مشاہدہ کر رہا ہے اس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ وَیَرْحَمُ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَاِلَیْہِ تُقْلَبُوْنَ (۲۱)

یعنی اس دنیا کے واقعات و حوادث اور اس کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے سزا دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم فرماتا ہے۔ اس کے اپنے قانونِ عدل و حکمت کے سوا اور کوئی چیز بھی اس کی مشیت و قدرت پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے۔ قرآن میں قوموں کی جو تاریخ بیان ہوئی ہے وہ اس حقیقت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ آخرت میں بھی عذاب و ثواب کا معاملہ تمام تر اسی کے اختیار میں ہوگا، کوئی دوسرا اس کے اس اختیار میں مداخلت نہ کر سکے گا۔ وہی اپنے عدل و حکمت کے مطابق جس کو چاہے گا سزا دے گا، جس کو چاہے گا اپنی مغفرت سے نوازے گا۔

'وَاِلَیْہِ تُقْلَبُوْنَ'۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ سب کی واپسی بالآخر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہوتی ہے، کسی اور کی یہ حیثیت نہیں ہے کہ وہ مولیٰ و مرجع بن سکے۔ جب اس دنیا میں اس کی گرفت سے بچانے والا کوئی اور نہ بن سکا، کسی اور کی دہائی کچھ کارگر نہ ہو سکی تو آخرت میں اس کے نافع ہونے کی توقع کس بنیاد پر کی جائے!

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ز وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۲۲)

اوپر کی باتیں غائب کے اسلوب میں ارشاد ہوئی ہیں۔ اب یہ قریش کو براہِ راست خطاب کر کے تنبیہ کی جارہی ہے تاکہ کلام بالکل مطابقِ حال ہو جائے۔ فرمایا کہ جب وہ تم کو پکڑنا چاہے گا تو اس کی پکڑ سے نہ تم زمین میں کہیں اس کے قابو سے باہر نکل سکو گے اور نہ آسمانوں میں۔ نہ یہاں تمہارا کوئی ساتھی اور کارساز بن سکے گا نہ آخرت میں تمہارا کوئی حامی و شفیع ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۳)

'یَئِسُوْا' یہاں 'حُرِمُوا' اور 'بُعِدُوا' کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ لوگ ہمیشہ کے لیے خدا کی رحمت و عنایت سے محروم ہوئے۔ اس لفظ میں 'حُرِمُوا' کے بالمقابل زیادہ زور ہے۔ بعض اوقات کسی چیز سے محرومی اس کے دوبارہ حصول کی امید کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ محرومی زیادہ دل شکن نہیں ہوتی۔ کفار کو آخرت میں خدا کی رحمت سے جو محرومی ہوگی وہ کامل مایوسی کے ساتھ ہوگی۔ ان کے لیے امید کے دروازے ہمیشہ کے واسطے بند ہو جائیں گے۔

فرمایا کہ جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا، جو آج ان کو سنائی جارہی ہیں اور خدا کے حضور پیشی کا، جس سے ان کو ڈرایا جارہا ہے، انکار کیا وہ یاد رکھیں کہ وہ ہمیشہ کے لیے میری رحمت سے مایوس و نامراد ہوئے۔ اس رحمت کا استحقاق پیدا کرنے کا موقع صرف اسی دنیا کی زندگی میں ہے۔ جو لوگ یہ فرصت

رائگاں کر دیں گے ان کے لیے اس کو کھو کر پا سکنے کا کوئی امکان نہیں۔

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا اقْتُلُوْهُ اَوْ حَرِّقُوْهُ فَاَنْجٰىهُ اللّٰهُ مِنَ النَّارِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۲۴)

اصل سرگزشت کا بقیہ حصہ

بیچ میں تضمین کی جو آیات آ گئی تھیں وہ اوپر کی آیت پر ختم ہوئیں۔ اب اصل سرگزشت کا بقیہ حصہ پھر سامنے آ گیا۔ فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ کی اس دردمندانہ دعوت کا جواب ان کی قوم نے دیا تو یہ دیا کہ اس شخص کو یا تو قتل کر دو یا جلا دو۔ بالآخر اسی دوسری رائے پر اتفاق ہوا اور قرآن میں دوسری جگہ یہ تصریح ہے کہ اس کے لیے ایک خفیہ اسکیم بنائی گئی لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دشمنوں کے اس شر سے بچا لیا۔ فرمایا کہ اس واقعہ کے اندر ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان کی راہ اختیار کریں۔

اس سرگزشت کی نشانیاں

اس میں پہلی نشانی تو اس بات کی ہے کہ جو لوگ ایمان کی راہ اختیار کریں وہ اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ اس راہ میں بہت سے سخت امتحانات پیش آتے ہیں، جن سے گزرے بغیر کوئی شخص ایمان کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو اس راہ میں آگ کے الاؤ کے اندر سے ہو کر گزرنا پڑا ہے۔

دوسری نشانی اس بات کی ہے کہ اس راہ میں علائق کی زنجیریں کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے باپ ـــ آزر ـــ نے ان پر پورا دباؤ ڈالا کہ ان کو ایمان کی راہ سے روک دے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ دین کے معاملہ میں ان کا باپ خدا کے ہاں ان کی طرف سے جواب دہ نہیں ہوگا بلکہ انھیں اپنی جواب دہی خود کرنی ہوگی اس وجہ سے باوجود اس کے کہ وہ اپنے باپ کے لیے اپنے سینہ میں ایک نہایت دردمند دل رکھتے تھے لیکن وہ اس کے مقابل میں اپنے دین کی حفاظت کے لیے علائقِ محبت کی تمام زنجیریں توڑ کر سینہ سپر ہو گئے۔

تیسری نشانی اس میں اس بات کی ہے کہ جو لوگ حق کو پسپا کرنے کے لیے اپنا زور و زر اور اپنا اختیار و اقتدار استعمال کرتے ہیں، اگرچہ ایک حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو زور آزمائی کی مہلت ملتی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ آزمائش کا یہ ایک لازمی تقاضا ہے لیکن اس مہلت کی ایک خاص حد ہے۔ اگر اہلِ حق اس کے مقابل میں ڈٹ جاتے ہیں تو بالآخر فتحمند وہی ہوتے ہیں اور اہلِ باطل دنیا اور آخرت دونوں میں رسوا ہوتے ہیں۔

وَقَالَ اِنَّمَا اتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا ۙ مَّوَدَّةَ بَیْنِكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ وَّیَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ۫ وَّمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ (۲۵)

گمراہ لیڈروں اور گمراہ پیروؤں کی دوستی بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے

اِنَّمَا حصر کے مفہوم میں ہے اور مَوَدَّةَ بَیْنِکُمْ بیانِ علت کے لیے نہیں بلکہ بیانِ حال کے لیے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ جو تم نے اللہ کے سوا دوسرے اصنام و اوثان بنائے ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ محض تمھارے خیال و وہم کی ایجادیں ہیں۔ ان کے ساتھ تمھاری ساری دوستی و نیازمندی بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے۔ قیامت کے دن جب اصل حقیقت سامنے آئے گی تو تم ایک دوسرے کا انکار کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے۔ تم کہو گے کہ اے رب، ہم کو فلاں اور فلاں نے گمراہ کیا۔ اگر یہ نہ ورغلاتے تو ہم تیری سیدھی راہ پر ہوتے۔ وہ جواب دیں گے کہ ہم جیسے خود تھے ہم نے تم کو ویسے ہی بنایا، تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی تو ہم کو ملامت کرنے کے بجائے خود اپنے کو ملامت کرو اور اپنے کیے کی سزا بھگتو۔ اس جنگ و جدال کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ ہوا ہے اور مقصود اس کے ذکر سے یہ ہے کہ جو لوگ دعوت کے اس دور میں اپنے زیردستوں کو یہ اطمینان دلا رہے تھے کہ وہ ان کے طریقے پر چلتے رہیں، قیامت کے دن وہ ان کی طرف سے جواب دہی کر لیں گے، ان کو یہ آگاہی دے دی جائے کہ اس دن اس قسم کے لیڈر اور اس قسم کے پیرو، اس قسم کے معبود اور اس قسم کے عابد سب ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے۔ دوستی و وفاداری کے سارے دعوے بس اسی وقت تک ہیں جب تک اصل حقیقت سے پردہ نہیں اٹھتا۔ پردہ اٹھتے ہی سب پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس طرح کے سارے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۲۶)

اول اول صرف حضرت لوطؑ نے حضرت ابراہیمؑ کا ساتھ دیا

اٰمَنَ لَهٗ تصدیق و تائید کے مفہوم میں ہے۔ حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے اور خود منصبِ رسالت پر فائز اور اپنی قوم کی دعوت پر مامور تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے جو روش اختیار کی اس کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا۔ یہاں حضرت لوطؑ کی تصدیق و تائید کا حوالہ اس لیے دیا ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی پر بھی ایک وقت ایسا گزرا ہے کہ ان کی دعوت میں ان کی ہمنوائی کرنے والا حضرت لوطؑ کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا لیکن بالآخر وہ وقت بھی آیا کہ ان کی دعوت کی صدائے بازگشت دنیا کے کونے کونے سے اٹھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی ہجرت

وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔ قَالَ کا فاعل حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے اپنی قوم کا رویہ دیکھ لیا کہ وہ ان کے قتل کر دینے اور جلا دینے کے درپے ہے تو انھوں نے سنتِ الٰہی کے مطابق ہجرت کا عزم فرمایا کہ اب میں قوم کو چھوڑ کر اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں، میرا رب عزیز و حکیم ہے۔ یعنی اگرچہ بظاہر حالات بالکل نامساعد ہیں لیکن میرا رب ہر چیز پر غالب ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ وہ میرے لیے اپنی قدرت و حکمت سے راہ کھولے گا اور اس تاریکی کے اندر سے روشنی نمودار کرے گا۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ فِی الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۲۷)

ہجرت کے بعد اللہ تعالیٰ کا انعام

یہ وہ انعام بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہجرت کے بعد فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ اگرچہ ابراہیمؑ نے جب ہجرت کی ہے لوط علیہ السلام کے سوا اور کوئی ان کی ہمنوائی کرنے والا نہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو تنہا نہیں چھوڑتا بلکہ وہ ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں صالحین و ابرار کی معیت و رفاقت نصیب کرتا ہے۔ چنانچہ ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ جیسے بیٹے اور پوتے عطا فرمائے جن سے دین کے خدمت گزاروں کا ایک عظیم گھرانا آباد ہوا اور اس گھرانے کے اندر اللہ تعالیٰ نے نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری فرمایا۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کو اس دنیا میں بھی ان کی خدمات کا صلہ عطا ہوا اور آخرت میں بھی وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوں گے۔

نبی صلعم اور آپ کے صحابہؓ کو بشارت

اس آیت میں در پردہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے لیے بشارت ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ سورہ مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب مسلمانوں پر کفار نے عرصۂ حیات بالکل تنگ کر دیا تھا اور مظلوم مسلمانوں کے لیے ہجرت کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ان حالات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے اس پہلو کو نمایاں کرکے اللہ تعالیٰ نے ان کو تسلی دی کہ اگر یہ مرحلہ پیش آتا ہے تو اس سے ہراساں نہ ہونا، اپنے باپ ابراہیمؑ کی طرح اپنے ربّ عزیز و حکیم کے بھروسہ پر دامن جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہونا۔ اگر اپنے رب کی خاطر تم اپنی ناہنجار قوم کو چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ تمھارے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں اچھے ساتھی پیدا کرے گا۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖۤ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۫ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (۲۸)

حضرت لوطؑ کی دعوت

حضرت لوطؑ، اوپر گزر چکا ہے، حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے، ان کی دعوت کا علاقہ اگرچہ الگ تھا لیکن زمانہ ایک ہی تھا۔ ان کی قوم میں یوں تو وہ ساری ہی برائیاں تھیں جو دوسری مشرک قوموں میں رہی ہیں لیکن امرد پرستی کی بے حیائی اس قوم میں فیشن کی حیثیت حاصل کر گئی تھی اس وجہ سے اس کی اصلاح پر ان کو خاص طور پر توجہ مرکوز کرنی پڑی۔ لفظ 'فَاحِشَة' سے انھوں نے اسی بے حیائی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ 'فَاحِشَة' کھلی ہوئی بدکاری و بے حیائی کو کہتے ہیں جس کے بدکاری و بے حیائی ہونے میں کسی اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ 'لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ' کے الفاظ سے حضرت لوطؑ نے لوگوں کی اخلاقی حس بیدار کرنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ان کو غیرت دلائی کہ یہ تو وہ بے حیائی ہے جو سب سے پہلے اس روئے زمین پر تمھی نے ایک فیشن کی حیثیت سے اختیار کی ہے، تم سے پہلے کسی قوم نے بھی یہ لعنت ایک قومی تہذیب کی حیثیت سے اختیار نہیں کی۔

ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ 'مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ'
سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ قوم لوطؑ سے پہلے دنیا میں کسی ایک فرد نے بھی اس برائی کا ارتکاب نہ کیا ہو۔
لفظ 'اَحَد' جمع کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اس کی مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں اس وجہ سے اس کا صحیح مفہوم
یہی ہے کہ تم سے پہلے کسی قوم نے بھی اس بے حیائی کو من حیث القوم اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا۔ اس
برائی کا یہی وہ پہلو ہے جس کے سبب سے پوری قوم لوطؑ عذاب کی مستحق ٹھہری۔

اَئِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ ۙ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ ۭ فَمَا كَانَ جَوَابَ
قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۲۹)

برائی فیشن کی حیثیت سے

'سبیل' سے مراد یہاں فطرت کی راہ ہے۔ حضرت لوطؑ نے ان کو نہایت دردمندانہ لہجہ میں فطرت
سے اس انحراف پر ملامت فرمائی کہ بدبختو! تم مردوں سے شہوت رانی کرتے اور فطرت کی راہ مارتے ہو! ظاہر
ہے کہ اگر کسی قوم میں یہ بیماری عام ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلے گا کہ عورتوں کی طرف مردوں کی رغبت
بالکل ہی ختم ہو جائے گی اور اگر کچھ رہے گی بھی تو وہ بھی صحیح نوعیت کی نہ ہوگی اور اس طرح پوری قوم اہلاکِ
نسل کی اس راہ پر چل پڑے گی جو فاطرِ فطرت کے منشا کے بالکل خلاف اور تباہی کی راہ ہے۔

'وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ' سے اس فسادِ اخلاق کے عام ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ
یہ کوئی ڈھکی چھپی برائی نہیں رہ گئی تھی بلکہ ان کی سوسائٹی میں اس نے تہذیب اور فیشن کی حیثیت حاصل کر لی
تھی۔ مجلسوں میں علانیہ ناشائستہ حرکتیں ہوتیں اور فخر و لذت کے ساتھ ہر بزم و انجمن میں ان کے چرچے
ہوتے۔ ہماری جس شاعری کو حالی مرحوم نے سنڈاس سے بدتر قرار دیا ہے وہ انہی خرافات کا دفتر ہے
اور ہمارے قومی اخلاق و کردار پر اس کا جو اثر پڑا اس کے دردانگیز نتائج کی تفصیل تاریخ کے صفحات
میں موجود ہے۔

'فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖ الاية' یعنی ان تمام دردمندانہ تنبیہات کا جواب اس قوم نے دیا تو
یہ دیا کہ اگر تم سچ مچ اللہ کے رسول ہو اور تمہاری تکذیب سے ہم پر اللہ کا کوئی عذاب آنے والا ہے
تو ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ تم اس عذاب کو دکھا دو تب ہم تمہاری بات باور کریں گے۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ (۳۰)

حضرت لوطؑ کی فریاد بارگاہ الٰہی میں

جب قوم نے اپنی ضد سے حضرت لوطؑ کو بالکل مایوس کر دیا تب انھوں نے اپنے رب سے
فریاد کی کہ اے رب، میری تمام سعیٔ اصلاح بے سود ہو چکی ہے تو اب اس مفسد قوم کے مقابل میں میری
مدد فرما۔

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مُهْلِكُوْٓا اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ ۚ
اِنَّ اَهْلَهَا كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ (۳۱)

رحمت ونقمت دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہیں

'بُشْرٰی' سے مراد وہ بشارت ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو دی۔ اس کا ذکر اوپر آیت ۲۷ میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ جو فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لیے بیٹے اور پوتے کی بشارت لے کر آئے وہی فرشتے قوم لوط کے لیے عذاب کا تازیانہ لے کر آئے۔ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت کے ساتھ قوم لوط کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی بھی خبر دی کہ اب ہم اس بستی والوں کو (اشارہ قوم لوط کی بستی کی طرف ہے) ہلاک کر دینے والے ہیں۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہی ہاتھ میں رحمت و نقمت دونوں ہیں۔ جس طرح ایک ہی بارش کو وہ کسی کے لیے عذاب اور کسی کے لیے رحمت بنا دیتا ہے اسی طرح اس کے جو فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے لیے بشارت لے کر آئے وہی قوم لوط کے لیے عذاب کا پیش خیمہ بن کر نمودار ہوئے۔ اس سے مشرک قوموں کے اس واہمہ کی بھی تردید ہو رہی ہے جس میں وہ اس کائنات کے اندر اضداد کے وجود کے سبب سے مبتلا ہوئیں کہ انھوں نے خیر و شر کے الگ الگ دیوتا مان کر ان کی الگ الگ عبادت شروع کر دی۔

'اِنَّ اَھْلَھَا کَانُوْا ظٰلِمِیْنَ' یہ قوم لوط کی ہلاکت کی علت بیان ہوئی ہے کہ ان کے ہلاک کیے جانے کا فیصلہ خود ان کے اس ظلم کے نتیجہ میں ہوا جو انھوں نے اپنے اوپر کیا کہ فطرت کی راہ سے کھلم کھلا انحراف اختیار کیا اور اللہ کے رسول نے جب اس کے نتائج سے ان کو آگاہ کیا تو اس کی بات پر کان دھرنے کے بجائے اس سے عذاب کا مطالبہ کیا۔ اس طرح کے لوگوں پر جو عذاب آتا ہے وہ خود ان کے ظلم کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر کوئی ظلم نہیں کرتا۔

قَالَ اِنَّ فِیْهَا لُوْطًا ط قَالُوْا نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَنْ فِیْهَا قف لَنُنَجِّیَنَّهٗ وَاَھْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ق کَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ۔ (۳۲)

حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی تشویش کا ازالہ

حضرت ابراہیمؑ کو جونہی فرشتوں کی اس مہم کا علم ہوا انھیں حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کی فکر پڑ گئی کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟ انھوں نے سوال فرمایا کہ اس بستی میں تو لوطؑ بھی ہیں؟ فرشتوں نے ان کو اطمینان دلایا کہ اس میں جتنے اہل ایمان ہیں ہم ان سب سے اچھی طرح واقف ہیں۔ آپ ان کے بارے میں بالکل مطمئن رہیں، ہم لوطؑ اور ان کے تمام متعلقین کو اس عذاب سے بچا لیں گے۔ صرف ان کی بیوی پیچھے رہ جائے گی اور وہ عذاب کی زد میں آئے گی۔

وَلَمَّآ اَنْ جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالُوْا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ قف اِنَّا مُنَجُّوْكَ وَاَھْلَكَ اِلَّا امْرَاَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِیْنَ (۳۳)

زبان کا ایک نکتہ

یہاں زبان کا ایک نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے جس کی طرف علامہ ابن قیمؒ نے اشارہ فرمایا ہے کہ جب 'لَمَّا' اور اس کے بعد کے فعل کے درمیان 'اَنْ' آ جائے تو اس صورت میں شرط اور اس کے جواب کے درمیان سبب اور مسبب کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت لوطؑ کی آزردگی کا سبب۔

مطلب یہ ہے کہ جب فرشتے حضرت ابراہیمؑ کے پاس سے ہو کر حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے تو وہ ان کو دیکھ کر آزردہ اور متردّد ہوئے۔ یہاں یہ سوال قابلِ غور ہے کہ حضرت لوطؑ فرشتوں کو دیکھ کر آزردہ و دل گرفتہ کیوں ہوئے؟ انھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کا خیر مقدم کیوں نہیں کیا؟ قرآن مجید کے دوسرے مقامات کے مطالعہ سے ان کی اس آزردگی و پریشانی کے دو سبب معلوم ہوتے ہیں، جو الگ الگ دو مختلف مرحلوں میں ظاہر ہوئے ہیں۔

پہلے مرحلے میں تو وہ ان کو دیکھ کر اس وجہ سے پریشان ہوئے کہ یہ فرشتے خوبرو نوجوانوں کی شکل میں آئے تھے۔ ان کا اس شکل و صورت میں آنا قوم لوط کے لیے ایک آخری ابتلاء تھا تاکہ ان کے اندر جو خبث بھرا ہوا ہے وہ پوری طرح ظاہر ہو جائے اور جو عذاب ان کے لیے مقدّر ہو چکا ہے اس کے وہ آخری درجے میں مستحق بن جائیں۔ حضرت لوطؑ پر یہ حقیقت چونکہ ابھی واضح نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے وہ اپنے دروازے پر چند خوبرو شریف زادوں کو دیکھ کر سخت پریشان ہوئے کہ آج کا دن تو بہت کٹھن ہے۔ بستی کے گنڈوں کو جب ان نوجوانوں کی خبر ہو گی تو وہ ٹوٹ پڑیں گے اور مجھ کو اور میرے مہمانوں کو رسوا کریں گے۔ چنانچہ ان کا یہ اندیشہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ گنڈے ان نوجوانوں کی خبر پاتے ہی حضرت لوطؑ کے گھر پر ٹوٹ پڑے اور ان کو رسوا کرنا چاہا۔ حضرت لوطؑ نے لاکھ منت سماجت کی لیکن انھوں نے ان کی ایک نہیں سنی۔ بالآخر فرشتوں نے اپنا پردہ اٹھایا اور حضرت لوطؑ کو اطمینان دلایا کہ تم اطمینان رکھو، ہم چھوکرے نہیں ہیں، جیسا کہ ان اندھوں نے گمان کیا ہے، بلکہ ہم خدا کے فرشتے ہیں اور ان کے لیے فیصلہ کن عذاب لے کر آئے ہیں۔ فرشتوں کے اس انکشافِ راز سے حضرت لوطؑ کو یہ تو اطمینان ہوا کہ گنڈوں کے شر سے وہ اور ان کے مہمان محفوظ ہیں لیکن عذاب کی خبر بھی ان کے لیے سخت تردّد کا باعث ہوئی کہ اب دیکھیے ان کے اور ان کے متعلقین کے لیے کیا حکم ہوتا ہے! فرشتوں نے اس پہلو سے بھی ان کو اطمینان دلایا کہ تم اپنے اور اپنے متعلقین کے باب میں کوئی اندیشہ نہ کرو، ہم تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو اس آفت سے نجات دیں گے۔ البتہ تمھاری بیوی تمھارے ساتھ یہاں سے نہیں نکلے گی۔ وہ اپنی قوم کے ساتھ مبتلائے عذاب ہو گی۔

حضرت لوطؑ کی بیوی کے ذکر کی خاص وجہ

یہاں حضرت لوطؑ کی بیوی کے انجام کی طرف دو مرتبہ اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس سے مقصود اس حقیقت کو مؤکد کرنا ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ دین کے معاملہ میں کوئی کسی دوسرے کے بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا۔ عورت ہو یا مرد ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے۔ حضرت لوطؑ کی بیوی ایک جلیل القدر پیغمبر کی بیوی تھی لیکن چونکہ وہ خود ناہنجار تھی اس وجہ سے وہ بھی عذاب میں گرفتار ہوئی اور حضرت لوطؑ سے جو نسبت اس کو حاصل تھی وہ اس کے لیے کچھ نافع نہ بن سکی۔

إِنَّا مُنزِلُونَ عَلَىٰ أَهْلِ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ (۳۴)

قوم لوط پر قہرِ آسمانی

حضرت لوطؑ کو نجات کی خوش خبری دینے کے بعد فرشتوں نے ان کو اس فیصلۂ الٰہی سے بھی آگاہ کر دیا کہ اس بستی والوں پر ہم قہرِ آسمانی نازل کرنے والے ہیں۔ 'رجز' سے مراد اس طرح کا عذاب ہے جو سننے اور دیکھنے والوں کے دلوں میں کپکپی پیدا کر دے۔ اس کے ساتھ 'مِنَ السَّمَآءِ' کی قید اس کی شدت اور بے پناہی کے اظہار کے لیے ہے۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں قہرِ الٰہی یا عذابِ آسمانی کے الفاظ بولتے ہیں اسی طرح عربی زبان میں یہ اسلوب ہے۔ اس عذاب کی نوعیت پر ہم اس کے محل میں گفتگو کر چکے ہیں۔ 'بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ' سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کا عذاب کسی قوم پر اس وقت بھیجتا ہے جب سرکشی و نافرمانی اس کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَآ اٰيَةًۢ بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۳۵)

خاموش آثار سے صرف اہل عقل فائدہ اٹھاتے ہیں

قوم لوط کی یہ بستی قریش کی تجارتی گزرگاہ پر واقع تھی اس وجہ سے وہ ان کے لیے اس سنتِ الٰہی کے ظہور کا ایک نہایت واضح نشان تھی جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا تھا لیکن یہ خاموش آثار نافع ان کے لیے ہوتے ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ دیکھتے سب کچھ ہیں لیکن ان کو نظر کچھ بھی نہیں آتا۔ آخر اس زمانے میں کتنے ماہرینِ اثریات ہیں جو قدیم کھنڈروں کے ایک ایک نقش کو پڑھ لینے میں بڑے ہوشیار ہیں لیکن ان سے جو اخلاقی سبق حاصل ہوتے ہیں ان کے سمجھنے میں ان کی عقل بالکل کند ہے۔

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ (۳۶-۳۷)

بعض اقوام افراد کی طرف اجمالی اشارات

اوپر کی سرگزشتیں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں لیکن آگے صرف اجمالی حوالے پر اکتفا فرمایا ہے۔ مقصود ان کے حوالہ سے اسی حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں مبرہن کرنا ہے جس کی طرف سورہ کی تمہید میں اشارہ فرمایا ہے کہ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّسْبِقُوْنَا ۭ سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ (۴) (کیا جو لوگ برائیاں کر رہے ہیں انھوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں گے؟ اگر انھوں نے یہ گمان کر رکھا ہے تو بہت ہی برا فیصلہ کر رہے ہیں) آگے کے تاریخی واقعات اسی بات کے ثبوت میں پیش کیے گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شرارت کرنے والوں کو جو ڈھیل دیتا ہے اس سے ان کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ اب ان کی پکڑ نہیں ہوگی یا وہ خدا کے قابو سے باہر ہیں۔ اس سلسلہ میں اقوام میں سے قوم شعیب اور عاد و ثمود کا حوالہ دیا ہے اور جبار و سرکش افراد میں سے قارون، فرعون اور ہامان کا اور قریش کو متنبہ کیا ہے کہ جو زور و اقتدار آج تم کو اور تمھارے لیڈروں کو حاصل ہے اس سے زیادہ زور و اقتدار ماضی میں ان کو حاصل رہ چکا ہے لیکن جب انھوں نے سرکشی کی اور ہماری تنبیہات کے باوجود باز نہیں آئے تو ہم نے ان کو پکڑا اور اس طرح پکڑا کہ ان کا سارا زور و زر ہمارے مقابل میں ذرا بھی ان کے کام نہ آ سکا۔

قوم شعیب — اور قریش میں قدرِ مشترک

قوم شعیب کے متعلق پیچھے واضح ہو چکا ہے کہ اس قوم نے تجارت کے میدان میں بڑی ترقی کی تھی۔ یہی اصلی میدان قریش کا بھی تھا۔ اس لیے کہ یہ بھی تجارت پیشہ تھے لیکن ابھی یہ ان کے مرتبہ کو نہیں پہنچے تھے۔ شاید اسی اشتراک کی وجہ سے انہی کے حالات اور انجام کی طرف سب سے پہلے توجہ دلائی۔ فرمایا کہ اہل مدین کے حالات سے سبق لو جن کی طرف ہم نے شعیبؑ کو رسول بنا کر بھیجا۔ انھوں نے ان کو خدا کی بندگی کی دعوت دی اور آخرت کا خوف دلا کر متنبہ کیا کہ دنیا میں بڑھو اور پھیلو تو مفسد بن کر نہ پھیلو بلکہ مصلح اور حق و عدل کے علم بردار بن کر پھیلو لیکن انھوں نے حضرت شعیبؑ کی ایک بات بھی نہ سنی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے عین ان کے دورِ عروج میں ان کو پکڑا اور ایسا عذاب ان پر آیا کہ وہ اپنے گھروں میں اوندھے منہ پڑے رہ گئے۔ سورۂ ہود کی آیت ۸۵ کے تحت ان کے فساد فی الارض اور آیت ۹۴ کے تحت ان کے عذاب کی تفصیل گزر چکی ہے۔

وَعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ ۣ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ (۳۸)

عاد اور ثمود

یہاں فعل 'اَخَذْنَا' بربنائے قرینہ محذوف ہے یعنی ہم نے عاد و ثمود کو بھی اس سے پہلے عذاب میں پکڑا۔ ان قوموں کی تمدنی و تعمیری ترقیوں کا ذکر پچھلی سورتوں میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ 'وَقَدْ تَّبَيَّنَ لَكُمْ مِّنْ مَّسٰكِنِهِمْ' یہ قریش کو توجہ دلائی گئی ہے کہ قوم لوط کی طرح ان کی بستیوں کے آثار بھی تم سے مخفی نہیں ہیں، تم اپنے تجارتی سفروں میں ان کے کھنڈروں پر سے گزرتے ہو اور اندازہ کر سکتے ہو کہ ماضی میں وہ کس شان و شوکت کے مالک تھے لیکن اب ان کے کھنڈروں کے سوا ان کی کہانی سنانے والا روئے زمین پر کوئی باقی نہیں رہا۔ 'وَكَانُوْا مُسْتَبْصِرِيْنَ' یعنی یوں تو وہ بڑے کاردان، بڑے زیرک و ہوشیار، تعمیر و تمدن اور حکومت و سیاست میں بڑے ماہر و چالاک تھے لیکن ان کی یہ چالاکی و ہوشیاری ان کو شیطان کے پھندوں سے نہ بچا سکی۔ اس نے ان کے دنیوی انہماک کو اس طرح ان کی نگاہوں میں کھبا دیا کہ ان کی آنکھیں خدا اور آخرت کی طرف سے بالکل بند ہو گئیں جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ اصل شاہراہ سے وہ بالکل منحرف ہو گئے اور ہلاکت کے کھڈ میں جا گرے — اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ مجرد سائنس اور تمدن و تعمیر میں کسی قوم کا عروج اس بات کی شہادت نہیں ہے کہ وہ زندگی کی صحیح شاہراہ پر گامزن ہے، جیسا کہ عام طور پر بے بصیرت لوگ سمجھتے ہیں، بلکہ یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی ایک آنکھ کھلی ہوئی ہے جو اس دنیا کو دیکھتی ہے لیکن دوسری آنکھ جو اس دنیا کی پس پردہ حقیقتوں کو دیکھتی ہے اگر وہ کھلی ہوئی نہ ہو تو تمام علم و سائنس کے باوجود شیطان اس کو ہلاکت کے ایسے کھڈ میں گراتا ہے جس سے اس کو کبھی نکلنا نصیب نہیں ہوتا۔

وَقَارُوْنَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ ۣ وَلَقَدْ جَاۗءَهُمْ مُّوْسٰي بِالْبَيِّنٰتِ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي الْاَرْضِ

وَمَا كَانُوا سٰبِقِيْنَ (۳۹)

تاریخ کے بعض نمایاں متکبرین

یہ نام بھی اسی فعل محذوف کے تحت ہیں جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ گزرا۔ اقوام کے ذکر کے بعد یہ تاریخ کے بعض نمایاں متکبرین — قارون، فرعون اور ہامان — کا ذکر فرمایا ہے۔ ان تینوں کا ذکر تفصیل سے پچھلی سورتوں میں گزر چکا ہے۔ سورۂ قصص میں ہم نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ حضرت موسیٰ کی قوم میں جو حیثیت قارون کی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں اسی سے ملتی جلتی حیثیت ابولہب کی تھی۔ اس وجہ سے یہ محض ماضی کے اشخاص کا حوالہ نہیں ہے بلکہ قریش کے سامنے یہ ایک آئینہ رکھا گیا ہے جس میں ان کے لیڈر اپنی شکلیں بڑی آسانی سے پہچان سکتے تھے۔ فرمایا کہ ان کو بھی موسیٰ نے بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں لیکن ان کی آنکھوں پر غرور کی ایسی ایسی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں کہ کوئی نشانی بھی ان کو کھولنے میں کارگر نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ خدا کے عذاب نے ان کو آ دبوچا۔ 'وَمَا كَانُوا سٰبِقِيْنَ' میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو آیت ۳۰ میں بیان ہوئی ہے۔ یعنی جب وہ ہمارے عذاب کی گرفت میں آگئے تو اپنے تمام طمطراق، اور اپنے تمام لاؤ لشکر اور اپنی ساری دولت و حشمت کے باوجود ہماری گرفت سے باہر نہ نکل سکے۔

فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۴۰)

خلاصۂ کلام

اب یہ آخر میں بطور خلاصہ مذکورہ بالا تمام اقوام و افراد کا انجام یکجا بیان فرما دیا کہ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے اس کے جرم کی پاداش میں پکڑا۔ کسی پر ہم نے حاصب (کنکر پتھر برسا دینے والی طوفانی ہوا) بھیجی، کسی پر رعد و برق کا عذاب بھیجا، کسی کو زمین سمیت دھنسا دیا اور کسی کو غرق کر دیا۔

پچھلی سورتوں میں ان تمام عذابوں کی تفصیل گزر چکی ہے۔

— قوم لوط پر حاصب کا عذاب آیا۔

— عاد، ثمود، مدین پر صیحہ کا عذاب نازل ہوا۔

— قارون زمین میں دھنسا دیا گیا۔

— فرعون اور ہامان غرق کر دیے گئے۔

'وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ' یعنی یہ جو کچھ ہوا خدا کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہوا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیا گیا تھا لیکن انھوں نے اللہ کے رسولوں کی کوئی پروا نہ کی۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۱۔ ۶۹

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں بالترتیب مندرجہ ذیل باتیں واضح فرمائی گئی ہیں۔

مشرکین نے شرک کی اساس پر جو گھروندا بنایا ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ اس کی حیثیت مکڑی کے جالے کی ہے۔ اگر اس کے بل پر انھوں نے حق کا مقابلہ کرنا چاہا ہے تو انھوں نے نہایت کمزور سہارا ڈھونڈا ہے۔ یہ سہارا نہ دنیا میں ان کے کام آنے والا بنے گا نہ آخرت میں۔

اہلِ ایمان اطمینان رکھیں کہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا عدل ایک دن ظاہر ہو کے رہے گا۔ اہلِ ایمان صبر کے ساتھ اس عدل کے ظہور کا انتظار کریں، دعوتِ حق کے کام میں لگے رہیں اور نماز کا اہتمام رکھیں، نماز تمام برائیوں سے محفوظ رکھنے والی اور اللہ تعالیٰ کی یاد بہت بڑی طاقت ہے۔

اہلِ کتاب کے متعلق مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ اگر وہ مشرکین کے پہلو بہ پہلو ہو کر تم سے بحث و مناظرہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو جہاں تک ان کے اشرار کا تعلق ہے ان کو تو منہ نہ لگاؤ البتہ ان کے اندر جو معقول لوگ ہیں ان کو حسن و خوبی کے ساتھ اس قدرِ مشترک کی اساس پر دعوت دو جو ان کے اور تمہارے درمیان موجود ہے۔ اسی ضمن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بعض دلائل کی طرف اشارہ اور مخالفین کے بعض مطالبات کا جواب۔

ان مسلمانوں کو ہجرت کی ترغیب جو کفار کے ہاتھوں مصائب کے ہدف بنے ہوئے تھے اور ہجرت کرنے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ تعالیٰ کی جو مدد اور کفالت حاصل ہوتی ہے اس کی بشارت۔

آخر میں مشرکینِ قریش کو نہایت سخت الفاظ میں تہدید و وعید کہ قرآن کے خلاف ان کی تمام محاذ آرائی خود ان کے اپنے مسلمات کے خلاف ہے۔ یہ نہایت ناشکرے اور ناہنجار لوگ ہیں۔ ان کو جو نعمتیں حاصل ہوتی ہیں وہ ہیں تو تمام تر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ لیکن یہ ان کو منسوب دوسروں کی طرف کرتے اور ان کو خدا کا شریک بناتے ہیں۔ یہ لوگ عنقریب اپنی اس ناشکری کا انجام دیکھیں گے اور جو لوگ آج اللہ کے کلمہ کی سربلندی کے لیے سردھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے لیے اپنی راہیں فراخ کرے گا۔

اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۱-۶۹

مَثَلُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِيَآءَ كَمَثَلِ الْعَنْكَبُوْتِ ۚ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۭ وَاِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ لَوْ

كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۴۱﴾ إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ مِنْ
شَيْءٍ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿۴۲﴾ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا
لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ﴿۴۳﴾ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ
الْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿۴۴﴾ ع اُتْلُ مَا
أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ ۖ إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ
الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ أَكْبَرُ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا
تَصْنَعُونَ ﴿۴۵﴾ وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتٰبِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۖ
إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۖ وَقُولُوا اٰمَنَّا بِالَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْنَا
وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلٰهُنَا وَإِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿۴۶﴾
وَكَذٰلِكَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۚ فَالَّذِينَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ
يُؤْمِنُونَ بِهِ ۖ وَمِنْ هٰؤُلَاءِ مَنْ يُؤْمِنُ بِهِ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَا
إِلَّا الْكٰفِرُونَ ﴿۴۷﴾ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهُ
بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ﴿۴۸﴾ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِي
صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَا إِلَّا
الظّٰلِمُونَ ﴿۴۹﴾ وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِ ۚ قُلْ
إِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ﴿۵۰﴾ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ
أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذٰلِكَ
لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُونَ ﴿۵۱﴾ ع قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ

ع ۴ ۱۴ ۱۶

ع ۵ ۱

شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ
وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ
بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ
بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٥٣﴾ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَاِنَّ
جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿٥٤﴾ ۙ يَوْمَ يَغْشٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ
وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٥٥﴾ يٰعِبَادِيَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِىْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴿٥٦﴾ كُلُّ
نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۫ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿٥٨﴾ ۖ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ
عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ
اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦٠﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ
مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ
اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿٦١﴾ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ
عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٦٢﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ
مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ مَوْتِهَا
لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٦٣﴾ ع ٦ ١٢ ٢
وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ

لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿٦٤﴾ فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا (وقف لازم)
اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ
يُشْرِكُونَ ﴿٦٥﴾ لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ ۙ وَلِيَتَمَتَّعُوا ۖ فَسَوْفَ
يَعْلَمُونَ ﴿٦٦﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا آمِنًا وَيُتَخَطَّفُ
النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۚ أَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُونَ وَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَكْفُرُونَ ﴿٦٧﴾
وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا
جَاءَهُ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْكَافِرِينَ ﴿٦٨﴾ وَالَّذِينَ جَاهَدُوا
فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ﴿٦٩﴾ ع ۷ ۳

ترجمہ آیات ۴۱-۶۹

ان لوگوں کی تمثیل جنھوں نے اللہ کے سوا دوسرے کارساز بنائے ہیں بالکل مکڑی کی تمثیل ہے جس نے ایک گھر بنایا۔ اور بے شک تمام گھروں سے بودا گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔ کاش کہ وہ اس حقیقت کو جانتے! بے شک اللہ اچھی طرح جانتا ہے ان چیزوں کو جن کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں اور وہ عزیز و حکیم ہے۔ اور یہ تمثیلیں ہیں جن کو ہم لوگوں کے غور کرنے کے لیے بیان کرتے ہیں لیکن ان کو صرف اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔ ۴۱-۴۳

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو مقصدِ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے ایمان والوں کے لیے۔ جو کتاب تم پر وحی کی جا رہی ہے اس کو پڑھو اور نماز کا اہتمام کرو۔ بے شک نماز بے حیائی اور منکر سے روکتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ۴۴-۴۵

اور اہل کتاب سے نہ بحث کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے بجز ان کے جو ان میں سے

ظالم ہیں اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہم پر نازل ہوئی اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف اتاری گئی اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کی فرماں برداری کرنے والے ہیں۔ ۴۶

اور اسی طرح ہم نے تمہاری طرف بھی کتاب اتاری تو جن کو ہم نے کتاب عطا فرمائی ہے وہ اس پر ایمان لائیں گے اور ان میں سے بعض اس پر ایمان لا بھی رہے ہیں۔ اور ہماری آیات کا تو بس وہی انکار کرتے ہیں جو کٹر کافر ہیں۔ اور تم تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ ایسا ہوتا تو یہ جھٹلانے والے مین میکھ نکالتے۔ بلکہ یہ تو کھلی ہوئی آیات ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم عطا ہوا ہے۔ اور ہماری آیات کا بس وہی لوگ انکار کر رہے ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ ۴۷-۴۹

اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی جانب سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری گئیں! کہہ دو، نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ کیا ان کے لیے یہ چیز کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب اتاری وہ ان کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔ بے شک اس کے اندر رحمت اور یاد دہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائیں۔ کہہ دو کہ اللہ میرے اور تمہارے درمیان گواہی کے لیے کافی ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو لوگ باطل پر ایمان لائے اور اللہ کا جنھوں نے انکار کیا وہی لوگ اصلی نامراد ہیں۔ ۵۰-۵۲

اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں اور اگر اس کے لیے ایک مدت مقرر نہ ہوتی تو ان پر عذاب آدھمکتا۔ اور وہ ان کے اوپر اچانک آجائے گا اور ان کو

اس کی خبر بھی نہ ہوگی۔ اور وہ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ جہنم کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس دن کو یاد کریں جس دن عذاب ان کے اوپر سے اور ان کے پاؤں کے نیچے سے ان کو ڈھانک لے گا اور ارشاد ہوگا کہ اب چکھو اس چیز کا مزا جو تم کرتے رہے ہو۔ ۵۳-۵۵

اے میرے بندو، جو ایمان لائے ہو، بے شک میری زمین بڑی کشادہ ہے تو بس میری ہی بندگی کرو۔ ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے پھر تم ہماری ہی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ہم ان کو جنت کے بالاخانوں میں متمکّن کریں گے، اس کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ کیا ہی خوب صلہ ہے کارگزاروں کا، جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پر ہر حال میں انھوں نے بھروسہ رکھا۔ اور کتنے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے۔ اللہ ہی ان کو بھی رزق دیتا ہے اور تم کو بھی۔ اور وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۵۶-۶۰

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو اور کس نے مسخر کیا ہے سورج اور چاند کو؟ تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ تو وہ کہاں اوندھے ہو جاتے ہیں! اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کا رزق چاہتا ہے کشادہ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان سے کس نے پانی اتارا، پس اس سے زمین کو زندہ کیا، اس کے مردہ ہو چکنے کے بعد، تو وہ جواب دیں گے کہ اللہ نے۔ کہو، شکر کا سزاوار اللہ ہے۔ بلکہ ان کے اکثر عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۶۱-۶۳

اور یہ دنیا کی زندگی تو بس لہو و لعب ہے۔ اور دارِ آخرت ہی ہے جو اصل زندگی کی جگہ

ہے اگر وہ اس کو جانتے! ۶۴

پس جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اللہ کو پکارتے ہیں اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔ پس جب ان کو خشکی کی طرف نجات دے دیتا ہے تو پھر وہ اس کے شریک ٹھہرانے لگتے ہیں کہ ہم نے جو نعمت بخشی اس کی ناشکری کریں اور چند دن اور بہرہ مند ہولیں۔ پس وہ عنقریب جانیں گے۔ ۶۵-۶۶

کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان کے لیے ایک مامون حرم بنایا اور حال یہ ہے کہ لوگ ان کے گرد و پیش سے اُچک لیے جاتے ہیں! تو کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں! اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا حق کو جھٹلائے جب کہ وہ اس کے پاس آچکا ہے! کیا ایسے کافروں کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہوگا! ۶۷-۶۸

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے اور بے شک اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے! ۶۹

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَثَلُ الَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ كَمَثَلِ الْعَنكَبُوتِ اتَّخَذَتْ بَيْتًا ۖ وَإِنَّ أَوْهَنَ الْبُيُوتِ لَبَيْتُ الْعَنكَبُوتِ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (۴۱)

شرک اور اہلِ شرک کی تمثیل

اوپر کے بیان کردہ تاریخی حقائق سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی نہیں بن سکتا۔ مشرکین نے خدا کے سوا جو سہارے ڈھونڈھے تھے وہ سب جھوٹے ثابت ہوئے۔ اور یہ جس طرح اس دنیا میں جھوٹے ثابت ہوئے اسی طرح آخرت میں بھی جھوٹے ثابت ہوں گے۔ خدا کا قانون مجازات اور اس کا بے لاگ عدل لازماً ظہور میں آکے رہے گا اور جو لوگ اپنے فرضی دیوتاؤں کی سفارش پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جس سہارے کو انھوں نے قلعہ کی دیوار سمجھا اس کی حقیقت

مکڑی کے جالے سے زیادہ نہیں تھی۔ اسی حقیقت کو یہاں تمثیل کی صورت میں سمجھایا ہے کہ اللہ کے سوا دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے والوں کی مثال مکڑی کی ہے جو اپنے بنے ہوئے جالے کو اپنے زعم میں بڑی چیز سمجھتی ہے لیکن سب سے زیادہ بے ثبات اور بودا گھر مکڑی ہی کا ہوتا ہے جو ہوا کے ایک جھونکے کی بھی تاب نہیں لاسکتا۔ 'لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ' یعنی اصل حقیقت تو یہ ہے جو ظاہر کردی گئی ہے لیکن اس کا فائدہ تو جب ہے کہ یہ لوگ سمجھیں لیکن ان نادانوں میں اس حقیقت کو سمجھنے کی صلاحیت کہاں!

اِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ مِنْ شَیْءٍ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۴۲)

یعنی کوئی یہ نہ خیال کرے کہ مشرکین کے دیویوں دیوتاؤں کی یہ تمثیل ان کی مبالغہ آمیز تحقیر ہے۔ یہ تحقیر نہیں بلکہ اصل حقیقت کا اظہار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دیویوں دیوتاؤں کی حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے۔ "اچھی طرح واقف ہے" کے اسلوب بیان میں جو طنز و تحقیر مضمر ہے وہ اصحاب ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ یہ اسلوب ہماری زبان میں بھی معروف ہے۔

شرک کی نفی خدا کی صفات سے

'وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ' یعنی یہ دیوی دیوتا اس خدا کے مقابل میں اپنے پجاریوں کے کیا کام آسکیں گے جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔ 'عزیز' یعنی سب پر غالب اور سب کی رسائی سے بالاتر۔ 'حکیم' یعنی جس کا ہر کام عدل و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خدا عزیز ہے تو کوئی دوسرا، خواہ اس کا مرتبہ کتنا ہی اونچا ہو اس کو اپنے زور و اثر سے دبا نہیں سکتا اور جب وہ 'حکیم' بھی ہے تو کوئی اس کے قانونِ مجازات و عدل کو باطل نہیں کرسکتا۔ تو جب یہ دیوی دیوتا نہ اس کو دبا سکتے اور نہ اس کے عدل پر سر مُو اثر انداز ہو سکتے تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ نادان لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کے متعلق یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ خدا کے ہاں بڑا زور و اثر رکھنے والے ہیں اس وجہ سے یہ اپنی پرستش کرنے والوں کو، خواہ ان کے اعمال کچھ بھی ہوں، خدا کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ یہ عقیدہ خدا کے عزیز و حکیم ہونے کی نفی کرتا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ان دونوں صفتوں کی یاددہانی کر کے اس بے ہودہ عقیدہ کی نفی کردی۔

وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُھَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا یَعْقِلُھَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ (۴۳)

قرآن کی اصطلاح میں اصل علم کون ہیں؟

'امثال' سے اشارہ ان تمام امثال و واقعات کی طرف ہے جو اوپر مذکور ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ یہ مثالیں ہم جو بیان کر رہے ہیں اس سے مقصود داستان سرائی نہیں ہے۔ ہم یہ اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ لوگ ان پر غور کریں اور خود اپنی زندگیوں کے لیے ان سے سبق حاصل کریں۔ کوئی مثال جب کسی کے سامنے رکھی جاتی ہے تو اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر اس کو خود اس کا ماضی و مستقبل دکھا دیا جائے۔ لیکن دوسروں کی مثال سے خود اپنے لیے سبق حاصل کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ یہ کام وہی لوگ کرتے ہیں جن کے اندر عقل و علم کی روشنی موجود ہو۔ یہاں 'عالمون' سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی فطری صلاحیتیں

زندہ اور جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ ہر واقعہ سے سبق حاصل کرتے ہیں جس سے درجہ بدرجہ ان کے علم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ برعکس اس کے جن کے اندر سبق آموزی و عبرت پذیری کی صلاحیت مردہ ہو جاتی ہے وہ اول تو اس طرح کی چیزوں کی طرف دھیان ہی نہیں کرتے اس لیے کہ اس سے ان کی بے فکری میں خلل پڑتا ہے اور اگر کچھ توجہ کرتے بھی ہیں تو اس میں اپنے لیے کوئی درس تلاش نہیں کرتے بلکہ اس کو محض قصۂ ماضی سمجھتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاح میں اصلی عالم وہ لوگ نہیں ہیں جو اپنے اوپر کتابوں کا بوجھ لادے ہوئے ہیں بلکہ عالم وہ ہیں جو آفاق و انفس کی نشانیوں پر غور کرنے والے اور ان سے صحیح سبق حاصل کرنے والے ہیں۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۴۴)

آسمان و زمین کی شہادت

یعنی آسمانوں اور زمین کے نظام پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ دنیا نہ تو کسی خالق کے بغیر وجود میں آگئی ہے اور نہ یہ مختلف دیوتاؤں کی کوئی بازی گاہ یا رزم گاہ ہے بلکہ یہ ایک علیم و حکیم اور عزیز و مقتدر خالق نے ایک مقصدِ حق کے ساتھ اس کو وجود بخشا ہے اور یہ اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ ایک دن آئے گا جب یہ مقصدِ حق سب کے سامنے آجائے گا۔ اس دن اس کے خالق کا کامل عدل ظاہر ہوگا اور باطل بالکل نابود ہو جائے گا۔ جو لوگ اس دنیا کو ایک بازی گاہ سمجھ کر زندگی بطالت میں گزار رہے ہیں وہ اپنی اس بے فکری کے انجام سے دوچار ہوں گے اور جو لوگ آنکھیں کھول کر زندگی بسر کریں گے وہ خالق کی ابدی خوشنودی کے حق دار ٹھہریں گے۔ 'وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا' الآیۃ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ'۔ 'اٰيَةً' کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے ہے یعنی اس میں اہلِ ایمان کے لیے بہت بڑی نشانی ہے۔ اس نشانی کے مختلف پہلو مختلف مقامات میں واضح کیے جا چکے ہیں اس وجہ سے یہاں ہم صرف اجمالی اشارات پر اکتفا کریں گے۔

اس میں سب سے بڑی نشانی تو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک روزِ جزا و سزا کے ظہور کی ہے۔ یہ دنیا اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ اس کا خالق حکیم ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں اس کا کامل عدل و حق ظاہر ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دنیا محض کسی کھلنڈرے کا ایک کھیل ہے اور یہ بات اس عظیم خالق کی شان کے بالکل منافی ہے جس کی قدرت، حکمت اور رحمت اس دنیا کے ہر گوشے سے نمایاں ہے۔

دوسری نشانی اس میں اس بات کی ہے کہ اس دنیا میں انجام کے اعتبار سے کامیاب زندگی وہی ہے

جو آخرت کو نصب العین بنا کر گزاری جائے اس لیے کہ ابدی کامیابی اور ابدی ناکامی کا فیصلہ وہیں ہونا ہے۔ یہ دنیا آخرت کے بغیر ناتمام ہے۔ اس کی تکمیل آخرت میں ہوگی جب کہ اس کی پیدائش کا اصلی مقصد ظہور میں آئے گا۔ یہ چیز اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر چیز کے خیر و شر کا فیصلہ اس کے اخروی نتائج کو سامنے رکھ کر کیا جائے۔ ہو سکتا ہے بلکہ ہمیشہ ہوا ہے کہ حق کی راہ میں اہلِ حق کو نہایت زہرہ گداز مصائب سے سابقہ پیش آیا ہے لیکن ان مصائب سے گھبرا کر حق سے انحراف جائز نہیں ہے اس لیے کہ یہ مصائب اپنے نتائج کے لحاظ سے نہایت خوش آئند ہیں۔

تیسری نشانی اس میں اس بات کی ہے کہ شرک و شفاعت کا نظریہ بالکل باطل ہے اس لیے کہ یہ نظریہ اس کائنات کے 'بالحق' ہونے کی بالکل نفی کر دیتا ہے۔ اگر اس کائنات میں ایسے شرکاء و شفعاء کا وجود مان لیا جائے جو اپنے زور یا اثر سے کسی حق کو باطل یا باطل کو حق بنا سکتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ کائنات 'بالحق' نہیں ہے بلکہ ایک اندھیر نگری ہے۔

اس ٹکڑے کی مزید وضاحت آگے سورۂ روم کی آیت ۸ کے تحت آئے گی۔ یہاں ان اشارات پر اکتفا فرمایا ہے۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ (۴۵)

پیغمبر صلعم اور مسلمانوں کو تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ تم یہ قرآن لوگوں کو سناؤ اور اسی کے ذریعے سے لوگوں کو دعوت دو۔ اگر مخالفین ان نشانیوں اور دلائل کی طرف توجہ نہیں کرتے جن کی طرف قرآن ان کو توجہ دلا رہا ہے بلکہ معجزے یا عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو ان کے ان مطالبات کی کوئی پروا نہ کرو۔ قرآن ان کے لیے ایک عظیم رحمت ہے۔ اگر وہ اس کی قدر نہیں کریں گے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے۔

'وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ' یعنی اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے نماز کا اہتمام کرو۔ اس خاص مرحلے میں نماز کے اہتمام کی یہ تاکید، قرینہ دلیل ہے کہ عام نماز کے ساتھ اس خاص نماز کے لیے ہے جس کی ہدایت صبر و استقامت کے حصول کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کو فرمائی گئی تھی اور جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکا ہے۔

دعوت اور جماعتی تربیت کے لیے دو باتوں کی ہدایت

یہاں دو باتوں کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ ایک تلاوتِ وحی کی، دوسری اہتمامِ نماز کی۔ پہلی چیز کا تعلق عام تبلیغ و دعوت سے ہے اور دوسری چیز کا تعلق مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی تربیت و اصلاح سے۔ آیت کے اسلوب سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تلقین فرمائی جا رہی ہے کہ جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے ان کے نت نئے مطالبات کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جو وحی تم پر کی جا رہی ہے وہ لوگوں کو پہنچا دو، وہ اس کی قدر کریں یا نہ کریں۔ تمھارے اوپر اصل ذمہ داری اس وحی کو

پہنچا دینے کی ہے۔ اس سے آگے تمہارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ رہے وہ لوگ جو تمہاری دعوت قبول کر چکے ہیں تو ان کی تربیت کے لیے نماز کا اہتمام کرو۔ یہی چیز ان کو ان مفاسد سے پاک کرے گی جو پچھلی قوموں کی تباہی کا باعث ہوئے اور اسی سے ان کے اندر وہ قوت و ہمت پیدا ہو گی جو مشکلات و مصائب کے علی الرغم ان کو ایک صالح معاشرہ کی ذمہ داریاں اٹھانے کا اہل بنائے گی۔

نماز کے دو اہم پہلو

یہاں اس نماز کے دو اثرات بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ فحشاء اور منکر سے روکتی ہے۔ (اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ) اور دوسرا یہ کہ نماز اللہ کی یاد ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے (وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ) نماز کے یہ دونوں پہلو کسی قدر وضاحت کے محتاج ہیں۔

'فَحْشَاء' اور 'مُنْکَر'، کے دو لفظوں نے اخلاقی مفاسد کے تمام پہلو اپنے اندر سمیٹ لیے ہیں۔ بہت سی برائیاں ایسی ہیں جو شہوانی جذبات کی بے اعتدالی یا ان کے انحراف سے وجود میں آتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ پورے معاشرے کو اس طرح بے حیا بنا دیتی ہیں کہ لوگوں کے اندر سے بے حیائی کا احساس ہی مٹ جاتا ہے۔ ماضی کی قوموں میں سے اس کی مثال کے طور پر قرآن نے قوم لوط کا ذکر کیا ہے۔ حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کی بے حیائی کے لیے 'فاحشۃ' کا لفظ استعمال بھی فرمایا ہے۔ اس زمانے میں جدید فکر و فلسفہ اور نئی تہذیب کی برکت سے بے حیائی و فحاشی کی جو نت نئی شکلیں وجود میں آئی ہیں اور برابر آ رہی ہیں ان کے مقابل میں قوم لوط کی بے حیائی بالکل گرد ہو کے رہ گئی ہے اور جن لوگوں کی نظر حالات پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اب ہمارا معاشرہ بھی پوری طرح ان کے لپیٹ میں آ چکا ہے اور آہستہ آہستہ لوگوں کا ضمیر اس طرح مردہ ہوتا جا رہا ہے کہ ہماری قوم کا بہت بڑا طبقہ، جو ہماری بدقسمتی سے تعلیم یافتہ بھی کہلاتا ہے، ان بے حیائیوں کو بے حیائی سمجھنا تو درکنار ان کو تہذیب و ترقی کا لازمہ سمجھنے لگا ہے اور جو لوگ ان پر تنقید کرتے ہیں ان کو احمق اور دقیانوسی قرار دیتا ہے۔

دوسری برائیاں وہ ہیں جو طمع و حرص کی بے اعتدالی اور حبِّ مال و جاہ کی زیادتی سے ظہور میں آتی ہیں۔ ان کے لیے یہاں جامع لفظ 'مُنْکَر' استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ معروف کا ضد ہے اس وجہ سے وہ تمام برائیاں اس میں شامل ہیں جو ایک صالح معاشرہ کی پاکیزہ روایات اور اس کے معروف مسلّمات کے خلاف ہوں۔ پچھلی قوموں میں سے قوم عاد و ثمود کے تمدنی مفاسد اور قوم شعیب کے معاشی فساد کا ذکر قرآن نے اس کی مثال کے طور پر کیا ہے اور اس زمانے میں معاشرت و معیشت کا یہ فساد زندگی کے ہر شعبہ پر جس طرح چھا چکا ہے اس کے متعلق یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ ماضی کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔

یہاں معروف و منکر سے متعلق ان اشارات پر قناعت فرمائیے۔ آگے سورۂ روم کی آیات ۳۱ - ۴۰ اور سورۂ لقمان کی آیت ۱۷ کے تحت اس پر مفصل بحث ان شاء اللہ آئے گی۔

فرمایا کہ نماز ان تمام برائیوں سے روکتی ہے۔ "روکتی ہے" یعنی نماز کی حیثیت ایک نہایت مؤثر واعظ وزاجر کی ہے۔ جو لوگ نماز اس کے آداب وشرائط کے ساتھ ادا کرتے ہیں، خواہ خلوت کی نماز ہو یا جلوت کی، ان کی نماز اپنے ظاہر وباطن دونوں سے، ان کو ان حقائق کی یاد دہانی کرتی رہتی ہے جن کی یاددہانی زندگی کو صحیح شاہراہ پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ خاص طور پر خلوت کی نمازیں انسان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص نماز نہیں پڑھتا تو اس کی مثال اس ڈرائیور کی ہے جو اپنی زندگی کی گاڑی پوری رفتار سے چلا تو رہا ہے لیکن اس کی رہنمائی کے لیے داہنے بائیں جو نشانات اس کو صحیح راہ بتانے اور خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے لگے ہوئے ہیں ان سے وہ بالکل بے پروا اور بے خبر ہے۔ ایسا ڈرائیور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اپنی گاڑی کس کھڈ میں گرائے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ اثرات اس نماز کے بیان ہو رہے ہیں جو صحیح "تذکر" اور اخلاص کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ اگر کسی نماز کے اندر یہ اثرات مفقود ہوں تو لازماً وہ یا تو صحیح "تذکر" سے خالی ہے یا اخلاص سے۔ یعنی یا تو نماز پڑھنے والا اپنی نماز کے معنی مفہوم سے بالکل بے خبر ہے، اس کو کچھ معلوم نہیں کہ نماز میں اس نے کس چیز کا اقرار اور کس بات کا انکار کیا ہے یا یہ کہ اس نے محض دوسروں کو دکھانے کے لیے ریاکاری (ایکٹنگ) کی ہے۔

"وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ"۔ یہ نماز کے دوسرے پہلو کی طرف اشارہ ہے اور دو لفظوں کے اندر معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نازک موقع پر جماعت کے اندر عزم وحوصلہ اور قوت واستقامت پیدا کرنے کے لیے نماز کے اہتمام کی جو تاکید کی جارہی ہے اس کو کوئی معمولی بات یا محض طفل تسلی نہ تصور کرے۔ اس سوئے ظن میں نہ مبتلا ہو کہ بھلا نماز جماعت کی تنظیم وتقویت میں کیا مؤثر ہوسکتی ہے! حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔ اسی سے انسان کے دل کو حقیقی طمانیت وسکینت حاصل ہوتی ہے۔ "اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ" (اچھی طرح سن لو کہ دلوں کو طمانیت اللہ کی یاد ہی سے حاصل ہوتی ہے) اور دل ہی انسان کے اندر وہ چیز ہے جو تمام عزم وحوصلہ کا منبع ہے۔ اگر دل مضبوط ہے تو انسان سے زیادہ طاقت ور کوئی چیز نہیں اور اگر دل کمزور ہے تو انسان سے زیادہ ناتواں کوئی شے نہیں اور دل کو قوت دینے والی اصلی چیز خدا کی یاد ہے۔ جس کی سب سے زیادہ بہتر جامع اور مؤثر شکل نماز ہے۔

شجاعت اور تہوّر میں فرق

یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث دل کی وہ طمانیت وسکینت ہے جو انسان کے اندر وہ عزم وحوصلہ پیدا کرتی ہے کہ جو اس کو خدا کے سوا ہر خوف اور ہر طمع سے بے پروا کردیتی ہے۔ یہی وہ اصلی قوت اور حقیقی شجاعت وبسالت ہے جو ایمان اور خدا کی یاد سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ شجاعت اس تہوّر سے بالکل مختلف چیز ہے جو یا یوسی یا جذبۂ انتقام، یا خوف یا ناموری کی خواہش یا ناعاقبت اندیشی

سے ظہور میں آتا ہے۔ جو لوگ شجاعت اور تہوّر کے اس فرق سے واقف نہیں ہیں وہ ایک مومن کی شجاعت اور ایک کافر کے تہور کو ایک ہی نوعیت کی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ دونوں کے نفسیاتی محرکات بھی الگ الگ ہوتے ہیں اور اس دنیا میں دونوں کے اثرات بھی دو بالکل مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک کا منبع ایمان اور اللہ کی یاد ہے اور دوسرے کا منبع ان نفسیاتی محرکات میں سے کوئی محرک ہوتا ہے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔ اس وجہ سے ایک کی شجاعت سے دنیا میں اس طرح کی برکت و رحمت ظہور میں آتی ہے جس طرح کی رحمت و برکت حضرت عمرؓ اور حضرت خالدؓ کی شجاعت سے ظہور میں آئی اور دوسرے کے تہور سے اس قسم کا شر و فساد ظہور میں آتا ہے جس قسم کا شر و فساد ہٹلر اور مسولینی اور اس قبیل کے دوسرے متہورین کے ہاتھوں ظہور میں آیا۔

مسلمانوں کو تسلی

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ: یہ مسلمانوں کو اطمینان دلایا گیا ہے کہ اپنی تربیت اور دوسروں کی اصلاح کے لیے جو جدوجہد بھی تم کر رہے ہو یا کرو گے اللہ اس سے اچھی طرح واقف ہے تو جب وہ واقف ہے تو اس پر پورا بھروسہ رکھو کہ وہ تمہاری کوئی محنت خواہ وہ شب کی خلوتوں میں ہو یا دن کی جلوتوں میں، ضائع نہیں جانے دے گا بلکہ تم اپنی ہر کوشش کا بھرپور صلہ پاؤ گے۔

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ اوپر کے ٹکڑے میں خطاب بصیغۂ واحد ہے اور اس ٹکڑے میں جمع کا صیغہ آگیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اوپر کا خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے ہے۔ علاوہ ازیں خطاب بھی تمام امت سے ہے اس لیے کہ دعوت اور تربیت کی ذمہ داری جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھی اسی طرح دوسرے مسلمانوں پر بھی تھی لیکن واحد کے خطاب سے یہ بات نکلتی ہے کہ پیغمبر کو تو یہ فرض بہرحال ادا کرنا ہے، خواہ دوسرے اس کو ادا کریں یا نہ کریں۔ وہ ادا کریں گے تو اپنی ایک ایک محنت کا اجر پائیں گے اور اگر نہیں کریں گے تو خدا اور اس کے رسول کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ اپنی ہی محرومی کا سامان کریں گے۔

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (۴۶)

پڑھے لکھے جنون سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو ہدایت

دعوت کے اس دور میں، جو اس سورہ میں زیر بحث ہے، اہلِ کتاب بھی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اس وجہ سے جس طرح اوپر والی آیت میں ان لوگوں کے باب میں دعوت کا طریقہ واضح کر دیا گیا جو قرآن کی صداقت تسلیم کرنے کے لیے معجزات کے طالب تھے اسی طرح یہاں چند آیات میں اس طریقہ کی وضاحت فرما دی گئی جو اہل کتاب کے ساتھ بحث و استدلال میں مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اہل کتاب کی اس خصوصیت کی وجہ آگے کی آیات سے خود واضح ہو جائے گی کہ ان کی دینی حیثیت بھی مشرکین عرب سے بالکل مختلف تھی اور ان کے شبہات و اعتراضات بھی ذرا مختلف نوعیت کے تھے۔ یہ پڑھے لکھے

جنات تھے اس وجہ سے ضروری ہوا کہ ان سے نمٹنے کے لیے مسلمانوں کو ضروری ہدایات پہلے سے دے دی جائیں۔

فرمایا کہ اہل کتاب سے بحث و استدلال کی نوبت آئے تو ان سے صرف احسن طریقہ سے بحث و استدلال کرو۔ 'مجادلۃ' یہاں اچھے معنوں یعنی بحث و استدلال اور حجت کے مفہوم میں ہے۔ اور طریقۂ احسن کی وضاحت اسی آیت کے آگے والے ٹکڑے میں آ گئی ہے کہ تمھارے اور ان کے درمیان دین کے جو مشترک اقدار ہیں ان کو بنیاد قرار دے کر ان سے مطالبہ کرو کہ وہ بھی ان مشترک اقدار اور ان کے لوازم کو تسلیم کریں اور اپنی مانی ہوئی باتوں کی خود اپنے منہ سے تردید نہ کریں۔ اس طریقۂ بحث سے ان کی انانیت کو ٹھیس نہیں لگے گی۔ ان میں جو سلیم الطبع ہوں گے وہ تمھاری باتوں پر غور کریں گے اور کیا عجب کہ ان میں سے کچھ ایسے نفوس بھی نکل آئیں جو حق کو قبول کر لیں۔

'اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡہُمۡ'۔ عام طور پر لوگوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ اہل کتاب میں سے جو شریر اور مناظرہ باز ہیں ان کے ساتھ طریق احسن کی پابندی ضروری نہیں ہے، ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے لیکن میرے نزدیک یہ استثنائے منقطع ہے اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رہے وہ جو ان میں سے شریر اور مناظرہ باز ہیں تو ان کو سرے سے منہ ہی نہ لگاؤ۔ قرآن کے نظائر سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ضدی اور کج فہم مناظرہ بازوں اور کٹ حجتی کرنے والوں سے اعراض کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ سورۂ کہف میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ جو ہٹ دھرم بات سمجھنی نہیں چاہتے ان سے اول تو تعرض ہی نہ کرو اور اگر کبھی بحث کی نوبت آ ہی جائے تو بات ٹالنے (مراءِ ظاہر) کے انداز میں گفتگو کرو۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اور صالحین کا طریقۂ بحث و دعوت ہمیشہ یہی رہا ہے اور یہی طریقہ خیر و برکت کا طریقہ ہے۔ شریروں اور کج فہموں کے جواب میں انھیں کی سی روش اختیار کر لینا اور الزام کا جواب الزام اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینا نہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ ہے اور نہ اس میں کوئی خیر و برکت ہے۔

احسن طریقۂ بحث کی وضاحت

'وَقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِالَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَاُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ وَاِلٰـہُنَا وَاِلٰـہُکُمۡ وَاحِدٌ وَّنَحۡنُ لَہٗ مُسۡلِمُوۡنَ'۔ یہ اس احسن طریقۂ بحث و دعوت کی وضاحت ہے کہ تمھارے اور ان کے درمیان قدر مشترک موجود ہے اس وجہ سے اس قدر مشترک کو بنیاد بنا کر ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دو۔ ان سے کہو کہ ہم اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتری ہے اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتری ہے۔ ہم جس کتاب پر ایمان لائے ہیں وہ تمھاری کتابوں کی مکذب نہیں بلکہ ان کی مصدق ہے۔ تمھاری کتابوں میں آخری نبی اور کتاب کامل سے متعلق جو پیشین گوئیاں تھیں وہ اپنے مصداق کے ظہور کی منتظر تھیں اس کتاب سے وہ مصداق ظہور میں آ گیا تو ہم تمام اگلے انبیاء اور صحیفوں پر ایمان رکھنے والے ہیں۔ اگر تم بھی صحیح روش

اختیار کرو تو تمہیں اس رسول اور اس کتاب سے چڑنے کے بجائے ان کا خیر مقدم کرنا چاہیے جن کے ظہور سے سب سے زیادہ تمہارا سر اونچا ہوا ہے اس لیے کہ ان کی بشارت اپنے صحیفوں کے واسطے سے تمہی نے دنیا کو سنائی تھی۔ اب اگر ضد میں آ کر تم نے انکار کیا تو تم خود اپنے کو اور اپنے صحیفوں کو جھٹلاؤ گے درآنحالیکہ ہم تمہارے صحیفوں کی تصدیق و تائید کر رہے ہیں۔

اسی طرح ان کو کامل توحید کی بھی دعوت دو اور ان سے کہو کہ ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ اس مسئلہ میں ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی اصولی نزاع نہیں ہے۔ تورات و انجیل اور دوسرے تمام صحائف توحید کی تعلیم سے معمور ہیں۔ بس ہم میں اور تم میں اگر کوئی فرق ہے تو یہ ہے کہ جو باتیں اس مسلّم حقیقت کے خلاف ہیں ہم نے ان کو چھوڑ کر اپنے آپ کو اپنے ایک ہی رب کے حوالہ کر دیا ہے۔ اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم توحید کے بھی مدعی ہو اور ساتھ ہی تم نے اپنے اندر ایسی باتیں بھی جمع کر رکھی ہیں جو اس عقیدے سے صریحاً متناقض ہیں تو ہماری دعوت تمہارے لیے یہ ہے کہ جس طرح ہم نے اپنے آپ کو کلیتہً اپنے ایک ہی رب کے حوالہ کر دیا ہے اسی طرح تم بھی اپنا یہ تناقض دُور کر کے مسلم بن جاؤ۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰۤؤُلَاۤءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَاۤ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۷﴾

قرآن کا دعویٰ

'وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ' یعنی دعوت کے اسی اصول پر جس کی طرف اوپر کی آیت میں اشارہ ہے ہم نے تم پر یہ کتاب اتاری ہے۔ یہ کتاب اس بات کی مدعی نہیں ہے کہ سب سے پہلے یہ باتیں اسی کتاب میں نازل ہوئیں بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام نبیوں اور رسولوں نے اسی دین کی دعوت دی ہے جس کی دعوت یہ کتاب دے رہی ہے لیکن پچھلی اُمتوں نے یا تو اللہ کی اتاری ہوئی تعلیمات بھلا دیں یا ان میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق تبدیلیاں کر دیں اس طرح اللہ کا دین بالکل مسخ و محرف ہو گیا تھا۔ اب اللہ نے اپنے دین کو بالکل صحیح اور مکمل صورت میں اس کتاب اور اس رسول کے ذریعہ سے پھر دنیا میں اُتار دیا ہے تاکہ خلق اللہ کی ہدایت سے محروم نہ رہے۔

صالحین اہل کتاب کے ایمان کی بشارت

'فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ' - ہم پیچھے جگہ جگہ یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قرآن نے جہاں جہاں اہل کتاب کا ذکر معروف کے صیغے سے کیا ہے، جیسا کہ یہاں ہے، بالعموم اچھے معنوں میں کیا ہے اس وجہ سے 'اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ' سے یہاں مراد عام اہل کتاب نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر کے وہ لوگ ہیں جو اپنے علم کے حد تک تورات و انجیل پر قائم تھے۔ ان لوگوں کے بابت اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بشارت دی کہ اگر ان کے آگے تم اس کتاب کو اس طرح پیش کرو گے جس طرح تمھیں ہدایت کی جا رہی ہے تو یہ صالحین اس کتاب پر ایمان لائیں گے۔

'وَمِنْ هٰۤؤُلَاۤءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ' - یہاں 'يُؤْمِنُ بِهٖ' حال کے مفہوم میں ہے۔ فرمایا کہ اسی گروہ

کے کچھ لوگ ہیں جن کو تم دیکھ رہے ہو کہ وہ ایمان لا بھی رہے ہیں۔ اسی طرح دوسرے لوگ بھی جن کے اندر صلاحیت باقی ہے آہستہ آہستہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے۔

'وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا الْکٰفِرُوْنَ'۔ یعنی ہماری آیات (قرآن) کا انکار تو ان اہل کتاب میں سے صرف وہی کریں گے جو پکے کافر ہیں یعنی جن کا ایمان نہ اپنی کتابوں اور اپنے نبیوں اور رسولوں پر ہے اور نہ وہ آئندہ کسی چیز پر ایمان لانے کے لیے تیار ہیں۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِیَمِیْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ (۴۸)

آنحضرت صلعم کی رسالت کی ایک دلیل

یہ اہل کتاب کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر وہ ضد اور انانیت سے کام نہ لیں تو تمھاری رسالت کی یہ دلیل ان کے لیے کافی ہے کہ ایک شخص جس نے نہ آسمانی صحیفوں میں سے کوئی صحیفہ پڑھا اور نہ جو لکھنے کے فن سے واقف ہے آخر اس کے اوپر یہ تمام علوم کہاں سے برس پڑے کہ اس نے نہ صرف تمام نبیوں کی تعلیم کو از سر نو زندہ کر دیا بلکہ جو کسر انھوں نے چھوڑی تھی وہ بھی اس نے پوری کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی یہ دلیل یوں تو سب پر حجت ہے لیکن اہل کتاب پر یہ خاص طور پر حجت ہے اس لیے کہ وہ انبیاء سابقین کی تمام شریعت و حکمت کے وارث تھے۔ انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ حضرت نوحؑ و حضرت ابراہیمؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ و حضرت مسیحؑ تک کے سارے خزائن حکمت ایک اُمّی پر کس طرح نازل ہو گئے۔

'اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ'۔ یعنی اگر تم پڑھے لکھے ہوتے تب تو یہ جھٹلانے والے لوگ کوئی نہ کوئی لایعنی بات شک پیدا کرنے والی بنا سکتے تھے۔ بصورتِ موجودہ ان کے لیے کوئی بات بنانے کا موقع تو ہے نہیں لیکن اب بھی اگر وہ شکوک پیدا کرتے ہیں تو ان کی شامت ہی ہے۔

بَلْ هُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ (۴۹)

سچے اہل کتاب کے لیے قرآن ان کے دل کی آواز ہے

یعنی اہل کتاب میں سے جن کے اندر دین کا صحیح علم ہے ان کے سینوں میں تو یہ قرآن نہایت واضح اور روشن آیات کی شکل میں موجود ہے۔ وہ اس کی ہر بات کو اپنے ہی دل کی بات سمجھتے ہیں۔ ان کے لیے یہ ایک جانی پہچانی ہوئی اور ایک موعود و منتظر چیز ہے۔ وہ اپنے نبیوں کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس کے لیے سراپا انتظار تھے۔ اور اب اس کو پا کر سمجھتے ہیں کہ گویا ان کو اپنی مطلوب و محبوب چیز مل گئی۔ قرآن مجید میں سچے اہل کتاب کے جذبات، قرآن اور آخری رسول سے متعلق، نہایت واضح الفاظ میں نقل ہوئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح آخری بعثت کے لیے چشم براہ تھے اور کس والہانہ جذبہ کے ساتھ انھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس آیت میں بھی اجمال کے ساتھ اسی حقیقت کی

طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

'وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ' میں وہی حقیقت دوسرے الفاظ میں واضح فرمائی گئی ہے جو اوپر آیت ۴۷ میں بیان ہو چکی ہے۔ یعنی قرآن کی ان آیات کا انکار تو وہی کرتے ہیں جنھوں نے اللہ کے عطا کردہ علم کی ناقدری کر کے اپنے سینوں اور دلوں کو تاریک کر لیا ہے اور اس طرح خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے ہیں۔ یہاں 'ظٰلِمُوْنَ' سے وہی بدبخت لوگ مراد ہیں جن کا ذکر اوپر آیت ۴۶ میں 'اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' کے الفاظ سے ہوا ہے اور جن کے باب میں مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ ان سے کوئی امید نہ رکھی جائے۔ وہ بالکل ناقابلِ علاج ہیں۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۵۰)

اہل کتاب کے سکھائے ہوئے ایک اعتراض کا جواب

یہ اہل کتاب کا ایک اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے لیکن جواب کا انداز نہایت بے پروائی کا ہے، یہاں تک کہ ان کو مخاطب کرنا بھی پسند نہیں فرمایا ہے بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپ کے واسطہ سے ان کو بات پہنچا دی ہے۔ اہل کتاب کا عام اعتراض نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اوّل اوّل یہی رہا ہے کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو ان کو اس طرح کے معجزے کیوں نہیں عطا ہوئے جس طرح کے معجزے ہمارے نبیوں، خاص طور پر حضرت موسٰی اور حضرت عیسٰی علیہما السلام کو عطا ہوئے۔ یہ اعتراض وہ قریش کو اکسانے کے لیے اٹھاتے تھے۔ قریش کے لیڈر ان سے سوال کرتے کہ آپ لوگ نبوت و رسالت کے لوازم و خصوصیات سے خوب واقف ہیں تو ان نئے مدعیٔ نبوت کے بارے میں آپ لوگوں کی رائے کیا ہے؟ اس کے جواب میں وہ نہایت معصومانہ انداز میں یہ کہہ دیتے کہ ہم اور کچھ تو کہہ نہیں سکتے لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہیں تو آخر ان پر بھی اس طرح کے معجزے کیوں نہیں اتارے گئے جس طرح کے معجزے سابق نبیوں پر اتارے گئے! اہل کتاب کے اس اعتراض سے چونکہ قریش کو ایک بہت بڑی تائید حاصل ہو جاتی اس وجہ سے وہ اس کو خوب پھیلاتے اور عوام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرتے۔ قرآن نے یہاں اہل کتاب کے القا کردہ اس اعتراض کا جواب دیا ہے اور جواب میں اہل کتاب سے زیادہ قریش کو سامنے رکھا ہے اس لیے کہ اس قسم کے اعتراضات سے سب سے زیادہ نقصان انہی کو پہنچتا کہ وہ اپنے حاسدوں کے حسد کے شکار ہو کر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی رحمت سے محروم ہو جاتے۔

'قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ'۔ یہ اس اعتراض کا پہلا جواب ہے کہ نشانیوں اور معجزات کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ میں اس معاملے میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔ وہ اگر چاہے گا تو کوئی نشانی دکھا دے گا اور نہیں چاہے گا تو نہیں دکھائے گا۔ میں تو صرف ایک نذیر مبین ہوں، مجھے حکم ہے کہ تمھیں آنے والے خطرات سے اچھی طرح آگاہ کر دوں سو یہ فرض میں ادا کر رہا ہوں۔ باقی تمام

امور اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ میں نے رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، خدائی کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ تمہاری طلب کے مطابق معجزے دکھا دوں۔

اَوَلَمْ یَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰى عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (۵۱)

یہ دوسرا جواب ہے اور نہایت جامع ہے۔ فرمایا کہ کیا ان کے لیے تمہاری نبوت و رسالت کی یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ ہم نے تمہارے اوپر ایک کتاب اتاری ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ایک پوری کتاب ان کو سنائی جا رہی ہے جو اپنے دعوے پر خود حجت ہے اور اس کا سنانے والا بھی سامنے موجود ہے تو اس عظیم نشانی کے ہوتے کسی اور نشانی کی ضرورت کہاں باقی رہی۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔ یعنی یہ تو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا فضل ہوا ہے کہ کسی حسی معجزے یا کسی نشانیٔ عذاب کے بجائے اس نے ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اگر وہ کوئی حسی معجزہ دکھاتا تو وہ بہرحال ایک وقتی چیز ہوتا اور اگر کوئی نشانیٔ عذاب دکھاتا تو وہ ایک آفت ہوتی اور معلوم نہیں وہ کس شکل میں نمودار ہوتی۔ یہ تو اللہ کا بہت بڑا فضل ہوا ہے کہ اس نے ان پر کتاب اتاری جو ان کے واسطے ایک دائمی رحمت اور یاددہانی ہے بشرطیکہ وہ اس کی قدر کریں اور اس پر ایمان لائیں۔ لفظ 'ذکرٰی' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ قرآن درحقیقت انسان کو انہی حقائق کی یاددہانی کرتا ہے جو خود اس کی عقل و فطرت کے اندر موجود ہیں لیکن وہ ان کو بھولا ہوا ہے۔ قرآن کی صداقت ثابت کرنے کے لیے کسی خارجی نشانی یا معجزے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان قرآن کی رہنمائی میں اپنی فطرت کے خزانوں کا جائزہ لے۔ وہ خود پکار اٹھے گا کہ قرآن جو کچھ بتا رہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ شَهِیْدًا ۚ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۵۲)

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے یہ شبہات و اعتراضات جو اٹھائے جا رہے ہیں یہ تو محض اوپری باتیں ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے دل گواہی دے رہے ہیں کہ تم اللہ کے رسول ہو اور جو کچھ تم ان کو بتا رہے ہو حرف حرف ٹھیک ہے تو ایسے لوگوں سے زیادہ بحث و حجت کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو اور ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہی کے لیے کافی ہے کہ فی الحقیقت تم پر میری صداقت واضح نہیں ہوئی اس وجہ سے تم نے انکار کیا یا سب کچھ جان بوجھ کر محض اپنی مشیخت کی پاسداری میں تم نے میری تکذیب کی۔ اللہ آسمانوں اور زمین کے ہر بھید سے اچھی واقف ہے، وہ قیامت کے دن سارا راز کھول دے گا۔ البتہ یہ یاد رکھو کہ جو لوگ جان بوجھ کر باطل پر ایمان لائیں گے اور خدا کا انکار کریں گے وہی لوگ آخرت میں اصلی نامراد ہونے والے ہیں۔

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَاۗءَهُمُ الْعَذَابُ ۭ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ (۵۳)

اوپر جن نشانیوں کے مطالبے کا ذکر ہے ان میں خاص طور پر عذاب کی نشانی کے لیے قریش بہت مستعجل تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن کی تکذیب کی صورت میں ان کو عذاب سے ڈراتے تو اس سے ان کے پندار کو بڑی چوٹ لگتی اور وہ جھنجھلا کر آپ کو زچ کرنے کے لیے یہ مطالبہ کرتے کہ اگر تم اس بات میں سچے ہو تو جس عذاب کی دھمکی سنا رہے ہو وہ لاؤ، ہم اس کو دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔ فرمایا کہ عذاب کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک مدت مقرر ہے اس مدت سے پہلے عذاب نہیں آتا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی یہ مقررہ سنت نہ ہوتی تو ان پر عذاب آ دھمکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس معاملے میں اگر ان لوگوں کی اس جلد بازی کے باوجود دیر ہو رہی ہے تو اس دیر کا سبب نہ کسی کا پاس و لحاظ ہے، نہ کسی کی قوت و صولت اور نہ کسی تیاری کی ضرورت، بلکہ خود خدا کا اپنا ٹھہرایا ہوا قانون ہے۔ اس قانون کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قوموں کی تباہی کی مدت ان کے اخلاقی زوال کے پیمانے سے ناپ کر مقرر کی ہے۔ صرف وہی جانتا ہے کہ کب کسی قوم کا پیمانہ لبریز ہوا، کوئی دوسرا اس چیز کو نہیں جانتا۔ فرمایا کہ جب عذاب کا وقت آ جائے گا تو وہ اچانک ان پر آ دھمکے گا، وہ اس کے مقابل میں کوئی پیش بندی نہ کر سکیں گے۔

يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ يَوْمَ يَغْشٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵۴-۵۵)

جس عذاب کے لیے وہ جلدی کر رہے ہیں وہ ان کے ساتھ ہے

یہاں ان کے استعجال بالعذاب کو پھر دہرایا ہے۔ بظاہر اس تکرار کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہ اعادہ اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے طنطنہ سے بار بار عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں گویا عذاب ان سے بہت دور ہے، حالانکہ عذاب ان کے اوپر اور ان کے نیچے سے ان کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ خدا کی جہنم کے احاطے میں ہیں۔ یہ جن اعمال کے اندر گھرے ہوئے ہیں یہی اعمال ان کے لیے جہنم کا ایندھن ہوں گے، تو جس عذاب کے لیے وہ جلدی مچاتے ہوئے ہیں اس کا پورا سامان تو انھوں نے خود فراہم کر رکھا ہے۔ ان کے یہی اعمال ایک دن عذاب بن کر ان کے اوپر اور نیچے سے ان کو ڈھانک لیں گے اور اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ اب لو، اس عذاب کا مزہ چکھو جس کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے — مطلب یہ ہوا کہ جس عذاب کا لبادہ انھوں نے خود اوڑھ رکھا ہے اس کے لیے جلدی مچانے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کوئی باہر سے منگانے کی چیز تو نہیں ہے، اس کو تو انھوں نے اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ یہ محض خرد باختگی ہے کہ وہ اس کو دور سمجھ کر اس کے لیے جلد بازی کر رہے ہیں۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ (۵۶)

مظلوم مسلمانوں سے خطاب

یہ ان مظلوم مسلمانوں کو خطاب فرمایا جن کا مسئلہ ابتدائے سورہ سے اس میں زیرِ بحث ہے۔ انداز خطاب میں بڑی دلنوازی ہے۔ فرمایا کہ اے میرے بندو، جو مجھ پر ایمان لائے ہو، اگر تم پر مکہ کی سرزمین تنگ کر دی گئی ہے تو تم مایوس اور دل شکستہ ہو کر میری بندگی کے عہد سے دست بردار نہ ہونا بلکہ اپنے اس عہد پر جمے رہو۔ اگر یہ سرزمین تمھیں چھوڑنی پڑی تو اطمینان رکھو کہ میری زمین بہت کشادہ ہے، کوئی اور سرزمین تمھارا خیر مقدم کرے گی۔ فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ بہرحال تم جمے رہو کہ میرے سوا کسی اور کی بندگی کی ذلت گوارا نہ کرو گے۔ اگر میری خاطر تم اپنے گھروں کو چھوڑو گے تو تمھاری ذمہ داری میرے اوپر ہے اور میرے پاس کسی چیز کی بھی کمی نہیں ہے۔

ہجرت سے متعلق ہدایات

اس آیت سے چند باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آگئیں۔

—— ایک یہ کہ کسی سرزمین سے ہجرت صرف اس وقت ضروری ہوتی ہے جب اس میں آدمی کے دین و ایمان کے لیے فتنہ پیش آ جائے۔

—— اگر فتنہ پیش آ جائے تو وہ ہر قیمت پر اللہ کی بندگی کے عہد پر قائم رہے، کسی صورت میں بھی غیر اللہ کی بندگی کی ذلت گوارا نہ کرے۔

—— اگر اپنے ایمان کو بچانے کے لیے اپنا گھر در سب کچھ چھوڑنا پڑ جائے تو سب کچھ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہو۔ اللہ تعالیٰ رزّاق و کفیل ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ قف ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ (۵۷)

تسلی کا ایک اہم پہلو

یہ آیت اگرچہ تہدید و تسلی دونوں کی متحمل ہے لیکن یہاں پیش و عقب کی آیات تسلی کے مفہوم کی تائید میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ زندگی تو چند روزہ ہے۔ بالآخر ایک دن سب کو مرنا اور خدا ہی کی طرف لوٹنا ہے تو اس حیاتِ چند روزہ کی خاطر آدمی اپنے رب سے کیوں تمسار ہو! اپنے رب کی خاطر اس دنیا ہی پر کیوں نہ لات مارے!

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحَٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُم مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَٰرُ خَٰلِدِينَ فِيهَا ۚ نِعْمَ أَجْرُ الْعَٰمِلِينَ (۵۸)

یعنی خدا کے ہاں کسی کی کوئی سعی رائگاں نہیں جائے گی۔ جو لوگ ایمان و عملِ صالح کی زندگی بسر کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو جنت کے بالا خانوں میں فروکش کرے گا اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس حیاتِ چند روزہ کے ایمان و عملِ صالح کے بدلے جب یہ اجر دائمی و ابدی حاصل ہونے والا ہے تو یہ بہت بڑی چیز ہے۔ ہر عاقل کو اسی کے لیے جد و جہد کرنی چاہیے، اس دنیا کے بڑے سے بڑے عیش کی خاطر بھی اس کو قربان نہیں کرنا چاہیے۔

الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (۵۹)

یہ 'عاملین' کی صفت ہے اور اس سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ صلہ ہمارے ان کارگزار بندوں کے لیے ہے جو ہر طرح کے حالات میں ہماری بندگی پر ثابت قدم اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے رہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اپنے رب پر یہ بھروسہ ہی ہے جو ہر طرح کے حالات میں بندے کو خدا کی بندگی پر استوار رکھتا ہے۔ اگر یہ بھروسہ نہ ہو تو ہجرت اور جہاد تو درکنار کوئی معمولی آزمائش بھی آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَاۗبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ڰ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ڮ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (۶۰)

خدا کا خوانِ کرم بہت کشادہ ہے

یعنی جس طرح خدا کی زمین بہت کشادہ ہے اسی طرح خدا کا خوانِ کرم بھی بہت کشادہ ہے۔ اگر اللہ کی راہ میں اموال و جائداد سے دست بردار ہونا پڑ جائے تو بے درنگ ہاتھ جھاڑ کے اٹھ کھڑے ہونا۔ یہ نہ سوچنا کہ آگے کیا کھائیں گے اور کہاں سے پہنیں گے؟ دیکھتے ہو کہ اس زمین میں کتنے جاندار ہیں جو اپنے ساتھ اپنی روزی باندھے نہیں پھرتے تاہم ان کا رب ان کو ان کا رزق بہم پہنچاتا ہے۔ وہی رب ان کو بھی رزق دیتا ہے وہی تم کو بھی رزق دیتا ہے۔ وہ سمیع و علیم ہے۔ اس وجہ سے ہر ایک کی فریاد سنتا اور ہر ایک کی ضرورت کو جانتا ہے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ تم اس کو پکارو گے اور وہ بے خبر رہے گا یا تم حاجت مند ہو گے اور وہ تمہاری پریشانی سے ناواقف ہو گا۔

یہی حکمت سیدنا مسیحؑ نے اپنے انداز میں یوں واضح فرمائی ہے:

"تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے؟ اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے؟ کیا جان خوراک سے اور بدن پوشاک سے بڑھ کر نہیں؟ ہوا کے پرندوں کو دیکھو نہ بوتے ہیں نہ کاٹتے۔ نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں تو بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوشاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو غور سے دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے نہ کاتتے ہیں تو بھی میں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی ساری شان و شوکت کے ان میں سے کسی مانند ملبّس نہ تھا۔ پس جب خدا میدان کی گھاس کو جو آج ہے کل تنور میں جھونکی جائے گی ایسی پوشاک پہناتا ہے تو اے کم اعتقادو، تم کو کیوں نہ پہنائے گا! اس لیے فکر مند ہو کر یہ نہ کہو کہ ہم کیا کھائیں گے یا کیا پئیں گے یا کیا پہنیں گے؟ کیونکہ ان سب چیزوں کی تلاش میں غیر قومیں[۱] رہتی ہیں اور تمہارا آسمانی باپ جانتا ہے کہ تم ان سب چیزوں کے محتاج ہو۔ بلکہ تم پہلے اس کی بادشاہی اور اس کی راست بازی

---

[۱] 'غیر قوموں' سے حضرت مسیح علیہ السلام کافر قوموں کو مراد لیتے ہیں۔ یہ قدیم صحیفوں کی ایک معروف اصطلاح ہے۔

کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں بھی تم کو مل جائیں گی۔ پس کل کے لیے فکر نہ کرو کیونکہ کل کا دن اپنے لیے آپ فکر کر لے گا۔ آج کے لیے آج ہی کا دکھ کافی ہے۔" متی باب ۶: ۲۵-۳۴

یہ قرآن کی بلاغت کا اعجاز ہے کہ سیدنا مسیحؑ نے جو حکمت اتنے فقروں میں واضح فرمائی ہے وہ اس نے ایک ہی آیت میں سمیٹ دی ہے۔

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (۶۱)

خدا ہی پر بھروسہ کرنے کے دلائل

اوپر کی آیات میں خدا ہی پر بھروسہ کرنے اور اسی کی راہ میں جینے اور مرنے کی جو تعلیم دی گئی ہے، اس آیت میں اور آگے کی آیات میں اسی کے دلائل بیان ہو رہے ہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور حقدار نہیں ہے کہ اس کی بندگی کی جائے اور اس پر بھروسہ کیا جائے۔ یہ حقیقت ایسی مسلّم ہے کہ اس سے ان لوگوں کو بھی مجالِ انکار نہیں ہے جو خدا کے بہت سے شریک و سہیم بنائے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کی پوجا کر رہے ہیں۔ اگر ان سے بھی پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا خالق، سورج اور چاند کا مسخر کرنے والا کون ہے تو وہ بھی اس کا یہی جواب دیں گے کہ اللہ! اس واضح حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد پھر وہ معلوم نہیں کہاں بھٹک جاتے ہیں کہ دوسروں کو بھی ماویٰ و مرجع مان کر ان کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ حقیقت اس کتاب میں ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ مشرکینِ عرب اپنی دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کو آسمان و زمین یا سورج و چاند کا خالق نہیں مانتے تھے۔ ان تمام چیزوں کا خالق و مالک وہ اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس وہم میں بھی مبتلا تھے کہ جن ہستیوں کی وہ پوجا کرتے ہیں وہ خدا کی بڑی مقرب ہیں۔ وہ ان کے لیے جو چاہیں خدا سے منوا سکتی اور کرا سکتی ہیں۔ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ کے الفاظ سے ان کے اسی تضادِ فکر پر اظہارِ تعجب فرمایا ہے کہ جب ہر چیز کا خالق و مالک خدا ہے تو آخر دوسروں کو ماویٰ و مرجع بنانے، ان کی پوجا کرنے اور ان سے استغاثہ و استرحام کا کیا تُک ہے! یہ تو خود اپنے منہ سے خود اپنے مسلّمہ کی تردید ہے!

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۶۲)

رزق کی کمی بیشی اللہ ہی کے اختیار میں ہے

یعنی جب آسمانوں اور زمین کا خالق خدا ہے اور سورج اور چاند کو ہماری خدمت میں اسی نے سرگرم کیا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ رزق کے خزانوں کا مالک کوئی اور بن بیٹھے۔ پھر تو وہی ہے جو اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور اپنے علم و حکمت کے مطابق رزق کی تقسیم فرماتا ہے۔ نہ کوئی دوسرا اس سے زیادہ علم رکھنے والا ہے کہ اس کو بتائے کہ فلاں کا رزق پہنچا ہے، فلاں کا نہیں پہنچا اور نہ کوئی اس کے بندوں کے احوال و مصالح سے اس سے زیادہ باخبر ہے کہ اس کو رائے دے سکے کہ فلاں کا رزق زیادہ ہونا چاہیے، فلاں کا کم۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۶۳)

مشرکین کا تضادِ فکر

اسی طرح اگر ان سے سوال کرو کہ وہ کون ہے جو آسمان سے پانی اتارتا ہے اور اس سے زمین کو، اس کے خشک اور بے آب و گیاہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ و شاداب کر دیتا ہے تو اس سوال کا جواب بھی وہ یہی دیں گے کہ اللہ! ان سے کہو، اگر اس بات کا تم کو اقرار ہے تو پھر تو شکر کا سزاوار بھی اللہ تعالیٰ ہی ہوا تو آخر تم اس کے سوا دوسروں کی عبادت کس حق کی بنا پر کرتے ہو!

مشرکین عرب ابر و ہوا پر بھی حقیقی تصرف اللہ تعالیٰ ہی کا مانتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ رزق و فضل کو دوسروں کی طرف منسوب اور ان کی عبادت کرتے۔ اس طرح وہ ایک شدید قسم کے تضادِ فکر میں مبتلا تھے حالانکہ جب یہ نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کی بخشی ہوئی ہیں تو شکر کا حقدار بھی وہی ہوا اور یہی شکر تمام عبادت و اطاعت کا محرکِ اوّل ہے۔ اس کی وضاحت ہم سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ، یعنی یہ تضادِ فکر ہے تو نہایت بھونڈے قسم کا لیکن ان کی اکثریت اس پر غور نہیں کرتی۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۶۴)

گمراہی کا اصل سبب

یہ ان کی ساری گمراہی کے اصل سبب کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس دنیائے فانی کی دلفریبیوں نے ان کو اس طرح گرویدہ کر لیا ہے کہ وہ اس کے مفادات سے بالاتر ہو کر کسی چیز کو سوچ ہی نہیں سکتے۔ حالانکہ یہ دنیا جس پر یہ ریجھے ہوئے ہیں اور جس کے عشق نے ان کی عقل اور ان کے دل کی ہر چیز کو ماؤف کر دیا ہے اس کی حقیقت چند روزہ لہو و لعب سے زیادہ کچھ بھی نہیں، اصلی زندگی دارِ آخرت کی زندگی ہے لیکن اس کی طرف سے ان کی آنکھیں بند ہیں۔ دنیا کی زندگی قدر و قیمت رکھنے والی چیز اس صورت میں بنتی ہے جب آخرت کو نصب العین بنا کر گزاری جائے۔ اس صورت میں بے شک انسان اس چند روزہ زندگی کے بدلے میں ابدی بادشاہی حاصل کرتا ہے۔ یہ نصب العین اگر نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو پھر یہ محض چند دن کا کھیل تماشا ہے اور اس کے بدلے میں انسان ابدی خسران کا وارث بنتا ہے۔ فرمایا کہ اصل حقیقت یہ ہے بشرطیکہ یہ دنیا کے متوالے لوگ اس حقیقت کو جانیں اور سمجھیں۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِى الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۙ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۚ وَلِيَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۶۵-۶۶)

دنیا کے سرمستوں کی تمثیل

یعنی دنیا کے ان سرمستوں کی مثال کشتی کے مسافروں کی ہے۔ جب کشتی سازگار ہوا کے ساتھ رواں دواں ہوتی ہے تو یہ اس میں اس طرح مگن ہوتے ہیں گویا ابر و ہوا سب انہی کے تابع فرمان ہیں لیکن جونہی کشتی کسی طوفانی

گرداب میں پھنسی ان کو خدا یاد آتا ہے اور اس وقت وہ اس سے مخلصانہ اطاعت کا عہد کرتے ہوئے دعا کرتے لیکن جب کشتی گرداب میں سے نکل جاتی ہے تو وہ اپنی انہی سرمستیوں اور گمراہیوں میں پھر کھو جاتے ہیں جن میں پہلے کھوئے ہوئے تھے اور خدا سے کیا ہوا عہد ان کو بالکل بھول جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس طرح خدا کی بخشی ہوئی نجات ان کے لیے خدا ہی کی ناشکری کی راہ کھولتی ہے اور ہم بھی ان کو ڈھیل دے دیتے ہیں کہ وہ چند دن ہماری نعمتوں سے متمتع ہولیں، بالآخر تو ان کو اس کا خمیازہ بھگتنا ہی ہے۔

اس آیت میں بعض اجزاء محذوف ہیں، ہم نے نظائر قرآن کی روشنی میں وہ کھول دیے ہیں۔ یہ مضمون مختلف اسالیب سے زیر بحث آچکا ہے اس وجہ سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ سورۂ روم میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔

وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۙ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○ (الروم: ۳۳-۳۴)	اور جب لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی طرف متوجہ ہو کر پھر جب وہ ان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھا دیتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے کہ اس نعمت کی ناشکری کریں جو ہم نے ان کو بخشی۔ تو چند دن فائدہ اٹھا لو، عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا!

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ ۭ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَكْفُرُوْنَ (۶۷)

اوپر کی تمثیل کا انطباق قریش کے حال پر

فرمایا کہ بالکل یہی حال قریش کے ان ناشکروں کا ہے۔ یہ اپنی تاریخ کی اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ہم نے ان کے لیے ایک مامون حرم بنایا جس میں یہ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں درآنحالیکہ ان کے گردوپیش کا حال یہ ہے کہ لوگ دن دہاڑے اچک لیے جاتے ہیں، نہ کسی کی جان کے لیے امان ہے نہ کسی کا مال محفوظ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کی قدر انھوں نے یہ کی ہے کہ اس کے بنائے ہوئے حرم کے کونے کونے میں انھوں نے بتوں کو لا بٹھایا ہے اور ان کی پوجا کر رہے ہیں۔ ان بدبختوں سے پوچھو کہ کیا وہ باطل پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں!

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اوپر کشتی کی جو مثال دی ہے اس میں اور اس صورت واقعہ میں بڑی گہری مناسبت ہے۔ یہ مامون حرم قریش کے لیے ایک سفینۂ نجات کے مانند تھا جس میں ہر خطرے سے بالکل بےخطر وہ چین کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس چین کی زندگی نے ان کو خدا سے بالکل غافل کر دیا۔ حالانکہ اگر خدا چاہتا تو ان کو بھی وہ اسی بے اطمینانی میں مبتلا کر سکتا تھا جس میں ان کے گردوپیش کے لوگ مبتلا تھے لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب تک کشتی سازگار ہوا سے رواں دواں رہے اس وقت تک وہ چین کی بانسری

بجاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بازی اس کی ہے لیکن جب کسی گرفت میں آجاتا ہے تو واویلا شروع کر دیتا ہے۔
اس حرم کی تولیت کی بدولت قریش کو جو رفاہیت اور سارے عرب پر جو قیادت و سیادت حاصل ہوئی اس پر مفصل بحث کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ سورۂ قصص کی آیت، ۵۷ کے تحت بھی اس پر بحث گزر چکی ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُ ۚ أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ (۶۸)

فردِ قرارداد جرم سنانے کے بعد ایک سوال

تمام فردِ قرارداد جرم سنانے کے بعد سوال فرمایا کہ ان لوگوں سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ گھڑ کر لگائیں یا حق کو جھٹلائیں جب کہ وہ ان کے پاس آچکا ہے۔ 'افتراء علی اللہ' سے مراد دین شرک ہے اور 'حق' سے مراد یہاں قرآن اور رسول ہیں۔ 'لَمَّا جَاءَهُ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ رسول کی بعثت سے پہلے تو ان کے لیے اللہ کے ہاں کچھ عذر ہو سکتا تھا لیکن اب جب کہ رسول بھی آچکا اور قرآن بھی نازل ہو چکا تو ان کے لیے کیا عذر باقی رہا! 'أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ' کیا ایسے کٹے کافروں کا ٹھکانا بھی دوزخ میں نہ ہوگا! مطلب یہ ہے کہ ایسوں کے دوزخی ہونے میں بھلا کسے کلام ہو سکتا ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (۶۹)

اہلِ ایمان کو بشارت

کفار کو ان کے ٹھکانے تک پہنچا کر ان مظلوم مسلمانوں کی طرف پھر توجہ فرمائی جن کا مسئلہ اس سورہ میں ابتدا سے زیرِ بحث ہے۔ فرمایا کہ ہمارے جو بندے ہماری راہ میں آج طرح طرح کی مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہ وعدہ ان کے لیے دین، دنیا اور آخرت تینوں سے متعلق ہے۔ یعنی ان کے لیے دین کی راہیں بھی کھلیں گی، ان کی دنیا کی مشکلات بھی حل ہوں گی اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ ان کی رہنمائی صراطِ حمید کی طرف فرمائے گا۔

'وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ' یہ ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی معیّت کی بشارت ہے اور یہ بہت بڑی بشارت ہے اس لیے کہ جن کو اللہ کی معیّت حاصل ہو تمہیں و تم سب ان کی راہ میں گرد ہیں لیکن یہ بشارت 'احسان' کی قید کے ساتھ مقید ہے۔ یعنی یہ معیّت ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو نہایت خوبی کے ساتھ راہِ حق کی مصیبتوں کا مقابلہ کریں گے اور ہر مرحلے میں اپنے رب پر پورا پورا بھروسہ کرنے والے ثابت ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کی مدد سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔
اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کر دے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

بروز پیر۔ دس بجے دن
۲۷ رمئی ۱۹۷۴ء
رحمان آباد

تدبّرِ قرآن

۳۰

الرّوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورۃ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

یہ سورہ، سابق سورہ ـــــ عنکبوت ـــــ کا مثنیٰ ہے اور دونوں کا قرآنی نام بھی ایک ہی یعنی الٓمّٓ ہے۔ اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ پچھلی سورہ میں ظاہری حالات کے علی الرغم مسلمانوں کو نصرتِ الٰہی اور غلبہ کی بشارت دی گئی ہے اور اس بشارت کی بنیاد اس حقیقت پر رکھی گئی ہے کہ اس کارخانۂ کائنات کو اللہ تعالیٰ نے بالحق پیدا کیا ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ تمام امرونہی اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ اس دنیا میں بھی اپنے رسول اور اپنے ساتھیوں کو غلبہ بخشے گا اور اس دنیا کے بعد آخرت بھی ہے جس میں اس کے کامل حق و عدل کا ظہور ہو گا۔ اس وقت باطل یکسر نابود ہو جائے گا اور حق و اہلِ حق کو ابدی بادشاہی حاصل ہو گی۔

یہ مسائل مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں کے درمیان زیرِ بحث ہی تھے کہ اسی اثنا یعنی ۶۱۴ء میں پڑوس کے ملک یعنی شام اور فلسطین میں یہ انقلاب پیش آیا کہ مجوسیوں نے حملہ کر کے رومیوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔ رومی چونکہ نصرانیت کے پیرو تھے اس وجہ سے دین و عقیدہ کے اعتبار سے وہ مسلمانوں سے قریب تھے اور اس قربت کے سبب سے قدرتی طور پر مسلمانوں کو ان سے ہمدردی تھی۔ اس کے برعکس مجوسی دینِ شرک کے پیرو تھے اس وجہ سے مشرکین کی تمام ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں۔ مجوسیوں کے ہاتھوں رومیوں کی اس شکست سے مشرکینِ مکہ کو بڑی شہ ملی۔ اس کی آڑ میں انھوں نے قرآن کی ان تمام باتوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیا جو ان کی خواہشوں کے خلاف تھیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان جو یہ کہتے ہیں کہ دینِ توحید ہی حق ہے یا مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہو گا یا قیامت آنے والی ہے جس میں حق کا بول بالا ہو گا، یہ سب باتیں ان کی محض لاطائل ہیں۔ اگر ان کی یہ باتیں سچی ہوتیں تو بھلا مجوسیوں کو رومیوں پر کس طرح غلبہ حاصل ہوتا! یہ واقعہ تو اس بات کی صاف شہادت ہے کہ ہمارا ہی دین و عقیدہ اور ہمارا ہی نظریۂ زندگی صحیح ہے اور ہم ہی غالب و حاکم رہیں گے۔

قرآن نے اس سورہ میں اسی واقعہ کو بنیاد بنا کر ان تمام حقائق کو از سرِ نو مبرہن کیا ہے جن کو مشرکین نے مشتبہ بنانے کی کوشش کی۔

اس سورہ کا نظام سمجھنے کے لیے اگرچہ یہ تمہید بھی کافی ہے لیکن ہم سہولت کے لیے مطالب کا تجزیہ بھی کیے دیتے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۷) رومیوں اور مجوسیوں کے واقعہ کی طرف ایک اجمالی اشارہ اور اس حقیقت کا اظہار کہ اس دنیا میں قوموں

کے ردّوبدل کے جو واقعات پیش آتے ہیں وہ اتفاقی واقعات کے طور پر نہیں پیش آتے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک مبنی بر عدل سنت کے تحت ظہور میں آتے ہیں لیکن اس سنت تک ان لوگوں کی نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں جو صرف اس دنیا کے ظواہر کو دیکھنے کے عادی ہیں۔

(۸-۱۰) اس دنیا کے نظام اور اس کی تاریخ پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اس حقیقت کا اعتراف کرے گا کہ اس کے خالق نے اس کو کھیل تماشہ نہیں بنایا ہے اس وجہ سے یہ لازماً جزاء و سزا پر منتہی ہوگی۔ قوموں کی تاریخ سے بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ ان کے کردار کے مطابق معاملہ کیا ہے اس وجہ سے قیامت ناگزیر ہے جو لوگ اس کا انکار کر رہے ہیں وہ ایک بدیہی حقیقت کا انکار کر رہے ہیں۔ جب قیامت آئے گی تو اس دن اہلِ ایمان کو فلاح حاصل ہوگی اور اہلِ کفر نامراد ہوں گے۔ جن لوگوں نے شرکاء و شفعاء بنا رکھے ہیں وہ نہایت ہی غلط سہارے پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قیامت کے دن یہ شفعاء بالکل بے حقیقت ثابت ہوں گے۔ عبادت و اطاعت کا اصلی حقدار اللہ ہے۔ اسی کی حمد و تسبیح اس کائنات کی ہر چیز کر رہی ہے۔ اس وجہ سے انسانوں کا بھی فرض ہے کہ وہ صبح و شام اسی کی تسبیح کریں۔

(۱۹-۲۹) قیامت اور توحید کے آفاقی و انفسی دلائل۔

(۳۰-۴۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو اصل دینِ فطرت پر قائم رہنے اور اسی کی دعوت دینے کی تاکید۔ اس دین کی بنیاد نماز اور زکوٰۃ پر ہے۔ جن لوگوں نے اس دینِ فطرت کو بگاڑا ہے ان کو زجر و تنبیہ کہ اب ان کے محاسبہ کا وقت آگیا ہے، وہ پچھلی قوموں کی تاریخ سے سبق لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تم صبر کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہو اور فیصلہ کے دن کا انتظار کرو۔

(۴۶-۶۰) اللہ تعالیٰ کے وعدۂ نصرت کے ظہور کے جو دلائل و آثار تاریخ و آفاق میں موجود ہیں ان کی طرف اشارہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تم اپنی دعوت انہی لوگوں کے دلوں میں اتار سکتے ہو جو سننے سمجھنے والے ہیں۔ اس وجہ سے ان لوگوں کے رویہ سے بددل نہ ہو جو اندھے بہرے بن چکے ہیں۔ سوچنے سمجھنے والوں کے لیے یہ قرآن کافی ہے۔ باقی رہے ضدی اور ہٹ دھرم تو ان کو کوئی معجزہ بھی قائل نہیں کر سکتا۔ تم صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ اللہ کا وعدۂ نصرت پورا ہو کر رہے گا۔

سُوْرَةُ الرُّوْمِ (۳۰)

مَكِّيَّةٌ ———— اٰيَاتُهَا ۶۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ﴿۳﴾ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۬ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ
مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۴﴾ بِنَصْرِ اللّٰهِ ؕ يَنْصُرُ مَنْ
يَّشَآءُ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۵﴾ وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۶﴾ يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۚۖ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾ اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ
اَنْفُسِهِمْ ۫ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَكٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾
اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَآ
اَكْثَرَ مِمَّا عَمَرُوْهَا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ
لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۹﴾ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ
اَسَآءُوا السُّوْٓآٰى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۰﴾ ع

اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ
السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ
شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳﴾ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ
يَّتَفَرَّقُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَهُمْ فِيْ
رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَ
لِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِى الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَسُبْحٰنَ
اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَلَهُ الْحَمْدُ فِى
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ﴿۱۸﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۸

یہ الٓمّٓ ہے۔ رومی پاس کے علاقے میں مغلوب ہوئے اور وہ اپنی مغلوبیت کے
بعد عنقریب ـــ چند سالوں میں ـــ غالب آجائیں گے۔ اللہ ہی کے حکم سے ہوا جو پہلے
ہوا اور اللہ ہی کے حکم سے ہوگا جو بعد میں ہوگا اور اس وقت اہلِ ایمان مسرور ہوں گے۔
اللہ کی مدد سے۔ وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور عزیز و رحیم تو وہی ہے۔ یہ اللہ کا
حتمی وعدہ ہے اور اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں
جانتے۔ وہ اس دنیا کی زندگی کے صرف ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت سے وہ بالکل
ہی بے خبر ہیں۔ ۱-۷

کیا انھوں نے اپنے دلوں میں غور نہیں کیا! اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے
درمیان ہے نہیں پیدا کیا ہے مگر غایت و حکمت اور ایک مدتِ مقرر کے ساتھ۔ اور لوگوں
میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔ ۸

کیا وہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ وہ دیکھتے کہ کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے تھے۔ وہ اِن سے قوت میں زیادہ اور زمین کو زرخیز بنانے اور آباد کرنے میں اِن سے بڑھ چڑھ کر تھے اور ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں لے کر آئے۔ پس اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہیں تھا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے۔ پھر ان لوگوں کا انجام، جنھوں نے بری روش اختیار کی، بُرا ہوا۔ بوجہ اس کے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور ان کا مذاق اڑاتے رہے۔ ۹-۱۰

اللہ ہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جس دن قیامت واقع ہوگی تو مجرم اس دن مایوس ہو جائیں گے اور ان کے شریکوں میں سے کوئی ان کے لیے سفارش کرنے والا نہیں بنے گا اور وہ اپنے شریکوں کا انکار کریں گے۔ ۱۱-۱۳

اور جس دن قیامت واقع ہوگی مومن و کافر دونوں الگ الگ ہو جائیں گے۔ پس جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے ہوں گے وہ تو ایک شاندار باغ میں مسرور ہوں گے۔ رہے وہ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کی تکذیب کی تو وہ عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔ پس اللہ ہی کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے اور جس وقت صبح کرتے ہو اور آسمانوں اور زمین میں اسی کی حمد ہو رہی ہے اور عشاء کے وقت بھی اور اس وقت بھی جب تم ظہر کرتے ہو۔ ۱۴-۱۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

نبی صلعم کی رسالت کا اثبات آپ کے پیش کردہ اصولوں کی صداقت کے پہلو سے

الٓمّٓ (۱) یہ ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آرہے ہیں، مستقل جملہ ہے۔ یعنی یہ

سورۂ الٓمّٓ ہے۔ یہ اس سورہ کا اصل قرآنی نام ہے۔ یہی نام سابق سورہ کا بھی ہے۔ قرینہ ہے اس بات کا کہ عمود کے اعتبار سے دونوں سورتوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ پچھلی سورہ میں اس کائنات کا جو فلسفہ بیان ہوا تھا اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر رسول اور اس کے ساتھیوں کے لیے دنیا اور آخرت میں جس نصرتِ الٰہی اور غلبہ کی بشارت دی گئی تھی، ایک خاص واقعہ کو جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، دلیل بنا کر کفار نے اس کا خوب مذاق اڑایا اور اس طرح ان کے زعم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تکذیب کے لیے ان کو ایک ایسی شہادت مل گئی جس پر وہ بہت مسرور ہوئے اور قدرتی طور پر ان کی یہ شادمانی مسلمانوں کے لیے باعثِ رنج ہوئی۔ قرآن نے اس سورہ میں اسی واقعہ کو تمہید بنا کر ان تمام پہلوؤں کی وضاحت فرمائی جن سے بے خبری کی بنا پر کفار مغالطہ میں مبتلا ہوئے اور جن کے اچھی طرح ذہن نشین نہ ہونے کے سبب سے مسلمانوں کی ایک جماعت کو بھی خلجان لاحق ہوا۔ اس طرح یہ سورہ گویا سابق سورہ کے مطالب کو از سرِ نو مدلل و مبرہن اور ان تمام شبہات کا ازالہ کر رہی ہے جو اس سلسلہ میں پیدا ہوئے یا پیدا ہو سکتے تھے۔ گویا دونوں سورتوں میں زیرِ بحث موضوع ایک ہی ہے۔ فرق صرف پہلو اور نہجِ استدلال کا ہے۔ ان دونوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت آپ کے پیش کردہ اصولوں کی صداقت کے پہلو سے واضح کی گئی ہے۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۬ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ یَوْمَىِٕذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ (۲-۴)

قرآن کی ایک پیشین گوئی کی صداقت

'اَدْنَی الْاَرْضِ' سے مراد یہاں شام و فلسطین کی سرزمین ہے جو عرب کی سرزمین سے بالکل متصل تھی۔ اس علاقے پر اس زمانے میں رومیوں کی حکومت تھی لیکن وہ اس وقت سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا تھے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ایرانیوں نے ان پر حملہ کر دیا اور ان علاقوں سے ان کو بے دخل کر دیا۔ یہ واقعہ ۶۱۴ء یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے چھٹے یا ساتویں سال پیش آیا۔

'وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ'۔ 'غَلَبٌ' اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔ یہ قرآن نے پیشین گوئی فرمائی کہ اگرچہ رومی اس وقت مغلوب ہو گئے ہیں لیکن یہ مغلوبیت ان کی عارضی ہے، بہت جلد وہ پھر ایرانیوں پر غالب ہو جائیں گے۔

'فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ' یعنی اس انقلاب میں، جس کی قرآن خبر دے رہا ہے، زیادہ دن نہیں لگیں گے صرف چند سالوں کے اندر اندر یہ واقع ہو جائے گا۔ اگرچہ 'سَیَغْلِبُوْنَ' کے اندر بھی مستقبل قریب کا مفہوم موجود تھا لیکن اس میں ایک قسم کا ابہام تھا اس ابہام کو رفع کرنے کے لیے اس کے ساتھ 'فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ' کی قید لگا دی جس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ انقلاب زیادہ سے زیادہ اگلی دہائی کے اندر واقع ہو جائے گا۔ لفظ 'بِضْعٌ' کا اطلاق دس سے زیادہ کی تعداد کے لیے نہیں ہوتا۔ اس تعیین و تصریح کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ اس واقعہ کو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مشرکین نے اپنے فکر و فلسفہ کی صحت

کی دلیل بنالیا تھا جس سے قدرتی طور پر مسلمانوں کو صدمہ پہنچا۔ قرآن نے اس مؤکد پیشین گوئی کے ذریعے سے ایک طرف تو مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ تمہارے مخالفوں نے اس واقعہ کو اپنے حق میں جو دلیل بنایا ہے اور جس سے وہ بہت خوش ہیں، ان کی یہ خوشی چند روزہ ہے، بہت جلد یہ غم سے بدل جائے گی۔ دوسری طرف مشرکین کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے جانچنے کے لیے ایک کسوٹی رکھ دی کہ یہ پیشین گوئی آپ کی نبوت کی ایک دلیل ہوگی۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ اس واقعہ کے تقریباً نو سال بعد ہرقل نے رومیوں کو از سر نو منظم کرکے ایرانیوں کو سخت شکست دی اور ان سے صرف اپنے علاقے واپس لے لیے بلکہ ان کے بھی بہت سے علاقوں پر قبضہ کرلیا اور اس طرح قرآن کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوگئی۔

قوموں کے بناؤ اور بگاڑ میں اصلی عامل کردار ہے

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ۔ یعنی جو کچھ ہوا وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوا ہے اور آگے جو کچھ ہوگا وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوگا۔ قوموں کی زندگی میں اتنے بڑے بڑے انقلابات محض اتفاقاتِ زمانہ اور گردشِ روزگار سے نہیں پیش آتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیش آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ہر حکم حق و عدل پر مبنی ہوتا ہے۔ رومیوں نے جب اپنے اندر وہ خرابیاں پیدا کرلیں جو کسی قوم کو خدا کے تازیانۂ تنبیہ کا مستحق بناتی ہیں تو وہ اس سے مجرد اس بنیاد پر نہیں بچ سکتے تھے کہ وہ بعض اچھے عقائد و رسوم کا اظہار کرتے ہیں۔ صرف رسوم و عقائد اجتماعی زندگی کے بنانے بگاڑنے میں اصلی دخل نہیں رکھتے بلکہ اصل شے وہ انفرادی و اجتماعی کردار ہے جو ان عقائد و رسوم سے پیدا ہوتا ہے یا پیدا ہونا چاہیے۔ اگر وہ کردار نہ پیدا ہو تو محض کھوکھلے رسوم کچھ بھی کارآمد نہیں ہوتے۔ چنانچہ رومیوں کا یہی کھوکھلا پن مجوسیوں کے آگے ان کی شکست کا سبب ہوا اور اب مستقبل قریب میں ان کے لیے جس غلبہ کی بشارت دی جا رہی ہے تو وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوگا اور اللہ کا ہر حکم عدل و حق پر مبنی ہوتا ہے اس وجہ سے لازماً یہ غلبہ اس وجہ سے ان کو حاصل ہوگا کہ وہ اپنے حالات کی اصلاح کرکے ایرانیوں کے مقابل میں اپنے کو اللہ کی مدد کا مستحق بنائیں گے۔

مسلمانوں کا رویہ دوسری قوموں کے ساتھ

وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ۔ اس دن مسلمان خوش ہوں گے۔ اس وجہ سے بھی کہ جو لوگ مذہب اور فکر و فلسفہ میں ان سے قریب تر ہیں ان کو فتح ہوگی اور اس وجہ سے بھی کہ قرآن کی ایک عظیم پیشین گوئی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے، پوری ہوگی۔

یہ امر یہاں قابلِ توجہ ہے کہ باوجودیکہ رومی صحیح نصرانیت کے پیرو نہیں تھے بلکہ ان کے عقائد و اعمال میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوچکی تھیں لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کو مجوسیوں کے مقابل میں ان سے ہمدردی ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی اس ہمدردی کی تحسین فرمائی۔ اسلام نے دوسری غیر مسلم قوموں کے ساتھ اسی اصول پر اپنے قانون اور معاملات کی بنیاد رکھی ہے۔ یعنی جو قوم اپنے نظریات و عقائد اور فکر و فلسفہ

میں اسلام سے جتنی ہی قریب ہوگی بین الاقوامی میدان میں مسلمانوں کی ہمدردیاں دوسروں کے مقابل میں ان کے ساتھ اتنی ہی زیادہ ہوں گی۔

بِنَصْرِ اللّٰهِ ۭ يَنْصُرُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۵)

قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

'بِنَصْرِ اللّٰهِ' کا تعلق 'سَيَغْلِبُوْنَ' سے بھی ہو سکتا ہے اور 'يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ' سے بھی۔ پہلی صورت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ غلبہ جو ان کو حاصل ہوگا اللہ تعالیٰ کی مدد سے حاصل ہوگا، اس لیے کہ اللہ ہی جس کی چاہتا ہے مدد فرماتا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت تمام تر حق و عدل پر مبنی ہے اس وجہ سے وہ انھیں کی مدد فرماتا ہے جو اس کے عدل و حکمت کی رو سے اس کی مدد کے سزاوار ہوتے ہیں۔ 'عزیز و رحیم' کی صفات کا حوالہ یہاں اس کی مشیت کی نوعیت کے اظہار کے لیے ہے کہ وہ غالب و مقتدر ہے اس وجہ سے اس کی مشیت میں کوئی مزاحم تو نہیں ہو سکتا لیکن ساتھ ہی وہ رحیم بھی ہے اس وجہ سے اس کا ہر ارادہ عدل و رحمت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ اپنی مشیت کے زور میں یہ نہیں کرتا کہ قوموں کو قوموں سے ٹکرا کر ان کے فساد فی الارض کا تماشا دیکھے۔

وَعْدَ اللّٰهِ ۭ لَا يُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۶)

مسلمانوں کے غلبہ کا وعدہ

'وَعْدَ اللّٰهِ' یہاں مصدر مؤکد ہے اس وجہ سے اس کے اندر تاکید کا مفہوم پیدا ہو جائے گا یعنی اہل ایمان کی مدد کا یہ وعدہ بالکل قطعی اور اٹل ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا لیکن جن لوگوں کی نظر صرف ظاہری اسباب و حالات تک محدود ہے وہ اس مخفی ہاتھ کو نہیں دیکھ رہے ہیں جو ان ظواہر کے اندر کار فرما ہے۔ اس وجہ سے وہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ یہاں جس وعدے کے پورے ہونے کی طرف اشارہ ہے وہ صرف رومیوں کے غلبہ کا وعدہ نہیں ہے بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے غلبہ کا وہ وعدہ بھی ہے جس کی تکذیب کے لیے قریش نے مجوسیوں کی فتح کو دلیل بنایا تھا۔ اس واقعہ پر تبصرہ کرنے کے بعد یہ قرآن نے نہایت تاکید کے ساتھ اس وعدے کے پورے ہونے کا اظہار فرمایا جو اصلاً اس سورہ میں زیر بحث ہے۔ آگے اسی سورہ کی آیات ۴۷، ۶۰ میں اس کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ښ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ (۷)

ظاہر پرستوں کا اصل مغالطہ

اوپر والی آیت میں ان ظاہر پرستوں کے جس اندھے پن کی طرف اشارہ فرمایا ہے یہ اس کی توجیہ ہے کہ اول تو یہ لوگ اس دنیا کے صرف ظاہر حالات کو دیکھتے ہیں، ان کے باطن تک ان کی نگاہ نہیں پہنچتی کہ اصل متصرف اس کے اندر کون ہے اور اس کی صفات کیا ہیں اس وجہ سے یہ ان کے لیے ایک کھیل تماشا بن کر رہ گئی ہے، دوسرے یہ آخرت سے بالکل غافل ہیں اور جب یہ آخرت سے غافل ہیں تو آخرت کے بغیر اس کارخانۂ کائنات کو مبنی بر عدل و حکمت تصور کرنا ناممکن ہے۔ 'وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ

هُمْ غٰفِلُوْنَ' میں مبتدا کا اعادہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اس حقیقت کو زور و تاکید کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ آخرت سے اصلی غافل یہی لوگ ہیں۔ اس تاکید کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین عرب اگرچہ آخرت کا صاف الفاظ میں انکار نہیں کرتے تھے لیکن انھوں نے شرک و شفاعت کا ایک ایسا نظام کھڑا کر رکھا تھا کہ آخرت ان کے لیے ایک بالکل بے حقیقت چیز بن کر رہ گئی تھی۔ قرآن یہاں یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کوئی یہ نہ گمان کرے کہ یہ لوگ آخرت کو کسی درجے میں بھی مانتے ہیں۔ اصلی حقیقت یہ ہے کہ آخرت سے یہ لوگ بالکل ہی بے خبر ہیں۔

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ ۫ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ۭ وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ لَکٰفِرُوْنَ (۸)

کائنات کی مقصدیت سے استدلال

اس آیت میں اور آگے کی چند آیات میں اسی حقیقت کی تائید ہیں، جو اوپر بیان ہوئی، آفاق کے دلائل کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر وہ خود اپنے باطن میں اتر کر غور کرتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، ان میں سے کسی چیز کو بھی بے غایت و مقصد، محض کھیل تماشے کے طور پر، نہیں بنایا ہے بلکہ ہر چیز ایک غایت و مقصد اور ایک مقررہ مدت کے ساتھ بندھی ہوئی پیدا ہوئی ہے۔ تو جب اس کائنات کی ہر چیز اپنے اندر ایک غایت و حکمت رکھتی ہے اور اس کے لیے ایک مدت بھی مقرر ہے تو یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ انسان جو اس کے اندر، واضح طور پر، ایک برتر مخلوق کی حیثیت رکھتا ہے، بالکل بے مقصد اور عبث پیدا کیا گیا ہو۔ اس چیز کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک روز جزا و سزا آئے جس میں وہ اپنے اعمال کی بابت مسئول ہو، اپنی نیکیوں کا صلہ پائے اگر اس نے نیکیاں کی ہوں اور اپنی بدیوں کی سزا بھگتے اگر اس نے بدیاں کمائی ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ کارخانۂ کائنات ایک کھلنڈرے کا کھیل اور انسان ایک شتر بے مہار اور بے غایت و مقصد وجود بن کے رہ جاتا ہے اور یہ بات اس کائنات کی اس مقصدیت اور حکمت کے بالکل منافی ہے جس کی شہادت اس کے ہر گوشہ سے مل رہی ہے۔ یہی مضمون دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے: 'وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ' (اور وہ آسمانوں اور زمین کی خلقت میں غور کرتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو نے یہ کارخانہ عبث نہیں پیدا کیا۔ تیری ذات پاک ہے تو ہمیں عذاب نار سے بچا!) 'اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ' کے الفاظ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ آسمان و زمین کی خلقت کی یہ حکمت ان لوگوں پر کھلتی ہے جو بالکل غیر جانبدار ہو کر اپنے باطن میں غوطہ لگاتے اور اصل حقیقت کو پانا چاہتے ہیں۔ رہے وہ جو محض دوسروں کے اندھے مقلد یا حقیقت کو جھٹلانے کے لیے معجزات اور نشانیوں کے طالب اور مناظرہ و مجادلہ کے لیے آستینیں چڑھائے رہتے ہیں وہ اس سے محروم ہی رہتے ہیں۔

وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآئِ رَبِّهِمۡ لَكٰفِرُوۡنَ؛ یعنی ہے تو یہ حقیقت بالکل واضح لیکن اس کے باوجود بہت سے نادان یہ سمجھتے ہیں کہ وہ صرف کھانے پینے اور عیش کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور اسی طرح ایک دن ختم ہو جائیں گے۔ ان کے لیے خدا کے آگے پیشی کا کوئی دن آنا نہیں ہے۔

اَوَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَيَنۡظُرُوۡا كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ؕ كَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡهُمۡ قُوَّةً وَّاَثَارُوا الۡاَرۡضَ وَعَمَرُوۡهَاۤ اَكۡثَرَ مِمَّا عَمَرُوۡهَا وَجَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ ؕ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظۡلِمَهُمۡ وَلٰكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ۞ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيۡنَ اَسَآءُوا السُّوۡۤاٰى اَنۡ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوۡا بِهَا يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (۹-۱۰)

تاریخ کے دلائل کی طرف اشارہ

یہ اسی حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ کے دلائل کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر وہ اپنے ہی ملک کے آثار اور اس کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ جو قومیں اپنی عسکری قوت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر اور تمدنی و تعمیری صلاحیتوں میں ان سے کہیں آگے تھیں، ان کا انجام کیا ہو چکا ہے! اشارہ قوم عاد، ثمود، قوم مدین وغیرہ کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں تفصیل کے ساتھ پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکی ہیں۔ فرمایا کہ ان کے رسول ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن انھوں نے اپنی آنکھیں اس طرح بند رکھیں کہ وہ کسی نشانی سے بھی نہ کھلیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کو عذاب میں پکڑا اور ان کا عذاب میں پکڑا جانا ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہوا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے اس لیے کہ انھوں نے اس انذار کی کوئی قدر نہیں کی جس کا اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اہتمام فرمایا بلکہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور نہایت جسارت کے ساتھ ان کا مذاق اڑاتے رہے — مطلب یہ ہے کہ قریش قوموں کی اس تاریخ پر غور کریں کہ اس سے کیا بات ثابت ہوتی ہے؛ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے، جس میں ہر شخص اپنے زور میں جو چاہے کرتا پھرے۔ کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے، یا یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ قوموں کے ساتھ اپنے قانون عدل و حکمت کے مطابق معاملہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی دوسری بات ثابت ہوتی ہے اور پھر اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن بھی آئے گا جس میں اللہ تعالیٰ ایک ایک فرد کا محاسبہ کرے گا اور ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔

اَللّٰهُ يَبۡدَؤُا الۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ ثُمَّ اِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ (۱۱)

اصل حقیقت

اوپر کی آیات میں اس کائنات کے 'بالحق' ہونے سے قانونِ مجازات کی صحت و صداقت پر استدلال فرمایا ہے۔ اب اس آیت اور بعد کی چند آیات میں نہایت آشکارا الفاظ میں وہ اصل حقیقت سامنے رکھ دی ہے جس سے ہر ایک کو سابقہ پیش آنا ہے۔ فرمایا کہ اللہ ہی خلق کا آغاز فرماتا ہے اور وہی اس کا اعادہ فرمائے گا۔ ان دو لفظوں میں دعویٰ اور دلیل دونوں جمع ہیں۔ دعویٰ یہ ہے کہ اللہ اس خلق کا

اعادہ فرمائے گا، دلیل اس کی یہ ہے کہ اسی نے اس کا آغاز کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس نے اس کا آغاز کیا اور اس کام میں اس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی اس کو اس کے اعادے میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ بلکہ اعادہ ابدار کے مقابل میں زیادہ آسان ہے۔ یہ جواب ہے منکرین قیامت کے شبہ کا کہ وہ قیامت کو نہایت مستبعد چیز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جب خلق کا ابدار مستبعد نہیں ہے تو اس کے اعادے میں کیا استبعاد ہے!

'ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ' :- یہ منکرین کے ایک دوسرے مغالطے کو رفع فرمایا۔ منکرین، اول تو قیامت کے وقوع ہی کو نہایت مستبعد خیال کرتے تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجے میں مانتے بھی تھے تو ان کا گمان یہ تھا کہ ہمارا لوٹنا تو ہمارے معبودوں کی طرف ہوگا اور ان کو خدا کے ہاں اتنا تقرب حاصل ہے کہ اول تو وہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے اوپر ہاتھ ڈالنے ہی نہیں دیں گے اور اگر اس نے ہاتھ ڈالا تو وہ اپنی سفارش سے ہم کو بچالیں گے۔ فرمایا کہ یہ خبط اپنے ذہن سے نکالو۔ ہر ایک کی پیشی اللہ ہی کے حضور ہونی ہے۔ اس دن کوئی اور مرجع و ماویٰ نہیں بنے گا۔

وَیَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ یُبۡلِسُ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿۱۲﴾ وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہُمۡ مِّنۡ شُرَکَآئِہِمۡ شُفَعٰٓؤُا وَکَانُوۡا بِشُرَکَآئِہِمۡ کٰفِرِیۡنَ ﴿۱۳﴾ (۱۲-۱۳)

'ابلاس' کے معنی بالکل مایوس اور بھونچکا ہو کر رہ جانا ہے۔ فرمایا کہ آج یہ مخالفین جن کی شفاعت پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں جب قیامت کے دن ان کے سامنے اصلی صورتِ حال آئے گی تو وہ مایوس اور بھونچکے ہو کر رہ جائیں گے ــــ وہ دیکھیں گے کہ جن کو انھوں نے شریک خدا بنایا اور جن کی زندگی بھر پوجا کی ان میں سے کوئی بھی ان کی شفاعت کرنے والا نہیں ہے۔

'وَکَانُوۡا بِشُرَکَآئِہِمۡ کٰفِرِیۡنَ': اور خود ان کا حال یہ ہوگا کہ جن کی حمایت میں آج آستینیں چڑھائے ہوتے ہر ایک سے لڑنے کو تیار ہیں، ان کے منکرین جائیں گے۔ سورۂ قصص کی تفسیر میں ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ قیامت کے مختلف مراحل میں مشرکین اپنے شرکاء کے معاملے میں مختلف رویے اختیار کریں گے ــــ کبھی تو وہ ان کو اپنی مدد کے لیے پکاریں گے اور کبھی وہ مرحلہ بھی آئے گا کہ صاف صاف ان کا انکار کریں گے۔ حیرانی و پریشانی کے عالم میں جہاں جو بات بنتی نظر آئے گی وہ کریں گے لیکن قیامت بات بنانے کی جگہ نہیں ہوگی بلکہ حقائق سے دوچار ہونے کی جگہ ہوگی۔

یہاں زبان کے اس اسلوب پر بھی نگاہ رہے کہ مستقبل کے احوال ماضی کے صیغوں ــــ 'وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہُمۡ' اور 'وَکَانُوۡا بِشُرَکَآئِہِمۡ' ــــ میں بیان ہوئے ہیں۔ یہ اسلوب تقریبِ فہم کے لیے اختیار کیا جاتا ہے گویا مخاطب جس چیز کو نہایت بعید سمجھتے ہیں متکلم اس کو ماضی کے اسلوب میں ایک واقع شدہ واقعہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ احوالِ قیامت کے بیان میں قرآن نے یہ اسلوب اکثر جگہ استعمال کیا ہے۔

وَیَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ یَوۡمَئِذٍ یَّتَفَرَّقُوۡنَ ﴿﴾ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَہُمۡ فِیۡ رَوۡضَۃٍ

يُحْبَرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآئِ الْاٰخِرَةِ فَاُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (۱۴-۱۶)

کفار کا ایک مغالطہ

یعنی اس دنیا کا کارخانہ ابتلار کے قانون کے تحت چل رہا ہے اس وجہ سے اس میں نیک و بد اور مومن و فاسق دونوں ملے ہوئے ہیں اور اکثر حالات میں اہلِ حق مظلوم و مقہور اور اہلِ باطل غالب و فتحمند ہیں اس وجہ سے اس دنیا کا 'بالحق' ہونا ان لوگوں کو نظر نہیں آتا جن کے اندر بصیرت نہیں ہے لیکن جب آخرت کا یوم الفرقان نمایاں ہوگا اور اس دن نیک و بد اور مومن و کافر دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہو جائیں گے۔ جو ایمان و عمل صالح والے لوگ ہوں گے وہ ایک شاندار باغ میں مسرور و شادماں ہوں گے اور جنھوں نے کفر کیا اور اللہ کی آیات و ملاقات کو جھٹلایا ہوگا وہ عذاب میں پکڑے ہوئے ہوں گے۔ یہاں 'رَوْضَةٌ' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ یعنی جنت کے باغوں میں سے شاندار باغ میں۔ 'حَبَرٌ' کے معنی خوش اور مسرور کرنے کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے لیے وہ تمام اسباب مہیا فرما دے گا جو ان کی خوشی کے لیے ضروری ہوں گے۔ مجرمین کے باب میں لفظ 'مُحْضَرُوْنَ' ان کی ذلت و بے لسبی کی تصویر کے لیے ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عذاب میں اس طرح باندھ کر اور گھسیٹ کر لائے جائیں گے جس طرح سزا یافتہ قیدی لائے جاتے ہیں۔

فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ (۱۷-۱۸)

توحید اور قانونِ مجازات کا تقاضا

اب یہ تقاضا بیان ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی اس یکتائی اور اس کے قانونِ مجازات کا جس کا بیان اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ جب اصل حقیقت یہ ہے جو بیان ہوئی تو ہر ایک کا فرض ہے کہ صرف اللہ ہی کی تسبیح کرے شام و صبح اور عشا کے وقت اور ظہر کے وقت۔

'وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' یہ اوقاتِ تسبیح کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ بطور تنبیہ و تذکیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خدا ہی کی تسبیح کی جو دعوت دی جا رہی ہے یہ کوئی بیگانہ دعوت نہیں ہے بلکہ آسمانوں اور زمین کے ہر گوشے سے خدا ہی کی حمد کا ترانہ گونج رہا ہے۔ تو جو لوگ خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کر رہے ہیں اُن کا سُر اس کائنات کے مجموعی سُر سے بالکل بے جوڑ ہے البتہ جو لوگ خدا کی حمد و تسبیح کر رہے ہیں وہ اس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ اس میں دعوت کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی بے نیازی کا اظہار بھی ہے کہ اگر کچھ بدقسمت خدا کی حمد و تسبیح سے گریز کریں گے تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ اس کائنات میں اس کی حمد و تسبیح کرنے والوں کی کمی ہے، آسمانوں اور زمین کا ہر گوشہ اس کی حمد کرنے والوں سے معمور ہے۔

اوقاتِ عبادت کے تعین میں حکمت

یہاں جو اوقات مذکور ہوئے ہیں ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حمد و تسبیح کے لیے

وہ اوقات خاص طور پر پسند فرمائے ہیں جن کی اس کی کسی بڑی نشانی کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ رات دن میں داخل ہوتی ہے یا دن رات میں داخل ہوتا ہے۔ یا سورج سمت راس سے جھکتا ہے یا رات تاریک ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو انسان غور کرنے والا ہے یہ اوقات اس کے ذہن و دماغ پر خاص طور پر اثر انداز ہوتے اور اس کو جھنجوڑتے ہیں کہ وہ اس ذات کو اس وقت یاد کرے جس کے حکم سے یہ عظیم تغیر اس دنیا میں واقع ہوا ہے۔ اگر ان اوقات میں بھی کوئی شخص اللہ کی نشانیوں اور اس کی شانوں سے متاثر نہیں ہوتا تو وہ نہایت بلید جانور ہے۔

اوقاتِ نماز میں سے فجر اور ظہر کا ذکر تو اس آیت میں نہایت واضح طور پر موجود ہی ہے۔ 'تُمْسُوْنَ' میں اگر عصر اور مغرب دونوں کو شامل کر لیجیے اور 'عَشِیًّا' سے 'عشاء' کو مراد لیجیے تو تمام اوقاتِ نماز آ جاتے ہیں۔ لفظ 'عشی' کا اطلاق زوال کے وقت پر بھی ہوتا ہے اور مغرب سے لے کر عشاء کے وقت پر بھی' اس وجہ سے اس سے عشاء کا وقت مراد لینے میں لفظ سے کوئی تجاوز نہیں ہو گا۔

۲۔ آگے کا مضمون ــــ آیات ۱۹ - ۲۹

آگے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ بعث و قیامت اور توحید کے دلائل آ رہے ہیں۔ قیامت کا بیان اس پہلو سے ہوا ہے کہ اس دنیا کی اصلی غایت و حکمت قیامت ہی سے واضح ہو گی اور توحید کا مضمون اس پہلو سے اس کے ساتھ آیا ہے کہ توحید کے بغیر قیامت ایک بالکل بے معنی چیز ہو کے رہ جاتی ہے۔ جب نظریہ یہ ہو کہ آدمی کے اعمال خواہ کچھ ہی ہوں شرکاء و شفعاء اس کو بخشوا لیں گے تو قیامت کا آنا نہ آنا دونوں یکساں ہوا۔ قیامت کی ساری اہمیت اس عقیدے میں ہے کہ اس دن خدا کے کامل حق و عدل کا ظہور ہو گا اور کسی کا زور و اثر بھی اس کے بے لاگ عدل کے ظہور میں مزاحم نہ ہو سکے گا ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

آیات ۱۹-۲۹ ع ۲ ۹ ۶

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ
وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّسْمَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا
وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ
السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً ۖۗ مِّنَ الْاَرْضِ ۖۗ
اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ
لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ
اَهْوَنُ عَلَيْهِ ؕ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَ
هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾ ۧ ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ
لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ
فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ
نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾ بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا
اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَا
لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۹﴾

ع

ترجمہ آیات ۱۹-۲۹

وہ زندہ کو مردہ سے پیدا کرتا ہے اور مردہ کو زندہ سے پیدا کرتا ہے اور زمین کو
اس کے خشک ہو جانے کے بعد از سر نو شاداب کر دیتا ہے اور اسی طرح تم بھی

نکالے جاؤ گے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر تم دیکھتے دیکھتے بشر بن کر روئے زمین پر پھیل جاتے ہو اور یہ بھی اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمھاری ہی جنس سے تمھارے لیے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور ہمدردی ودیعت کی۔ بے شک اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو غور کرنے والے ہیں۔ اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی خلقت اور تمھاری بولیوں اور تمھارے رنگوں کا تنوع بھی ہے۔ بے شک اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں اصحاب علم کے لیے۔ اور اس کی نشانیوں میں سے رات اور دن میں تمھارا سونا اور اس کے فضل کا طالب بننا ہے — بے شک اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں ان کے لیے جو سننے سمجھنے والے ہیں اور وہ اپنی نشانیوں میں سے تم کو دکھاتا ہے بجلی کو جو خوف بھی پیدا کرتی ہے اور امید بھی اور اتارتا ہے آسمان سے بارش پس زندہ کر دیتا ہے اس سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد۔ بے شک اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ چیز بھی ہے کہ آسمان و زمین اس کے حکم سے قائم ہیں پھر جب وہ تم کو زمین سے نکلنے کے لیے ایک ہی بار پکارے گا تو تم دفعتہً نکل پڑو گے۔ اور آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں اسی کے مملوک ہیں، سب اسی کے فرماں بردار ہیں اور وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے سب سے برتر صفت ہے اور عزیز و حکیم وہی ہے۔ ۲۰-۲۷

وہ تمھارے لیے خود تمھارے اندر سے ایک تمثیل بیان کرتا ہے۔ کیا ہم نے تم کو جو

رزق و فضل بخشا ہے اس میں تمہارے مملوکوں میں سے بھی کچھ شریک ہیں کہ تم اور وہ اس میں برابر کے حقوق رکھنے والے بن گئے ہو اور جس طرح تم اپنوں کا لحاظ کرتے ہو اسی طرح ان کا بھی لحاظ کرتے ہو؟ اسی طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں، بلکہ اپنی جانوں پر ان ظلم کرنے والوں نے بے دلیل اپنی بدعات کی پیروی کر رکھی ہے تو ان کو کون ہدایت دے سکتا ہے جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے! اور ان کا کوئی بھی مدد کرنے والا نہیں بنے گا۔ ۲۸-۲۹

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ وَكَذٰلِكَ تُخْرَجُونَ (۱۹)

قیامت کا شاہد روزمرہ کے واقعات میں

'اخراج' کے معنی جس طرح کسی چیز سے کسی چیز کے نکالنے کے آتے ہیں اسی طرح کسی چیز کے ظاہر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ یہ منکرین قیامت کے استبعاد کو رفع فرمایا ہے کہ تم مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو بہت مستبعد سمجھتے ہو حالانکہ اس دنیا کے ہر گوشہ میں زندہ کو مردہ سے ظہور میں آتے اور زندہ پر موت کو طاری ہوتے دیکھتے ہو۔ اس کی مثال کے طور پر فرمایا کہ تم زمین کو دیکھتے ہو کہ وہ بالکل خشک اور مردہ ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ بارش کے ایک ہی چھینٹے سے اس کے ہر گوشے میں زندگی نمودار کر دیتا ہے! اسی طرح تم بھی ایک دن مر کھپ جانے کے بعد نکال کھڑے کیے جاؤ گے۔ زندگی اور موت سب خدا کے اختیار میں ہے۔ نہ اس کے لیے زندہ کو مردہ کرنا مشکل ہے نہ مردہ کو زندہ کرنا قیامت کا یہ عمل برابر تمہاری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ اگرچہ یہاں مثال دراصل حیات بعد الموت کی پیش کرنی مقصود ہے لیکن اپنی کامل قدرت کو سامنے لانے کے لیے موت بعد الحیات کا بھی حوالہ دے دیا ہے۔ انعام کی آیات ۹۵-۹۶ کے تحت اس پر مفصل بحث گزر چکی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ (۲۰)

قدرت الٰہی کا شاہد خود اپنے وجود میں

یعنی تم کو جن حقائق کے ماننے کی دعوت دی جا رہی ہے وہ تمام تر تمہارے خالق کی قدرت و حکمت پر مبنی ہیں تو اس کی قدرت و حکمت کے ثبوت کے لیے تم کسی خارجی دلیل کا مطالبہ کیوں کرتے ہو؟ اس کی سب سے بڑی دلیل تو خود تمہاری خلقت ہی کے اندر موجود ہے۔ اس نے تم کو جامد مٹی سے پیدا کیا اور پھر تم زندہ

اور عقل و شعور رکھنے والی ہستی بن کر تمام روئے زمین پر پھیل گئے۔ 'اِذَا' یہاں اس عظیم قدرت و شان کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے۔ یعنی غور کرو، کہاں خشک مٹی اور کہاں جیتا جاگتا انسان، دیکھتے دیکھتے خدا کی قدرت نے اسی مٹی سے ایک پورا جہان آباد کر دیا! مطلب یہ ہے کہ اگر یہ انسان اس بات پر جھگڑے کہ خدا اس کو دوبارہ کس طرح پیدا کر سکتا ہے تو یہ بلادت و حماقت کی انتہا ہے۔ اسی بات کو قرآن میں دوسرے مقام میں یوں فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا مٹی سے لیکن اب وہ ہمارا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا ہے اور علانیہ ہماری قدرت کو چیلنج کر رہا ہے!

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (۲۱)

ہر چیز کے جوڑے جوڑے ہونے کی حکمتیں

اب ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے وجود سے خارج کی ایک عظیم نشانی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ہم نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے تمہارا جوڑا پیدا کیا تاکہ تم اس سے تسکین و راحت حاصل کرو اور اس تسکین و راحت کے حصول کے لیے تمہارے درمیان محبت و ہمدردی ودیعت فرمائی ——— فرمایا کہ جو لوگ غور کرنے والے ہیں ان کے لیے اس کے اندر گوناگوں نشانیاں ہیں۔

اس کے اندر ایک واضح نشانی تو اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں ہر چیز جوڑا جوڑا پیدا کی ہے اور ہر چیز اپنے مقصد وجود کی تکمیل اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر کرتی ہے۔ اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس دنیا کا بھی ایک جوڑا ہے جس کو آخرت کہتے ہیں۔ اسی آخرت سے اس دنیا کی غایت کی تکمیل ہوتی ہے۔

دوسری نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ ہمارا خالق نہایت مہربان اور محبت کرنے والا ہے۔ اس نے ہمارے اندر جوڑے کی طلب دی تو ہماری ہی جنس سے ہمارا جوڑا بھی اس نے پیدا کیا اور پھر دونوں کے اندر محبت و ہمدردی کے جذبات بھی ودیعت فرمائے تاکہ دونوں دو قالب یک جان ہو کر زندگی بسر کریں۔

تیسری نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ اس کائنات کے اضداد کے اندر نہایت گہرا توافق اور ایک بالاتر مقصد کے لیے نہایت عمیق سازگاری پائی جاتی ہے جو اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اس کا خالق و مالک ایک ہی ہے جو اپنی حکمت کے تحت اس کائنات کے اضداد میں توفیق پیدا کرتا ہے۔

چوتھی نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ ان لوگوں کا خیال بالکل احمقانہ ہے جو سمجھتے ہیں کہ اس کائنات کا ارتقا آپ سے آپ ہوا ہے۔ اگر اس کا ارتقا آپ سے آپ ہوا ہے تو اس کے اضداد میں یہ حیرت انگیز توافق کہاں سے پیدا ہوا؟ یہ تو اس بات کی صاف شہادت ہے کہ ایک قادر و حکیم ہستی ہے جو اس پورے نظام کو اپنی حکمت کے تحت چلا رہی ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ

لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ (۲۲)

کثرت کے اندر وحدت

اُسی حقیقت کی طرف جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی ہے ایک دوسرے زاویے سے توجہ دلائی کہ اگر لوگ غور کریں تو ان کو یہ چیز صاف نظر آئے گی کہ اس کائنات میں کثرت کے اندر وحدت مضمر ہے۔ ایک طرف آسمانوں کی ایک وسیع اور ناپیدا کنار کائنات ہے اور دوسری طرف یہ کرۂ زمین ہے۔ بظاہر دونوں میں کتنی دوری ہے لیکن اس دوری کے باوجود دونوں میں اتنا گہرا اتصال ہے کہ کوئی عاقل یہ تصور نہیں کر سکتا کہ دونوں الگ الگ خالقوں کی قدرت سے وجود میں آئے اور الگ الگ ارادوں کے تحت گردش کر رہے ہیں بلکہ ان کی باہمی سازگاری پکار پکار کر شہادت دے رہی ہے کہ ایک ہی تدبیر و حکیم دونوں پر متصرف ہے اور دونوں کو ایک مشترک مقصد کے لیے مسخر کیے ہوئے ہے۔ اسی طرح انسانوں کے عالم پر غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ قوموں قوموں کی زبانیں الگ اور فرد فرد کا لہجہ مختلف ہے، اسی طرح ان کے رنگ بھی الگ الگ ہیں، لیکن اس اختلاف و تنوع کے باوجود کوئی عاقل یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں رنگ اور فلاں زبان و لہجہ کے لوگ الگ خدا کی مخلوق ہیں اور فلاں رنگ و روغن کے لوگ کسی الگ خالق کی مخلوق ہیں، بلکہ ہر دانشمند یہ جانتا ہے کہ ایک ہی خالق نے تمام انسانوں کو وجود بخشا ہے۔ یہ محض اس کی حیرت انگیز کاریگری کا کرشمہ ہے کہ اس نے ہر انسان کا لب و لہجہ اور اس کا ناک نقشہ ایسا بنایا ہے کہ لاکھوں کروڑوں آدمیوں کا بھی جائزہ لیجیے تو ناممکن ہے کہ کوئی دو فرد بھی آپ کو بالکل ایک ہی رنگ و روغن، ایک ہی قد و قامت اور ایک ہی ناک نقشہ کے مل سکیں۔

حقیقی علم کون ہیں؟

'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ' فرمایا کہ علم والوں کے لیے اس کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔ اوپر والی آیت میں 'لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ' فرمایا تھا یہاں 'لِلْعٰلِمِیْنَ' فرمایا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اصلی عالم درحقیقت وہی لوگ ہیں جو اس کائنات پر تفکر کرتے اور اس تفکر سے اس کی کثرت کے اندر وحدت اور اس کے اضداد کے اندر توافق و سازگاری کا مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر اس کے خالق کی صفات قدرت و حکمت سے اس نتیجہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ یہ عظیم کائنات بے غایت و مقصد نہیں ہو سکتی اس وجہ سے لازم ہے کہ ایک روز جزا آئے جس میں نیکوکار اپنی نیکیوں کا صلہ پائیں اور بدکار اپنی بدیوں کی سزا بھگتیں۔

انسانوں کے درمیان وصل و فصل کی بنیاد

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ قوموں کے درمیان زبان اور رنگ کے اختلاف کو فارق نہیں ہونا چاہیے۔ انسانوں کے درمیان یہ چیزیں وصل و فصل کی بنیاد نہیں ہیں۔ جس طرح رنگوں اور زبانوں کے اختلاف کے باوجود تمام انسان خدا کی مخلوق ہیں اسی طرح اس قسم کے تمام ظاہری اختلافات کے علی الرغم تمام انسانوں کو ایک ہی خدائی نظام کے تحت زندگی بسر کرنی چاہیے۔ جو لوگ رنگ، نسل یا زبان یا اس نوع کی کسی اور چیز کو انسانوں کے درمیان وصل و فصل کی بنیاد بناتے ہیں

وہ اس کائنات کی وحدت پر ضرب لگاتے ہیں اور یہ چیز قرآن کی اصطلاح میں شرک اور فساد فی الارض ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ (۲۳)

'وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ' کا عطف 'مَنَامُكُمْ' پر ہے اس وجہ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی نشانیوں میں سے یہ چیز بھی ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات بنائی جس میں تم سوتے ہو اور دن بنایا جس میں تم اس کے رزق و فضل کے حصول کے لیے جد و جہد کرتے ہو۔ اس مفہوم کی نظیریں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔

دلائل ان کے لیے نافع ہوتے ہیں جو بات کو سنیں

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ: فرمایا کہ اس میں بھی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو بات کو سنیں۔ رات اور دن کے توافق کے اندر توحید کی جو دلیل ہے اور شب میں سونے کے بعد صبح کو اٹھنے میں قیامت کا جو اشارہ ہے اس کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے لیکن یہ نشانیاں اور دلیلیں ان لوگوں کی سمجھ میں آ سکتی ہیں جو پیغمبر اور قرآن کی بات کو توجہ سے سنیں۔ اس فقرے میں مخالفین کے رویہ پر تعریض ہے کہ جو لوگ بات سننے اور سمجھنے کے بجائے مخالفت کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں ان کے لیے یہ سارے دلائل بے سود ہیں۔

اوپر کی آیات میں 'تفکر' اور 'علم' کا ذکر ہوا ہے اور ہم ان کے باہمی تعلق کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں 'سمع' کا ذکر ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا درجہ اوپر کی دونوں چیزوں کے نیچے ہے لیکن حصولِ علم کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے۔ اگر ایک شخص کے اندر اتنی معقولیت موجود ہو کہ وہ معقول لوگوں کی باتیں توجہ سے سنے تو اس راہ سے بھی اس کو ہدایت حاصل ہو سکتی ہے اگرچہ وہ کائنات کے نظام اور اس کے اسرار میں زیادہ تفکر کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (۲۴)

امید و بیم دونوں کا مرکز خدا ہے

اور اس کی نشانیوں میں سے بجلی بھی ہے جو اپنے اندر امید و بیم اور طمع و خوف دونوں کے پہلو رکھتی ہے۔ یہ ابر رحمت کی بشارت اور اس کا مقدمۃ الجیش بن کر بھی نمودار ہوتی ہے اور کسی قوم کے لیے عذاب کا تازیانہ بن کر بھی۔ پہلی صورت تو عامۃ الورود ہے جس کا تجربہ ہم ہمیشہ کرتے ہیں۔ دوسری صورت کی مثالیں بھی قوموں کی تاریخ میں موجود ہیں۔ قرآن نے عاد و ثمود کی تباہی کے سلسلے میں 'صاعقہ' کا ذکر کیا ہے اور ہم اس کے محل میں اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ فرمایا کہ اس میں بھی ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیں۔ اس میں پہلی نشانی تو اس بات کی ہے کہ نعمت و نقمت دونوں خدا ہی کے ہاتھ میں ہے اس وجہ سے امید و بیم اور خوف و طمع دونوں حالتوں میں بندے کو اللہ ہی کی طرف

رجوع کرنا چاہیے۔ مشرکین کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ وہ کسی کو رحمت لانے والا اور کسی کو عذاب نازل کرنے والا بنائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ دوسری نشانی اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کے معاملات سے بالکل بے تعلق ہو کر کسی گوشے میں نہیں بیٹھا ہوا ہے بلکہ وہ براہِ راست تمام امور کی تدبیر فرماتا ہے اور اپنے قانونِ حق و عدل کے مطابق قوموں کو جزا اور سزا دیتا ہے۔ تیسری نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر کسی قوم پر عذاب نازل کرنا چاہے تو اس کے لیے اسے علیحدہ کوئی ایٹم بم نہیں بنانا پڑتا بلکہ وہ اپنی جس نعمت کو جب چاہے نقمت کی صورت میں تبدیل کر دیتا ہے۔

'وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحۡيِۦ بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا' کے استدلالی پہلو کی طرف آیت ۱۹ کے تحت ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ تَقُوۡمَ السَّمَآءُ وَالۡاَرۡضُ بِاَمۡرِهٖ ؕ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمۡ دَعۡوَةً ۖ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۖ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ تَخۡرُجُوۡنَ ۝ وَلَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ (۲۵-۲۶)

آسمان اور زمین خدا کے حکم سے قائم ہیں۔

یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ آسمان و زمین کا یہ ٹھوس نظام کس طرح متزلزل ہو سکتا ہے کہ قیامت آجائے گی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اہلِ عرب پہاڑوں کی نسبت جو سوال اٹھاتے تھے اور جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ اسی پہلو سے اٹھاتے تھے کہ بھلا ان کو کون ان کی جگہ سے ہلا سکتا ہے! اس وجہ سے قیامت کے ڈراوے ان کے خیال میں بالکل وہمی ڈراوے تھے۔ ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا ہے کہ آسمان و زمین جو قائم ہیں تو اللہ کے حکم سے قائم ہیں اور اسی وقت تک قائم رہیں گے جب تک اللہ تعالیٰ ان کو قائم رکھنا چاہے گا۔ پھر جب وہ اس نظام کو درہم برہم اور دوسرا نظام قائم کرنا چاہے گا تو اس کو اس میں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئے گی، وہ زمین کی طرف سے تمہیں بلانے کے لیے ایک ہی پکار پکارے گا اور تم سب دفعۃً زمین سے نکل پڑو گے۔ یعنی اس کو پکارنے کی زحمت بھی بار بار نہیں اٹھانی پڑے گی۔ ایک ہی پکارنا بالکل کافی ہوگا۔ اسی مضمون کو دوسرے مقام میں یوں فرمایا ہے 'وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا وَحُقَّتۡ' (اور زمین اپنے رب کی فرمانبرداری کرے گی اور اس کے لیے یہی زیبا ہے)۔

'وَلَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ'۔ یہ اوپر والی بات کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اسی کی مخلوق، اسی کے مملوک اور اسی کے فرمانبردار ہیں تو کس کی مجال ہے کہ اس کے حکم سے سرتابی اور اس کی پکار سے سرِ مو انحراف کر سکے۔

وَهُوَ الَّذِىۡ يَبۡدَؤُا الۡخَـلۡقَ ثُمَّ يُعِيۡدُهٗ وَهُوَ اَهۡوَنُ عَلَيۡهِ ؕ وَلَهُ الۡمَثَلُ الۡاَعۡلٰى فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ وَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ (۲۷)

یہ اوپر والے ٹکڑے 'اِذَاۤ اَنۡتُمۡ تَخۡرُجُوۡنَ' کی دلیل بھی ہے اور اس میں اس توحید کے مضمون کی تمہید بھی ہے جو آگے آ رہا ہے۔ قیامت کے دن اٹھائے جانے کی یہ دلیل اوپر آیت ۱۱ میں بھی گزر چکی ہے۔

یہاں بعینہٖ اسی کا اعادہ نہیں ہے بلکہ اس پر 'وَھُوَ اَھْوَنُ عَلَیْہِ' کا اضافہ بھی ہے۔ فرمایا کہ وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ تم سوچو تو اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہو کہ اسی نے خلق کو وجود بخشا ہے تو اس کے دوبارہ پیدا کیے جانے کو کیوں مستبعد خیال کرتے ہو؟ پہلا کام زیادہ مشکل ہے یا یہ دوسرا؟

تمام اعلیٰ صفتیں اللہ ہی کے لیے ہیں

'وَلَہُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'۔ 'مثل' یہاں صفت کے مفہوم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کے لیے یہ لفظ اس وجہ سے قرآن میں استعمال ہوا ہے کہ اس کی صفتیں انہی الفاظ میں بیان ہوئی ہیں جو ہماری زبان کے ہیں اور جن کو ہم اپنے لیے بھی بولتے ہیں۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ یہ تمثیلی صورت اختیار کیے بغیر یہ صفتیں ہماری فہم سے قریب نہیں آ سکتی تھیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ اس اعلیٰ مفہوم میں استعمال ہوئی ہیں جو اللہ جل شانہٗ کے شایانِ شان ہے۔

فرمایا کہ آسمانوں اور زمین میں تمام اعلیٰ صفتوں کا اصلی حقدار وہی ہے، کوئی دوسرا ان صفات میں اس کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ اس کے بعد خاص طور پر اپنی دو صفتوں ——— عزیز و حکیم ——— کا حوالہ دیا کہ وہ ہر چیز پر غالب، سب سے بالاتر، اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی کام بھی مشکل نہیں، اس کے ارادے میں اس کی حکمت کے سوا اور کوئی چیز بھی دخیل نہیں، اور اس ساری کائنات میں کوئی نہیں جو اس کی صفات میں برابری کر سکے۔ اس سے یہ بات لازمی نتیجہ کے طور پر آپ سے آپ نکل آئی کہ جب صفات میں کوئی اس کی برابری کا نہیں تو اس کے حقوق میں بھی کوئی اس کی برابری کا نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ضَرَبَ لَکُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِکُمْ ۭ ھَلْ لَّکُمْ مِّنْ مَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ مِّنْ شُرَکَاۗءَ فِیْ مَا رَزَقْنٰکُمْ فَاَنْتُمْ فِیْہِ سَوَاۗءٌ تَخَافُوْنَھُمْ کَخِیْفَتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ ۭ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۲۸)

خدا کے حقوق میں حصہ داری کے خلاف ایک دلیل

یہ خدا کی صفات اور اس کے حقوق میں دوسروں کی حصہ داری کے خلاف ایک ایسی دلیل کی طرف توجہ دلائی ہے جس پر خود مخاطب کا طرزِ عمل شاہد ہے۔ فرمایا کہ تمہارے شرک کے خلاف دلیل ڈھونڈھنے کے لیے کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے تمہارے باہمی طرزِ عمل ہی کو اللہ تعالیٰ تمہارے آگے بطور مثال پیش کرتا ہے۔ تم بتاؤ کہ جو رزق و فضل ہم نے تم کو دے رکھا ہے اپنے غلاموں کے لیے بھی تم اس میں اس طرح کی حصہ داری تسلیم کرتے ہو کہ وہ اور تم اس میں برابر کے شریک ہو جائیں اور تم ان کا بھی اسی طرح لحاظ کرو جس طرح اپنا اور اپنے حق داروں کا لحاظ کرتے ہو! لفظ 'خوف' یہاں لحاظ کرنے کے مفہوم میں ہے۔ یہ لفظ وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس پر ہم کہیں بحث کر آئے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جب تم اپنے حقوق میں اپنے مملوکوں کے لیے مساوی درجے کی حصہ داری تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہو درآنحالیکہ جو کچھ تمہارے پاس ہے ہمارا عطا کردہ ہے تو خدا کے حقوق میں تم اس

کی مخلوقات کو کس طرح شریک بنائے دے رہے ہو؟ یہ تو نہایت بھونڈی بات ہوئی کہ جس چیز کو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے اس کو خدا کے لیے پسند کرتے ہو حالانکہ تمام اعلیٰ صفات اور برتر حقوق کا اصلی حقدار آسمانوں اور زمین میں وہی ہے۔ شرک کی تردید میں یہ اسی طرح کی نفسیاتی دلیل ہے جس طرح کی دلیل دوسرے مقام میں یوں بیان ہوئی ہے کہ یہ مشرکین خود تو لڑکیوں کو ناپسند کرتے اور اپنی طرف ان کی نسبت سے بھی شرماتے ہیں لیکن اللہ کے لیے انھوں نے بہت سی بیٹیاں فرض کر رکھی ہیں۔ اس میں دلیل کا اصلی پہلو یہ ہے کہ شرک کے خلاف انفس و آفاق اور عقل و فطرت میں جو شواہد و دلائل موجود ہیں وہ تو ہیں ہی، ان سے قطع نظر یہ دلیل بھی اس کے خلاف موجود ہے کہ مشرکین جس چیز کو اپنے لیے پسند نہیں کرتے اس کو خدا کے ساتھ جوڑتے ہیں، حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جس بات کو اپنے لیے ناپسند کرتے ہیں اس کو خدا کے لیے بدرجۂ اولیٰ ناپسند کرتے۔

'وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ'، اس دلیل نے وضاحتِ مقصد کی گویا تکمیل کر دی اس وجہ سے فرمایا کہ ہم اس طرح اپنے دلائل کی تفصیل بیان کر رہے ہیں لیکن یہ دلائل کارآمد ان کے لیے ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں، جنھوں نے اپنی عقلوں پر تالے چڑھا رکھے ہوں ان کے لیے یہ دلیلیں کیا کارآمد ہو سکتی ہیں!

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَاۗءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ۭ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۲۹)

عقل کی جگہ خواہشوں کی پیروی کرنے والوں کا انجام

'اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' سے مراد یہی مشرکین ہیں جنھوں نے شرک جیسے 'ظلم عظیم' کا ارتکاب کیا ہے۔ فرمایا کہ یہ لوگ عقل سے رہنمائی حاصل کرنے والی مخلوق نہیں بلکہ اپنی خواہشوں اور بدعات کے پیچھے چلنے والے ہیں۔ 'بِغَيْرِ عِلْمٍ' میں 'علم' سے مراد دلیل و حجت ہے۔ یعنی اس پیروی میں انھوں نے علم اور دلیل کو رہنما نہیں بنایا ہے بلکہ آنکھ بند کر کے خواہشوں کے پیچھے چل پڑے ہیں۔

'فَمَنْ يَّهْدِيْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ' یعنی جو اللہ کے قانون کی زد میں آ کر گمراہ ہو چکے ہوں بھلا ان کو کون راہ یاب کر سکتا ہے! اللہ نے رہنمائی کے لیے انسان کو عقل عطا فرمائی ہے لیکن بہت سے شامت زدہ عقل کے بجائے اپنی باگ اپنی خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں۔ ایسے کج عقلوں کو خدا ان کی خواہشوں کے پیچھے آوارہ گردی کے لیے چھوڑ دیا کرتا ہے۔ 'وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ' پھر وہ اسی آوارہ گردی میں زندگی گزار دیتے ہیں۔ نہ اس دنیا میں ان کو اس ضلالت سے نکالنے میں کوئی مددگار بنتا اور نہ آخرت میں ان کو ان کے مہلک انجام سے بچانے میں کوئی ان کا مددگار بن سکے گا۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۳۰-۳۹

اوپر کی آیات میں مشرکین کے ان تمام اعتراضات کا، جو انھوں نے رومیوں کی شکست اور مجوسیوں

کی قسم کو دلیل بنا کر اسلام کی دعوت کے خلاف اٹھائے، جواب دیا گیا۔ آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ دینِ فطرت ــــــ اسلام ــــــ پر قائم رہنے اور اس کے دونوں بنیادی ستون ــــــ نماز اور انفاق ــــــ قائم کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے اور آخر میں قریش کو تنبیہ کیا گیا ہے کہ ان کے عقیدہ و عمل کے فساد نے ان کا ہر طرف سے احاطہ کر لیا ہے اس وجہ سے اب ان کے محاسبہ کا وقت قریب آ لگا ہے۔ وہ جلد اپنے انجام سے دوچار ہوں گے اور جو لوگ دینِ قیّم ملّتِ ابراہیم پر پوری مضبوطی سے قائم رہیں گے اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے نوازے گا ــــــ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَـلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۙ ﴿۳۰﴾ مُنِيۡبِيۡنَ اِلَيۡهِ وَاتَّقُوۡهُ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۙ ﴿۳۱﴾ مِنَ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزۡبٍۢ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ ﴿۳۲﴾ وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوۡا رَبَّهُمۡ مُّنِيۡبِيۡنَ اِلَيۡهِ ثُمَّ اِذَاۤ اَذَاقَهُمۡ مِّنۡهُ رَحۡمَةً اِذَا فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ بِرَبِّهِمۡ يُشۡرِكُوۡنَ ۙ ﴿۳۳﴾ لِيَكۡفُرُوۡا بِمَاۤ اٰتَيۡنٰهُمۡ ؕ فَتَمَتَّعُوۡا ۚ وقفة فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۴﴾ اَمۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ سُلۡطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوۡا بِهٖ يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۳۵﴾ وَاِذَاۤ اَذَقۡنَا النَّاسَ رَحۡمَةً فَرِحُوۡا بِهَا ؕ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ اِذَا هُمۡ يَقۡنَطُوۡنَ ﴿۳۶﴾ اَوَلَمۡ يَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ يَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيَقۡدِرُ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۷﴾ فَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى حَقَّهٗ وَالۡمِسۡكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ ؕ ذٰلِكَ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَ اللّٰهِ ۖ وَاُولٰٓئِكَ

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴿۳۹﴾

ترجمہ آیات ۳۰-۳۹

پس تم اپنا رُخ یکسو ہو کر دینِ حنیفی کی طرف کرو۔ اس دینِ فطرت کی پیروی کرو جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا۔ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو تبدیل کرنا جائز نہیں ہے یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اسی کی طرف متوجہ ہو کر اور اسی سے ڈرو اور نماز کا اہتمام رکھو۔ اور تم لوگ مشرکین میں سے نہ ہو۔ ان مشرکین میں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور گروہ گروہ بن گئے۔ ہر پارٹی بس اسی پر مگن ہے جو اس کے اپنے پاس ہے۔ ۳۰-۳۲

جب لوگوں کو کوئی تکلیف لاحق ہوتی ہے تو اپنے رب کو پکارتے ہیں اسی کی طرف متوجہ ہو کر۔ پھر جب اللہ ان کو اپنی رحمت سے شاد کام کر دیتا ہے تو ان میں سے ایک گروہ اپنے رب کے شریک ٹھہرانے لگتا ہے کہ جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا اس کی ناشکری کریں تو چند روز حظ اٹھا لو، عنقریب تم کو پتہ چل جائے گا۔ کیا ہم نے ان پر کوئی ایسی دلیل اتاری ہے جو ان چیزوں کی شہادت دے رہی ہو جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں! ۳۳-۳۵

اور جب ہم لوگوں کو رحمت سے شاد کام کرتے ہیں تو وہ اس پر اترانے لگتے ہیں اور اگر ان کے اعمال کے سبب سے ان کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو وہ فوراً مایوس ہو جاتے ہیں۔ کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہی کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لیے

چاہتا ہے فراخ اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان والے ہیں۔ ۳۶-۳۷

پس قرابتدار کو اور مسکین و مسافر کو اس کا حق دو۔ یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ کی رضا کے طالب ہیں اور وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ اور جو سودی قرض تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ دوسروں کے مال کے اندر پروان چڑھے تو وہ اللہ کے ہاں پروان نہیں چڑھتا اور جو تم زکوٰۃ دو گے اللہ کی رضا جوئی کے لیے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کے ہاں اپنے مال کو بڑھانے والے ہیں۔ ۳۸-۳۹

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

دینِ فطرت کی پیروی کی ہدایت

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰)

یہاں خطاب واحد کے صیغہ سے ہے جس کا ظاہر قرینہ یہی ہے کہ خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بحیثیت امت کے وکیل کے خطاب ہے۔ چنانچہ بعد کی آیت میں آپ دیکھیں گے کہ حال اور خطاب کے تمام صیغے جمع استعمال ہوئے ہیں۔ اب یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے واسطہ سے امت کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ اوپر جو دلائل بیان ہوئے ہیں ان سے یہ بات بالکل مبرہن ہوگئی کہ تمہاری دعوت اور تمہارے پیش کردہ دین کے برخلاف تمہارے مخالفوں کے سارے اعتراضات بالکل لایعنی ہیں تو تم بالکل یکسو ہو کر اپنا رخ اللہ کے حقیقی دین کی طرف رکھو اور ان مخالفوں کی یا وہ گوئی کی مطلق پروا نہ کرو۔ 'الدِّین' سے مراد اللہ کا حقیقی دین۔ اسلام۔ ہے جس کی دعوت اس کے تمام نبیوں اور رسولوں نے دی اور جس کی تکمیل نبی اُمّی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوئی۔ یہی دین اللہ تعالیٰ کا اصلی دین ہے چنانچہ فرمایا ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (اصلی دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام ہے) 'حَنِیْفًا' کے معنی یکسو ہو کر یعنی شرک کے تمام علائق سے کٹ کر اس طرح اپنا رخ اس دینِ توحید کی طرف کرو جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنا رخ اس دین کی طرف کیا۔ یہ لفظ قرآن میں خاص طور پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے لیے استعمال

ہوا ہے اس وجہ سے اس لفظ کے استعمال میں اس حنیفیّت اور یکسوئی کے لیے ایک یاددہانی ہے جس کی تمثال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قائم فرمائی۔

'فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا' یہاں ایک فعل محذوف ہے جو سابق فعل سے مستفاد ہوتا ہے یعنی ہر طرف سے کٹ کر اس دینِ فطرت کی پیروی کرو جس پر فاطرِ فطرت نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اس حذفِ فعل کے فائدے کی طرف ہم دوسری جگہ اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سے مقصود مخاطب کی ساری توجہ مفعول پر مرتکز کرنا ہوتا ہے۔ یہ اس 'الدّین' کی صحت و صداقت کی دلیل بیان ہوئی ہے جس کی طرف یکسو ہونے کی اوپر والے ٹکڑے میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ یہ دین کوئی خارج کی چیز نہیں ہے جو تم پر اوپر سے لادی جا رہی ہو بلکہ یہ عین تمھاری فطرت کا بروز اور تمھارے اپنے باطن کا خزانہ ہے جو تمھارے دامن میں ڈالا جا رہا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ جو فلسفی یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک صفحۂ سادہ اور تمام تر اپنے ماحول کی پیداوار اور الف و عادت کی مخلوق ہے، ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہترین ساخت اور بہترین فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اس کو خیر و شر اور حق و باطل کی معرفت عطا فرمائی ہے اور نیکی کو اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کا جذبہ بھی اس کے اندر ودیعت فرمایا ہے لیکن اس کی یہ فطرت حیوانات کی جبلت کی طرح نہیں ہے کہ وہ اس سے انحراف نہ اختیار کر سکے بلکہ وہ اپنے اندر اختیار بھی رکھتا ہے، اس وجہ سے بسا اوقات وہ اس دنیا کی محبت اور اپنی خواہشوں کی پیروی میں اس طرح اندھا ہو جاتا ہے کہ حق و باطل کا شعور رکھتے ہوئے نہ صرف باطل کی پیروی کرتا ہے بلکہ باطل کی حمایت میں فلسفے بھی ایجاد کر ڈالتا ہے۔

انبیاء فطرت کو جگانے کے لیے آئے

انسان انبیائے کرام کی رہنمائی کا محتاج اس وجہ سے نہیں ہوا کہ وہ حق و باطل میں امتیاز یا ان کے شعور سے عاری تھا بلکہ اس وجہ سے ہوا کہ اس راہ میں اس کو اس کی بعض کمزوریوں کے سبب سے، جن کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں، بہت سے مغالطے پیش آ سکتے تھے نیز مبادیٔ فطرت کے تمام لوازم اور ان کے سارے مقتضیات کو سمجھنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی رہنمائی کے لیے نبی و رسول بھیجے۔ ان نبیوں اور رسولوں کی تعلیمات چونکہ انہی مبادی پر مبنی ہیں جو انسان کے اندر ودیعت ہیں اس وجہ سے جو سلیم الطبع تھے انھوں نے نبیوں کی ہر بات کو اپنے ہی دل کی آواز سمجھا، صرف ان لوگوں نے ان کی مخالفت کی جنھوں نے اپنی فطرت مسخ کر ڈالی تھی، اگرچہ اپنے دلوں کے اندر وہ بھی رسولوں کی صداقت و حقّانیت کے معترف رہے۔ اس مسئلہ پر ہم سورۂ ہود اور سورۂ نور کی تفسیر میں مفصل بحث کر چکے ہیں۔ وضاحت مطلوب ہو تو ان پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ قرآن کو 'ذِکْر' اور 'ذِکْرٰی' جو کہا گیا ہے اس میں بھی یہی پہلو ہے کہ وہ درحقیقت انہی حقائق کی یاددہانی کرتا ہے جو انسان کے اندر موجود ہیں لیکن اس نے خود فراموشی میں ان پر نسیان کا پردہ

ڈال رکھا ہے۔

'لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ' یہ لائے نفی، نفی امکان یا نفی وقوع کے مفہوم میں نہیں ہے بلکہ نفی جواز کے مفہوم میں ہے۔ 'خلق' سے مراد وہی فطرت ہے جو اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے۔

فطرت سے انحراف تباہی ہے

مطلب یہ ہے کہ جو چیز اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے اس کو بدلنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو ہر چیز کا خالق ہے وہ اپنی مخلوقات کے مقاصد و مقتضیات کو جتنے بہتر طریقے پر جانتا یا جان سکتا ہے کوئی دوسرا نہیں جان سکتا کہ وہ کسی چیز میں ترمیم و تغیر کرنے کا حقدار بن سکے۔ اگر کوئی شخص اس کی جسارت کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی چیز کی اصلاح کا مدعی ہے جو بالبداہت ایک حماقت ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ خدا نے آنکھیں پیشانی کے ساتھ لگائی ہیں، کوئی ان کو گدی یا پاؤں کے ساتھ لگانے کی کوشش کرے یا اللہ تعالیٰ نے عورت کو عورت اور مرد کو مرد بنایا لیکن عورت مرد بننے کے لیے زور لگائے یا مرد عورت بننے کی خواہش مند ہو جائے۔ اس قسم کی سعیٔ نامراد کا نتیجہ بگاڑ اور فساد کے سوا کچھ اور نہیں نکل سکتا۔ بالکل یہی حال دینِ فطرت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جو مبادی فطرت کے اندر ودیعت فرمائے ہیں انہی پر انسان کی دنیا میں صلاح اور آخرت میں فلاح منحصر ہے۔ اگر انسان اس سے ذرا سا انحراف اختیار کرے تو وہ خدا کی صراطِ مستقیم سے ہٹ جائے گا جس کا لازمی نتیجہ اس کے دین اور اس کی دنیا دونوں کی تباہی ہے اگرچہ وہ یہ انحراف علم اور سائنس کے کتنے ہی بلند بانگ دعاوی کے ساتھ کرے۔

'ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ' فرمایا کہ یہی دین سیدھا دین ہے یعنی اس کو انسان کی عقل اور اس کی فطرت کے ساتھ براہِ راست تعلق ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا نہایت سیدھا اور قریبی راستہ ہے، اس میں کہیں کوئی کج پیچ نہیں ہے۔

'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ' لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے اس وجہ سے انھوں نے اس میں بگاڑ پیدا کیا اور اب اس بگاڑ ہی پر قائم رہنے یا لوگوں کو اس پر قائم رکھنے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں۔

مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (۳۱)

حنیفیت کی تاکید

'مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ' حال پڑا ہوا ہے 'فَاَقِمْ وَجْهَكَ' کی ضمیر خطاب سے۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ لفظاً یہ خطاب اگرچہ واحد ہے لیکن معناً یہ جمع کے حکم میں ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو خطاب ہے وہ امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے۔ اس حال کے جمع لانے سے خطاب کی یہ نوعیت بالکل مبرہن ہو گئی۔ اوپر والی آیت میں حنیفیت کی تاکید فرمائی ہے، اس آیت میں 'انابت' اور 'تقویٰ' کی تاکید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے مجرد عقلی یکسوئی کافی نہیں ہے بلکہ دل کی انابت و خشیت بھی مطلوب ہے، اور حدودِ الٰہی کی پوری پوری پاسداری بھی۔

'وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ'۔ نماز اس دین قیّم کے بنیادی احکام میں سے ہے اور یہی اس حنیفیت اور انابت و تقویٰ کی محافظ اور اس کا مظہر ہے جس کی یہاں ہدایت فرمائی گئی ہے۔

'وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ'۔ یہ تنبیہ ہے کہ مشرکین سے دور رہو اس لیے کہ انھوں نے یہ ساری چیزیں برباد کر دی ہیں جو دین قیم کے لوازم میں سے ہیں۔

مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۲)

مشرکین سے بیزاری کا اظہار

یہ انہی مشرکین کی تفصیل ہے جن کے طریقہ سے بچنے کی اوپر والی آیت میں ہدایت فرمائی گئی ہے۔ اس وضاحت سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا ہے۔ اس کے اول مصداق قریش ہیں جنھوں نے اس دین کو، جو ان کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ذریعے سے ملا، شرک میں مبتلا ہو کر، بالکل ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے ان کو ایک خدا کی تعلیم دی تھی لیکن انھوں نے سینکڑوں خدا بنا ڈالے اور ہر گروہ اپنے اپنے معبود پر اس طرح فدا تھا کہ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ مسلمانوں کو یہ ہدایت اس لیے نہیں فرمائی گئی کہ ان میں سے کسی کے مشرکین کے ساتھ جا ملنے کا اندیشہ تھا بلکہ یہ شرک اور مشرکین سے بیزاری کا اظہار ہے جو مشرکین کے بجائے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے ـــــ گویا مشرکین اپنی ہٹ دھرمی کے سبب سے لائق خطاب نہیں رہے اس وجہ سے بات اپنوں کو مخاطب کر کے کہہ دی گئی۔

وَاِذَا مَسَّ النَّاسَ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُّنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ ثُمَّ اِذَآ اَذَاقَهُمْ مِّنْهُ رَحْمَةً اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُوْنَ ۙ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۳۳-۳۴)

یہ مشرکین کو براہ راست دھمکی ہے کہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب کسی گرداب میں پھنستے ہیں تب تو نہایت نیاز مندی سے اور تذلّل کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں لیکن جب خدا ان کو اپنی رحمت سے نواز دیتا ہے تو پھر یہ خدا کو بھول کر اپنے انہی معبودوں کی طرف لوٹ جاتے ہیں جن کو انھوں نے شریک بنا رکھا ہے۔ یہ مضمون پیچھے مختلف اسلوبوں سے گزر چکا ہے اور آگے سورۂ لقمان کی آیت ۳۲ میں ایک نئے اسلوب سے آئے گا۔

'لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ'۔ یہ مضمون بعینہٖ عنکبوت کی آیت ۶۶ میں بھی گزر چکا ہے۔ یعنی وہ نعمت تو پاتے ہیں خدا سے لیکن گُن گاتے ہیں دوسروں کے اور اس طرح خدا کی نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں۔ اس کے بعد نہایت تند لہجہ میں مخاطب کر کے فرمایا کہ اچھا کچھ دن ہماری نعمتوں سے اپنی اس ناسپاسی و ناشکری کے باوجود، فائدہ اٹھا لو، عنقریب تمھاری اس حرکت کا خمیازہ تمھارے سامنے آنے والا ہے۔

اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ يُشْرِكُوْنَ (۳۵)

ہم پیچھے اس اسلوب کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اس قسم کے سوالیہ جملوں میں کلام کا ایک ٹکڑا حذف ہو جاتا ہے جس کی خانہ پری متکلم کا لب و لہجہ کر دیتا ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان نادانوں نے یونہی خدا کے شریک بنا رکھے ہیں یا ہم نے کوئی دلیل اتاری ہے جو ان کے شریکوں کے شریک خدا ہونے کی شہادت دے۔

رہی ہو!! اس اسلوبِ کلام میں طنز و تحقیر اور غیظ و غضب سب جمع ہو جاتا ہے۔ آخری گروپ کی سورتوں میں اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔

توحید کی ایک نفسیاتی دلیل

ان آیات میں توحید کی ایک نہایت اہم نفسیاتی دلیل کی طرف توجہ دلائی گئی۔ وہ یہ کہ جب انسان پر حقیقی افتقار اور بے بسی کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ تمام دوسرے اسباب و وسائل اور خود تراشیدہ معبودوں کو چھوڑ کر پوری انابت کے ساتھ اپنے ربِّ حقیقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کی اصل فطرت کے اندر ایک خدا کے سوا کسی اور کے لیے کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ لیکن جب افتقار کی حالت ختم ہو جاتی ہے تو پھر وہ انہی گمراہیوں میں کھو جاتا ہے جن میں وہ اس سے پہلے کھویا ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شرک کا اصلی سبب انسان کی غفلت ہے۔ یہ غفلت جب قدرت کی کسی تنبیہ سے دور ہو جاتی ہے تو اس کو اصل حقیقت نظر آجاتی ہے لیکن جب حالات بدل جاتے ہیں تو اس کی سابق غفلت پھر عود کر آتی ہے۔

وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوْا بِهَا ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اِذَا هُمْ يَقْنَطُوْنَ (۳۶)

تکلیف اور راحت دونوں آزمائش ہیں

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تو جب لوگوں کو اپنی نعمت سے نوازتا ہے تو یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب کے شکر گزار ہوں اور اگر ان کو ان کے اعمال کے نتیجے میں کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے تو یہ چاہتا ہے کہ وہ اس آزمائش پر صبر کریں لیکن بہت تھوڑے لوگ ایسے نکلتے ہیں جو نعمت پر شکر اور مصیبت پر صبر کریں۔ زیادہ لوگ ایسے ہی نکلتے ہیں جو نعمت پاتے ہیں تو فخر کرتے ہیں اور اکڑتے ہیں اور اگر کسی آزمائش میں پڑتے ہیں تو دل شکستہ اور مایوس ہو کے رہ جاتے ہیں۔ یہ باتیں سب عام الفاظ میں ارشاد ہوئی ہیں اس لیے کہ عام حالت درحقیقت یہی ہے لیکن ان آیات کے نزول کے وقت ظاہر ہے کہ ان کا اشارہ قریش کی طرف تھا اور اس طرح در پردہ ان کو متنبہ فرمایا گیا کہ آج تو خدا کی بخشی ہوئی نعمت پر اس کے آگے اکڑتے ہو لیکن کل کو اگر کسی پکڑ میں آگئے تو روؤ گے اور چلاؤ گے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس آیت کے الفاظ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ سے یہ بات نکلتی ہے کہ لوگوں کو اگر کوئی بری افتاد اس دنیا میں پیش آتی ہے تو ان کے برے اعمال کے نتیجے میں پیش آتی ہے۔ جہاں تک بروں کا تعلق ہے سنت الٰہی یہی ہے جو اس آیت میں بیان ہوئی ہے لیکن اس دنیا میں نیکوں یہاں تک کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کو بھی بڑی بڑی آزمائشیں پیش آئی ہیں۔ اس قسم کی آزمائشیں اللہ تعالیٰ کی اس سنتِ ابتلاء کے تحت پیش آتی ہیں جو اس کے تمام بندوں کے لیے عام ہیں، خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ ان کا تعلق ضروری نہیں کہ آدمی کے اعمال ہی سے ہو بلکہ اکثر حالات میں مجرد اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تربیت ان کی مقتضی ہوتی ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۳۷)

نعمت اور آزمائش دونوں میں صحیح رویہ

یعنی کیا ان لوگوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ رزق کی فراخی ہو یا تنگی دونوں اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

وہی جس کے لیے چاہتا ہے رزق کو تنگ کر دیتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے کشادہ کر دیتا ہے۔ اس کا یہ چاہنا تمام تر اس کی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے نہ تو کسی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مایوس ہو اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ اترانے اور اکڑنے والا بنے۔ اترانے کا حق اس کو ہے جس کا رزق اس کے اپنے اختیار میں ہو اور خدا سے مایوس وہ ہو جو اپنے لیے کوئی اور دروازہ تلاش کر سکے۔ جب ان دونوں میں سے کوئی بات بھی ممکن نہیں ہے تو صحیح رویہ صرف یہی ہے کہ بندہ نعمت پر شکر کرے اور آزمائش پر صبر۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں ہی چیزوں سے بندے کا امتحان کرتا ہے اور یہ آخرت میں کھلے گا کہ کون اس کے امتحان میں کامیاب ہوا اور کون ناکام!

فرمایا کہ اگر لوگ اس حقیقت پر غور کریں تو اس میں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو ایمان لانے والے ہیں۔

اس میں سب سے بڑی نشانی تو اس بات کی ہے کہ اس کائنات کے تمام امور اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کے اختیار میں ہیں۔ جس طرح موت اور زندگی پر کسی کو اختیار نہیں ہے اسی طرح رزق کی تنگی و کشادگی پر بھی کسی کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

دوسری نشانی اس بات کی ہے کہ اس دنیا میں رزق کی کشادگی نہ کسی کی کامیابی کی دلیل ہے نہ اس کی تنگی کسی کی ناکامی کی، بلکہ یہ دونوں ہی چیزیں بندے کے امتحان کے لیے ہیں۔ کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ آخرت میں ہوگا۔

تیسری نشانی اس میں یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں ہر وقت بندے کے شکر اور صبر کا امتحان ہوتا رہتا ہے اور انسان کے تمام اعلیٰ اوصاف کا سرچشمہ یہی دو صفتیں ہیں۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۡ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۳۸)

اوپر آیت ۳۱ میں دینِ فطرت کے اولین رکن نماز کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس کے بعد بعض مناسب مقام تنبیہات آ گئی تھیں جن میں آخری تنبیہ یہ تھی کہ جس کو رزق کی فراخی حاصل ہو تو اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کو اب وجد کی وراثت یا اپنے فضل و کمال کا ثمرہ سمجھ کر اس پر اترائے بلکہ اس کو اپنے رب کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

شکر گزاری کا طریقہ

اس آیت میں اس شکر گزاری کا طریقہ بتا دیا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے مال میں سے قرابت داروں، مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دے۔ 'حَقَّهٗ' کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ رزق کی کشادگی عطا فرماتا ہے اس کے مال میں درحقیقت دوسروں کے حقوق بھی ہوتے ہیں جو اس کی امانت میں ہوتے ہیں، اس وجہ سے یہ اس کا فرض ہے کہ وہ ان حقوق کو ادا کرے۔ اگر اس نے اس میں کوتاہی کی تو وہ حقوق کا غصب کرنے والا ٹھہرے گا۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی رضا کے طالب ہیں ان کے لیے یہی طریقہ بہتر ہے اور آخرت میں

وہی فلاح حاصل کرنے والے بنیں گے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ اپنے مال کو فخر و غرور یا عیش و تنعم یا مال پروری کا ذریعہ بنائیں گے ان کا مال خدا کے ہاں موجبِ وبال و خسران ہوگا۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِىٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (۳۹)

'ربا' اس مال کو بھی کہتے ہیں جو کسی کو سودی قرض کے طور پر دیا جائے اور اس سود کو بھی کہتے ہیں جو کسی قرض پر حاصل کیا جائے۔ اس لفظ کو جن لوگوں نے ہدیہ یا عطیہ کے معنی میں لیا ہے انھوں نے بالکل غلط لیا ہے۔ یہ لفظ یہاں اس اسلوب پر استعمال ہوا ہے جس کو 'تسمیۃ الشئ بما یئول الیہ' کہتے ہیں جس طرح 'اِنِّیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا' ہے۔ ہم نے اس آیت پر ایک مستقل مضمون لکھ دیا ہے جو ہمارے مجموعۂ مضامین میں ملے گا۔

لفظ 'زکوٰۃ' یہاں اصطلاحی زکوٰۃ کے مفہوم میں نہیں بلکہ صدقات کے عام مفہوم میں ہے۔ اس مفہوم میں اس کا استعمال قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی ہوا ہے۔

انفاق کا ضد کردار

اوپر کی آیت میں انفاق کا جو حکم دیا ہے یہ اس کے ضد کردار کا بیان ہے کہ جو لوگ مال کو پا کر اس کو اللہ کی رضا جوئی میں خرچ کرنے کے بجائے مال پروری کی فکر میں لگ جاتے ہیں اور اس کو سودی قرض کے طور پر دیتے ہیں کہ ان کا مال دوسروں کے مال کا خون چوس کر فربہ ہو جائے تو وہ یاد رکھیں کہ اس قسم کا مال اس دنیا میں موٹا ہو تو ہو لیکن خدا کے ہاں اس میں کوئی بڑھوتری نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ اس مال کو، جیسا کہ دوسرے مقام میں وضاحت ہے، مٹا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اس مال میں بڑھوتری ہوتی ہے جو خدا کی رضا جوئی کے لیے خدا کی راہ میں خرچ کیا جاتا ہے۔

اس آیت کے الفاظ پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ سود خوار کے مال کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے سانڈے سے تشبیہ دی ہے جو دوسرے کی چراگاہ میں چر کر موٹا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی فربہی میں کوئی خیر و برکت نہیں ہے۔ خیر و برکت صرف اس مال میں ہے جو اپنی چراگاہ میں چر کر پروان چڑھتا ہے پھر خدا کی رضا جوئی اور ادائے حقوق کی راہ میں قربان ہوتا ہے۔ فرمایا کہ بے شک یہ لوگ اپنے سرمائے کو بڑھانے والے بنیں گے۔ اس بڑھانے کی شرح قرآن کے دوسرے مقامات میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی ہے۔

مال جمع کرنے کی خواہش بالعموم مستقبل کے اندیشوں کو پیش نظر رکھ کر ہوتی ہے لیکن انسان مستقبل کو بہت تنگ نگاہ سے دیکھتا ہے اس وجہ سے اس کی نظر اسی زندگی تک محدود رہ جاتی ہے۔ اصل مستقبل یعنی آخرت کو وہ نہیں دیکھتا حالانکہ اس کے مال کا اصلی فائدہ صرف اس صورت میں اس کو حاصل ہو سکتا ہے جب وہ اس دنیا کے بنکوں میں جمع کرنے کے بجائے خدا کے بنک میں اس کو جمع کرے تاکہ وہ اس کی ابدی زندگی میں اس کے کام آئے۔

یہاں اس بات کو بھی یاد رکھیے جس کی طرف ہم دوسرے مقام میں اشارہ کر چکے ہیں کہ ایک تاجر یا کاروباری کے سرمایہ میں جو اپنے سرمایہ کو کسی جائز تجارت یا کاروبار میں لگا کر اس کو بڑھاتا ہے اور ایک سُود خور کے سرمایہ میں جو سود پر قرض دے کر اس میں اضافہ کرتا ہے یہ بنیادی فرق ہے کہ تاجر کا سرمایہ ہر قسم کے حالات و خطرات کا مقابلہ کر کے خود اپنی چراگاہ میں فربہی و توانائی حاصل کرتا ہے اور سود خور کا سرمایہ ایک کمین گاہ میں چھپ کر، بغیر کوئی خطرہ مول لیے، حاجتمندوں سے غنیمت حاصل کرتا اور موٹا ہوتا ہے۔ ان دونوں کے اسی بنیادی فرق کے سبب سے اسلام نے تجارت اور کاروبار کی بڑھوتری کو مبارک قرار دیا ہے اور سود کی بڑھوتری کو فاسد اور حرام۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۰ - ۶۰

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کو دھمکی دی گئی ہے کہ انھوں نے دینِ فطرت کی دونوں بنیادیں ——— توحید اور ہمدردیِ خلق ——— ڈھا دی ہیں اور اس طرح پورے نظامِ معاشرت و تمدن کو بگاڑ کر خدا کی زمین کو فساد سے بھر دیا ہے۔ اس چیز نے ان کو مستحق بنا دیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کسی گرفت میں آئیں تاکہ وہ اپنے اس فساد فی الارض کا کچھ مزا چکھیں۔

پھر مسلمانوں کو غلبہ و نصرت کی بشارت دی گئی ہے اور اس کائنات کے شواہد سے یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کسی پر نازل کرنا چاہتا ہے تو اپنے تصرفِ غیبی سے ناسازگار حالات کو بھی سازگار بنا دیتا ہے۔

اسی کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو دینِ فطرت پر جمے رہنے کی تاکید اور ان لوگوں سے بے پروا ہونے کی ہدایت فرمائی گئی جو بالکل اندھے بہرے بن چکے ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۰ - ۶۰

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۰﴾ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۴۱﴾ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ

ع ۱۴

كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ ﴿٤٢﴾ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ الْقَيِّمِ مِنْ قَبْلِ
اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ ﴿٤٣﴾ مَنْ كَفَرَ
فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ﴿٤٤﴾ لِيَجْزِيَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٤٥﴾
وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ
وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٤٦﴾
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا ؕ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٤٧﴾
اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ
كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ
فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿٤٨﴾
وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ﴿٤٩﴾
فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ
ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٥٠﴾ وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا
رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ ﴿٥١﴾ فَاِنَّكَ
لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ﴿٥٢﴾
وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ؕ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا
فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿٥٣﴾ ع اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْ

ع ۵ ۱۳ ۸

بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ۝۵۴ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ڏ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ ۭ كَذٰلِكَ كَانُوْا يُؤْفَكُوْنَ ۝۵۵ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَالْاِيْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ ۡ فَھٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ وَلٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۵۶ فَيَوْمَىِٕذٍ لَّا يَنْفَعُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝۵۷ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَلَىِٕنْ جِئْتَهُمْ بِاٰيَةٍ لَّيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ ۝۵۸ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۵۹ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ ۝۶۰ ع ۶ ۹

ترجمہ آیات ۴۰ - ۶۰

اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تم کو روزی دی، پھر تم کو موت دیتا ہے، پھر تم کو زندہ کرے گا۔ کیا تمھارے شریکوں میں سے بھی کوئی ایسا ہے جو ان کاموں میں سے کوئی کام کرتا ہو! وہ پاک ہے اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں! خشکی اور تری ہر جگہ لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں فساد چھا گیا ہے تاکہ اللہ ان کی بعض کرتوتوں کا مزہ چکھائے تاکہ یہ رجوع کریں۔ ۴۰ - ۴۱

ان سے کہو کہ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جو پہلے ہو گزرے ہیں! ان میں سے اکثر مشرک ہی تھے۔ ۴۲

پس اپنا رُخ دینِ قیّم کی طرف سیدھا رکھو۔ قبل اس کے کہ اللہ کی طرف سے ایک

ایسا دن آجائے جس کے لیے پھر واپسی نہیں ہے۔ اس دن وہ جدا جدا ہو جائیں گے۔ جس نے کفر کیا اس کا وبال اس پر ہوگا اور جنھوں نے نیک اعمال کیے وہ بے شک اپنے لیے زمین ہموار کر رہے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بدلہ دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے۔ اللہ کافروں کو ہرگز دوست نہیں رکھتا۔ ۴۳۔۴۵

اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ بھیجتا ہے ہواؤں کو اپنے ابرِ رحمت کی خوش خبری دینے والی بنا کر اور تاکہ وہ تم کو اپنی رحمت سے نوازے اور تاکہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ ۴۶

اور ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے ان کی قوموں کی طرف۔ پس وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جنھوں نے جرم کیا۔ اور اہلِ ایمان کی نصرت ہم پر لازم تھی۔ اللہ ہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو پس وہ بادلوں کو ابھارتی ہیں پھر اللہ ان کو پھیلا دیتا ہے آسمان میں جس طرح چاہتا ہے اور ان کو تہ بہ تہ کرتا ہے پھر تم دیکھتے ہو مینہ کو ان کے بیچ سے نکلتے ہوئے پس جب وہ اس کو نازل کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے تو وہ یکایک خوش ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ اس کے نازل کیے جانے سے قبل، اس خوشی سے پہلے، بالکل مایوس تھے۔ پس رحمتِ الٰہی کے آثار کو دیکھو، وہ کس طرح زمین کو زندہ کر دیتا ہے اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد!

بے شک وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۴۷۔۵۰

اور اگر ہم دوسری ہوا بھیج دیں پس وہ کھیتوں کو زرد ہوئی دیکھیں تو اس کے بعد وہ کفر کرنے والے بن کر رہ جائیں گے۔ تو تم نہ مردوں کو اپنی پکار سنا سکتے اور نہ بہروں کو سنا سکتے جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر چلے جا رہے ہوں۔ اور نہ اندھوں کو تم ان کی ضلالت سے موڑ کر

راہ پر لا سکتے۔ تم تو بس ان کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لانے والے ہوں، پس وہی اطاعت کرنے والے ہیں۔ ۵۱-۵۳

اللہ ہی ہے جس نے تم کو ناتوانی سے پیدا کیا، پھر ناتوانی کے بعد قوت بخشی، پھر قوت کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے اور وہی علیم و قدیر ہے۔ ۵۴

اور جس دن قیامت واقع ہوگی، مجرم قسم کھا کر کہیں گے کہ وہ ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ اسی طرح ان کی عقلیں اوندھی ہو جاتی رہی ہیں۔ اور جن کو علم و ایمان عطا ہوا ہوگا وہ کہیں گے کہ اللہ کے رجسٹر کی رُو سے تو تم قیامت تک رہے ہو۔ سو یہ حشر کا دن ہے لیکن تم جانتے نہیں تھے۔ پس اس دن ان لوگوں کو ان کی معذرت کچھ نفع نہ دے گی جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہوگا اور نہ ان سے یہ چاہا جائے گا کہ وہ خدا کو راضی کریں۔ ۵۵-۵۷

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہر قسم کی تمثیلیں بیان کر دی ہیں اور اگر تم ان کے پاس کوئی سی نشانی بھی لاؤ گے تو جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ یہی کہیں گے تم لوگ بالکل جھوٹے ہو۔ اسی طرح اللہ مُہر کر دیا کرتا ہے ان لوگوں کے دلوں پر جو جاننا نہیں چاہتے۔ تو تم صبر کرو، بے شک اللہ کا وعدہ شدنی ہے اور یہ یقین نہ رکھنے والے تم کو بے وزن نہ بنانے پائیں۔ ۵۸-۶۰

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ ثُمَّ رَزَقَکُمْ ثُمَّ یُمِیْتُکُمْ ثُمَّ یُحْیِیْکُمْ ط ھَلْ مِنْ شُرَکَآئِکُمْ مَّنْ یَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِکُمْ مِّنْ شَیْءٍ ط سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۴۰)

قریش کو دھمکی

مجوسیوں کے وقتی غلبہ کو دلیل بنا کر قریش نے مسلمانوں کے غلبہ اور توحید و قیامت ہر چیز کو مشکوک بنانے کی جو مہم چلائی اس کی تردید پچھلے کی آیات میں تفصیل سے ہو چکی ہے۔ اب یہ قریش کو براہِ راست دھمکی دی جا رہی ہے کہ اس قسم کی طفل تسلیوں سے اپنے کو بہلانے کی کوشش نہ کرو بلکہ حقائق کا مواجہہ کرو۔ تم نے اپنے اعمال سے جو فساد اپنے چاروں طرف جمع کر لیا ہے اس کے نتائج کے ظہور کا وقت اب سر پر آ گیا ہے اور تمھارے یہ فرضی دیوی دیوتا اس سے تمھیں بچا نہ سکیں گے۔ یہ آیت اسی دھمکی کی تمہید ہے۔ فرمایا کہ تم کو پیدا تو خدا نے کیا، روزی وہ دیتا ہے، موت اس کے اختیار میں ہے پھر تم کو زندہ وہ کرے گا۔ تمام کاموں میں سے کسی ایک کام کے متعلق بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ تمھارے ان دیوتاؤں کے ہاتھوں انجام پاتا ہے یا وہ اس میں اللہ کا ہاتھ بٹاتے ہیں تو آخر ان کے بل پر تم کب تک جیو گے اور اگر تم خدا کی پکڑ میں آ گئے تو یہ تمھارے کیا کام آئیں گے!

'سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ'۔ اوپر کی بات تو ان کو خطاب کر کے فرمائی ہے اور یہ بات ان سے منہ پھیر کر فرمائی ہے۔ ان دونوں اسلوبوں کی بلاغت پر ہم مختلف مقامات میں گفتگو کر چکے ہیں۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۴۱)

جس طرح روز و شب اور صبح و شام وغیرہ کے الفاظ احاطہ پر دلیل ہوتے ہیں اسی طرح برّ و بحر کے الفاظ بھی اس طرح کے سیاق میں صرف احاطہ پر دلیل ہوتے ہیں۔ مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے پر خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، اعتقادی ہو یا عملی فساد طاری ہو چکا ہے۔ فکر و نظر کی صحت کا انحصار تمام تر اللہ تعالیٰ کے ایمان پر ہے اور عمل کی ساری استقامت اسلام پر مبنی ہے اور یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا بھی انہدام دوسرے کے انہدام کو مستلزم ہے اور جب یہ دونوں منہدم ہو جائیں تو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر فساد لازماً مستولی ہو کے رہے گا۔ اگر ان دونوں کے انہدام کے باوجود کہیں زندگی کی چمک دمک نظر آتی ہے تو وہ بالکل عارضی چیز ہے اور جو لوگ اس کو کچھ اہمیت دیتے ہیں وہ فریبِ نظر میں مبتلا ہیں۔

'لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ'۔ یہ نتیجہ بیان ہوا ہے اس صورتِ حال کا۔ ——— یعنی جب لوگ اپنے اعمال سے اس طرح زندگی کے ہر شعبہ کو فساد سے بھر دیتے ہیں تو وہ گویا زبانِ حال سے اللہ تعالیٰ کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ان کی کرتوتوں کا کچھ مزہ ان کو چکھائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اعمال کا کچھ مزا چکھاتا ہے اور مقصود اس سے ان کو متنبہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف رجوع کریں اور غلط روی سے باز آ کر زندگی کی صحیح شاہراہ کی طرف مڑیں۔

یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ رسولوں کی قوموں پر دو قسم کے عذاب آئے ہیں۔ اوّل تنبیہی پھر فیصلہ کن۔

یہاں قریش کو پہلے قسم کے عذاب سے ڈرایا ہے کہ تم نے اپنے اعمال سے اپنے آپ کو ایک تنبیہی عذاب کا مستحق بنا لیا ہے لیکن یاد رکھو کہ اگر وہ عذاب آگیا اور تم نے اپنی روش نہ بدلی تو پھر وہ عذاب بھی آ جائے گا جو تمھاری کمر توڑ کے رکھ دے گا۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلُ ۚ كَانَ أَكْثَرُهُم مُّشْرِكِينَ (۴۲)

یعنی ان لوگوں سے کہو کہ اپنے آپ کو طفل تسلیوں سے نہ بہلاؤ بلکہ خود اپنی آنکھوں سے اپنے ملک کی پچھلی قوموں کے آثار پر نگاہ ڈالو کہ ان کا انجام کیا ہو چکا ہے۔ ان کی اکثریت بھی تمھاری ہی طرح مشرک تھی۔ جس طرح تمھارے اندر سے موحد بہت تھوڑے نکلے ہیں اسی طرح ان کے اندر سے بھی خالص خدا پرست بہت تھوڑے نکلے۔ بالآخر اللہ نے ان تھوڑے سے خدا پرستوں کو علیحدہ کر لیا اور اکثریت کو اپنے عذاب سے تباہ کر دیا۔

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ الْقَيِّمِ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَهُ مِنَ اللَّهِ ۖ يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ (۴۳)

آنحضرت صلعم کی طرف التفات

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی طرف اس قسم کا التفات ہے جس قسم کا التفات اوپر آیت ۳۱ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ ہٹ دھرم اور شامت زدہ لوگ نہیں سنتے تو ان کی پروا نہ کرو بلکہ تم خدا کے سیدھے اور فطری دین کی طرف یکسو ہو جاؤ اور اس دن کی مسئولیت سے بچنے کی فکر کرو جس کا آنا قطعی ہے اور جب وہ دن خدا کی طرف سے ظہور میں آئے گا تو کسی کی طاقت نہیں ہوگی کہ اس کو لوٹا سکے۔ 'يَوْمَئِذٍ يَصَّدَّعُونَ' یعنی آج تو ان لوگوں کو اپنے شرکاء و شفعاء پر بھی اعتماد ہے اور اپنی جمعیت پر بھی ناز ہے لیکن اس دن سب منتشر ہو جائیں گے، کوئی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔ آیت ۱۴ میں لفظ 'يَتَفَرَّقُونَ' آیا ہے، یہاں 'يَصَّدَّعُونَ' ہے۔

مَن كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِأَنفُسِهِمْ يَمْهَدُونَ (۴۴)

اس دن ہر ایک اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔ جس نے کفر کیا ہوگا اس کے کفر کا وبال اسی پر آئے گا، کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا۔ اسی طرح جو لوگ عمل صالح کر رہے ہیں وہ درحقیقت اپنے ہی مستقبل کو سنوار رہے ہیں اور اس کا صلہ انھی کو ملنے والا ہے۔

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِن فَضْلِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (۴۵)

قیامت کا اصل مقصد

اس کا تعلق اوپر والی آیت 'مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ' سے ہے یعنی اس دن کے آنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان و عمل صالح والوں کو اپنے فضل سے صلہ دے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کا اصل مقصود اہل ایمان کو جزا دینا ہے، کفار کو سزا دینا اس کی اصل غایت نہیں بلکہ اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ 'مِن فَضْلِهِ'

کے لفظ سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اہلِ ایمان کو جو صلہ ملے گا وہ محض ان کے اعمال کے پیمانے سے تول کر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے مطابق ملے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کا فضل ایسی چیز ہے کہ اس کا اندازہ ہم اپنے پیمانوں اور قیاسوں سے نہیں کر سکتے۔

اہلِ کفر سے نفرت۔

اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ: اس ٹکڑے میں کفر و اہلِ کفر کے لیے جو نفرت و کراہت چھپی ہوئی ہے قلم اس کی تعبیر سے قاصر ہے۔ اہلِ ایمان کے درجے و مرتبے کا اندازہ کرنے کے لیے تو تنہا یہی بات کافی ہے کہ آخرت کا ظہور ہی تمام تر ان کی داد اور ان کے انعام کے لیے ہے۔ رہے اہلِ کفر تو یہاں اللہ تعالیٰ نے صرف یہ فرما کر ان کا ذکر ختم کر دیا کہ اللہ ان کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ ان کو پسند نہیں کرتا تو وہ جس جہنم میں بھی جا گریں خدا کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِیُذِیْقَکُمْ مِّنْ رَّحْمَتِہٖ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْکُ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ (۴۶)

اس آیت اور اس کے بعد کی آیات میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ جس طرح دیکھتے ہو کہ گھٹی ہوئی فضا کے اندر سے اللہ تعالیٰ سازگار ہوا چلا دیتا ہے جو تمہارے لیے اس کے بارانِ رحمت کی بشارت بن کر ظاہر ہوتی ہے تاکہ تم کو اپنے رزق و فضل سے نوازے اسی طرح موجودہ ناموافق حالات کے اندر سے بھی تمہارے لیے سازگار حالات پیدا کر دے گا۔ وَلِتَجْرِیَ الْفُلْکُ بِاَمْرِہٖ یعنی یہی سازگار ہوائیں ہیں جن کے ذریعے سے تمہاری کشتیاں بحکم خدا چلتی ہیں تاکہ تم ایک مقام سے دوسرے مقام کا سفر کر سکو۔ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِہٖ اور تاکہ تم تجارت وغیرہ کے ذریعے سے اس کے رزق و فضل کے طالب بن سکو۔ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ یعنی ربوبیت کا یہ سارا نظام اس نے اس لیے قائم فرمایا ہے تاکہ تم اس کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو اور اس کے شکر گزار رہو۔ اس میں مسلمانوں کے لیے نہایت لطیف انداز میں یہ تنبیہ بھی ہے کہ خدا کی نصرت و برکت تمہارے لیے ظاہر تو ہوگی لیکن اس کو پا کر اپنے رب سے غافل نہ ہو جانا بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ خدا کے برابر شکر گزار رہنا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِہِمْ فَجَآءُوْہُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا ط وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ (۴۷)

یہ اسی اوپر والی حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں واضح فرمایا ہے کہ تم دنیا میں پہلے رسول نہیں ہو بلکہ تم سے پہلے بھی ہم رسول بھیج چکے ہیں تو ہماری جو سنت ان کے معاملے میں ظاہر ہو چکی ہے وہی تمہارے معاملے میں بھی ظاہر ہوگی۔ تم سے پہلے جو رسول آئے وہ بھی تمہاری طرح اپنی قوموں کے پاس کھلی کھلی نشانیاں اور دلیلیں لے کر آئے لیکن ان کی قوموں نے ان نشانیوں اور حجتوں کی قدر کرنے کے بجائے مجرمانہ روش اختیار کی اور اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کی دشمن بن گئیں۔ بالآخر ان کی اس مجرمانہ روش کا نتیجہ یہ نکلا

کہ ہم نے ان سے ان جرائم کا انتقام لیا جن کی وہ اہلِ حق کے باب میں مجرم ہوئیں۔ اس لیے کہ اہلِ ایمان کی نصرت ہم پر حق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی معاملہ تمھارے دشمنوں کے ساتھ بھی ہوگا تم مطمئن رہو۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَاۤ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَ (۴۸-۴۹)

اوپر کی آیت میں نصرت کی جو بشارت اس قطعیت کے ساتھ دی گئی ہے وقت کے ظاہری حالات اس کے بالکل خلاف تھے اس وجہ سے مسلمانوں، بالخصوص عام مسلمانوں کو، اطمینان دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت و رحمت کے ظہور کی ایک ایسی نشانی کی طرف توجہ دلائی جس کا تجربہ و مشاہدہ ہر شخص کو ہوتا رہتا ہے۔ فرمایا کہ یہ اللہ ہی کی قدرت اور شان ہے کہ وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے جو بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر وہ ان بادلوں کو اپنی حکمت کے مطابق جس طرح چاہتا ہے فضا میں پھیلاتا اور ان کو تہ بہ تہ کرتا ہے۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ ان کے درمیان سے مینہ نکلتا ہے تو پھر جو خدا کی اس رحمت سے فیضیاب ہوتے ہیں وہ یکایک خوشیاں منانے لگتے ہیں حالانکہ اس سے ذرا پہلے وہ اس سے بالکل مایوس ہوتے ہیں ــــ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہی شانِ رحمت تمھارے لیے بھی ظاہر ہوگی۔ آج تمھیں یہ چیز بہت بعید نظر آتی ہے لیکن جب ظاہر ہوگی تو تمھیں یہ بہت قریب کی چیز معلوم ہوگی اور تم اس وقت خوش ہو جاؤ گے۔

'مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ' کے بعد پھر 'مِنْ قَبْلِهٖ' میں بظاہر کچھ تکرار سی محسوس ہوتی ہے لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تکرار نہیں ہے۔ بلکہ یہاں دو الگ الگ باتیں فرمائی گئی ہیں۔ یعنی بارش سے پہلے وہ بارش سے مایوس تھے اور بشارت کے ظہور سے پہلے خوشی سے۔

فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَیْفَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْیِ الْمَوْتٰى ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۵۰)

قیامت کا یہ ذکر مسلمانوں کی تسلی ہی کے ضمن میں ہے۔ اہلِ ایمان کی تمام امیدوں کا مرجع چونکہ آخرت ہی ہے اس وجہ سے اوپر کی آیات میں اس دنیا کے اندر ان کی کامیابی کے آثار کی طرف اشارہ کرنے کے بعد آخرت کی رحمت کے ظہور کی طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ جس طرح زمین میں اس کی رحمت کے آثار دیکھتے ہو کہ وہ اس کے خشک ہو جانے کے بعد اس کو دوبارہ باغ و بہار کر دیتا ہے اسی طرح وہ دوبارہ مردوں کو بھی زندہ کر دے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار آخرت کو جو جھٹلاتے اور اس کو محض تمھارا خواب و خیال قرار دیتے ہیں۔ تم ان کی لوالغفولیوں کی پروا نہ کرو۔ خدا کی یہ عظیم رحمت ظاہر ہو کے رہے گی اور تمھارے یہ حریف اس دن اپنی بدبختی و محرومی پر اپنے سر پیٹیں گے۔ یہ حقیقت قرآن سے واضح ہے کہ قیامت دراصل اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا مقتضیٰ ہے اور اس کا اصل مقصد اہلِ ایمان کو ان کی جانبازیوں کا

صلہ دینا ہے۔ سورۂ انعام کی آیت ۱۲ ’كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ‘ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں، اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَلَئِنْ اَرْسَلْنَا رِيْحًا فَرَاَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوْا مِنْ بَعْدِهٖ يَكْفُرُوْنَ (۵۱)

ایک استدراک

یہ اوپر کی آیات ۴۸-۴۹ پر استدراک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کا عام حال یہ ہے کہ ذرا دیر میں مایوس ذرا دیر میں مگن ہو جاتے ہیں۔ بارش میں ذرا توقف ہو جائے تو سب کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں، بارش ہو جائے تو ناچنے کودنے لگتے ہیں اور اگر بارش کے بعد ہم کوئی ناسازگار ہوا بھیج دیں اور وہ اپنی اُگی ہوئی فصلوں کا رنگ زرد پڑتے دیکھیں تو وہی ناشکری و مایوسی ان پر پھر چھا جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے متلوّن مزاج ہیں ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو، تمھاری باتیں صرف ان کے دلوں میں اتریں گی جو نعمت پر شکر اور مصیبت پر صبر کا مزاج رکھتے ہوں۔

لفظ ’ریاح‘ اور ’ریح‘ کے فرق پر ہم اس کے محل میں بحث کر چکے ہیں۔ مقدم الذکر کا غالب استعمال سازگار اور موسمی ہواؤں کے لیے اور مؤخر الذکر کا عام استعمال آفت لانے والی ہوا کے لیے ہوتا ہے۔ ’فَرَاَوْهُ‘ میں ضمیر کا مرجع ’زَرْع‘ یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ ہوگا جس کا قرینہ اوپر والی آیت میں موجود ہے اس لیے کہ ’يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا‘ کا مفہوم زمین کا سبزہ اور نباتات سے معمور ہو جانا ہے۔

فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۵۲-۵۳)

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایسے متلوّن مزاج اور بے ثبات ہیں کہ آن میں کچھ اور آن میں کچھ ہیں — ذرا میں مایوس اور ذرا میں مغرور ہوتے ہیں۔ خدا کی بے شمار نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی ان کے دل خدا پر نہیں جمتے، وہ روحانی و عقلی اعتبار سے زندہ نہیں بلکہ مردہ ہیں، سننے والے نہیں بلکہ بہرے ہیں، دیکھنے والے نہیں بلکہ اندھے ہیں۔ ایسے مردوں، بہروں اور اندھوں کو سنانا، سمجھانا نہ تمھارے بس میں ہے اور نہ اس کی تمھارے اوپر کوئی ذمہ داری ہے۔ ’وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ‘ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہروں سے بھی کچھ سننے سمجھنے کی توقع کی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ پکارنے والے کی طرف متوجہ ہوں لیکن ان بہروں سے کس خیر کی امید ہو سکتی ہے جو پیٹھ پھیر کر بھاگے جا رہے ہوں! ’وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِ الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ‘ میں ’عَنْ‘ اس بات پر دلیل ہے کہ لفظ ہدایت یہاں ’صرف‘ یا اس کے ہم معنی کسی لفظ پر متضمن ہے۔ یعنی تم اندھوں کو ان کی غلط روی سے موڑ کر راہِ راست پر نہیں لا سکتے۔

’اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا‘ یہاں آیات سے مراد آفاق و انفس کی وہ نشانیاں ہیں جن کی طرف پوری تفصیل کے ساتھ پیچھے توجہ دلائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری باتیں اگر کارگر ہو سکتی ہیں تو ان لوگوں پر کارگر ہو سکتی ہیں جو خدا کی قدرت، رحمت اور اس کے عدل کی ان نشانیوں کو مانتے ہوں جو آفاق میں پھیلی

ہو گئی ہیں، جو ان کو نہ مانتے ہوں ان کے آگے سارا وعظ بھینس کے آگے بین بجانے کے حکم میں داخل ہے۔

'فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ' یعنی جو لوگ آفاق و انفس کی نشانیوں کو دیکھتے سمجھتے اور مانتے ہیں وہ بے شک تمھاری بات سنیں سمجھیں گے اور تمھاری دعوت پر اپنے آپ کو اپنے رب کے حوالہ کر دیں گے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّ شَیْبَةً ؕ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۚ وَ هُوَ الْعَلِیْمُ الْقَدِیْرُ (۵۴)

ایک تنبیہ

اب یہ آخر میں تنبیہ ہے کہ کسی کو اپنی قوت و صلاحیت اور اپنے اسباب و وسائل پر ناز نہیں ہونا چاہیے۔ جو کچھ بھی انسان کو ملتا ہے سب خدا ہی کا دیا ہوا ملتا ہے اور پھر اسی کی طرف سب لوٹ جاتا ہے۔ تم اپنے وجود ہی پر غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نہایت ہی کمزور و ناتواں حالت میں تم کو وجود بخشتا ہے۔ پھر اس ناتوانی کے بعد جوانی کی توانائیاں اور صلاحیتیں عطا فرماتا ہے۔ اس کے بعد پھر بڑھاپے کی صورت میں اسی سابق ناتوانی کا دور عود کر آتا ہے۔ کسی کے امکان میں نہیں ہے کہ اپنی پائی ہوئی جوانی اور طاقت کو برابر قائم رکھ سکے۔ یہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے کہ وہ جو چاہے پیدا کرتا اور پیدا کر سکتا ہے۔ وہی ہر چیز کا علم اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ یُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ۬ مَا لَبِثُوْا غَیْرَ سَاعَةٍ ؕ كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ (۵۵)

یہ دوسری تنبیہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی کو بہت طویل نہیں خیال کرنا چاہیے۔ قیامت کے دن جب مجرم لوگ اٹھیں گے تو قسم کھا کے آپس میں کہیں گے کہ ہمارا یہ سارا زمانہ جو گزرا ہے ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر قیامت ہے بھی تو اس کے ظہور میں زندگی، موت، برزخ اور حشر و نشر کے بہت سے طول طویل مراحل حائل ہیں، ابھی سے اس کے لیے فکر مند ہونے اور اپنا عیش مکدر کرنے کی کیا ضرورت ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس دن یہ اٹھیں گے تو اس دن ان کا احساس یہ ہو گا کہ یہ سارے مراحل پلک جھپکتے گزر گئے۔

'كَذٰلِكَ كَانُوْا یُؤْفَكُوْنَ' یعنی ان نادانوں کو اصل حقائق کا اندازہ کرنے کی توفیق کبھی نہیں ہوتی۔ قیامت کے دن انھیں اپنا سارا ماضی پلک جھپکتے ختم ہوتا نظر آئے گا لیکن جب تک دنیا میں رہے ان کو زندگی، موت اور حشر و نشر کے مراحل اتنے طویل نظر آتے تھے کہ اس کے لیے انھوں نے فکر مند ہونے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِیْمَانَ لَقَدْ لَبِثْتُمْ فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِلٰی یَوْمِ الْبَعْثِ ؗ فَهٰذَا یَوْمُ الْبَعْثِ وَ لٰكِنَّكُمْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۵۶)

قیامت کے دن اہل علم کی طمانیت

'اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِیْمَانَ' سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی عقل اس دنیا میں سیدھی رہی اور ان کو اللہ کی آیات کا علم اور خدا اور آخرت کا ایمان نصیب ہوا۔ وہ ان لوگوں کی اس بدحواسی پر ٹوکیں گے کہ تمھارا یہ

اندازہ بالکل غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی رُو سے تو تم قیامت تک رہے ہو اور آج یہ قیامت کا دن تمہارے سامنے ہے لیکن تم اس کو جانتے نہیں رہے ہو۔ 'کِتٰبُ اللّٰہِ' سے مراد اللہ تعالیٰ کا وہ دفتر ہے جس میں ساری باتیں مندرج ہیں۔ 'وَلٰکِنَّکُمْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ' سے مقصود یہ ہے کہ تم اس کو محض ایک خیالی چیز سمجھتے رہے، اس کو تم نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اپنی زندگی کی قدر و قیمت پہچانتے اور اس کو آخرت کے نصب العین کے تحت گزارتے ہیں ان پر روزِ حشر میں کوئی بدحواسی نہیں طاری ہوگی بلکہ وہ یہ محسوس کریں گے کہ زندگی کا جو سفر انھوں نے شروع کیا تھا اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے پروگرام کے مطابق اس سفر کی آخری منزل پر وہ پہنچ گئے۔

فَیَوْمَئِذٍ لَّا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَعْذِرَتُهُمْ وَلَا هُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ (۵۷)

لفظ 'اِسْتِعْتَاب' پر دوسرے مقام میں بحث ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن کسی کو اس کی کوئی معذرت نفع نہیں دے گی اور نہ کسی کو یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے رب کو راضی کرنے کی کوشش کرے۔ ان چیزوں کے لیے جو مرتع مطلوب ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں دے دیا ہے۔ جس نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا اس کو یہ موقع پھر کبھی حاصل نہ ہو سکے گا جس کو تیاری کرنی ہو آج تیاری کر لے۔ پھر کسی کو یہ کہنے کا موقع ملنے والا نہیں ہے کہ اس کو تیاری کے لیے وقت نہیں ملا۔

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَلَىِٕنْ جِئْتَهُمْ بِاٰیَةٍ لَّیَقُوْلَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ (۵۸)

'ضربِ مثل' اصل میں تو کسی موعظت و حکمت کی بات کو تمثیل کی صورت میں پیش کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن یہ اپنے وسیع مفہوم میں مجرد موعظت و حکمت کی بات بیان کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ اس محاورے پر ہم دوسرے مقام میں بحث کر چکے ہیں۔

اب یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ جو باتیں بتانے اور سمجھانے کی ہیں وہ سب ہم نے اس قرآن میں بیان کر دی ہیں تو تم اس چیز کو ان کے آگے پیش کر دو۔ اور اس بات کو یاد رکھو کہ اگر وہ اس کتاب سے نہ سمجھے تو خواہ تم ان کو کتنا ہی بڑا معجزہ دکھا دو یہ کفر کرنے والے یہی کہیں گے کہ یہ بھی جھوٹ اور محض تمہاری شعبدہ بازی اور ساحری ہے۔

كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۵۹)

یعنی جو لوگ اپنے آپ کو سمع و بصر اور دل کی صلاحیتوں سے محروم کر لیتے ہیں اور کوئی معقول بات سننا سمجھنا نہیں چاہتے اللہ تعالیٰ اسی طرح ان کے دلوں پر مہر کر دیا کرتا ہے۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا یَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ (۶۰)

'استخفاف' کے معنی کسی کو ہلکا پھلکا اور معمولی سمجھ کر باتوں میں اڑا دینا اور اس کو بے وزن بنا دینا ہے۔

اب یہ آخر میں نہایت قطعی الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا کہ تم اپنے موقف پر جمے رہو۔ اللہ نے دنیا اور آخرت میں تمھاری نصرت اور فلاح کا جو وعدہ کیا ہے وہ پورا ہو کے رہے گا تو یہ لوگ جو اللہ کے وعدوں پر یقین نہیں رکھتے ہیں تمھارا مذاق اڑا کر تمہیں بے وزن بنانے کا موقع نہ پائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنی دعوت اور اپنے موقف پر جمے رہے تو یہ خود رسوا اور بے وزن ہوں گے۔ تمھارے قدم اکھاڑنے کی جو کوششیں یہ کر رہے ہیں یہ سب ناکام ہو جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

رحمان آباد
ہفتہ } ۲۲ر جون ۱۹۷۴ء

تدبرِ قرآن

۳۱

لقمٰن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

دونوں سابق سورتوں ـــــ العنکبوت اور الروم ـــــ کی طرح اس سورہ کا قرآنی نام بھی 'الٓمّٓ' ہی ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ ان کے عمود و مضمون میں فی الجملہ اشتراک ہے۔ اس سورہ کی تمہید سورۂ بقرہ کی تمہید سے ملتی جلتی ہوئی ہے اور بقرہ کا قرآنی نام بھی یہی ہے۔ بقرہ کی تمہید میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس قسم کے لوگ اس کتاب پر ایمان لائیں گے اور کس قسم کے لوگ اس سے اعراض کریں گے۔ اسی طرح اس سورہ کی تمہید میں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ کس قسم کے لوگ اس برکت و رحمت سے فائدہ اٹھائیں گے اور کون لوگ اس سے محروم رہیں گے۔

سابق سورہ میں یہ حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ یہ قرآن اس دین فطرت کی دعوت ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اور اس دعوے پر آفاق و انفس کے دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ اس سورہ میں آفاق و انفس کے دلائل کے ساتھ ساتھ عرب کے مشہور حکیم ـــ لقمان ـــ کے نصائح کا حوالہ دیا گیا ہے جس کا مقصود اہل عرب پر یہ واضح کرنا ہے کہ ان کے اندر جو صحیح فکر و دانش رکھنے والے لوگ گزرے ہیں انھوں نے بھی انہی باتوں کی تعلیم دی ہے جن باتوں کی تعلیم یہ پیغمبر دے رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عقل سلیم (COMMON SENSE) انہی باتوں کے حق میں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں، نہ کہ ان باتوں کے حق میں جن کی وکالت قرآن کے مخالفین کر رہے ہیں۔ یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اصل فطرت یہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ سوچنے سمجھنے والے لوگ ان حقائق تک کس طرح پہنچتے؟

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مغربی فلاسفہ جب اخلاقیات پر بحث کرتے ہیں تو اس کی بنیاد وہ عقل عام کے معروف اخلاقی مسلّمات (COMMON SENSE ETHICS) ہی پر رکھتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں بتا سکے کہ یہ اخلاقی مسلّمات کہاں سے پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک حکیم فاطر اور فطرۃ اللہ کو تسلیم کرنے سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ اس حقیقت سے گریز کی سزا ان کو اللہ تعالیٰ نے یہ دی کہ ان کا سارا فلسفۂ اخلاق بالکل بے بنیاد اور بے معنی ہو کے رہ گیا ہے۔ ان کی تمام فلسفیانہ کاوشیں نہ تو نیکی اور بدی کے امتیاز کے لیے کوئی کسوٹی معین کر سکیں اور نہ وہ یہ بتا سکے کہ کیوں انسان کو نیکی کرنی چاہیے اور کیوں بدی سے بچنا چاہیے۔ سود مندی، لذت، خوشی اور فرض برائے فرض وغیرہ کی قسم کے جتنے نظریات بھی انھوں نے ایجاد کیے سب باد در ہوا ثابت ہوئے اور خود انہی نے ان کے بخیے

ادھیڑ کے رکھ دیے۔ قرآن نے نہ صرف اخلاقیات کی بلکہ پورے دین کی بنیاد فطرت پر رکھی ہے اور یہ فطرت چونکہ ایک حکیم فاطر کی بنائی ہوئی ہے اس وجہ سے کسی کے لیے اس سے انحراف جائز نہیں ہے۔ جو شخص اپنی فطرت سے انحراف اختیار کرے گا وہ اپنے آپ کو تباہ اور اپنے فاطر کو ناراض کرے گا۔ انسان کی رہنمائی کے لیے اس کی فطرت اپنے اندر حقائق و معارف کا خزانہ رکھتی ہے لیکن انسان اپنے ماحول سے متاثر ہو کر بگڑ بھی سکتا ہے اور اپنے اختیار سے غلط فائدہ اٹھا کر اپنی فطرت کی خلاف ورزی بھی کر سکتا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے فطرت کے تمام مضمرات واضح کر دیے تاکہ کسی کے لیے کسی التباس واشتباہ کی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ بلکہ ہر شخص فطرت کی سیدھی راہ پر چل کر دنیا کی فوز و فلاح اور آخرت میں اپنے رب کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

اس سورہ میں لقمان کی حکمت کے حوالے سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، قرآن کی تائید میں ایک ایسے حکیم کی شہادت پیش کرنا ہے جس نے زندگی کے حقائق پر غور کیا تھا اور جو قرآن کے مخالفین کے نزدیک بھی نہایت ہی بلند پایہ اور واجب الاحترام حکیم سمجھا جاتا رہا ہے۔ ساتھ ہی اس میں قرآن کی دعوت کی تائید میں آفاق و انفس کے دلائل ایک نئے اسلوب سے پیش کیے گئے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ ــــ ۱۱) یہ کتاب ایک پُرحکمت کتاب ہے جو لوگوں کے لیے ہدایت و رحمت بن کر نازل ہوئی ہے لیکن اس کا فیض انہی لوگوں کو پہنچے گا جو اپنی فطرت کی صلاحیتیں زندہ رکھنے اور ان سے کام لینے والے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اس حکیمانہ کلام پر مخالفین کی مزخرف باتوں کو ترجیح دیتے اور اس سے متکبرانہ اعراض کر رہے ہیں تو وہ اپنے اس استکبار کی پاداش میں ذلت کے عذاب سے دوچار ہوں گے، عزت و سرفرازی صرف اس پر ایمان لانے والوں ہی کو حاصل ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ شدنی ہے اس لیے کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب خدا ہی کی مخلوق ہے، کسی اور کی اس میں کوئی حصہ داری نہیں ہے۔ جو لوگ مدعی ہیں کہ اس میں کسی اور کی بھی حصہ داری ہے وہ دکھائیں کہ ان کے معبودوں نے کیا پیدا کیا ہے۔

(۱۲ ــــ ۱۹) لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت کی ہے اس کا حوالہ، جس سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ اہلِ عرب جس کی حکمت پر فخر کرتے اور جس کی روایات ان کے لٹریچر میں موجود ہیں، اس نے بھی اپنے بیٹے کو انہی باتوں کی نصیحت کی تھی جن کی دعوت یہ حکیمانہ کتاب دے رہی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عقلِ سلیم اسی دعوت کے حق میں ہے۔ جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ درحقیقت عقلِ سلیم اور فطرتِ سلیم سے جنگ کر رہے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کے لیے خاص طور پر تنبیہ ہے جو اس دور میں، جیسا کہ سورۂ عنکبوت میں گزر چکا ہے، اپنے بیٹوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لیے ان پر ظلم کر رہے تھے۔ گویا قرآن نے یہ دکھایا ہے کہ لقمان اپنے بیٹے کو جن باتوں پر کاربند ہونے کے لیے اس دل سوزی سے نصیحت کرتے تھے آج انہی باتوں سے روکنے کے لیے باپوں کی طرف سے

بیٹوں پر ستم ڈھائے جا رہے ہیں۔

(۲۰-۲۴) تمہید کے مضمون کی تائید کہ جتنی ظاہری و باطنی نعمتیں انسان کو ملی ہوئی ہیں وہ ہیں تو سب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ، اور اس حقیقت سے کسی کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود بہت سے نادان لوگ اللہ کی توحید کے باب میں جھگڑ رہے ہیں حالانکہ نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے، نہ کسی حکیم یا کسی پیغمبر کی رہنمائی اور نہ کسی کتاب الٰہی کی روشنی اور جب ان کو اللہ کی کتاب کی پیروی کی دعوت دی جاتی ہے تو بڑے پندار کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم اپنے باپ دادا کے طریقے کی پیروی کرتے رہیں گے اگرچہ ان کے باپ دادا شیطان کی پیروی کرتے رہے ہوں۔ خدا کے ساتھ تعلق کی مضبوط رسی صرف ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو خدا کی اتاری ہوئی کتاب کی پیروی کریں اس لیے کہ بالآخر تمام امور کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ ایسے سرپھرے لوگوں کا غم کھانے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ایک دن ان لوگوں کا انجام ان کے سامنے رکھ دے گا۔

(۲۵ - ۳۰) مخالفین کی تردید میں خود ان کے اعتراضات کا حوالہ کہ یہ لوگ خود اپنے مسلّمات کے لوازم کو تسلیم کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ ان کو اعتراف ہے کہ تمام آسمان و زمین کا خالق اللہ ہی ہے تو جب وہی خالق ہے تو شکر اور عبادت کا حقدار اس کے سوا کوئی اور کس طرح ہو سکتا ہے؟ ہر چیز اسی کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ وہ ہر ایک سے بے نیاز ہے۔ وہ کسی کے ہاتھ بٹانے کا محتاج نہیں اور وہ خود ستودہ صفات ہے اس وجہ سے اس کی نظر عنایت کو متوجہ کرنے کے لیے کسی کی سفارش کی حاجت نہیں۔ اس کی قدرت و حکمت کی اتنی نشانیاں اس کائنات میں موجود ہیں کہ اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر، مزید سات سمندروں کے اضافے کے ساتھ، روشنائی بن جائیں جب بھی اس کی تمام نشانیوں کو قلم بند کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے تمام خلق کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ویسا ہی ہے جیسا ایک جان کو پیدا کر دینا۔ رات اور دن سب اسی کے حکم سے گردش کرتے ہیں اور وہ ہر چیز سے پوری طرح باخبر ہے۔ اگر اس کائنات کے نظام میں کسی اور کا بھی دخل ہوتا تو یہ درہم برہم ہو کے رہ جاتا۔

(۳۱ - ۳۴) کشتی کی تمثیل سے مخالفین کو تنبیہ کہ ذرا میں اترانے والے اور ذرا میں مایوس ہو جانے والے نہ بنو بلکہ نعمت میں شکر کرنے والے اور مصیبت میں صبر کرنے والے بنو۔ آج جو کچھ تمہیں حاصل ہے اس کا حق یہ ہے کہ اپنے رب کے شکر گزار بنو اور اس دن کو یاد رکھو جس دن نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آسکے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے۔ اس دن کا آنا ایک امر قطعی ہے۔ محض اس بنیاد پر اس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ آج تمہیں اس کے ظہور کا وقت نہیں معلوم ہے۔ زندگی کی کتنی حقیقتیں ہیں جن کے ظہور کا وقت کسی کو معلوم نہیں لیکن کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کرتا۔ حقیقی علیم و خبیر صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

سُوْرَةُ لُقْمٰنَ (۳۱)

مَكِّيَّةٌ ـــــــ اٰيَاتُهَا ۳۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ ﴿۲﴾ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۙ ﴿۳﴾ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ؕ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۶﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتُ النَّعِيْمِ ۙ ﴿۸﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۹﴾ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۰﴾ هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۱﴾

آیات ۱-۱۱

ع ۱ / ۱۰

ترجمہ آیات ۱-۱۱

یہ الٓمٓ ہے۔ یہ پُرحکمت کتاب کی آیات ہیں۔ ہدایت و رحمت بن کر نازل ہوئی ہیں خوب کاروں کے لیے۔ ان کے لیے جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یہی لوگ یقین رکھتے ہیں۔ یہی اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ ۱-۵

اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو فضولیات کو ترجیح دیتے ہیں تاکہ اللہ کی راہ سے گمراہ کریں بغیر کسی علم کے۔ اور ان آیات کا مذاق اڑائیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اور جب ان کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو اس طرح متکبرانہ اعراض کرتے ہیں گویا ان کو سنا ہی نہیں، گویا ان کے کانوں میں بہرا پن ہے تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو! البتہ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے نعمت کے باغ ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کا وعدہ پورا ہو کے رہے گا۔ اور وہ غالب و حکیم ہے۔ ۶-۹

اس نے بنایا آسمانوں کو بغیر ایسے ستونوں کے جو تمھیں نظر آئیں اور زمین میں پہاڑ گاڑ دیے کہ وہ تمھارے سمیت لڑھک نہ جائے اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے۔ اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا پس اس میں نوع بنوع فیض بخش چیزیں پیدا کیں۔ ۱۰

یہ ساری چیزیں تو اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ تو اب مجھے دکھاؤ کہ انھوں نے کیا چیزیں پیدا کی ہیں جو اس کے سوا ہیں! بلکہ یہ ظالم لوگ ایک صریح گمراہی میں مبتلا ہیں!! ۱۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓ (۱)

حروفِ مقطعات پر ایک جامع بحث سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ (۲-۳)

اس کتاب سے فائدہ وہی اٹھائیں گے جن کی صلاحیتیں زندہ ہیں

تِلْكَ کا اشارہ الٓمّٓ کی طرف ہے۔ اس سورہ کا قرآنی نام یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سورہ ایک پرحکمت کتاب کی آیات پر مشتمل ہے لیکن حکمت کے جواہر ریزوں کا قدردان ہر شخص نہیں ہوتا۔ ان کی قدر کرنے والے وہی لوگ ہوں گے جو 'محسن' ہوں گے۔ 'مُحْسِن' سے مراد وہ خوب کار لوگ ہیں جنھوں نے اپنے سوچنے سمجھنے کی قوتوں سے صحیح کام لیا، اپنی فطرت کی صلاحیتوں کو زندہ رکھا اور اپنی بصیرت کے حد تک جو قدم بھی اٹھایا صحیح سمت میں اٹھایا۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے یہ آیات ہدایت اور رحمت ہیں۔ وہ دنیا میں ان سے ہدایت حاصل کریں گے اور آخرت میں ان کے لیے یہ باعثِ فضل و رحمت ہوں گی۔ لفظ 'مُحْسِن' پر ہم پیچھے بھی اس کتاب میں بحث کر چکے ہیں اور آگے آیت ۲۲ میں بھی یہ آ رہا ہے۔ وہاں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ اس تمہید ہی سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جو لوگ اس کتاب کی ناقدری کر رہے ہیں ان کی یہ ناقدری اس کتاب کے بے قیمت ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ یہ ان ناقدروں کی فطرت کے مسخ ہونے کی دلیل ہے۔ اس وجہ سے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان لوگوں کے رویے سے بددل نہیں ہونا چاہیے۔

الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (۴)

'محسنین' کی صفات

یہ 'مُحْسِنِيْن' کی صفات بیان ہوئی ہیں اور ان کے پردے میں وہ لوگ نگاہوں کے سامنے کر دیے گئے ہیں جو اس وقت اس لفظ کے صحیح مصداق تھے۔ فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھنے والے ہیں۔

'وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ' میں ان اہل ایمان کی غایت درجہ تحسین ہے۔ یعنی درحقیقت یہی لوگ ہیں جو آخرت پر پکا یقین رکھنے والے ہیں۔ اسی یقین کا یہ ثمرہ ہے کہ ان کو نماز اور زکوٰۃ کے اہتمام کی توفیق حاصل ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ نماز اور زکوٰۃ سے غافل ہیں وہ درحقیقت آخرت کے یقین سے محروم ہیں اور اگر وہ اس کے مدعی ہیں تو وہ اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۵)

فرمایا کہ یہی لوگ اس دنیا میں اپنے رب کی صراطِ مستقیم پر ہیں اور یہی لوگ آخرت میں فلاح پانے والے بنیں گے۔ باقی سارے لوگ گمراہی پر ہیں اور وہ آخرت میں جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا

هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ۔(۶)

لَهْوَ الْحَدِيْثِ کا مفہوم

'اِشْتِرَاء' کے معنی، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، ترجیح دینے کے بھی آتے ہیں۔ 'لَهْوَ الْحَدِيْثِ' اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح دوسرے مقام میں 'زخرف القول' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ یہاں یہ لفظ کتاب حکیم کی آیات کے مقابل میں استعمال ہوا ہے۔ اس وجہ سے اس سے مراد وہ گمراہ کن باتیں ہیں جو وقت کے مفسدین لوگوں کو آیات الٰہی سے برگشتہ کرنے کے لیے پھیلاتے تھے۔ قرآن لوگوں کو زندگی کے اصل حقائق کے سامنے کھڑا کرنا چاہتا تھا لیکن مخالفین کی کوشش یہ تھی کہ لوگ انہی مزخرفات میں پھنسے رہیں جن میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہاں اسی صورت حال کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور اسلوب بیان اظہار تعجب کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو لوگوں کی ہدایت کے لیے ایک پر حکمت کتاب اتاری ہے لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان میں بہتیرے اس کے مقابل میں انہی فضول باتوں کو ترجیح دیتے ہیں جو ان کی خواہشوں اور بدعتوں کے لیے سند تصدیق فراہم کرتی ہیں۔

'لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا'۔ 'عِلْمٌ' سے مراد دلیل و برہان ہے۔ آگے آیت ۲۰ میں بھی یہ لفظ آ رہا ہے۔ وہاں اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ مفسدین کی یہ تمام سعئ نامراد اس لیے ہے کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں حالانکہ اللہ کی راہ چھوڑ کر جس راہ پر وہ چل رہے ہیں اور جس پر لوگوں کو بھی چلانا چاہتے ہیں اس کے حق میں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے لیکن اس کے باوجود جسارت کا یہ عالم ہے کہ اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے اور اپنی بے سروپا باتوں کی تائید میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے ہیں۔

'اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ'۔ اوپر اہل ایمان کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہی لوگ ہدایت پر ہیں اور وہی لوگ فلاح پانے والے بنیں گے؛ اس کے مقابل میں یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو قرآن کی آیات حکمت کے مقابل میں اپنی خرافات بدعت و ضلالت کو پھیلانے میں سرگرم تھے۔ فرمایا کہ ان کے لیے ایک نہایت سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔ 'ذلیل کرنے والا عذاب' اس وجہ سے ہوگا کہ حق کے مقابل میں اپنی بات کی پچ استکبار ہے اور استکبار کی سزا اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلت و رسوائی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عذاب اور عذاب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ یوں تو ہر عذاب عذاب ہے، اللہ تعالیٰ اس سے امان میں رکھے، لیکن سب سے زیادہ سخت وہ عذاب ہے جو رسوا کر دینے والا ہو۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا وَلّٰى مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا كَاَنَّ فِيْٓ اُذُنَيْهِ وَقْرًا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۷)

استکبار کی سزا

یہ ان لوگوں کے اس استکبار کی تصویر ہے جس کے سبب سے یہ ذلت کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ فرمایا کہ ان کا حال یہ ہے کہ جب ان کو ہماری آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ نہایت غرور کے ساتھ اس طرح پیٹھ پھیر

کر چل دیتے ہیں گویا انھوں نے ان کو سرے سے سنا ہی نہیں، گویا ان کے دونوں کان بہرے ہیں۔ یعنی یہ ہماری آیات کو یک قلم ناقابلِ التفات سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر ان کا پندار اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ ہماری باتیں ان کے لیے لائقِ توجہ ہی نہیں رہ گئی ہیں تو پھر ہماری طرف سے ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر معاملہ محض غفلت کا ہو تو اس کی اصلاح تذکیر و تنبیہ سے ہو سکتی ہے لیکن جب تذکیر و تنبیہ کے جواب میں رعونت و استکبار کا مظاہرہ ہونے لگے تو یہ مرض لاعلاج ہے۔ اس طرح کے لوگ دوزخ ہی کا ایندھن بننے والے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمۡ جَنّٰتُ النَّعِیۡمِ ۙ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَا ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ (۸-۹)

قرآن کا مذاق اڑانے والوں کو جواب

یہ ان کے مقابل میں ان لوگوں کا صلہ بیان ہوا ہے جو اللہ کی آیات پر ایمان لانے والے اور ان کے مطابق اپنی زندگیوں کو بنانے اور سنوارنے والے ہیں۔ فرمایا کہ ان کے لیے نعمت کے باغ ہوں گے جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ 'وَعۡدَ اللّٰهِ حَقًّا' یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا حتمی وعدہ ہے جو پورا ہو کے رہے گا۔ اس جملے میں تاکید در تاکید کا جو مضمون مضمر ہے اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس تاکید کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ اوپر آیت ۶ میں ذکر ہو چکا ہے کہ متکبرین اللہ کی آیات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے استہزا کا خاص ہدف وہ آیتیں تھیں جن میں اس دور کے بے بس اور غریب مسلمانوں کو ایک ابدی بادشاہی کی خوش خبری سنائی جاتی تھی۔ معاملے کا یہ پہلو مقتضی ہوا کہ یہ بات یہاں پورے زور اور تاکید سے کہی جائے کہ مذاق اڑانے والے اگر اس کا مذاق اڑاتے ہیں تو اڑائیں لیکن اہلِ ایمان اطمینان رکھیں کہ اللہ کا یہ وعدہ پورا ہو کے رہے گا۔

وعدۂ قیامت کی قطعیت پر صفاتِ الٰہی سے استدلال

'وَهُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ' یہ اسی وعدے کے حتمی ہونے پر اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات سے دلیل پیش کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر مستکبروں اور ظالموں کو سزا اور اہل ایمان و عمل صالح والوں کو جزا نہ دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نہ وہ عزیز ہے نہ حکیم ہے بلکہ العیاذ باللہ وہ ایک بالکل عاجز و بے بس ہستی ہے جس نے بالکل بے غایت و بے حکمت یہ دنیا بنا ڈالی۔ حالانکہ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ خدا نہ صرف عزیز و حکیم ہے بلکہ حقیقی عزیز و حکیم وہی ہے۔ اس طرز استدلال کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ یہاں اشارے پر اکتفا فرمایئے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا وَاَلۡقٰی فِی الۡاَرۡضِ رَوَاسِیَ اَنۡ تَمِیۡدَ بِکُمۡ وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ ؕ وَاَنۡزَلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنۡۢبَتۡنَا فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ (۱۰)

یہ اس کائنات کے ان دلائل و شواہد کی طرف توجہ دلائی ہے جن پر ایک نظر ڈال کر ایک متوسط درجہ کی عقل کا آدمی بھی، یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ اس کائنات کا خالق عزیز یعنی ہر چیز پر غالب و مقتدر

بھی ہے اور اس کے ہر کام میں اس کی قدرت کے ساتھ اس کی بے پایاں حکمت بھی نمایاں ہے۔ فرمایا کہ یہ اسی کی قدرت و حکمت ہے کہ اس نے آسمانوں کی یہ عظیم چھت ایسے ستونوں کے بغیر ہی کھڑی کر دی جو تمہیں نظر آئیں اور ساتھ ہی زمین میں پہاڑ لنگر انداز کر دیے کہ یہ کہیں تمہارے ساتھ لڑھک نہ جائے۔ پھر اس چھت کے نیچے اور اس زمین کے اوپر بے شمار قسم کے جاندار پھیلا دیے اور ان کی پرورش کے لیے آسمان سے پانی برسایا اور اس پانی سے ہر قسم کی فیض بخش چیزیں اگائیں۔

'بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا' میں 'تَرَوۡنَہَا' 'عَمَدٍ' کی صفت ہے۔ یعنی یہ عظیم چھت اس کے عظیم خالق نے کھڑی تو کی ہے ستونوں پر لیکن یہ اس کی قدرت، حکمت اور کاریگری کا اعجاز ہے کہ یہ ستون کسی کو نظر نہیں آتے۔ اس نے اس کائنات کے اجزائے مختلفہ کو جذب و کشش کے ایسے قوانین کے ساتھ باندھ رکھا ہے جو صرف اسی کو نظر آتے ہیں۔

'زَوۡجٍ کَرِیۡمٍ' میں لفظ 'کَرِیۡمٍ' کا صحیح لغوی مفہوم فیض بخش ہے۔ یہ خدا کی قدرت کے ساتھ ساتھ اس کی رحمت و ربوبیت کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے یہ عظیم محل اور یہ قصر بے ستون تعمیر کر کے اس کے مکینوں کی پرورش کے لیے اپنی گوناگوں نعمتوں کے انبار بھی لگا دیے۔

ہٰذَا خَلۡقُ اللّٰہِ فَاَرُوۡنِیۡ مَاذَا خَلَقَ الَّذِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہٖ ؕ بَلِ الظّٰلِمُوۡنَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (۱۱)

خدا کے شریک ٹھہرانے والوں سے ایک سوال

مطلب یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں تو اللہ کی بنائی ہوئی ہیں اور تم کو بھی یہ اعتراف ہے کہ یہ اللہ کی بنائی ہوئی ہیں تو اب بتاؤ کہ تم اس کے سوا دوسری چیزوں کو جو پوجتے ہو تو انھوں نے کیا پیدا کیا ہے اور ان کا کیا کارنامہ ہے کہ تم نے خدا کی خدائی اور اس کے حقوق میں ان کو بھی شریک بنا دیا ہے!!

'بَلِ الظّٰلِمُوۡنَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ' یہ ان سے منہ پھیر کر ان کے حال پر اظہار افسوس فرمایا ہے کہ ان ظالموں کے پاس اس حرکت کے جواز کی کوئی دلیل تو ہے نہیں جسے وہ پیش کر سکیں بلکہ ایک کھلی ہوئی گمراہی ہے جس میں وہ پڑے ہوئے ہیں۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۲-۱۹

آگے لقمان کی حکمت اور ان کی ان حکیمانہ نصیحتوں کا حوالہ ہے جو انھوں نے اپنے سعادتمند فرزند کو فرمائی ہیں اور ان کے حوالہ سے مقصود، جیسا کہ ہم نے پیچھے اشارہ کیا، اہل عرب کے سامنے خود ان کے حکماء اور ان کی حکمت کو پیش کر کے یہ دکھانا ہے کہ تمہارے اندر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی حکمت و معرفت میں سے کچھ حصہ ملا انھوں نے بھی اپنے متعلقین کو انہی باتوں کی تعلیم دی جن کی تعلیم تم کو یہ پر حکمت کتاب دے رہی ہے لیکن یہ تمہاری بدبختی و محرومی ہے کہ تم اپنے آباؤ اجداد کی اندھی تقلید پر تو بہت نازاں ہو جنھوں نے بے سوچے سمجھے شیطان کی پیروی کی لیکن اپنے ان اسلاف کی حکمت سے تم نے کوئی فائدہ

نہیں اٹھایا جنھوں نے زندگی کے حقائق پر سنجیدگی سے غور کیا اور اپنے قول و عمل سے اپنے بعد والوں کے لیے نہایت پاکیزہ روایات چھوڑیں۔ اس بے خردی کا نتیجہ تمھارے سامنے یہ آیا کہ جن باتوں کی لقمان اپنے فرزند کو نہایت دردمندی کے ساتھ تعلیم دیتے تھے انہی باتوں سے آج تم اپنی اولاد کو روکنے کے لیے نہایت ظالمانہ سزائیں دیتے ہو۔

لقمان کی شخصیت

یہ لقمان کون تھے؟ بعض لوگوں نے ان کو حبشی النسل قرار دیا ہے لیکن یہ بات ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ محمد بن اسحاق نے ان کا نسب سیدنا ابراہیمؑ سے ملایا ہے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ شعرائے جاہلیت میں سے طرفہ بن عبد اور سلمٰی بن ربیعہ نے اپنے شعروں میں ان کا اور ان کے قبیلہ کا ذکر کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یمن میں ان کو اور ان کی قوم کو بڑی شان و شوکت حاصل تھی اور یہ قوم عاد کے بقایا میں سے تھے۔

بعض لوگوں نے ان کو نبی قرار دیا ہے لیکن مذہب جمہور یہ ہے کہ یہ نبی نہیں بلکہ ایک حکیم تھے۔ عرب کے لٹریچر سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے اور قرآن نے بھی ان کا ذکر ایک حکیم ہی کی حیثیت سے کیا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بعض شعراء نے اپنے شعروں میں ان کی اس نصیحت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس کا حوالہ قرآن نے دیا ہے لیکن دم تحریر میرے پاس حوالہ کی کتابیں نہیں ہیں اس وجہ سے میں اس باب میں کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔

بعض مورخین نے ان کو بادشاہ مانا ہے۔ بادشاہ نہ سہی لیکن ان کو سرداری کا منصب ضرور حاصل تھا۔ شعرائے جاہلیت نے جس انداز سے ان کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو یمن میں اپنے قبیلہ پر ایک پدرانہ قسم کی سرداری حاصل تھی۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو جو نصیحتیں فرمائی ہیں، ان سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ نصیحتیں اس کو سرداری کی ذمہ داریاں سونپتے وقت کی ہیں۔ آگے اس کی وضاحت آئے گی ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۲-۱۹

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰي وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ

رقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿١٤﴾ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓي اَنْ تُشْرِكَ بِيْ
مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا
مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿١٥﴾ يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ
فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ﴿١٦﴾ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ
وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰي مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ
الْاُمُوْرِ ﴿١٧﴾ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ
اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ﴿١٨﴾ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ
وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ﴿١٩﴾ ع ٢/٨ ١١

ترجمہ آیات ١٢ - ١٩

اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا فرمائی کہ اللہ کے شکر گزار رہو اور جو شکر گزار رہے گا
تو اپنے ہی لیے رہے گا۔ اور جو ناشکری کرے گا تو اللہ بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ ١٢

اور یاد کرو جب کہ لقمان نے اپنے بیٹے سے اس کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ
اے میرے بیٹے! اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیو۔ بے شک شرک ایک بہت بڑا ظلم ہے۔ ١٣

اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دُکھ پر
دُکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑانا ہوا۔ کہ میرے شکر گزار
رہو اور اپنے والدین کے۔ میری ہی طرف بالآخر لوٹنا ہے۔ اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو
کسی چیز کو میرا شریک ٹھہرا جس کے باب میں تیرے پاس کوئی دلیل نہیں تو ان کی بات نہ

مانیو اور دنیا میں ان کے ساتھ نیک سلوک رکھیو۔ اور پیروی ان کے طریقہ کی کیجیو جو میری طرف متوجہ ہیں۔ پھر میری ہی طرف تمھارا لوٹنا ہے اور میں جو کچھ تم کرتے رہے ہو اس سے تم کو آگاہ کروں گا۔ ۱۴-۱۵

اے میرے بیٹے! کوئی عمل اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو خواہ وہ کسی گھاٹی میں ہو یا آسمانوں یا زمین میں ہو اللہ اس کو حاضر کر دے گا۔ بے شک اللہ نہایت ہی باریک بیں اور باخبر ہے۔ ۱۶

اے میرے بیٹے! نماز کا اہتمام رکھو، نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور جو مصیبت تمھیں پہنچے اس پر صبر کرو۔ بے شک یہ باتیں عزیمت کے کاموں میں سے ہیں۔ ۱۷

اور لوگوں سے بے رُخی نہ کر اور زمین میں اکڑ کر نہ چل، اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ، بے شک سب سے زیادہ مکروہ آواز گدھے کی آواز ہے۔ ۱۸-۱۹

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ (۱۲)

حکمت کا اوّلین ثمر

حکمت کا اوّلین ثمر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے۔ اللہ اپنے جس بندے کو اس دولت سے بہرہ مند کرتا ہے اس کا اوّلین اثر جو اس پر مترتب ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن جاتا ہے اور یہی شکر تمام حقوق اللہ اور تمام حقوق العباد کی معرفت کی بنیاد ہے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں ہم اس پر مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔ حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور ذوالقرنین کے واقعات کے سلسلہ میں بھی اس حقیقت کی طرف مفید اشارات گزر چکے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کے صاحبِ حکمت اور حکیم ہونے کی اوّلین شناخت یہ ہے کہ اس کے اندر اپنے رب کی شکر گزاری ہو۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو وہ بالکل کھوکھلا ہے اگرچہ وہ علم و فلسفہ کا کتنا ہی بڑا ماہر اور امام کیوں نہ سمجھا جاتا ہو۔

ایک شبہ کا ازالہ

وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۔ یہ برسر موقع ایک دفع دخل مقدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ گمان کرے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں سے اپنی شکر گزاری کا جو مطالبہ کیا ہے یا اس کو جو اس نے پسند فرمایا ہے تو اس میں اس کا کوئی نفع ہے بلکہ اس کو اس نے بندوں ہی کے نفع کے لیے پسند فرمایا ہے۔ جو شخص خدا کا شکر گزار رہتا ہے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے لیے اللہ کی نعمتوں کو بڑھاتا ہے۔ رہا اللہ کا معاملہ تو وہ ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ نہ کسی کی شکر گزاری سے اس کو کوئی نفع پہنچتا اور نہ کسی کی ناشکری سے کوئی نقصان۔ ساتھ ہی وہ حمید بھی ہے یعنی تمام اعلیٰ صفات سے متصف اور یہ تمام صفات اس کی ذاتی ہیں۔ نہ ان میں کوئی اضافہ کر سکتا، نہ کمی۔ اس کی اس صفت ہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خواہ کوئی اس کے احسانات کی قدر کرے یا ناقدری لیکن اس دنیا میں اپنے رزق و فضل سے وہ کسی کو بھی محروم نہیں کرتا۔ آگے آیت ۲۶ میں بھی انہی صفات کا حوالہ آ رہا ہے، وہاں مزید وضاحت ہو جائے گی۔

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (۱۳)

شکر کی اصل روح

جس طرح حکمت کا اولین ثمر اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری ہے اسی طرح شکر کی اصل روح شرک سے اجتناب ہے۔ بندے کو تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی سے ملتی ہیں اس وجہ سے جس طرح اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے اسی طرح یہ بھی واجب ہے کہ وہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو دوسروں کی طرف نہ منسوب کرے۔ دوسروں سے اگر بندے کو کوئی نفع پہنچتا ہے تو وہ اللہ ہی کے حکم سے پہنچتا ہے اس وجہ سے شکر کا اصل سزاوار اللہ ہی ہے۔ دوسروں کا حق اللہ تعالیٰ کے حق کے تحت ہے۔ اللہ کا حق سب سے بڑا ہے اگر کوئی شخص خدا کے حق میں دوسروں کو شریک کرتا ہے تو وہ سب سے بڑے حق کو تلف کرنے والا بنتا ہے جو ایک ظلم عظیم ہے۔

موقع اور بات دونوں کی اہمیت کی طرف اشارہ

یہاں یہ امر بھی توجہ کے لائق ہے کہ لقمان نے یہ باتیں اس وقت کہی ہیں جب وہ بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے۔ اس سے موقع اور بات دونوں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی سرسری بات نہیں ہے جو راہ چلتے کہہ دی گئی ہو بلکہ لقمان نے خاص اپنے بیٹے کو، ایک اہم موقع پر، خاص اہتمام کے ساتھ، بطور ایک موعظت کے بتائیں اور ان پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے کی تاکید کی۔ اس سے مقصود قرآن کے مخاطبوں کو توجہ دلانا ہے کہ ایک دانش مند باپ اپنے بیٹے کو کیا تعلیم دیتا تھا اور آج اس کے احمق نام لیوا اپنی اولاد کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہیں!

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰي وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۭ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ؀ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓي اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ

فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۴-۱۵)

دو آیتیں بطور تضمین

یہ دو آیتیں لقمان کی موعظت کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور تضمین ہیں۔ لقمان نے بیٹے کو خدا کی شکرگزاری کا حق ادا کرنے کی تاکید تو فرمائی لیکن اللہ تعالیٰ جل شانہ کے حق کے پہلو بہ پہلو اپنے حق کا ذکر انھوں نے ادب کے خلاف تصور فرمایا اس وجہ سے اس کو نظر انداز کرکے قیامت کے ذکر کی طرف بڑھ گئے۔ یہ بات انھوں نے ادباً کی اور ان کی تواضع کے شایانِ شان بات یہی تھی لیکن خدا کے حق کے بعد فطرت کی تربیت میں سب سے بڑا حق والدین کا ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے لقمان کے اس چھوڑے ہوئے خلا کو اپنی طرف سے بھر دیا۔ فرمایا کہ ہم نے انسان کو اس کے والدین کے باب میں ہدایت کی۔ اس ہدایت کا ذکر عنکبوت آیت ۸ میں بھی گزر چکا ہے اور سورۂ بنی اسرائیل میں بھی۔ وہاں ہم نے واضح کیا ہے کہ خدا کے حق کے بعد والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم تمام انبیائے کرام اور تمام آسمانی صحیفوں نے بالاتفاق دی ہے۔ یہاں اس ہدایت کی تفصیل آگے والے ٹکڑے سے ہو گئی ہے کہ اَنِ اشْكُرْلِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (کہ میرا شکرگزار رہ اور اپنے ماں باپ کا) یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی شکرگزاری کے ساتھ انسان کو اس کے والدین کی شکرگزاری کی ہدایت فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اوپر خدا کے بعد سب سے بڑا حق اس کے والدین کا ہے اس لیے کہ وہی اس کے وجود میں آنے اور پرورش پانے کا ذریعہ بنتے ہیں، والدین سے بڑا کسی کا حق بھی نہیں ہے لیکن یہ حق شکرگزاری اور خدمت کا ہے نہ کہ عبادت کا۔ شکر کا مفہوم اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ اس کی اصل حقیقت ایفائے حق ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو مجرد زبان سے شکر ایک بالکل بے حقیقت چیز ہے۔

خدا کے خلاف والدین کی اطاعت جائز نہیں ہے

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا۔ یعنی اگر والدین اس بات کے لیے اولاد پر دباؤ ڈالیں کہ وہ کسی چیز کو بے دلیل خدا کا شریک بنائے تو یہ حق ان کو حاصل نہیں ہے، اولاد کا فرض ہے کہ اس معاملے میں ان کی اطاعت سے صاف انکار کر دے۔ شرک کے بے دلیل ہونے پر اس کتاب میں ہم جگہ جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہ اس کی مستقل صفت ہے اس لیے کہ اب تک شرک کی تائید میں اس کے حامی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکے، جب کہ خدا کا حال یہ ہے کہ ہر مشرک اس کو لازماً تسلیم کرتا ہے۔ وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا یعنی اگر والدین شرک اختیار کرنے کے لیے زور لگائیں تو اس معاملے میں تو ان کی اطاعت نہ کی جائے لیکن جہاں تک دنیا کا معاملہ ہے اس کے اندر ان کے ساتھ حسنِ سلوک دستور کے مطابق باقی رکھا جائے۔ ان کی ضروریات حتی الامکان پوری کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان کی ہدایت کے لیے برابر دعا بھی کی جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت تک اپنے باپ کے لیے دُعا جاری رکھی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اس سے روک نہیں دیا گیا۔ کافر والدین سے بیٹے کے لیے کلی انقطاع صرف اس شکل میں صحیح ہے جب

مسلم معاشرہ جماعتی حیثیت سے ان سے اور ان کی قوم سے براءت کا اعلان کرے۔ اس کی وضاحت سورۂ براءت میں ہو چکی ہے۔

ماں کا حق باپ کے حق سے زیادہ ہے

یہاں ایک چیز یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جہاں تک شکرگزاری اور خدمت کا تعلق ہے اس کی ہدایت تو باپ اور ماں دونوں کے لیے فرمائی ہے لیکن قربانیاں اور جانفشانیاں صرف ماں کی گنائی ہیں، باپ کی کسی قربانی کا حوالہ نہیں دیا ہے۔ فرمایا ہے 'حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ' (اس کی ماں نے اس کو اٹھایا دکھ کے بعد دکھ جھیل کر اور پھر اس کا دودھ چھڑانا ہوا دو سالوں کے اندر)۔ یہاں حمل، ولادت اور رضاعت تینوں مراحل کی طرف اشارہ ہے (اگرچہ ولادت کا ذکر غایت وضاحت کے سبب سے محذوف ہے) اور ان تینوں ہی کا تعلق ماں سے ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ماں کا حق باپ کے مقابل میں زیادہ ہے۔ اسی پر وہ حدیث مبنی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کا حق باپ کے مقابل میں تین درجہ زیادہ قرار دیا ہے۔

'اِلَیَّ الْمَصِیْرُ' میں تنبیہ ہے کہ یہ بات ہر شخص کو یاد رکھنی چاہیے کہ بالآخر سب کو میری ہی طرف پلٹنا ہے۔ اگر کسی نے میری شکرگزاری اور والدین کے حق میں کوتاہی کی تو وہ میری بازپرس سے نہیں چھوٹ سکتا۔

'وَّاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ'۔ شرک کے معاملے میں والدین کی اطاعت نہ کرنے کی ہدایت کے ساتھ یہ اولاد کو تاکید مزید ہے کہ اسے بہرحال انہی لوگوں کے طریقے کی پیروی کرنی ہے جو خدا کی طرف متوجہ ہیں، ان لوگوں کی راہ نہیں اختیار کرنی چاہیے جو خدا سے منحرف ہیں اگرچہ وہ اس کے والدین ہی کیوں نہ ہوں۔ سورۂ عنکبوت میں والدین کا قول نقل ہو چکا ہے کہ وہ اپنی اولاد اور اپنے زیردستوں سے کہتے ہیں کہ 'اتَّبِعُوْا سَبِیْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰیٰكُمْ' - ۱۲ (تم ہمارے طریقے کی پیروی کرتے رہو، ہم تمہاری غلطیوں کا بوجھ اٹھانے کے ذمہ دار ہیں) یہاں اسی قول پر تعریض کرتے ہوئے فرمایا کہ جو بھی خدا کے خلاف کسی راستہ کی پیروی کی دعوت دے اس کی پیروی جائز نہیں ہے۔ پیروی صرف ان لوگوں کی کرنی ہے جو خدا کی راہ پر ہیں۔

'ثُمَّ اِلَیَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ'۔ یہ خطاب والدین اور اولاد دونوں سے یکساں ہے اور اس میں تنبیہ بھی ہے اور اطمینان دہانی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ ایک دن سب کی واپسی میری ہی طرف ہونی ہے اور اس دن جو کچھ جس نے کیا ہوگا میں اس کے سامنے رکھ دوں گا۔ اگر کسی کے والدین نے میرے بخشے ہوئے حق سے غلط فائدہ اٹھا کر اولاد کو مجھ سے منحرف کرنے کی کوشش کی تو وہ اس کی سزا بھگتیں گے اور اگر اولاد نے والدین کے حق کے ساتھ ساتھ میرے حق کو بھی کماحقہٗ پہچانا اور اس حق پر قائم رہنے میں استقامت دکھائی تو وہ اپنی اس عزیمت کا بھرپور صلہ پائے گی۔

يٰبُنَيَّ إِنَّهَآ إِن تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُن فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمٰوٰتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللّٰهُ ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ (۱۶)

لقمان کی موعظت قیامت کے باب میں

تضمین کی آیات کے بعد لقمان کی موعظت پھر شروع ہو گئی۔ اوپر لقمان نے بیٹے کو شرک سے اجتناب اور توحید کی تعلیم دی ہے اور یہ بات اپنے محل میں واضح ہو چکی ہے کہ اسی عقیدے پر تمام عقائد کی بنیاد ہے۔ توحید کے بعد دوسرا بنیادی عقیدہ آخرت کا عقیدہ ہے۔ اس آیت میں آخرت سے متعلق ان کی موعظت کا حوالہ ہے۔ فرمایا کہ اے بیٹے! اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی نیک یا بد عمل کسی کا ہو گا تو خواہ وہ کسی پہاڑی یا گھاٹی کے اندر ہو یا لامتناہی بانا پیدا کنار فضاؤں اور آسمانوں میں ہو یا زمین کی تہوں میں ہو، جہاں کہیں بھی ہو گا، خدا قیامت کے دن اس کو حاضر کر دے گا، اس لیے کہ اللہ نہایت باریک بین اور نہایت باخبر ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم سے ناآشنائی ہی ہے جس کے سبب سے قوموں کو توحید کے معاملے میں مغالطہ پیش آیا اور وہ شرک میں مبتلا ہوئیں اور یہی چیز آخرت کے باب میں بھی بہت سی گمراہیوں کا سبب ہوئی۔ اس وجہ سے لقمان نے اس حکمت کی یاددہانی کی جو توحید اور قیامت دونوں کے باب میں ان کے فرزند کے ذہن کو بالکل صاف کر دے۔

'اِنَّھَا' میں ضمیر قصہ یا ضمیر شان ہے۔ اس صورت میں متکلم، ضمیر اپنے معہودِ ذہنی کو پیش نظر رکھ کر استعمال کرتا ہے۔ یہاں معہودِ ذہنی 'حبۃ خردل' کے برابر عمل ہے اس وجہ سے 'حبۃ' کی رعایت سے ضمیر مؤنث استعمال ہوئی۔

'صَخْرَۃٌ' سے پتھر مراد لینا ضروری نہیں ہے اس سے پہاڑی اور گھاٹی بھی مراد لے سکتے ہیں۔ یہ بات عربیت کے بالکل مطابق ہو گی۔ میں نے ترجمہ میں اسی مفہوم کو پیش نظر رکھا ہے۔ ابن جریر نے بھی ایک گروہ کا یہی قول نقل کیا ہے۔

يٰبُنَيَّ أَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (۱۷)

شکر کا اثر زندگی پر

نماز کا اہتمام

اللہ تعالیٰ کے شکر کی تعلیم دینے کے بعد اس شکر کا زندگی میں جو اثر نمایاں ہونا چاہیے اس کی ہدایت فرمائی۔ اس سلسلہ میں سب سے اول، نماز کو لیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر کا سب سے اوّل اور سب سے بڑا مظہر نماز ہی ہے۔ یہی تمام انبیاء اور تمام مذاہب کی متفق علیہ تعلیم ہے۔ فرمایا کہ اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو۔ دوسرے مقام میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ 'نماز قائم کرو' کا مفہوم یہ ہے کہ نماز کا اہتمام کرو۔ یعنی خود بھی نماز کی پابندی کرو اور دوسروں کے لیے بھی اس کا انتظام کرو اور ان کو اس کے لیے ابھارو۔

امر بالمعروف

'وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ' یہ خدا کی شکرگزاری ہی کا دوسرا پہلو ہے جو بندے کو خلق سے مربوط کرتا ہے۔ نماز بندے کو اس کے رب سے جوڑتی ہے اور امر بالمعروف کے ذریعے سے وہ اللہ کے بندوں سے جڑتا ہے۔

معروف میں وہ تمام کام شامل ہیں جو ادائے حقوق سے متعلق ہیں۔ مثلاً اللہ کی راہ میں انفاق، یتیموں، مسکینوں، پڑوسیوں اور دوسرے مستحقین کی مدد اور اس نوع کے دوسرے کام جو ہر اچھی سوسائٹی میں معلوم و معروف ہیں اور جن کا یہ اہتمام ہر وہ شخص کرتا ہے اور اس کو کرنا چاہیے جو اپنے رب کا شکرگزار بندہ ہے۔

نہی عن المنکر

'وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ'۔ یہ ان چیزوں سے باز رکھنے کی ہدایت ہے جو معروف کی ضد ہیں۔ بخالت، غصب حقوق، تعدّی، عہد شکنی، فخر و غرور اور اس قبیل کی ساری چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔

صبر

'وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ'۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہ راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے۔ جب اس فرض کو ادا کرنے کے لیے اٹھوگے تو ہر قدم پر تمھیں راہ مشکلات و مصائب سے رندھی ہوئی نظر آئے گی، اگر تم میں صبر نہیں ہوگا تو ایک قدم بھی تم آگے نہیں بڑھا سکو گے۔ اگر اس راہ کی بازیاں جیتنی ہیں تو ضروری ہے کہ جو کچھ پیش آئے اس کا پوری عزیمت سے مقابلہ کرو۔

'اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ'۔ یہ اسی مضمون کی مزید تاکید اور وضاحت ہے کہ یہ کام نیم دلی کے ساتھ اور ڈھیلے ڈھالے ہاتھوں سے نہیں انجام پاتے۔ ان سے وہی لوگ عہدہ برآ ہوتے اور ہو سکتے ہیں جو پوری عزیمت کے ساتھ ان کے انجام دینے کے لیے اٹھتے اور سر دھڑ کی بازی لگا کر ان کو انجام دیتے ہیں۔ سورۂ عصر میں حق کے ساتھ صبر کا جو ذکر آیا ہے وہ بھی اسی تعلق سے آیا ہے۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ (۱۸)

'تصعیر خد' کے معنی ہیں برنبائے غرور و تکبر لوگوں سے بے رخی و بے پروائی اختیار کرنا۔

'لِلنَّاسِ' سے مراد عوام الناس خصوصاً غربا و فقرا ہیں جن کو امرا و اغنیا حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

شکر کے منافی باتیں

اوپر کی آیات میں اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کے موجبات بیان ہوئے ہیں۔ اب یہ ان باتوں کا ذکر آ رہا ہے جو اس شکرگزاری کے منافی ہیں۔ شکر کا مظہر، جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، اخبات و تواضع ہے اور اس کا ضد غرور و تکبر ہے۔ جو لوگ سفلہ اور کم ظرف ہوتے ہیں وہ نعمت پا کر اکڑنے اور اترانے والے بن جاتے ہیں اور ان لوگوں کو نہایت حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جو ان کے ہم سر نہیں ہوتے۔ لقمان نے اس روش کے اختیار کرنے سے اپنے فرزند کو روکا۔

'وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا'۔ یہ آیت بعینہٖ سورۂ بنی اسرائیل میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے ساتھ یہ تنبیہ بھی ہے کہ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا - ۳۷، یعنی کوئی کتنا ہی اکڑ کے اور سر اونچا کر کے چلے لیکن اسے یہ بات بھولنی نہیں چاہیے کہ نہ وہ زمین کو پھاڑ سکتا اور نہ وہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتا تو جس خدا کی قدرت و عظمت کے یہ آثار ہر شخص دیکھ رہا ہے اس کی خدائی میں اکڑنے اور اترانے کے کیا معنی! آدمی کا غرور اس کے چہرے اور اس کی گردن سے بھی نمایاں ہوتا ہے اور اس کی چال

سے بھی، لقمان نے ان دونوں ہی چیزوں میں غرور کی روش اختیار کرنے سے اپنے بیٹے کو روکا۔

'اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ' یہ تنبیہ ہے اور بڑی ہی سخت تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی اکڑنے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ جن کو مال و جاہ حاصل ہو اور وہ اس کو اللہ تعالیٰ کے انعام کے بجائے اپنی قابلیت و استحقاق کا کرشمہ سمجھ بیٹھیں ان کے اندر شکر کے بجائے لازماً فخر و غرور کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لقمان نے اسی خطرے سے اپنے بیٹے کو آگاہ فرمایا ہے کہ نعمت کو اللہ کا انعام اور اس کا امتحان سمجھنا، اس کے سبب سے مغرور ہو کر اپنے کو خدا کے غضب کا مستحق نہ بنا لینا۔

وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ (۱۹)

تواضع اور فروتنی کی تعلیم

اوپر کی باتیں نہی کے اسلوب میں ہیں۔ اب یہ اسی تواضع و فروتنی کی تعلیم مثبت انداز میں دی ہے کہ اپنی چال میں اکڑ کے بجائے فروتنی و تواضع اور اپنی آواز میں کرختگی اور خشونت کی جگہ نرمی اور لینت پیدا کرو۔ 'مِنْ' اس بات پر دلیل ہے کہ جب خالق نے انسان کو ایک ہی قسم کی آواز پر نہیں پیدا کیا ہے بلکہ اس کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے کہ اس کو وہ پست بھی کر سکتا ہے اور بلند بھی تو موقع و محل کے مطابق وہ اس صلاحیت کو استعمال کرے، گدھے کی طرح ہمیشہ اپنا حلق اور لوگوں کے کان پھاڑنے ہی کی کوشش نہ کرے۔ 'اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ' کا ٹکڑا یہاں کرخت اور سخت لب و لہجہ سے نفرت دلانے کے لیے ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس کو حسنِ بیان اور حسنِ کلام کی نعمت سے نوازا ہے تو وہ اس مقام کو چھوڑ کر گدھوں کی صف میں شامل ہونے کی کوشش کیوں کرے! یہ بلبل کی بدقسمتی ہے کہ وہ زاغ و زغن کی ہمنوائی کرے!!

لقمان کی نصیحتیں بڑوں کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہیں

لقمان کی یہ نصیحتیں اگرچہ ہر شخص کے لیے اپنے اندر یکساں خیر و برکت رکھتی ہیں لیکن ان لوگوں کے لیے یہ خاص اہمیت رکھنے والی ہیں جن کو قیادت و سربراہی اور امارت و حکومت کا مقام حاصل ہو۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، لقمان صرف ایک حکیم نہیں بلکہ ایک حکمران حکیم تھے۔ ان کو اپنی قوم کی سربراہی حاصل تھی اور یہ نصیحتیں اپنے بیٹے کو انھوں نے سرداری و قیادت کی ذمہ داریاں سمجھانے کے لیے کی ہیں۔ یہ اگرچہ نبی نہیں تھے لیکن ان کو حضرت داؤدؑ سے فی الجملہ مشابہت ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۰-۳۴

لقمان کی نصیحت میں سرفہرست اللہ واحد کی شکر گزاری کی تلقین ہے۔ اب آگے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کیوں اللہ ہی شکر کا سزاوار ہے۔ آفاق و انفس میں اس کے دلائل کیا ہیں؟ ساتھ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ اپنے مخالفین کے معاملے کو اب ہمارے اوپر چھوڑ دو، ہم ہی ان کا فیصلہ کریں گے۔ یہ لوگ نشانیوں کا جو مطالبہ کر رہے ہیں اس کی پروا نہ کرو۔ اللہ کی اتنی نشانیاں موجود

ہیں کہ اگر زمین کے سارے درخت قلم اور سمندر، مزید سات سمندروں کے اضافہ کے ساتھ، روشنائی بن جائیں جب بھی اس کی نشانیوں کو قلم بند نہیں کیا جا سکتا۔ یہ عہد شکن اور غدار لوگ ہیں۔ جب یہ کسی پکڑ میں آتے ہیں تو اللہ کی اطاعت و وفاداری کا عہد کرتے ہیں لیکن جب ذرا ڈھیل ملتی ہے تو وہی سرکشی ان پر پھر عود کر آتی ہے اور اپنے قول و قرار کو بالکل بھول جاتے ہیں۔ اس قسم کے عہد شکن ناشکروں پر کوئی نشانی کارگر نہیں ہو سکتی۔ آخر میں آخرت کی یاد دہانی ہے کہ لوگو! اس دن سے ڈرو جس دن نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کچھ کام آئے گا اور نہ بیٹا باپ کے بلکہ ہر ایک کو اپنی جواب دہی خود کرنی ہے۔ اگر آج یہ نہیں معلوم ہے کہ قیامت کا ظہور کب ہوگا تو اس سے کسی کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس کا ڈراوا محض ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ کتنے حقائق ہیں جن کے ظہور کا وقت کسی کو معلوم نہیں لیکن کوئی عاقل بھی ان کا انکار نہیں کر سکتا ۔۔۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۰-۳۴

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ؕ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ﴿۲۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ﴿۲۱﴾ وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ؕ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۲۲﴾ وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ؕ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۳﴾ نُمَتِّعُهُمْ قَلِيْلًا ثُمَّ نَضْطَرُّهُمْ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۲۴﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ

الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٢٦﴾ وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَ
الْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ
إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٧﴾ مَّا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ
إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ بَصِيرٌ ﴿٢٨﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ
وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي إِلَىٰ
أَجَلٍ مُّسَمًّى وَأَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿٢٩﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ
هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُونَ مِن دُونِهِ الْبَاطِلُ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْعَلِيُّ
الْكَبِيرُ ﴿٣٠﴾ أَلَمْ تَرَ أَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللَّهِ
لِيُرِيَكُم مِّنْ آيَاتِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُورٍ ﴿٣١﴾ وَ
إِذَا غَشِيَهُم مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ
فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمَا يَجْحَدُ بِآيَاتِنَا
إِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُورٍ ﴿٣٢﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ وَاخْشَوْا يَوْمًا
لَّا يَجْزِي وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَيْئًا
إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم
بِاللَّهِ الْغَرُورُ ﴿٣٣﴾ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ
وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا
وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿٣٤﴾

ع ۳ ۱۱ ۱۲

ع ۴ ۱۳

تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کی چیزوں کو تمھاری خدمت

ترجمہ آیات ۲۰-۳۴

میں لگا رکھا ہے اور تمہارے اوپر ہر قسم کی ظاہری و باطنی نعمتیں پوری کی ہیں! پھر بھی لوگوں میں ایسے لوگ ہیں جو اللہ کے باب میں بغیر کسی دلیل، بغیر کسی ہدایت اور بغیر کسی روشن کتاب کے جھگڑتے ہیں! اور جب ان کو دعوت دی جاتی ہے کہ اس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے اتاری ہے تو جواب دیتے ہیں کہ ہم یہ نہیں کریں گے، بلکہ اسی طریقہ کی پیروی کرتے رہیں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی جب کہ شیطان ان کو عذابِ دوزخ کی طرف بلا رہا ہو! ۲۰-۲۱

اور جو اپنا رخ فرمانبردارانہ اللہ کی طرف کرے گا اور وہ خوب کار بھی ہے تو اس نے بے شک مضبوط رسّی تھامی۔ اور انجام کار تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ اور جس نے کفر کیا اس کا کفر تمہارے لیے باعثِ غم نہ ہو۔ ہماری ہی طرف ان سب کی واپسی ہے تو جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا ہم اس سے ان کو آگاہ کریں گے۔ اللہ دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے۔ ہم ان کو کچھ دن برومند کریں گے پھر ان کو ایک سخت عذاب کی طرف دھکیلیں گے۔ ۲۲-۲۴

اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو جواب دیں گے اللہ نے! کہو، شکر کا سزاوار بھی اللہ ہے۔ بلکہ ان کے اکثر اس بات کو نہیں جانتے۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ ہی کا ہے۔ بے شک اللہ ہی بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ ۲۵-۲۶

اور اگر زمین میں جو درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر، سات مزید سمندروں کے ساتھ، روشنائی بن جائیں جب بھی اللہ کی نشانیاں قلم بند نہیں ہو سکتیں۔ بے شک اللہ غالب و حکیم ہے۔ ۲۷

اور تم کو پیدا کر دینا اور تم کو زندہ کر دینا بس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کا پیدا کر دینا اور زندہ کر دینا، بے شک اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ ہی ہے جو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور دن کو رات میں اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ ہر ایک گردش کرتا ہے ایک مقررہ وقت تک اور یہ کہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ہی معبودِ حقیقی ہے اور جن چیزوں کو یہ اس کے سوا پکارتے ہیں وہ باطل ہیں۔ اور بے شک برتر اور عظیم اللہ ہی ہے۔ ۲۸-۳۰

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ ہی کے فضل سے کشتی دریا میں چلتی ہے تاکہ وہ تم کو اپنی نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر صبر و شکر کرنے والے کے لیے۔ اور جب موجیں سائبانوں کی طرح ان کو ڈھانک لیتی ہیں وہ اللہ کو پکارتے ہیں خالص اسی کی اطاعت کا عہد کرتے ہوئے، پس جب وہ ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف کر دیتا ہے تو ان میں کچھ راہ پر رہتے ہیں اور باقی بے راہ ہو جاتے ہیں اور ہماری آیات کا انکار بس وہی لوگ کرتے ہیں جو بالکل بدعہد اور ناشکرے ہوتے ہیں۔ ۳۱-۳۲

اے لوگو، اپنے رب کی پکڑ سے بچو اور اس دن سے ڈرو جس دن نہ کوئی باپ اپنی اولاد کے کام آئے گا اور نہ کوئی اولاد اپنے باپ کے کچھ کام آنے والی بن سکے گی۔ بیشک اللہ کا وعدہ شدنی ہے تو دنیا کی زندگی تمھیں دھوکے میں نہ ڈالنے پاوے اور نہ اللہ کے باب میں فریب کار تمھیں دھوکے میں رکھے! قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے اور وہی بارش اتارتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحموں میں ہوتا ہے، اور کسی کو بھی پتہ نہیں کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا، اور نہ کسی کو یہ علم ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ

علیم وخبیر ہے۔ ۳۲-۳۳-۳۴

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ۭ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (۲۰)

خدا ہی کی شکرگزاری کے دلائل

اس سورہ کی تمہید آیت ۱۱ پر بدیں الفاظ ختم ہوئی تھی هٰذَا خَلْقُ اللّٰهِ فَاَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (یہ ساری چیزیں تو اللہ کی مخلوق ہیں تو تم مجھے دکھاؤ کہ انھوں کے کیا چیزیں پیدا کی ہیں جن کو تم اس کے سوا معبود بنائے بیٹھے ہو! بلکہ یہ ظالم نہایت کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں!) اس کے بعد اسی حقیقت کی تائید میں لقمان کی حکمت کا حوالہ آگیا تھا کہ انھوں نے بھی اپنے فرزند کو خدا ہی کا شکرگزار رہنے کی تلقین کی تھی۔ اب اسی مضمون کو آفاق کے دلائل کی روشنی میں مزید واضح فرمایا اور انداز کلام اظہار تعجب اور زجر کا ہے کہ خدا کے بندو، تم نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ آسمانوں اور زمین کی جتنی چیزیں بھی تمھارے کام آ رہی ہیں ان سب کو تمھاری مقصد برآری میں خدا نے لگایا ہے، ان میں سے کسی چیز کے متعلق بھی تم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ خدا کے سوا کسی اور نے ان کو پیدا کیا ہے تو آخر کس دلیل سے تم نے دوسروں کو شریک بنایا اور ان کی عبادت کر رہے ہو!

تمام ظاہری و باطنی نعمتیں اللہ ہی کی عطا کردہ ہیں

'وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً'۔ 'اسباغ' کے اصل معنی وسیع اور کشادہ کرنے کے ہیں پھر یہیں سے یہ اتمام و تکمیل کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ 'وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ'، یعنی اس نے ہر پہلو سے اپنی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔ یہ نعمتیں ظاہری و مادی بھی ہیں اور عقلی و روحانی بھی، شکل و صورت، قد و قامت، ہاتھ پاؤں، غذا، لباس اور اس قبیل کی دوسری تمام چیزیں بھی اس کی بخشی ہوئی ہیں اور سمع و بصر، عقل و ادراک اور بصیرت و ہدایت کی نعمتیں بھی اسی کی عطا کردہ ہیں، ان میں سے کسی چیز کے متعلق کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ خدا کے سوا کسی اور سے اس کو ملی ہیں یا کوئی دوسرا ان کے ملنے کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ تو جب تمام نعمتوں کو بخشنے والا اللہ ہی ہے تو بندے کی تمام شکرگزاری و نیازمندی کا حق دار بھی وہی ہوا، پھر بلا کسی دلیل کے کوئی دوسرا اس کے اس حق میں کس طرح ساجھی بن سکتا ہے!

مشرکین کا بے دلیل مجادلہ

'وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ'۔ یعنی جہاں تک خدا اور اس کی شکرگزاری کے حق کا تعلق ہے وہ تو ایک ثابت شدہ حقیقت ہے جس سے کسی کے لیے مجال انکار نہیں ہے، لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ لوگوں میں ایسے شامت زدہ لوگ بھی ہیں جو اللہ کی توحید کے بارے میں جھگڑتے ہیں حالانکہ ان کے پاس نہ کوئی دلیل ہے، نہ کوئی رہنمائی ہے اور نہ کسی روشن کتاب کی سند ہے۔ 'يُجَادِلُ فِي اللّٰهِ'

میں مضاف محذوف ہے یعنی 'فِیْ تَوْحِیْدِ اللّٰهِ'۔ مشرکین عرب خدا کے منکر نہیں تھے، ان کا سارا جھگڑا توحید کے باب میں تھا۔ 'بِغَیْرِ عِلْمٍ' میں علم سے مراد کوئی دلیل ہے خواہ وہ عقلی ہو یا نقلی۔ اوپر آیت ۶ میں بھی یہ لفظ گزر چکا ہے۔ یہ لفظ جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں 'ظن' کے مقابل میں بھی آتا ہے، اس وجہ سے اس سے ہر وہ چیز مراد ہو سکتی ہے جو یقین و اعتماد پیدا کرنے والی ہو۔ لفظ 'هُدًى' یہاں 'کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ' کے ساتھ آیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ خاص سے پہلے عام کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت خلق کو انبیاء علیہم السلام کی زبانی تعلیم کے ذریعہ سے بھی پہنچی ہے اور روشن صحیفوں کے ذریعہ سے بھی مثلاً تورات، زبور، انجیل اور قرآن مجید کے ذریعے سے۔ میرا خیال ہے کہ 'هُدًى' سے یہاں پہلی قسم کی دلیل مراد ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ دلیل کی یہ نفی اصل حقیقت کے اعتبار سے ہے۔ مشرکین اپنے موقف کی تائید میں جو کچھ کہتے تھے اس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ اس کی نوعیت مجرد تقلید کی ہے اور مجرد تقلید کوئی دلیل نہیں ہے۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْهُمْ اِلٰى عَذَابِ السَّعِیْرِ (۲۱)

یہ ان کے مجادلہ بلا علم کی تفصیل ہے کہ جب ان کو اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کی پیروی کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ ہم نے باپ دادا سے جو طریقہ پایا ہے ہم اسی پر چلتے رہیں گے، اس سے ہٹ کر کوئی نئی راہ اختیار کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔ فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ کیا اس شکل میں بھی یہ اسی روش پر جامد رہیں گے جب کہ شیطان ان کو تقلید آباء کے اس تعصب میں مبتلا کر کے ان کو جہنم کی طرف بلا رہا ہو! مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کی صحت و صداقت کی مجرد یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ آباء و اجداد سے چلی آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جس طرح بے سوچے سمجھے تم باپ دادا کے طریقہ کو دین بنائے بیٹھے ہو اسی طرح تمہارے باپ دادا نے بھی بے سوچے سمجھے اگلوں سے جو پایا ہو اس کو دین بنا لیا ہو۔ اس وجہ سے دانش مندی اور حق پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی جس کتاب کی تم کو دعوت دی جا رہی ہے اس کو سنو، اس پر غور کرو اور اس کے دلائل کی روشنی میں اپنے عقائد و اعمال کا جائزہ لو۔ ایسا نہ ہو کہ اس اندھے بہرے تعصب میں مبتلا ہو کر شیطان کی پیروی میں جہنم میں جا گرو۔ یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ قومی دین، قومی تہذیب اور قومی روایات کے نعروں میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ جو لوگ یہ نعرے بلند کرتے ہیں وہ قومی تہذیب و روایات کے محافظ سمجھے جاتے ہیں اور عوام ان کے نعروں سے اس طرح مسحور ہو جاتے ہیں کہ اس کے خلاف وہ کوئی بات بھی سننے کے روادار نہیں ہوتے، خواہ وہ کتنی ہی بڑی حقیقت ہو۔ میرے نزدیک 'یَدْعُوْهُمْ' میں ضمیر مفعول کا مرجع 'اٰبَآءَ' نہیں بلکہ خود اس قول کے قائلین ہیں۔

وَمَنْ يُّسْلِمْ وَجْهَهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۭ وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (۲۲)

اسلام کی اصل روح احسان ہے

'اَسْلَمَ' کا صلہ 'لِ' کے ساتھ بھی قرآن میں آیا ہے اور 'اِلٰی' کے ساتھ بھی۔ دونوں کے مواقع استعمال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صورت میں تو یہ کامل تفویض و سپردگی کے مفہوم میں آیا ہے جو اسلام کی اصل حقیقت ہے۔ دوسری صورت میں جیسا کہ یہاں ہے یہ نیازمندانہ متوجہ ہونے کے مفہوم میں آیا ہے۔ یہ متوجہ ہونا حقیقی بھی ہو سکتا ہے اور غیر حقیقی بھی اس وجہ سے اس کے ساتھ 'محسن' کی قید لگی ہوتی ہے۔ 'احسان' کے معنی، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، کسی کام کو کمال درجہ خوبی و اخلاص کے ساتھ کرنے کے آتے ہیں۔ اس قید کے لگ جانے سے لفظ 'اسلام' کا مفہوم یہاں متعین ہو گیا کہ آدمی خدا کی طرف متوجہ ہو اور بکمال درجہ خوبی و یکسوئی اور پوری وفاداری و جاں نثاری کے ساتھ متوجہ ہو۔ مشرکین و منافقین کی طرح نہیں کہ نام تو خدا کا لیتے ہیں لیکن اس کی خدائی اور اس کے حقوق میں دوسروں کو بھی شریک کیے بیٹھے ہیں اور ان کے نزدیک اصلی اہمیت خدا اور اس کے احکام کی نہیں بلکہ اس کے شریکوں اور ان سے متعلق رسوم و اوہام کی ہے۔

خدا کے ساتھ تعلق کا اصل ذریعہ

یہ آیت تقلیدِ آباء کے علم برداروں اور شرک کی حمایت میں لڑنے والوں کے جواب میں ارشاد ہوئی ہے کہ نہ باپ دادا کے طریقہ کی اندھی تقلید کوئی کام آنے والی چیز ہے اور نہ دیویوں دیوتاؤں کا سہارا کچھ کام آنے والا بنے گا۔ البتہ جو لوگ پورے اخلاص اور حسنِ عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں انھوں نے اپنے رب کے ساتھ وابستہ کرنے والی ایک مضبوط رسی تھام لی ہے جو ان کے لیے خدا کے ساتھ تعلق و توسّل کا ایک محکم ذریعہ ہوگی اور یہ کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔

ایک تنبیہ

'وَاِلَى اللّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ'۔ یہ تنبیہ ہے اور بڑی ہی سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس رسی کے سوا دوسری رسیاں جو لوگوں نے تھام رکھی ہیں، وہ بھی ان کے لیے کچھ کام آنے والی بن سکیں گی۔ ان جھوٹے سہاروں میں سے کوئی بھی کام آنے والا نہیں ہے اس لیے کہ تمام امور بالآخر اللہ ہی کے آگے پیش ہوں گے، کوئی دوسرا مولیٰ و مرجع بننے والا نہیں ہے کہ اس کا سہارا کچھ کام آسکے۔

وَمَنْ كَفَرَ فَلَا يَحْزُنْكَ كُفْرُهٗ ۭ اِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ فَنُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۲۳)

نبی صلعم کو تسلی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے اور ساتھ ہی اوپر والی آیت میں مخالفین کے لیے جو دھمکی ہے وہ مزید مؤکد کی گئی ہے۔ فرمایا کہ آج جو لوگ تمھاری دعوت کی مخالفت کر رہے ہیں ان کی مخالفت تمھارے لیے ذرا بھی باعثِ غم نہ ہو۔ بالآخر ان سب کی پیشی ہمارے ہی سامنے ہونی ہے۔

اس دن ہم ان کے آگے ان کا سارا کچا چٹھا رکھ دیں گے۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ، یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ ساری دنیا کے اعمال و اقوال سے واقف ہونا اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احاطۂ علم کا حال یہ ہے کہ لوگوں کے سینوں میں جو راز چھپے ہوئے ہیں وہ ان سے بھی باخبر ہے۔

نُمَتِّعُهُمۡ قَلِيۡلًا ثُمَّ نَضۡطَرُّهُمۡ اِلٰى عَذَابٍ غَلِيۡظٍ (۲۴)

سب خدا کی زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں

'اِضطرار' کے بعد 'اِلٰی' کا صلہ اس بات پر دلیل ہے کہ یہ لفظ مجبور کر کے کشاں کشاں لے جانے کے مفہوم پر متضمن ہے۔ اس تضمین کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ آخرت کا معاملہ بہت دور کا معاملہ ہے۔ اس دنیا کی مہلت ایک بالکل محدود مہلت ہے۔ فرمایا کہ ہم نے ان کو جو مہلت دی ہے یہ چند روزہ ہے۔ یہاں ہم کچھ دن ان کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند کریں گے پھر ہم ان کو کشاں کشاں ایک شدید عذاب کی طرف گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان اس دنیا میں قدرت کے ایسے نوامیس و قوانین میں جکڑا ہوا ہے جن سے کسی کے لیے کسی حال میں بھی مفر نہیں ہے۔ شاہ و گدا سب ان کے آگے یکساں بے بس ہیں اور ہر ایک کو بہر حال وہیں جانا ہے جہاں ان قوانین کی زنجیر ان کو گھسیٹ کر لے جائے۔

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ لَيَـقُوۡلُنَّ اللّٰهُ‌ ؕ قُلِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ‌ ؕ بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ (۲۵)

مخالفین پر خود ان کے مسلمات سے اتمام حجت

یہ خدا کی شکر گزاری کی وہ دلیل بیان ہوئی ہے جس کے بنیادی مقدمہ کا اعتراف خود مخالفوں کو بھی ہے۔ فرمایا کہ اگر ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو پیدا کس نے کیا ہے تو اس کا جواب وہ یہی دیں گے کہ اللہ نے۔ ان سے کہو کہ جب تم تمام چیزوں کا خالق خدا ہی کو مانتے ہو تو پھر تو شکر کا حق دار بھی وہی ہوا، آخر یہ بات کس قاعدے سے جائز ہو سکتی ہے کہ خالق تو تنہا وہ ہو لیکن شکر کے سزاوار دوسرے بھی بن جائیں جن کا نہ اس کائنات کے خلق میں کوئی حصہ اور نہ اس کی تدبیر میں!

'بَلۡ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ' یعنی یہ بات نہیں ہے کہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کی بنیاد کسی دلیل پر ہے۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کو خود اپنے تسلیم کردہ مقدمات کے بدیہی نتائج و لوازم کا بھی علم نہیں ہے۔ اس جہل کا نتیجہ یہ ہے کہ خود اپنے مانے ہوئے مسلمات کو خود اپنے ہی دوسرے اعمال و عقائد سے جھٹلا دیتے ہیں۔

لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ (۲۶)

اصل حقیقت کا اظہار

یہ اصل حقیقت کا اظہار ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اسی کی مخلوق و مملوک اور سب اسی کے دروازے کے سائل و محتاج ہیں۔ بے نیاز اور ستودہ صفات صرف اسی کی ذات ہے۔ اس وجہ سے شکر کا سزاوار حقیقی تنہا وہی ہے، اس کے سوا کسی کا بھی یہ درجہ و مرتبہ نہیں ہے کہ اس کے اس حق میں وہ

شریک قرار دیا جا سکے۔

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۷)

سورۂ کہف میں یہی مضمون بدیں الفاظ گزرا ہے:

نشانیوں کی تعبیر کلمات سے

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (۱۰۹)

ان سے کہہ دو کہ اگر میرے رب کی نشانیوں کو قلم بند کرنے کے لیے سمندر بھی روشنائی بن جائے تو میرے رب کی نشانیوں کے قلم بند ہونے سے پہلے سمندر خشک ہو جائے گا اگرچہ اسی کے برابر ہم اور روشنائی فراہم کریں۔

'کلمٰت' سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ نشانیاں ہیں جو اس کی ذات، صفات اور اس کی قدرت و حکمت پر گواہی دیتی ہیں۔ چونکہ ہر نشانی اللہ کے کلمۂ 'کُن' کا مظہر ہے اور ہر نشانی اپنی زبانِ حال سے ناطق بھی ہے اس وجہ سے یہاں نشانیوں کو کلمات سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ تعبیر نہایت ہی معنی خیز تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کوئی ایسی مبہم و مجہول چیز نہیں ہے کہ اس کے باب میں لوگوں کو ایسا التباس پیش آئے کہ لوگ جس اینٹ پتھر کو چاہیں خدا سمجھ کر اس کو ڈنڈوت شروع کر دیں۔ اس کائنات میں خدا کی اتنی نشانیاں ہیں کہ اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور تمام سمندر، مزید سات سمندروں کے اضافے کے ساتھ، روشنائی بن جائیں جب بھی ان کا قلم بند کیا جانا ممکن نہیں ہے۔ اور یہ تمام نشانیاں اس بات پر شاہد ہیں کہ اس کا خالق عزیز و حکیم ہے۔ ان دونوں صفتوں کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بنیادی صفات میں سے ہیں اور قرآن میں ان سے جگہ جگہ توحید، قیامت اور رسالت تینوں پر استدلال کیا گیا ہے اور یہی مسائل قرآن کے اصولی مسائل ہیں۔ گویا اس کائنات کی ہر چیز اس کے خالق کے عزیز و حکیم ہونے کی گواہی دے رہی ہے اور انہی کے مقتضیات ہیں جن کو تسلیم کرنے کی قرآن دعوت دے رہا ہے۔

ہر چیز شاہد ہے کہ خدا عزیز و حکیم ہے

اس آیت میں 'اقلام' کا مقابل لفظ 'مداد' حذف ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری عبارت یوں ہوگی۔ 'مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ مِدَادٌ' حذف کے اس اسلوب کی مثالیں ہم جگہ جگہ پیش کرتے آ رہے ہیں۔

سورۂ کہف کی مذکورہ بالا آیت کے تحت ہم یہ وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ کوئی مبالغہ کا اسلوب نہیں ہے بلکہ یہ بیانِ حقیقت ہے۔ وہاں ہم نے لکھا ہے کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے تو یہ روشنائی خود سمندر ہی کے عجائب کو قلم بند کرنے کے لیے کافی نہیں ہوگی چہ جائیکہ اس پوری کائنات کے عجائب۔ یہ زمین جو ہمارے قدموں کے نیچے ہے خدا کی لامتناہی کائنات کا ایک نہایت ہی حقیر حصہ ہے لیکن سائنس کی تمام ترقیوں کے باوجود اب تک انسان اس کے جو عجائب دریافت کر سکا ہے اس کی حیثیت سمندر کے ایک قطرے سے زیادہ نہیں ہے۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۲۸)

خدا کے عزیز و حکیم ہونے کا لازمی تقاضا

یہ اوپر کے تمام مقدمات کا نتیجہ اور خلاصہ سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ جب اس کائنات کی ہر چیز شاہد ہے کہ اس کا خالق عزیز بھی ہے اور حکیم بھی تو اس امر میں کسی شک کی گنجائش کہاں باقی رہی کہ ایک دن اللہ تعالیٰ سب کو از سرِ نو پیدا کر کے قبروں سے اٹھائے گا۔ وہ عزیز ہے اس وجہ سے اس کے لیے یہ کام ذرا بھی مشکل نہیں ہے اور حکیم ہے اس وجہ سے یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو وہ عزیز نہیں رہتا اور اگر کر سکنے کے باوجود نہ کرے تو یہ اس کی حکمت کے منافی ہے اس لیے کہ قیامت کے بغیر یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال بن کے رہ جاتی ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

'اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ' میں مضاف محذوف ہے یعنی 'كَخَلْقِ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ' یا 'كَبَعْثِ نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ' یعنی کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ اتنی ساری مخلوق کو از سرِ نو پیدا کرنا اور ان کو اکٹھا کرنا کس کے امکان میں ہے۔ فرمایا کہ اللہ کے لیے ایک نفس کو پیدا کر دینا اور تمام جہان کو پیدا کر دینا اور اس کو اٹھا کھڑا کرنا یکساں ہے۔ اس کے ایک ہی کلمۂ 'کُن'، یا ایک ہی نفخ صُور سے ساری دنیا از سرِ نو زندہ ہو کر اٹھ کھڑی ہو گی۔ وہ ہر چیز پر قادر اور عزیز ہے۔

'اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ' یہ قیامت کے اصل مقصد، حساب کتاب، کی یاد دہانی ہے کہ کسی کو یہ غلط فہمی بھی نہ ہو کہ اتنی وسیع خلقت کے احوال و معاملات کا علم کسے ہے کہ وہ ان کا حساب کرنے بیٹھے گا۔ فرمایا کہ اللہ سب کچھ سن اور دیکھ رہا ہے۔ کوئی چیز اس کے علم و مشاہدہ سے باہر نہیں ہے اس وجہ سے اس کو لوگوں کا حساب کرنے اور ان کو جزا یا سزا دینے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئے گی۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؗ كُلٌّ يَّجْرِىْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۲۹)

آفاق کی بعض نشانیوں کی طرف اشارہ

اوپر آیت ۲۰ میں 'اَلَمْ تَرَوْا'، جمع کے صیغہ سے اپنی آیات کی طرف توجہ دلائی تھی یہاں 'اَلَمْ تَرَ' واحد کے صیغہ سے توجہ دلائی ہے۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ 'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب جمع کے لیے بھی آتا ہے۔ اس صورت میں گویا مخاطب گروہ کے ایک ایک شخص کو فرداً فرداً توجہ دلائی جاتی ہے اور اس میں جمع کے مقابل میں زیادہ زور ہوتا ہے۔

فرمایا کہ یہ خدا ہی کی قدرت و حکمت ہے کہ وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ 'رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنا' تصویر ہے یکے بعد دیگرے، پوری سرگرمی کے ساتھ، ایک دوسرے کے تعاقب اور پوری پابندیٔ اوقات کے ساتھ، ان کی آمد و شد کی۔

'وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؗ كُلٌّ يَّجْرِىْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى' اور یہ اسی کی قدرت و حکمت ہے کہ اس نے سورج اور چاند کو اپنی خلق کی خدمت گزاری کے لیے مسخر کر رکھا ہے اور یہ دونوں پوری پابندیٔ اوقات کے ساتھ

اپنے مدار میں گردش کرتے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ مدار سے سرمو انحراف ہو یا نظامِ اوقات کی پابندی میں منٹ یا سیکنڈ کا بھی فرق واقع ہونے پائے۔

ان نشانیوں کی طرف توجہ دلانے سے مقصود انہی حقائق کو مبرہن کرنا ہے جو اوپر زیرِ بحث آئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا کی قدرت کی یہ نشانیاں دیکھتے ہو اس کی نسبت تم یہ گمان کرتے ہو کہ وہ تم کو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتا! جو رات اور دن اور سورج اور چاند کو اس طرح گردش دے رہا ہے کیا اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس کا شریک ہونے کا درجہ رکھتی ہے! اور کیا جس نے اپنی ربوبیت کی یہ شانیں دکھائی ہیں اس کی نسبت اس سوئے ظن کی کوئی گنجائش ہے کہ اس نے یہ سارا کارخانہ بالکل عبث بنایا ہے، اس کے پیچھے کوئی روزِ جزا نہیں ہے۔

وَاَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ یعنی اگر تم اس نظامِ ربوبیت و قدرت پر غور کرو تو اس امر میں ذرا شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہے گی کہ جو اس سارے نظام کو چلا رہا ہے وہ تم سے اور تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ بے خبر ہو تو وہ تمہاری پرورش کس طرح کرے گا؟ اور اگر باخبر ہے تو آخر وہ تم سے پرسش کیوں نہیں کرے گا کہ تم نے اس کی پروردگاری کا حق ادا کیا یا نہیں!

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۳۰)

نظامِ کائنات کی باقاعدگی خدا کی توحید کی دلیل ہے

یعنی اس نظامِ کائنات کے اندر یہ باقاعدگی، یہ پابندی اور یہ افادیت و ربوبیت جو پائی جاتی ہے یہ اس وجہ سے پائی جاتی ہے کہ معبودِ حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اس تمام کائنات کی باگ تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اس کے سوا کچھ دوسرے الٰہ بھی اس کے خلق و تدبیر میں دخیل ہوتے تو یہ سارا نظام جیسا کہ فرمایا ہے لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا درہم برہم ہو جاتا۔ اس وجہ سے وہ سارے معبود بالکل بے حقیقت اور باطل ہیں جن کی یہ لوگ پرستش کر رہے ہیں۔ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ یعنی یہ نظامِ کائنات جس طرح خدا کی یکتائی پر شاہد ہے اسی طرح اس بات پر بھی شاہد ہے کہ خدا کی ذات بڑی ہی برتر اور بڑی ہی عظیم ہے۔ اس کی قدرت و حکمت کا یہ ادنیٰ کرشمہ ہے کہ وہ رات کے بعد دن کو نمودار کر دیتا ہے اور دن پر رات کو ڈھانک دیتا ہے اور سورج اور چاند سب کی نکیل اس کے ہاتھ میں ہے۔ جو ذات اتنی عظیم و بلند ہے وہ اس سے ارفع ہے کہ کسی چیز کو اس کا شریک ٹھہرایا جائے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِيُرِيَكُمْ مِّنْ اٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۳۱)

مغروروں کو تنبیہ

اب یہ کشتی کی مثال سے مخاطبوں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دنیا میں مغرور اور مایوس ہو جانے والے نہ بنو بلکہ امتحان و آزمائش میں صبر کرنے والے اور نعمت میں شکر کرنے والے بنو۔ یہی راستہ سلامتی

کا ہے اور اسی پر چل کر فلاح حاصل کرنے والے بن سکو گے مگر تمھارا حال یہ ہے کہ اس وقت خدا کی عنایت سے جو تمھارے حالات سازگار ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر تمھارے پاؤں ہی نہیں پڑ رہے ہیں، حالانکہ یہ سارا نشہ بالکل عارضی ہے۔ اگر ابھی خدا کی کسی پکڑ میں آ گئے تو سارا نشہ ہرن ہو جائے گا اور توبہ توبہ پکار اٹھو گے۔ لیکن یہ توبہ بھی بالکل وقتی ہو گی، جونہی حالات سازگار ہوں گے وہی سرمستی پھر عود کر آئے گی۔ ایک کشتی کے مسافروں کو جس طرح کے حالات پیش آتے ہیں ان سے سبق لو۔ اگر کوئی آزمائش میں صابر اور نعمت میں شاکر رہنا چاہے تو اس کے لیے ان کے حالات میں بڑا درس ہے۔

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ (۳۲)

یہ اوپر کے اجمال کی تفصیل ہے کہ کشتی کے مسافروں کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب تک کشتی رواں دواں رہتی ہے اس وقت تک ان کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ یہ خدا کی چلائی ہوئی سازگار ہوا کا کرشمہ ہے کہ وہ سمندر کے سینہ پر سوار اس سکون و راحت کے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ بلکہ وہ اس کو اپنی ذہانت و قابلیت کا کرشمہ سمجھتے ہیں اور خدا اور اس کی قدرت کو بھولے رہتے ہیں۔ لیکن جب دفعتہً کسی گوشے سے طوفانی ہوائیں نمودار ہوتی ہیں اور سائبانوں کی مانند اٹھنے والی موجیں ان کو ڈھانک لیتی ہیں تب ان کو خدا یاد آتا ہے اور وہ سو سو طرح اس سے فریاد کرتے اور آئندہ کے لیے اطاعت و وفاداری کا عہد کرتے ہیں لیکن جب کشتی ساحل پر پہنچ جاتی ہے تو ان میں سے تھوڑے اپنے عہد پر قائم رہنے اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے والے نکلتے ہیں، باقی غدار و ناشکرے نکلتے ہیں اور وہ سب خدا کی نشانیوں کو فراموش کر کے اپنی پچھلی سرمستیوں میں کھو جاتے ہیں۔

یہ قریش کے متمردین کو تنبیہ اور ساتھ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ اس وقت ان کے حالات سازگار ہیں اس وجہ سے خدا سے یہ بے نیاز ہیں اور جب ان کو خدا کی پکڑ سے ڈرایا جاتا ہے تو اس کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن جب کسی پکڑ میں آ جائیں گے تو توبہ توبہ پکاریں گے۔ پھر جب ڈھیل مل جائے گی تو ان کو اپنا یہ عہد یاد بھی نہیں رہے گا۔ ایسے عہد شکن اور ناشکرے لوگ کسی نشانی سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے۔

'فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ' کے بعد 'وَاَكْثَرُهُمْ كٰفِرُوْنَ' یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔ اس محذوف کو بعد کے ٹکڑے 'وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ' نے کھول دیا ہے۔ 'مُقْتَصِدٌ' کے معنی راہِ حق و عدل پر چلنے والے کے ہیں۔

خَتَّار و كفور

'وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ'۔ 'خَتَّار' 'خَتْر' سے مبالغہ ہے۔ اس کے معنی بدترین قسم کی بے وفائی و عہد شکنی کرنے والا۔ یہ الفاظ یہاں اوپر کے الفاظ 'صَبَّارٍ شَكُوْرٍ' ... استعمال

ہوتے ہیں۔ 'صَبَّار' سے وہ لوگ مراد ہیں جو ہر طرح کے حالات میں اپنے رب کے عہد پر استوار رہتے ہیں اور 'خَتَّار' سے وہ لوگ مراد ہیں جو نعمت میں تو خدا سے بے پروا رہتے ہیں البتہ جب کسی مصیبت میں پھنستے ہیں تو خدا سے عہد و پیمان باندھتے ہیں لیکن یہ عہد و پیمان ان کو صرف اسی وقت تک یاد رہتا ہے جب تک خدا کی پکڑ میں رہتے ہیں، اس سے چھوٹتے ہی وہ اپنے سارے عہد و پیمان کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بدترین قسم کی غداری ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے لیے نہ اللہ کی نعمت کی نشانیاں کارگر ہوتی ہیں نہ کوئی تنبیہ ان پر اثر انداز ہوتی۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱتَّقُوا۟ رَبَّكُمْ وَٱخْشَوْا۟ يَوْمًا لَّا يَجْزِى وَالِدٌ عَن وَلَدِهِۦ وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِۦ شَيْـًٔا ۚ إِنَّ وَعْدَ ٱللَّهِ حَقٌّ ۖ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِٱللَّهِ ٱلْغَرُورُ (۳۳)

آخری تنبیہ

یہ آخری تنبیہ ہے کہ لوگو اپنے رب کی پکڑ اور اس کے قہر و غضب سے بچو اور اس دن سے ڈرتے رہو جس دن نہ کوئی باپ اپنی اولاد کے کچھ کام آئے گا اور نہ کوئی بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آنے والا بن سکے گا بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ باپ اور بیٹے کا رشتہ سب سے زیادہ قریبی رشتہ ہے جب یہ ایک دوسرے کے کام آنے والے نہ بن سکیں گے تو تا بہ دیگراں چہ رسد ملا

زبان کے ایک اسلوب کی بلاغت

یہاں اسلوب بیان کی یہ ندرت ملحوظ رہے کہ بیٹے کے کام نہ آ سکنے کی نفی میں شدت پائی جاتی ہے۔ فرمایا ہے 'وَلَا مَوْلُودٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِۦ شَيْـًٔا' زبان کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ بیٹا کے علاوہ اور فعل کی جگہ اسم کے استعمال نے اس جملہ میں بڑا زور پیدا کر دیا ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اوّل تو ہر باپ کو فطری طور پر اپنے بیٹے سے یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ پیری میں اس کا سہارا بنے گا، دوسری یہ کہ بیٹا اپنی عمر اور صلاحیت کے اعتبار سے باپ کے مقابل میں زیادہ اس بات کا اہل ہوتا ہے کہ اپنے ناتواں باپ کی مدد کر سکے۔ تیسری یہ کہ بیٹے کے اندر جوانی کے سبب سے فتوت و حمیّت کا جذبہ بھی زیادہ قوی ہوتا ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس دن نفسی نفسی کا یہ عالم ہوگا کہ بیٹا بھی اپنے باپ کے کام آنے والا نہ بن سکے گا۔

اس دنیا کا فریب نظر

یہاں اس دور کے حالات پر نظر رہے جس دور میں یہ آیات اتری ہیں۔ سورۂ عنکبوت کی تفسیر میں بھی ہم اشارہ کر چکے ہیں اور اس سورہ کی آیت ۱۵ کے تحت بھی یہ بات گزر چکی ہے کہ اس دور میں باپوں کی طرف سے بیٹوں پر ان کو اسلام سے روکنے کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا تھا اور اس کے حق میں بزرگانہ دلیل یہ پیش کی جاتی تھی کہ تم ہمارے طریقہ کی پیروی کرتے رہو۔ قیامت کے دن تمہارے نیک و بد کے ذمہ دار ہم ہیں۔ یہ آیت اس بات کی تردید کر رہی ہے۔

'إِنَّ وَعْدَ ٱللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ ٱلْحَيَوٰةُ ٱلدُّنْيَا' یعنی اللہ کا یہ وعدہ شدنی ہے۔ قیامت آ کے

رہے گی تو یہ دنیا کی زندگی تمھیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یعنی اس دنیا کا نظام چونکہ مجازات کے اصول پر نہیں چل رہا ہے بلکہ اس میں حق کے ساتھ باطل کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے اور اہلِ باطل اس میں زیادہ سربلند ہیں اس وجہ سے نادانوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ قیامت کا ڈراوا محض ڈراوا ہے۔ فرمایا کہ یہ چیز کسی کو غلط فہمی میں نہ ڈالے — یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ اس امتحان کے نتائج کے ظہور کا دن بعد میں آنے والا ہے۔

'وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ' یعنی یہ فریبِ نظر اور یہ دھوکا خدا کے بارے میں کسی کو غلط فہمی میں نہ ڈالے کہ خدا نے یہ دنیا بے مقصد بنا ڈالی ہے اور وہ اس کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق ہو کر الگ بیٹھا ہوا ہے۔ اگر کسی نے ایسا سمجھا ہے تو وہ خدا کو بہت غلط سمجھا ہے۔ بالآخر ایک دن آئے گا جس دن خدا کا کامل عدل ظاہر ہو گا۔ اس دن اس قسم کی غلط فہمیوں میں پڑے ہوئے لوگ اپنی اس حماقت پر اپنے سر پیٹیں گے۔ یہی مضمون 'مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ' والی آیت میں بھی بیان ہوا ہے۔ لفظ 'غرور' اس دنیا کے فریبِ نظر کے لیے بھی استعمال ہوا ہے اور اس فریبِ نظر میں مبتلا کرنے والے شیطان کے لیے بھی اور یہاں دونوں ہی معنی بنتے ہیں۔ البتہ اتنی بات یاد رکھیے کہ 'فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا' میں اس فریبِ نظر پر تنبیہ ہے جو آدمی کو اس دنیا کے باب میں لاحق ہوتا ہے اور 'وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ' میں اس مغالطہ سے آگاہ کیا گیا ہے جو نادانوں کو اللہ تعالیٰ کے باب میں لاحق ہوتا ہے۔ اور فلسفۂ دین کے اعتبار سے یہی دو مغالطے ہیں جو تمام گمراہیوں کی جڑ ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ ۚ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ (۳۴)

ایک شبہ کا ازالہ

یہ ایک دفع دخلِ مقدر یعنی ایک شبہ یا اعتراض کا برسرِ موقع جواب ہے۔ مخالفین کو جب قیامت سے ڈرایا جاتا تو وہ جھٹ یہ سوال کرتے کہ 'مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ' آخر یہ دھمکی کب پوری ہو گی! اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتی! اس کے جواب میں فرمایا کہ اس کے آنے کا وقت صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ اگر اس کا وقت معلوم نہیں ہے تو اس سے اس حقیقت کی نفی نہیں ہو جاتی۔ زندگی کی کتنی حقیقتیں ہیں جن کے وقت اور ان کی نوعیت کا کسی کو علم نہیں ہوتا لیکن کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کرتا — بارش ہوتی ہے اور اس کے ہونے سے کوئی انکار نہیں کرتا لیکن اس کے ٹھیک ٹھیک وقت، اس کی مقدار اور اس کے مقامات کو کون بتا سکتا ہے! اس زمانے میں انسان نے، سائنس میں بڑی ترقی کر لی ہے اور حکومتیں لاکھوں کروڑوں روپے محکمہ موسمیات پر خرچ کرتی ہیں لیکن ان محکموں کی پیشین گوئیوں کی حقیقت ظن و تخمین سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح ایک عورت حاملہ ہوتی ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ یہ عورت جنے گی، لیکن کیا جنے گی اور کب جنے گی اس کو خدا کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ علیٰ ہذا القیاس کسی کو یہ پتہ نہیں کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا، کیا فرائض انجام دے گا اور کن حالات و مشاغل میں اس کی زندگی گزرے گی۔ بڑے بڑے

ضابطہ پسندوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی احتیاط سے اپنے پروگرام بناتے ہیں اور بڑی وضع داری سے ان کو نباہتے ہیں لیکن عین وقت پر کوئی ایسی افتاد پیش آجاتی ہے کہ ان کا سارا پروگرام درہم برہم ہوجاتا ہے۔ افراد تو درکنار حکومتوں تک کا حال یہ ہے کہ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ منصوبہ بندی کرتی ہیں کہ اس سال ہم اپنے ملک میں اتنی گندم یا اتنا چاول پیدا کریں گے لیکن ذرا سا موسم کا تغیر و تبدل اور بارش کا اتار چڑھاؤ ساری منصوبہ بندی پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اور زیادہ دور کیوں جائیے، آدمی کے لیے خود اپنی زندگی اور موت کا مسئلہ کتنی اہمیت رکھنے والا ہے لیکن کون جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا اور کہاں دفن ہوگا! آدمی گھر سے ہنسی خوشی کسی تقریب کے لیے نکلتا ہے اور وہاں سے اس کی لاش آتی ہے۔ پیدا کہاں ہوتا ہے، رہتا بستا کہیں ہے اور دفن کہیں ہوتا ہے۔ تو جب اتنی قریب کی ایسی واضح حقیقتوں کا علم بھی انسان کو نہیں ہے حالانکہ یہ زندگی کے وہ حقائق ہیں جن کا کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا تو قیامت کا اگر وقت نہیں معلوم ہے تو وہ کیوں مشتبہ ہوجائے!!

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ‎ اصلی علیم و خبیر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہی جانتا ہے کہ قیامت کب آئے گی، لیکن وہ آئے گی ضرور۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے وقوع کی شہادت دے رہا ہے۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وللہ الحمد والمنۃ۔

اتوار۔ ۸ بجے دن
۲۸ / جولائی ۱۹۷۴ء
رحمان آباد

تدبرِ قرآن

۳۲

السّجدة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سُورہ کا عمود اور سابق سُورہ سے تعلّق

یہ سورہ سابق سورہ ــــــ لقمان ــــــ کا مثنیٰ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ قرآنی نام بھی دونوں کا ایک ہی یعنی الٓمّٓ ہے۔ تمہید بھی دونوں کی ایک ہی نوع کی ہے۔ اس کا آغاز اس مضمون سے ہوتا ہے کہ یہ کتاب خداوند عالم کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اس کو اتار کر اللہ تعالیٰ نے ان امّی عربوں پر عظیم احسان فرمایا ہے جن کے اندر اب تک کوئی منذر نہیں آیا تھا۔ وہ انتہائی ناشکرے ہوں گے اگر انھوں نے اس کی قدر کرنے کے بجائے اس کے کتابِ الٰہی ہونے کے دعوے کو افترا قرار دیا۔ اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے بعد کلام کا رُخ قرآن کے ان دعاوی کے اثبات کی طرف مڑ گیا ہے جو خاص طور پر مخالفین کی وحشت کا باعث تھے اور جن کے سبب سے وہ اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ آخر میں تورات کا حوالہ ہے کہ اسی طرح کی کتاب، اللہ نے حضرت موسیٰؑ پر بھی اتاری تھی جس کی فرعون اور اس کی قوم نے مخالفت کی اور اس کا نہایت برا انجام ان کے سامنے آیا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جس طرح تورات کے حاملین کو صبر کے امتحانوں سے گزرنے کے بعد کامیابی حاصل ہوئی اسی طرح تم کو اور تمھارے ساتھیوں کو بھی صبر کے امتحان سے گزرنا پڑے گا۔ اگر تم ان مراحل سے کامیابی سے گزر گئے تو فتح تمہی کو حاصل ہوگی، تمھارے یہ مخالفین بالآخر پامال ہو کر رہیں گے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) یہ قرآن اللہ کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اس کے کتابِ الٰہی ہونے میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں ہے جو لوگ سمجھتے ہیں کہ خدا کی طرف اس کی نسبت ایک افترا ہے وہ آگاہ رہیں کہ یہ افترا نہیں بلکہ یہ بالکل حق ہے اور اس کا مقصد ان لوگوں کو انذار کرنا ہے جن کے اندر کوئی منذر اب تک نہیں آیا تھا۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان قوموں کا ہو چکا ہے جنھوں نے خدا کے منذروں کی تکذیب کی۔

(۴-۹) یہ دنیا کوئی بازیچۂ اطفال نہیں بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہے اور پیدا کر کے اس نے اس کو چھوڑ نہیں دیا ہے بلکہ براہِ راست وہ اس کا انتظام فرما رہا ہے۔ تمام احکام اسی کی طرف سے صادر ہوتے اور پھر اسی کے حضور میں پیش ہوتے ہیں۔ اس کا کوئی دوسرا شریک و شفیع نہیں ہے۔ وہ خود تمام غائب و حاضر کا جاننے والا ہے۔ اس نے انسان کو بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ان صلاحیتوں

سے فائدہ اٹھاتے اور خدا کے شکر گزار بنتے ہیں۔

(۱۰-۱۴) منکرینِ قیامت کے شبہات کا جواب اور ان کے اصل محرکِ انکار کی طرف اشارہ۔ قیامت کے دن ان کا جو حال ہوگا اس کی تصویر اور اس امر کا بیان کہ اس دن کسی کا اقرار و اعتراف کسی کے لیے کچھ نافع نہ ہوگا۔ حقائق کو آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ان کا ماننا معتبر ہوتا تو اللہ تعالیٰ سب کو ایمان ہی پر پیدا کرتا، پھر یہ عقل و تمیز کی صلاحیتیں دینے اور ان کے امتحان کی کیا ضرورت تھی!

(۱۵-۲۲) قرآن پر ایمان لانے والوں کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کہ جو لوگ استکبار سے پاک ہیں اور جن کی نگاہوں میں حق کی عزت ہے وہ اس پر ایمان لائیں گے۔ یہ لوگ اس کی آیات سن کر اپنے سر جھکا دیتے ہیں، راتوں میں اٹھ اٹھ کر اپنے رب کو یاد کرتے اور اس کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا رکھی ہے آج ان کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فرمانبردار بندوں اور نافرمانوں کے ساتھ ایک ہی معاملہ نہیں کرے گا۔ ان نافرمانوں کو آخرت میں جو سزا ہونی ہے وہ تو ہوگی ہی، اس دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ ان کو سزا دے گا تاکہ وہ متنبہ ہونا چاہیں تو متنبہ ہو جائیں۔

(۲۳-۲۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تم سے پہلے اللہ نے موسیٰ کو بھی کتاب دی تھی تو جن لوگوں نے اس کو جھٹلایا خدا نے ان سے انتقام لیا۔ اسی طرح اس کتاب کے جھٹلانے والوں سے بھی وہ لازماً انتقام لے گا اور جس طرح بنی اسرائیل کے اندر سے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو امامت کا منصب بخشا جو حق پر ثابت قدم رہے اسی طرح وہ تمہارے ساتھیوں کو بھی خلق کی رہنمائی کے منصب پر سرفراز فرمائے گا اگر وہ حق پر مضبوطی سے جمے رہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی تاریخ کی طرف اجمالی اشارہ کہ تاریخ کی شہادت اسی حقیقت کو ثابت کر رہی ہے بشرطیکہ لوگوں کے پاس سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھیں ہوں۔

(۲۷-۳۰) کفار کو وعید کہ وہ اہلِ حق کے غلبہ کی اس بشارت کو بہت بعید از امکان چیز سمجھتے ہیں اور مذاق سے پوچھتے ہیں کہ یہ فتح کب ظاہر ہوگی! ان کو جواب کہ جب یہ چیز ظاہر ہوگی تو اس وقت اس کو ماننا ان لوگوں کے لیے ذرا بھی نافع نہ ہوگا جو آج اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قسم کے کج فہموں سے اعراض کی ہدایت کہ اگر یہ لوگ فیصلہ کے دن ہی کے منتظر ہیں تو تم بھی ان کا پیچھا چھوڑو اور اسی کا انتظار کرو۔

سُوْرَةُ السَّجْدَةِ (۳۲)

مَكِّيَّةٌ ——————— اٰيَاتُهَا ۳۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آيات ۱-۱۴

الٓمّٓ ۝۱ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝۳ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۴ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاۗءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝۵ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝۶ۙ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝۷ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاۗءٍ مَّهِيْنٍ ۝۸ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝۹ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۭ بَلْ هُمْ بِلِقَاۗئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ ۝۱۰ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ

عٔ ۱۱ / ۱۴

وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ تُرْجَعُونَ ﴿١١﴾ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الْمُجْرِمُونَ نَاكِسُو رُءُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوقِنُونَ ﴿١٢﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٣﴾ فَذُوقُوا بِمَا نَسِيتُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا إِنَّا نَسِينَاكُمْ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٤﴾

ترجمۂ آیات ۱-۱۴

یہ الٓمٓ ہے۔ اس کتاب کی تنزیل، اس میں ذرا شبہ نہیں، خداوندِ عالم کی طرف سے ہے۔ کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے خود اپنے جی سے گھڑ کر اس کو خدا کی طرف منسوب کر دیا ہے! بلکہ یہی تیرے رب کی جانب سے حق ہے تاکہ تم ان لوگوں کو ہوشیار کر دو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی ہوشیار کرنے والا نہیں آیا تاکہ وہ راہ یاب ہوں۔ ۱-۳

اللہ ہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو چھ دنوں میں پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ اس کے سوا نہ تمھارے لیے کوئی کارساز ہے اور نہ اس کے مقابل میں کوئی سفارشی۔ کیا تم لوگ چیتتے نہیں! ۴

وہی آسمان سے زمین تک سارے امور کا انتظام فرماتا ہے۔ پھر یہ تمام امور اسی کی طرف لوٹتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمھارے شمار سے ہزار سال کے برابر ہے۔ وہ غائب و حاضر کا جاننے والا، عزیز و رحیم ہے۔ ۵-۶

جس نے جو چیز بھی بنائی ہے خوب ہی بنائی ہے! اس نے انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا۔ پھر اس کی نسل حقیر پانی کے خلاصہ سے چلائی۔ پھر اس کے نوک پلک سنوارے

اور اس میں اپنی روح پھونکی اور تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے ۔ تم بہت ہی کم شکر گزار ہوتے ہو!! ۷۔۹

اور کہتے ہیں کہ کیا جب ہم زمین میں رل مِل جائیں گے تو ہم پھر نئی خلقت میں آئیں گے! بلکہ یہ لوگ اپنے رب کے آگے پیشی کے منکر ہیں۔ کہہ دو کہ تمھاری جان وہ فرشتہ ہی قبض کرتا ہے جو تم پر مامور ہے پھر تم اپنے رب ہی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور اگر تم دیکھ پاتے اس وقت کو جب کہ یہ مجرمین اپنے رب کے حضور اپنے سر جھکائے ہوئے اعتراف کریں گے کہ اے ہمارے رب، ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا تو ہمیں لوٹا کہ ہم نیک کام کریں، ہم یقین کرنے والے بن گئے۔ اگر ہم چاہتے تو ہر ایک کو اس کی ہدایت خود ہی دے دیتے لیکن میری طرف سے یہ بات متحقّق ہو چکی ہے کہ میں جنوں اور انسانوں، سب سے جہنم کو بھر کے چھوڑوں گا، تو اب چکھو مزا اس بات کا کہ تم نے اس دن کی پیشی کو بھلائے رکھا۔ ہم نے بھی تم کو نظر انداز کیا اور تم اپنے کیے کی پاداش میں اب ہمیشگی کا عذاب چکھو۔ ۱۰۔۱۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱-۲)

'الٓمّٓ' کی تحقیق سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ سابق سورہ کی طرح اس سورہ کی تمہید بھی بقرہ کی تمہید سے ملتی جلتی ہوئی ہے۔

قرآن پر قریش اور یہود کا اصل اعتراض

'تنزیل' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ صرف اتارنے کے نہیں بلکہ اہتمام خاص کے ساتھ درجہ بدرجہ اتارنے کے ہیں۔ 'الکتٰب' سے مراد قرآن مجید ہے۔ یعنی اس کتاب کی تنزیل اللہ ربّ العٰلمین کی طرف سے ہے۔ اس کے اللہ ربّ العٰلمین کی طرف سے ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ 'لَا رَيْبَ فِيْهِ' کا یہی مفہوم ہم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ اس آیت سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ قریش اور یہود دونوں کو سب سے زیادہ اختلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس

دعوے سے تھا کہ یہ کتاب آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی جاتی ہے۔ اس دعوے کو وہ، جیسا کہ آگے کی آیت سے واضح ہوگا 'افتراء' قرار دیتے یعنی آنحضرت صلعم پر یہ الزام لگاتے کہ نعوذ باللہ اس کتاب کو یہ تصنیف تو خود کرتے ہیں لیکن ہمارے اوپر دھونس جمانے کے لیے اس کو جھوٹ موٹ منسوب اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں۔

اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىهُ ۚ بَلۡ هُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰىهُمۡ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ لَعَلَّهُمۡ یَهۡتَدُوۡنَ (۳)

یہ سوال حیرت و تعجب کی نوعیت کا ہے کہ کیا یہ لوگ حق کی مخالفت میں ایسے اندھے بہرے ہوگئے ہیں کہ اس کتاب کے کتابِ الٰہی ہونے کے دعوے کو افتراء قرار دیتے ہیں! مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کے اندر انصاف اور سچائی کی کوئی رمق ہوتی تو یہ بات وہ زبان سے نہ نکالتے لیکن یہ لوگ مخالفت کے جوش میں بالکل اندھے بہرے بن چکے ہیں۔

جواب میں دھمکی

'بَلۡ هُوَ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ'۔ اس الزام کا جواب قرآن مجید نے مختلف پہلوؤں سے دیا ہے جن کی وضاحت پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ یہاں کوئی تفصیلی جواب دینے کے بجائے نہایت سخت دھمکی کے انداز میں دعوے کو مزید مؤکد کر دیا ہے۔ اور یہ تاکید یہاں دو پہلوؤں سے نمایاں ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ یہی حق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جس دینِ آبائی کے علمبردار ہیں وہ بالکل باطل ہے، صحیح دین یہی ہے جس کی دعوت یہ کتاب دے رہی ہے۔ دوسرا یہ کہ اس کتاب کے متعلق اس وہم میں نہ رہیں کہ اس کو خدا کی طرف جھوٹ موٹ نسبت دی جا رہی ہے۔ یہ فی الحقیقت خدا ہی کی طرف سے ہے، اگر یہ لوگ اسی طرح اس کو جھٹلاتے رہے تو اس کا انجام خود بھگتیں گے۔

اُمّی عربوں پر اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان

'لِتُنۡذِرَ قَوۡمًا مَّاۤ اَتٰىهُمۡ مِّنۡ نَّذِيۡرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ لَعَلَّهُمۡ یَهۡتَدُوۡنَ'۔ یہ اس کتاب کے اس اہتمام کے ساتھ اتارنے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اس لیے اتاری ہے کہ تم اس کے ذریعہ سے ان لوگوں کو اس زندگی کے انجام اور آخرت کے احوال سے آگاہ کر دو جن کے اندر تم سے پہلے کوئی منذر نہیں آیا۔ یہاں 'قوم' سے مراد اہلِ عرب ہیں جن کے اندر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ یہ اس کتاب کے احسان کا پہلو نمایاں فرمایا گیا ہے کہ اُمّی عربوں پر اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب نازل کر کے بہت بڑا فضل فرمایا ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ اس عظیم نعمت کی قدر کریں۔

ساتھ ہی اس کے اندر انذار کا پہلو بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کے اندر اپنا منذر بھیج دیتا ہے تو اس قوم کی قسمت میزان میں آجاتی ہے۔ اگر اس کے بعد بھی وہ اپنے رویہ کی اصلاح نہیں کرتی تو ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو لازماً تباہ کر دیتا ہے۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت جگہ جگہ اس کتاب میں ہو چکی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ (۴)

انذار کا خاص موضوع

اوپر کی آیت میں اس کتاب کی تنزیل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا خاص مقصد انذار بتایا گیا ہے۔ اب یہ اسی کی تفصیل آرہی ہے۔ انذار کا خاص موضوع دو چیزیں ہیں۔ ایک توحید دوسری قیامت قرآن مجید اوّل تو اس بات سے ڈراتا ہے کہ لوگ غلط سہاروں اور فرضی معبودوں کی شفاعت کی امید پر زندگی نہ گزاریں۔ اس کائنات کا خالق و مدبر تنہا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے۔ سب کو بالآخر اسی کی طرف لوٹنا اور اسی کے آگے جواب دہ ہونا ہے۔ اس وجہ سے اسی کی شکرگزاری اور اسی کی عبادت و اطاعت سب پر واجب ہے۔

دوسرے وہ قیامت سے ڈراتا ہے کہ قیامت شدنی ہے۔ بالآخر سب کی پیشی خدا ہی کے آگے ہوگی۔ اس وقت مجرم اپنے جرم کا اعتراف اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں گے کہ اگر ایک مرتبہ پھر انھیں دنیا میں جانے کی مہلت نصیب ہو تو وہ ایمان و عمل صالح کی زندگی گزاریں گے لیکن وہاں اس قسم کی درخواستوں اور التجاؤں کا موقع باقی نہیں رہے گا۔

آیت زیر بحث اور بعد کی چند آیتوں میں توحید کا بیان ہوا ہے اس کے بعد قیامت اور احوالِ قیامت کا ذکر آئے گا۔

یہ کائنات کسی اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں نہیں آئی ہے

'اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ'۔ چھ دنوں سے مراد، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، خدائی ایام ہیں اور آگے وضاحت آرہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کا ایک دن ہمارے ہزار سالوں کے برابر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے چھ دنوں سے مراد چھ ادوار ہوں گے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کی خلقت کسی اتفاقی واقعہ کی طرح ظہور میں نہیں آئی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہایت تدریج و اہتمام کے ساتھ وجود بخشا ہے۔ یہ تدریج و اہتمام اس کی غایت و حکمت پر دلیل ہے اور اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کوئی کھیل تماشا نہیں ہے بلکہ ایک بامقصد و باغایت کارخانہ ہے۔

اس کا انتظام اللہ تعالیٰ براہ راست خود کر رہا ہے

'ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ'۔ یعنی اس اہتمام و انتظام سے اس دنیا کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ اس سے بے تعلق نہیں ہو بیٹھا ہے بلکہ وہ اپنے عرشِ حکومت پر متمکن ہو کر براہ راست اور بالفعل اس کا انتظام بھی فرما رہا ہے۔ یہ مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو پیدا کر کے اس کا انتظام اپنی دوسری مقرب ہستیوں کے سپرد کر دیا ہے اور خود اس سے بالکل الگ ہو بیٹھا ہے۔ اس تصور کی بنیاد جس وہم پر تھی اس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔

براہ راست انتظام کا لازمی نتیجہ

'مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ'۔ یہ اس کے لازمی نتیجہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جب

براہِ راست تمام امور کی باگ اسی کے ہاتھ میں ہے تو سب کی پیشی بھی اسی کے آگے ہوتی ہے اور وہی سارے معاملات کا فیصلہ فرمائے گا۔ اس وقت اس کے سوا نہ کوئی کسی کا کارساز و مددگار بن سکے گا اور نہ اس کے مقابل میں کوئی کسی کی سفارش کر سکے گا۔ لفظ 'دُوْنَ' میں سوا اور مقابل دونوں کا مفہوم پایا جاتا ہے اس وجہ سے یہاں 'وَلِیّ' کے ساتھ 'شَفِیْع' کی بھی نفی فرما دی۔

'اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ'۔ یہ تمام نتائج چونکہ مخاطب کے مسلّمات پر مبنی ہیں اس وجہ سے ان کو سامنے رکھ دینے کے بعد تنبیہ کیا کہ آخر ایسی واضح باتیں تم لوگ کیوں نہیں چیتتے!!

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ (۵-۶)

مشرکین کے ایک خاص گروہ کی تردید

یعنی آسمان سے لے کر زمین تک تمام امور کی تدبیر وہی فرماتا ہے۔ یہ مشرکین کے اس گروہ کی تردید ہے جو اس وہم میں مبتلا تھا کہ زمین چونکہ اللہ تعالیٰ کی کائنات کا ایک دور دراز علاقہ ہے اس وجہ سے اس نے اپنی حکومت صرف آسمان تک محدود رکھی ہے، زمین کا انتظام اس نے اپنے دوسرے کارندوں کے حوالہ کر دیا ہے۔ اسی گروہ کو مخاطب کر کے قرآن میں بعض جگہ یہ سوال آیا ہے کہ کیا زمین میں الگ خدا اور آسمان میں الگ خدا ہیں! کیسی بے عقلی کی باتیں کرتے ہو!

'ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ' یعنی تمام امور صادر بھی اسی کی طرف سے ہوتے ہیں اور پھر رجوع بھی اسی کی طرف ہوتے ہیں۔ 'يَعْرُجُ اِلَيْهِ' یہاں (REFER) ہونے کے مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ احکام صادر کر کے پھر بے تعلق نہیں ہو بیٹھتا بلکہ ہر چیز اس کے سامنے پیش ہوتی رہتی ہے اور وہ پوری طرح باخبر رہتا ہے کہ کارکنانِ قضا و قدر نے کیا فرائض انجام دیے اور کس طرح انجام دیے۔

خدائی ایام کی نوعیت

'فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ'۔ عام طور پر لوگوں نے اس سے مراد قیامت کا دن لیا ہے اور اس دن لوگوں کے اعمال کی جو پیشی خدا کے سامنے ہونی ہے ان کے نزدیک یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ قیامت کا دن چونکہ بہت سخت ہوگا اس کی اس سختی کو بطریق استعارہ یوں تعبیر فرمایا کہ وہ ہزار سال کے برابر بن جائے گا۔ ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ حج میں اس طرح آیا ہے:

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۴۷)	اور تمہارے رب کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار سے ہزار سالوں کے برابر کا ہوتا ہے۔

وہاں یہ آیت عذاب کے لیے لوگوں کی جلد بازی کے جواب میں وارد ہوئی ہے کہ جب ان کو عذاب سے ڈرایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اس عذاب کی دھمکی ہم ایک مدت سے سن رہے ہیں لیکن وہ آیا نہیں، اگر اس کو آنا ہے تو آ کیوں نہیں جاتا! ان کے جواب میں فرمایا ہے کہ خدا کے کاموں کو اپنے محدود پیمانوں

سے نہ ناپو۔ تمھارے دن چوبیس گھنٹوں کے ہوتے ہیں اس وجہ سے تمھیں چند سالوں کی مدت بھی بہت طویل محسوس ہوتی ہے لیکن خدا کے ہاں کا ایک دن تمھارے شمار سے ایک ہزار سال کے برابر کا ہوتا ہے اور اسی کے حساب سے اس کے سارے پروگرام اور منصوبے بنتے ہیں۔ تم اپنے دنوں کو پیش نظر رکھ کر گھبرانے لگتے ہو کہ فلاں بات پر اتنی مدت گزر گئی لیکن اب تک وہ واقع نہیں ہوئی اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکال لیتے ہو کہ یہ دھمکی تمھیں جھوٹ موٹ سنائی گئی حالانکہ خدائی دنوں کے اعتبار سے ابھی اس پر ایک گھڑی بھی نہیں گزری ہوتی ہے۔

بعینہٖ اسی سیاق میں آیت زیر بحث بھی وارد ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام امر و تدبیر خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ اسی کی طرف سے احکام صادر بھی ہوتے ہیں اور پھر اسی کی طرف لوٹتے بھی ہیں لیکن یہ صادر ہونا اور لوٹنا سب خدائی دنوں کے حساب سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے نہ ہر شخص ان کے نتائج سے آگاہ ہو سکتا اور نہ ہر شخص ان کی حکمتوں کو سمجھ سکتا ہے۔ بندوں کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ خدا کے معاملات میں جلد بازی نہ کریں بلکہ صبر کے ساتھ انتظار کریں۔

ذٰلِكَ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ۔ غیب اور حاضر کا جاننے والا اور عزیز و رحیم وہی ہے۔ دوسرے کسی کا بھی یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ کائنات کے تمام اسرار سے واقف ہو سکے۔ وہ تمام غائب و حاضر سے واقف بھی ہے اور عزیز و رحیم بھی ہے۔ اس وجہ سے بندوں کو چاہیے کہ وہ کامل حسن ظن کے ساتھ اس پر بھروسہ کریں۔

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ یہی مضمون سورۂ معارج میں یوں وارد ہوا ہے:

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوحُ اِلَيْهِ	فرشتے اور جبریل اس کی طرف صعود کرتے
فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ	ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مدت پچاس
اَلْفَ سَنَةٍ (۴)	ہزار سال کے برابر ہے۔

بظاہر اس آیت اور اوپر کی آیت میں تضاد معلوم ہوتا ہے لیکن یہ تضاد نہیں ہے۔ دنوں کا یہ تفاوت مداروں کے اختلاف پر مبنی ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے مختلف سیاروں کے دن الگ الگ ہیں۔ پھر یہ بات بھی توجہ کے قابل ہے کہ آیت زیر بحث میں امور کے پیش کیے جانے کا ذکر ہے اور سورۂ معارج میں ملائکہ اور جبریل کی پیشی کا ذکر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ امور کی پیشی ہزار سال کے دن میں ہوتی ہو اور ملائکہ اور جبریل کی براہ راست پیشی کا دن پچاس ہزار سال کے برابر ہو۔ یہ امور غیب ہیں۔ ان کے باب میں کوئی بات جزم کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تاہم اتنی بات بالکل واضح ہے کہ دونوں آیتوں میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ سورۂ حج کی تفسیر میں اس مسئلہ پر ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ سورۂ معارج کی تفسیر میں ان شاء اللہ ہم اس کے بعض دوسرے گوشوں پر بھی نظر ڈالیں گے۔

الَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَہٗ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىہُ وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَۃَ ۭ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ ۝ (۷-۹)

انذارِ قیامت کے لیے تمہید صفاتِ الٰہی سے

اللہ تعالیٰ کی صفات عالم الغیب والشہادۃ اور عزیز و رحیم کو بنیاد قرار دے کر آگے قیامت کے انذار کے لیے تمہیداً استواد فرمائی کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی۔ یعنی اس نے جو چیز بھی بنائی ہے اس کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور اس کے بے نہایت علم کی شاہد ہے۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی لے کر انسان اگر اس پر غور کرے تو اس کی عقل صانع کی صنعت و کاریگری پر دنگ رہ جاتی ہے اور وہ بے خود ہو کر پکار اٹھتا ہے کہ تَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ (بڑی ہی بابرکت ذات ہے اللہ، بہترین پیدا کرنے والا!!) یہیں سے انسان پر اس حقیقت کا دروازہ کھلتا ہے کہ جو ذات اتنی قدرت رکھنے والی، اتنی حکیم، اتنی باریک بیں اور ایسی رحمان و رحیم ہے اس کی نسبت یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اتنا بڑا عالم بالکل بے مقصد کھڑا کر دے۔ پس ضرور ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس میں وہ حق و باطل میں امتیاز کرے۔ ان لوگوں کو جزا دے جنھوں نے اس کی نعمتوں کا حق پہچانا اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس دنیا میں اندھوں بہروں کی زندگی گزاری، نہ انھوں نے خود اس کی حکمتوں پر غور کیا اور نہ دوسرے غور کرنے والوں کی باتوں کو لائق اعتنا سمجھا۔

خدا کی قدرت کا کرشمہ — انسان

'وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ'۔ اوپر والے ٹکڑے میں یہ بات جو فرمائی ہے کہ اس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی، اس کے ثبوت میں خارج کی مثالیں پیش کرنے کے بجائے خود انسان ہی کی خلقت کو بطور مثال پیش کیا ہے کہ اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود اپنی ہی خلقت کے مراحل و مدارج پر غور کرو اور دیکھو کہ خدا کی قدرت و حکمت اور اس کی ربوبیت کی کیا کیا نشانیاں تمھارے اندر ظاہر ہوئی ہیں! فرمایا کہ یہ انسان جو آج اپنی قابلیتوں پر اتنا نازاں ہے، اس کا آغاز خدائے حکیم و قدیر نے کسی بڑے قیمتی جوہر سے نہیں کیا بلکہ مٹی سے کیا، اسی سے اس کا قالب بنا اور اسی مٹی کے اندر سے اس کے اندر زندگی کی حرکت نمودار ہوئی لیکن دیکھو خالق کی قدرت و حکمت کہ اس نے مٹی کے لوندے کو کیا سے کیا بنا دیا!!

انسان کی خلقت کا دوسرا مرحلہ

'ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَہٗ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ'۔ یہ انسان کی خلقت کے دوسرے مرحلہ کی طرف اشارہ ہے کہ دوسرے مرحلے میں اس کی حیثیت یہ ہوئی کہ مٹی کے بجائے اس کی نسل کے چلنے کا ذریعہ حقیر و ناپاک پانی کا خلاصہ بنا۔

تیسرا مرحلہ

'ثُمَّ سَوّٰىہُ وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَۃَ'۔ 'تسویۃ' کے معنی جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، کسی چیز کو سنوارنے اور اس کی نوک پلک درست کرنے

کے ہیں۔ آرٹ کی اصطلاح میں جس چیز کو تکمیلی یا اتمامی عمل (FINISHING TOUCH) کہتے ہیں ٹھیک وہی مفہوم 'تَسْوِیَۃ' کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیسرے مرحلے میں اگر اس نے مٹی سے بنتے ہوئے اس انسان کے نوک پلک سنوارے اور اس کے اندر اپنی روح پھونکی تب اس کے اندر سمع و بصر اور دل کی وہ صلاحیتیں نمودار ہوئیں جو دوسری حیوانی مخلوقات کے مقابل میں اس کے لیے وجہ امتیاز ہیں۔

انسان کا اصلی شرف

'نَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ' میں روح سے مراد وہ روح ہے جس کو ہم روحِ ملکوتی سے تعبیر کرتے ہیں۔ انسان کے اندر حیوانی روح کے ساتھ ایک نورِ یزدانی (DIVINE SPARK) بھی ہے اور اسی نور کے فیض سے انسان کے سمع و بصر اور فواد میں وہ روشنی پیدا ہوتی ہے جس سے اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہوا ہے۔ اگر اس روشنی سے وہ محروم ہو جائے تو پھر اس کا باطن بھی اسی طرح تیرہ و تار ہے جس طرح حیوانات کا ہے۔ کان، آنکھ اور دل حیوانات کے پاس بھی ہیں لیکن وہ نورِ یزدانی سے محروم ہیں اس وجہ سے ان کے کانوں، آنکھوں اور دلوں میں وہ صلاحیت نہیں ہے جو انسان کے سمع و بصر اور دل میں ہے۔ اگر انسان اپنے کو اس نور سے محروم کرلے تو پھر وہ بھی ایک حیوان ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس نور کو باقی رکھنا اور اس کو بڑھانا یا گھٹانا انسان کے اپنے اختیار پر منحصر ہے۔ جو لوگ اس کی قدر کرتے اور اس کے حقوق ادا کرتے ہیں وہ اس میں اضافہ کرتے ہیں اور ان کے اندر یہ قوی سے قوی تر ہوتا جاتا ہے اور جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے ان کے اندر یہ ضعیف ہوتے ہوتے بالکل ہی بجھ جاتا ہے۔

'مِنْ رُّوْحِہٖ' میں اضافت سے مقصود فی الجملہ اس روح کے اختصاص کا اظہار ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے خاص فیوض و برکات میں سے ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کوئی حصّہ ہے۔ اس غلط فہمی پر تنبیہ اس لیے ہم نے ضروری سمجھی ہے کہ وحدت الوجود کی گمراہیوں میں بڑا دخل اسی غلط فہمی کا ہے۔

تسویہ اور نفخ روح سے پہلے انسان حیوانیت کے دور میں تھا

اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تسویہ اور نفخ روح سے پہلے انسان پر ایک دَور ایسا بھی گزرا ہے جب انسان حیوانات کی طرح ناتراشیدہ اور بصیرت و ادراک سے محروم تھا۔ اس دَور کے بعد تسویہ نے اس کے ظاہر کو سنوارا اور نفخ روح نے اس کے باطن کو منور کیا۔

خلاصۂ بحث

'قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ' یعنی اپنی خلقت کے ان تمام مراحل پر غور کرو کہ کس طرح خدا نے تمہارا آغاز کیا اور پھر کس درجے تک تم کو پہنچایا! حق تھا کہ تمہارا بال بال اپنے رب کی اس عنایت و ربوبیت کا شکرگزار ہوتا اور جو نعمتیں و صلاحیتیں اس نے تم کو بخشیں ان کو تم اس کی رضا کے کاموں میں استعمال کرتے لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم بہت ہی کم اس کے شکرگزار ہوتے ہو۔

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِی الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ۚ بَلْ ھُمْ بِلِقَآئِ رَبِّھِمْ کٰفِرُوْنَ (۱۰)

سب کچھ دیکھنے کے بعد انسان کی بے بصیرتی

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو سمع و بصر اور ادراک و تعقل کی جو صلاحیتیں بخشی تھیں وہ اس لیے بخشی تھیں کہ ان سے وہ کام لیں اور خدا کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کے آثار کے مشاہدہ سے اس نتیجے تک پہنچیں کہ یہ دنیا عبث نہیں پیدا ہوئی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے بعد ایک ایسا دن آئے جس دن ہر شخص اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے اپنے رب کے حضور حاضر کیا جائے اور وہ جزا یا سزا پائے لیکن اس انسان کی کج فہمی کا یہ حال ہے کہ جب اس کو قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو خدا کی قدرت کی اتنی شانیں دیکھنے کے باوجود، وہ طنز و استہزار کے ساتھ یہ سوال کرتا ہے کہ کیا جب ہم گل سڑ کر زمین میں رل مل جائیں گے تو اس کے بعد از سر نو زندہ کیے جائیں گے!!

قیامت کے انکار کے لیے ایک بہانہ

'بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ'۔ یعنی یہ باتیں سب اوپر کے بہانے ہیں۔ آخر خدا کی اتنی شانیں اپنے وجود کے اندر اور باہر دیکھتے ہوئے یہ اتنے غبی کس طرح ہو سکتے ہیں کہ اپنے دوبارہ پیدا کیے جانے کو اس کی قدرت سے بعید سمجھیں! اصل چیز یہ ہے کہ یہ لوگ خدا کے آگے پیشی اور اعمال کی جواب دہی کے منکر ہیں، اس چیز کو تسلیم کرنا ان کے دلوں پر بہت شاق ہے اس وجہ سے اس سے گریز کے لیے یہ تمام عقلی استبعادات اور شبہات گھڑے اور اٹھائے جا رہے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بسا اوقات انسان انکار تو کسی اور چیز کا کرنا چاہتا ہے لیکن اس کے انکار کے لیے بہانہ کسی اور چیز کو بناتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ براہِ راست اس حقیقت کے انکار کی کچھ زیادہ گنجائش وہ نہیں پاتا۔ مشرکین عرب کا حال بھی یہی تھا۔ وہ خدا کے قائل تھے اس وجہ سے خدا کے آگے پیشی کا صریح انکار ان کے لیے مشکل تھا لیکن اس کو ماننے سے جو بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں وہ ان کے لیے بھی تیار نہیں تھے اس وجہ سے اس سے گریز کے لیے اول تو وہ قیامت پر اس قسم کے شبہات وارد کرتے تھے جس کی ایک مثال اوپر گزری اور بدرجۂ آخر اس کو مانتے بھی تھے تو اس کے نتائج سے بچاؤ کے لیے انھوں نے شرکاء و شفعاء ایجاد کر لیے تھے۔

دونوں شبہات کا اکٹھا جواب

قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ (۱۱)

یہ اوپر کی دونوں باتوں کا جواب ہے کہ جو مرتا ہے اس کو خدا کا وہ فرشتہ ہی وفات دیتا ہے جو خدا کی طرف سے ہر شخص پر مامور ہے۔ اس وجہ سے کوئی شخص مرنے کے بعد بھی خدا اور اس کے مامور ملائکہ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ چاہے گا وہ ہر شخص کو اٹھا کھڑا کرے گا اور وہ اس کے مامور ملائکہ کی نگرانی میں ان کے سامنے حاضر کیا جائے گا۔

'ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ'۔ یعنی کوئی اس طمع خام میں بھی مبتلا نہ رہے کہ اس کی واپسی اس کے مزعومہ شرکاء و شفعاء کی طرف ہونی ہے۔ اس دن ان شرکاء و شفعاء کا کوئی وجود نہیں ہوگا، سب کی پیشی اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سامنے ہی ہوگی اور وہی سب کا فیصلہ فرمائے گا۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا

نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ (۱۲)

'وَلَوْ تَرٰٓی' میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ہو سکتا ہے اور عام مخاطبوں سے بھی۔ پہلی شکل میں یہ آیت تسلی کے سیاق میں ہوگی اور دوسری صورت میں تہدید کے سیاق میں۔ اگر پہلی صورت اختیار کیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ آج تو یہ لوگ تمھارے آگے بہت اکڑ رہے ہیں اور بڑے تبختر د رعونت کے ساتھ قیامت اور خدا کے آگے پیشی کا انکار کر رہے ہیں لیکن اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب یہ تمام مجرمین سر نہیوڑائے اپنے رب کے سامنے حاضر ہوں گے تو ـــــ یہاں تمنی کا جواب محذوف ہے اور اس حذف میں بڑی بلاغت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس وقت ان کی بے بسی کا وہ منظر دیکھتے جس کا آج تصور بھی نہیں کر سکتے!

خطاب کی نوعیت اور تمنی کے جواب کے حذف کی بلاغت

'رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ'۔ یعنی اس وقت ان میں سے ہر ایک کی زبان پر یہ اعتراف ہوگا کہ اے ہمارے رب! ہم نے اچھی طرح دیکھا اور سن لیا۔ اب ہمیں ایک بار دنیا میں پھر لوٹا تاکہ ہم کچھ نیکی کمائیں۔ ہمیں ہر بات کا پورا یقین ہوگیا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ (۱۳)

یہ ان کے اعتراف اور ان کی درخواست کا جواب ہے جو برسرِ موقع ان کو دیا جائے گا کہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد تمھارا یہ اقرار و ایمان بالکل بے سود ہے۔ اگر اللہ کو اس طرح کا مجبورانہ ایمان پسند ہوتا تو وہ ہر شخص کو ایمان و ہدایت پر ہی پیدا کرتا۔ یہ اس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں تھا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہدایت کے معاملے میں اس نے لوگوں کو اختیار دیا کہ وہ امتحان کرے کہ کون اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر ایمان کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون اپنی خواہشوں کی پیروی میں شیطان کی راہ پسند کرتا ہے۔

مشاہدہ کے بعد کا ایمان بے سود ہے

'وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ' یہ اس فیصلہ کی طرف اشارہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اس کے چیلنج کے جواب میں آگاہ فرما دیا تھا۔ قرآن میں اس کا ذکر جگہ جگہ آیا ہے۔ سورۂ صٓ میں اس کا حوالہ یوں ہے:

اللہ تعالیٰ کے حتمی فیصلہ کا حوالہ

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝	ابلیس نے کہا تیرے عزت و جلال کی قسم! میں
اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝	ان سب کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ بس ان میں سے تیرے
قَالَ فَالْحَقُّ ۡ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۝	خاص بندے ہی بچ رہیں گے۔ اللہ نے فرمایا کہ پھر یہ
لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ	بات بھی حق ہے اور میں حق ہی کہتا ہوں کہ میں بھی
وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ	تجھ سے اور تیری ذریت سے اور ان انسانوں میں

اَجْمَعِیْنَ ٥ (ص: ۸۲-۸۵) سے جو تیری پیروی کریں گے، سب کو جہنم میں بھر کے رہوں گا۔

یہاں اس قول کا حوالہ دینے سے مقصود مجرموں کو اس بات سے آگاہ کرنا ہوگا کہ اب عذر و معذرت کا وقت گزر گیا۔ اللہ نے شیطان کے جواب میں پہلے ہی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ وہ بنی آدم میں سے جن کو گمراہ کر سکتا ہے گمراہ کرلے۔ انسان کو خدا نے یہ آزادی دی ہے کہ وہ چاہے تو رحمان کی راہ اختیار کرے اور چاہے تو شیطان کی راہ اختیار کرے۔ دنیا کی زندگی میں یہ امتحان تھا۔ اب امتحان کا مرحلہ گزر چکا اور نتائج بھگتنے کی باری ہے چنانچہ آج وہ انجام تمھارے سامنے آگیا اور میری بات تم پر پوری ہوئی۔

فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا ۚ اِنَّا نَسِیْنٰکُمْ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۴)

'نسی' کے معنی ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، نظر انداز کرنے اور ٹالنے کے بھی آتے ہیں۔ یہاں یہ نظر انداز کرنے ہی کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب کسی سوال و درخواست کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ جس طرح تم نے اس دن کو نظر انداز کیے رکھا آج ہم نے تم کو نظر انداز کیا۔ اب تمھاری کوئی درخواست و التجا ہمارے نزدیک درخور اعتنا نہیں رہی۔ اب اپنے اعمال کی پاداش میں ہمیشگی کا عذاب چکھو۔ یعنی یہ تمھارے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ عمر بھر جس فصل کی تم نے کاشت کی ہے یہ اسی کا حاصل تمھارے سامنے آیا ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۵-۲۲

اوپر کی آیات سے واضح ہوا کہ جو لوگ قرآن پر ایمان لانے سے گریز کر رہے تھے ان کے گریز کے اسباب کیا تھے۔ اب آگے کی آیات میں یہ بتایا ہے کہ کس قسم کے لوگ ہیں جو اس کتاب پر ایمان لا رہے ہیں یا لائیں گے اور ان کے لیے خدا کے ہاں کیا اجر و ثواب اور کیا مرتبہ و مقام ہے اور جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ دنیا اور آخرت دونوں میں کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں ــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۵-۲۲

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ﴿۱۵﴾ السجدة تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۫ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ ۚ

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑰ اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ ⑱ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى ۡ نُزُلًۢا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑲ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ⑳ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ㉑ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ثُمَّ اَعْرَضَ عَنْهَا ۭ اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِيْنَ مُنْتَقِمُوْنَ ㉒

وقف غفران

ع ۲ ۱۱ ۱۵

ترجمۂ آیات ۱۵-۲۲

ہماری آیات پر تو بس وہی لوگ ایمان لاتے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے ذریعہ سے ان کو یاددہانی کی جاتی ہے تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور وہ تکبّر نہیں کرتے۔ ان کے پہلو بستروں سے کنارہ کش رہتے ہیں۔ وہ اپنے رب کو پکارتے ہیں خوف اور طمع سے اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں تو کسی کو پتہ نہیں کہ ان لوگوں کے واسطے ان کے اعمال کے صلہ میں آنکھوں کی کیا ٹھنڈک پوشیدہ ہے!! ۱۵-۱۷

تو کیا وہ جو مومن ہے اس شخص کے مانند ہو جائے گا جو نافرمان ہے! دونوں یکساں نہیں ہو سکتے!! جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے ان کے لیے راحت کے باغ ہیں جو ان کو ان کے اعمال کے صلہ میں، اولین سامانِ ضیافت کے طور پر، حاصل ہوں گے۔ رہے وہ جنھوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ جب جب وہ اس

ہیں سے نکلنے کی کوشش کریں گے اسی میں دھکیلے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ اب اس دوزخ کے عذاب کا مزہ چکھو جس کی تم تکذیب کرتے رہے تھے۔ ۱۸-۲۰

اور ہم ان کو بڑے عذاب کے سوا قریب کا عذاب بھی چکھائیں گے تاکہ یہ رجوع کریں۔

اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جن کو ان کے رب کی آیات کے ذریعہ سے یاد دہانی کی جائے پھر وہ ان سے اعراض کریں! ہم ایسے مجرموں سے ضرور انتقام لیں گے۔ ۲۱-۲۲

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ (۱۵)

قرآن پر ایمان لانے والوں کی صفات

یہ آیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کے سیاق میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی دنیوی برتری کے زعم میں اپنے کو حق سے بھی بڑا سمجھنے لگے ہیں ان سے کسی خیر کی امید نہ رکھو، ہماری ان آیات پر صرف وہ لوگ ایمان لائیں گے جن کے دلوں کے اندر خشیت و انابت ہے۔ ان کو جب ان کے ذریعہ سے خدا اور آخرت کی یاددہانی کی جاتی ہے تو وہ جھگڑنے کے بجائے بے تحاشا سجدوں میں گر پڑتے اور اپنے رب کی تسبیح کرتے ہیں اس کی حمد کے ساتھ۔ یعنی ان آیات سے اثر پذیر وہ لوگ ہوں گے جن کے دلوں کے اندر قساوت نہیں پیدا ہوئی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کے دلوں پر اگر غفلت کا کچھ غبار ہوتا ہے تو وہ تذکیر و تنبیہ سے فوراً صاف ہو جاتا ہے اور پھر وہ حق کو ایسے جوش و جذبہ کے ساتھ اختیار کرتے ہیں کہ سالوں کی منزل، دنوں میں طے کرتے ہیں۔

'سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ'۔ 'تسبیح' اور 'حمد' دونوں کے ایک ساتھ ذکر کرنے کے فائدے پر ہم دوسری جگہ روشنی ڈال چکے ہیں۔ 'تسبیح' کے اندر تنزیہہ کا پہلو غالب ہے اور 'حمد' کے اندر اثبات کا ۔۔۔ خدا کی صحیح معرفت ان دونوں ہی پہلوؤں کو ملحوظ رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی پہلو بھی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو انسان خدا کے باب میں ایسی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ خدا کا وجود اور عدم دونوں اس کے لیے یکساں ہو کے رہ جاتا ہے۔

گُر کی بات

'وَهُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ'۔ یہ اصل گُر کی بات ارشاد ہوئی ہے کہ ان لوگوں کے اندر یہ صلاحیت اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ ان میں استکبار نہیں ہے۔ استکبار کی حقیقت پر ہم دوسری جگہ روشنی ڈال چکے ہیں۔

اس کا صحیح مفہوم حق کے مقابل میں اکڑتا ہے۔ یہ بیماری اُمّ الامراض ہے۔ جو لوگ اس مہلک مرض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اپنی خواہشوں اور اپنی رائے کے مقابل میں کسی واضح سے واضح حق کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو قبولِ حق کی صلاحیت سے بالکل ہی محروم کر دیتا ہے۔ قبولِ حق کی توفیق صرف وہی لوگ پاتے ہیں جو حق کو، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، ہر چیز سے بالا سمجھتے ہیں اور جب وہ ان کے سامنے آتا ہے تو خواہ کسی گوشے سے آئے، یہاں تک کہ اگر ان کا دشمن بھی اس کو پیش کرے، تو وہ فوراً اس کے آگے گردن جھکا دیتے ہیں۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۫ وَّمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۱۶)

یعنی ان لوگوں پر خدا کے حضور پیشی اور آخرت کی باز پرس کا خوف چونکہ ہر وقت طاری رہتا ہے اس وجہ سے وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اور بستروں کی لذت و راحت سے اپنے کو محروم رکھ کر اپنے رب کو پکارتے اور اس کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ یہ ڈرتے بھی اسی سے ہیں اور امید بھی اسی سے رکھتے ہیں۔ اور جو کچھ خدا نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خدا کی راہ میں وہ خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت میں دو چیزوں کا ذکر آیا ہے۔ ایک نماز، دوسری انفاق۔ ایمان کے بعد یہی دو چیزیں اس کے اولین مظاہر کی حیثیت رکھتی ہیں اور پھر انہی دو پر پورے دین کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس مسئلہ پر ہم اس کتاب میں جگہ جگہ بحث کر چکے ہیں۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۷)

شب بیداریوں اور قربانیوں کا صلہ تصور سے بالاتر!

یہ ان لوگوں کی شب بیداری اور انفاق کا صلہ بیان ہوا ہے کہ ان کے لیے اللہ نے آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا رکھی ہے اس دنیا میں اس کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ ایک نادیدہ عالم کی زندگی کی خاطر ان لوگوں کی ان جانفشانیوں پر آج جو لوگ ہنس رہے ہیں وہ بھی اس کو دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے اور اہلِ ایمان بھی نہال ہو جائیں گے کہ ان کی قربانیوں کا صلہ ان کے اندازوں اور قیاسوں سے کہیں بڑھ کر ملا۔

'جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ'۔ یعنی یہ جو کچھ ان کو ملے گا ان کے اپنے ہی اعمال کا صلہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ان کی چند روزہ مساعی کا صلہ ایک ابدی بادشاہی کی صورت میں دے گا اور فرمائے گا کہ یہ تمھارے اپنے ہی اعمال کا صلہ ہے۔ ہر چند یہ جو کچھ ملے گا یہ ہو گا اللہ تعالیٰ کا فضل لیکن اس کو اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا ثمرہ قرار دے گا اس لیے کہ آدمی کو اپنے کارناموں کے ثمرات و نتائج سے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ کسی دوسری چیز سے نہیں حاصل ہوتی۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ (۱۸)

اوپر کی بات کی دلیل

یہ اوپر والی بات کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ یہ جو کچھ کہا گیا ہے اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش

نہیں ہے۔ ایسا ہی ہوگا اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دنیا کے خالق کے نزدیک مومن اور فاسق دونوں یکساں ہیں اور وہ اپنے وفادار بندوں اور اپنے باغیوں اور غداروں میں کوئی فرق نہیں کرے گا۔ ایسا سمجھنا اس کارخانۂ کائنات کے مبنی برحکمت ہونے کی نفی اور اس کے خالق کے عادل، رحیم اور حکیم ہونے کا انکار ہے اس وجہ سے یہ بات صریحاً باطل ہے۔ دونوں خدا کے نزدیک یکساں نہیں ہو سکتے پس ضروری ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں خدا کے وفادار بندے اپنی وفاداریوں کا صلہ پائیں اور اس کے نافرمان اپنی نافرمانیوں کی سزا بھگتیں۔

وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰی نُزُلًا بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۱۹)

جنات الماوٰی

یہ اس جزا اور سزا کی تفصیل بیان فرمائی کہ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی زندگی بسر کریں گے ان کے لیے راحت کے باغ ہوں گے جو ان کو ان کے اعمال کے صلہ میں اولین سامانِ میزبانی کی حیثیت سے ملیں گے۔ 'نُزُل' اس سامانِ ضیافت کو کہتے ہیں جو مہمان کے سامنے اس کے مرکب سے اترتے ہی پیش کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 'جنّات الماویٰ' سے مراد وہ جنتیں ہیں جن میں یہ اہلِ ایمان اوّل اوّل اتارے جائیں گے۔ وہاں ان کی ابتدائی ضیافت ہوگی اور پھر وہ اصل جنت میں بھیجے جائیں گے۔ گویا ان باغوں کی حیثیت اہلِ جنت کے لیے (REST HOUSE) کی ہوگی اور اس کے جمع لانے سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ باغ تمام اہلِ جنت کے لیے الگ الگ ہوں گے۔ سورۂ نجم کی آیت ۱۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ 'جَنَّۃُ الْمَاْوٰی'، 'سدرۃ المنتہٰی' کے پاس ہے اور 'سدرۃ المنتہٰی' عالمِ ناسوت اور عالمِ لاہوت کے درمیان آخری نقطۂ اتصال ہے اس وجہ سے اگر اس کے پاس 'جنّات الماویٰ' ہوں تو یہ ان کے لیے موزوں ترین مقام ہے۔ یہ امورِ غیب کی باتیں ہیں، ان کے باب میں کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے لفظ 'نُزُل' کے مقتضیات کی وضاحت کے لیے لکھا ہے۔ ان شاء اللہ سورۂ نجم کی تفسیر میں 'جنت الماویٰ' پر مزید بحث آئے گی۔

وَاَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِیْدُوْا فِیْهَا وَقِیْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۲۰)

فسّاق کا انجام

اہلِ ایمان کی جزا بیان کرنے کے بعد یہ فسّاق و فجّار کی سزا کا بیان ہے۔ فرمایا کہ ان کا ٹھکانا دوزخ ہوگی۔ یہ اس میں سیدھے دھکیل دیے جائیں گے۔ دوزخ میں ان کے لیے اولین سامانِ ضیافت، قرآن کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ کھولتا ہوا پانی اور زقّوم ہوگا۔ یہ وہاں سے نکلنے کے لیے زور لگائیں گے لیکن جب جب نکلنے کی کوشش کریں گے اسی میں دھکیل دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ اب یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ وہی دوزخ اور اس کا عذاب ہے جس کا تم مذاق اڑاتے رہے تھے۔ اب اس کا مزا چکھو!

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۲۱)

قریش کے لیے تنبیہی عذاب

'عَذَابِ اَدْنیٰ' سے مراد اس دنیا کا عذاب ہے جو تذکیر و تنبیہ کے لیے آتا ہے۔ اوپر کی آیت میں 'عذاب اکبر' کا ذکر تھا جس سے کفار کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا۔ فرمایا اس 'عذاب اکبر' سے پہلے اس دنیا میں بھی ہم ان لوگوں کو اپنے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔ 'ان لوگوں' سے مراد ظاہر ہے کہ قریش ہیں۔ یہاں جو باتیں فرمائی گئی ہیں اگرچہ عام الفاظ میں فرمائی گئی ہیں لیکن ان کے اوّل مخاطب قریش ہی ہیں۔ ان کو دھمکی دی ہے کہ وہ متنبہ رہیں کہ اس دنیا میں بھی ان کو سزا ملے گی اور مقصود اس سے یہ ہوگا کہ وہ اپنی غلط روش سے باز آئیں اور صحیح زندگی کی طرف پلٹیں — اس 'عَذَابِ ادنیٰ' کا سلسلہ قریش کے لیے غزوۂ بدر سے شروع ہوا جس میں ان کو پہلا چرکا لگا اور ان کے بڑے بڑے سردار مارے گئے۔ پھر یکے بعد دیگرے اسی طرح کے حالات سے ان کو سابقہ پیش آتا رہا۔ یہاں تک کہ فتح مکہ کے موقع پر ان کی قوت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ ان کے اندر جو اچھے لوگ تھے وہ آہستہ آہستہ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے اور جو اشرار و مفسدین تھے وہ بالتدریج ختم ہوگئے۔ چونکہ ان کی اکثریت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائی اس وجہ سے ان پر کوئی اس قسم کا فیصلہ کن عذاب نہیں آیا جس قسم کے عذاب پچھلی قوموں پر آئے بلکہ یہ صرف تنبیہ کر کے چھوڑ دیے گئے، جیسا کہ 'لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ' کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے۔

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ ثُمَّ أَعْرَضَ عَنْهَا ۚ إِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِينَ مُنتَقِمُونَ (۲۲)

رسول کی تذکیر کے بعد عذاب لازمی ہے

اوپر کی آیت میں عذاب کی جو دھمکی دی ہے یہ اس کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ آخر ہم ان کو عذاب کیوں نہ دیں گے! ان سے بڑھ کر ظالم و مجرم کون ہو سکتا ہے جن کو ہماری آیات کے ذریعہ سے تذکیر و تنبیہ کی جائے اور وہ ان سے رُوگردانی کریں! تذکیر و تنبیہ کا سب سے بڑا ذریعہ خدا کی کتاب اور اس کا رسول ہی ہو سکتا ہے۔ جو لوگ اس آخری ذریعہ تذکیر و تنبیہ سے بھی نہ جاگے اب سنتِ الٰہی کے تحت ان کے جگانے کے لیے کوئی دوسری چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اب لاریب وہ مجرم ہیں اور ہم ایسے مجرموں سے لازماً انتقام لے کے رہیں گے۔ کسی قوم میں رسول کی بعثت کے بعد اللہ تعالیٰ اس قوم کے ساتھ جو معاملہ کرتا ہے اس کی وضاحت ہم اس کتاب میں جگہ جگہ کرتے آئے ہیں۔ اس آیت کو اس کی روشنی میں سمجھیے۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۳-۳۰

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ اوپر کے پیرے میں قریش کو یہ دھمکی جو دی ہے کہ ہدایت کے آ جانے کے بعد اگر وہ اس پر ایمان نہ لائے تو لازماً وہ اس دنیا میں بھی خدا کے عذاب سے دوچار ہوں گے

اور آخرت میں بھی ان کو عذاب سے سابقہ پیش آئے گا۔ آگے کی آیات میں اسی حقیقت کو تاریخ کی روشنی میں مبرہن کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کو بشارت دی ہے کہ اگر وہ ثابت قدم رہے تو بالآخر کامیابی انہی کو حاصل ہوگی ـــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۳-۳۰

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُن فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَائِهِ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿٢٣﴾ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ ﴿٢٤﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿٢٥﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّنَ الْقُرُونِ يَمْشُونَ فِي مَسَاكِنِهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ ۖ أَفَلَا يَسْمَعُونَ ﴿٢٦﴾ أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَاءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنفُسُهُمْ ۖ أَفَلَا يُبْصِرُونَ ﴿٢٧﴾ وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْفَتْحُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٢٨﴾ قُلْ يَوْمَ الْفَتْحِ لَا يَنفَعُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِيمَانُهُمْ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٢٩﴾ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانتَظِرْ إِنَّهُم مُّنتَظِرُونَ ﴿٣٠﴾

ع ۳ / ۸ / ۱۶

ترجمۂ آیات ۲۳-۳۰

اور ہم نے موسیٰ کو بھی کتاب عطا کی تھی تو تم اس یومِ موعود کے ظہور کے باب میں کسی شک میں نہ رہو۔ اور ہم نے اس کو بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا اور ہم نے ان میں پیشوا اٹھائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے جب کہ انھوں نے ثابت قدمی دکھائی۔ اور وہ ہماری آیات پر یقین رکھتے تھے۔ بے شک تیرا رب ہی قیامت کے دن ان کے درمیان ان چیزوں کے باب میں فیصلہ کرے گا جن میں یہ اختلاف

کرتے رہے ہیں۔ ۲۳-۲۵

کیا ان کے لیے یہ چیز ہدایت دینے والی نہ بنی کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی ہی قوموں کو ہلاک کر چھوڑا جن کی بستیوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں۔ بے شک ان کے اندر بہت سی نشانیاں ہیں۔ تو کیا یہ لوگ سنتے سمجھتے نہیں! ۲۶

کیا انھوں نے دھیان نہیں کیا کہ ہم پانی کے بادلوں کو چٹیل زمین کی طرف ہانک کر لے جاتے ہیں پس اس سے کھیتی اگاتے ہیں جس سے ان کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی۔ تو کیا انھیں سجھائی نہیں دے رہا ہے! ۲۷

اور وہ پوچھتے ہیں کہ یہ فیصلہ کا دن کب ظہور میں آئے گا اگر تم سچے ہو! کہہ دو کہ فیصلہ کے دن ان لوگوں کا ایمان نفع نہیں دے گا جنھوں نے کفر کیا ہوگا اور نہ ان کو اس کے بعد مہلت ہی دی جائے گی۔ تو ان سے اعراض کرو اور منتظر رہو، یہ بھی منتظر ہی ہیں۔ ۲۸-۳۰

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ۣ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ (۲۳-۲۴)

'الکتاب' سے مراد تورات ہے

'اَلْکِتٰب' سے مراد تورات ہے۔ جن لوگوں نے اس کو جنس کتاب کے مفہوم میں لیا ہے ان کی رائے قرآن کی تصریح کے خلاف ہے۔ 'وَجَعَلْنٰہُ' میں ضمیر کا مرجع بہرحال یہی کتاب ہے اور اس کی تعریف یہ بیان ہوئی ہے کہ اس کو ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت بنایا؛ اس تعریف نے خود متعین کر دیا کہ یہ لفظ جنس کتاب کے مفہوم میں نہیں بلکہ تورات کے لیے استعمال ہوا ہے۔

'من لقائه' میں ضمیر کا مرجع یوم عذاب ہے

'مِنْ لِّقَآئِہٖ' میں ضمیر کا مرجع سیاق و سباق دلیل ہے کہ 'اَلْکِتٰب' نہیں بلکہ وہ یومِ انتقام یا یوم عذاب ہے جس کی دھمکی اوپر کی آیات ۲۱-۲۲ میں دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اس کی تکذیب کرنے والوں کو ہم نے اس دنیا میں بھی عذاب دیا اور آخرت میں بھی ان کو عذاب دیں گے اسی طرح ہم نے تمہارے ذریعے سے جو کتاب اتاری ہے اس کی تکذیب کرنے والوں

کو بھی ہم دنیا اور آخرت دونوں میں سزا دیں گے۔

وَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ، یعنی اس یوم انتقام اور یوم عذاب کے ظہور کے باب میں تم کسی شک میں نہ رہو۔ یہ فیصلہ کی گھڑی آکے رہے گی۔ اس جملہ کا خطاب اگرچہ ظاہر الفاظ کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں جو وعید ہے اس کا رُخ مخالفین و مکذبین کی طرف ہے، گویا بات ان سے منہ پھیر کر کہی گئی ہے۔

رسول کی بعثت کا ایک لازمی تقاضا

یہ بات ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ رسول کی بعثت اور کتاب کے نزول کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ جو لوگ اس کی تکذیب کریں وہ دنیا و آخرت دونوں میں اس کی سزا پائیں۔ اسی حقیقت کو اسی اختصار و جامعیت کے ساتھ دوسرے مقام میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ	اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کے ساتھ اس
وَجَعَلْنَا مَعَهٗۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا	کے بھائی ہارون کو اس کا وزیر بنایا اور ان کو حکم دیا کہ
فَقُلْنَا اذْهَبَاۤ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا	تم دونوں ان لوگوں کے پاس جاؤ جنھوں نے ہماری
بِاٰيٰتِنَا فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿﴾	نشانیوں کی تکذیب کی ہے۔ پس ہم نے ان کو پامال
(الفرقان: ۳۵-۳۶)	کر کے رکھ دیا۔

یہی مضمون سورۂ مومنون میں یوں آیا ہے:

فَكَذَّبُوْهُمَا فَكَانُوْا مِنَ الْمُهْلَكِيْنَ ﴿﴾	پس ان دونوں کی (موسیٰ اور ہارون کی) انھوں
وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ	نے تکذیب کر دی اور ہلاک ہونے والوں میں سے بنے
لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿﴾	اور ہم نے موسیٰ کو کتاب سے نوازا کہ وہ ہدایت پانے
(المؤمنون: ۴۸-۴۹)	والے بنیں۔

یہی بات ایک کلیہ کے طور پر تمام رسولوں سے متعلق بھی ارشاد ہوئی ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا	اور ہم نے تم سے پہلے بھی رسول بھیجے ان کی قوموں کی
اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ	طرف تو وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے۔
فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا وَكَانَ حَقًّا	بالآخر ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو جرم کے مرتکب
عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (الروم: ۴۷)	ہوئے اور اہل ایمان کی مدد ہم پر واجب ہے۔

ان نظائر کی روشنی میں آیت زیر بحث پر غور کیجیے تو اس کا ہر جز پوری طرح واضح ہو جائے گا۔ ہمارے مفسرین نے اس کو چونکہ اس کے سیاق و سباق اور اس کے شواہد کی روشنی میں نہیں دیکھا اس وجہ سے اس کی تاویل میں ان کو بڑی الجھن پیش آئی ہے۔

کتاب سے فائدہ اٹھانے والے

وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ، یعنی تورات کے مکذبین تو اس انجام سے دوچار ہوئے جو کتاب الٰہی

کے مکذبین کے لیے ازل سے مقدر ہے البتہ بنی اسرائیل کے لیے، جنھوں نے اس کو قبول کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کو صحیفۂ ہدایت بنایا۔ بدقسمتوں نے اس سے ٹھوکر کھائی اور جنھوں نے اس کی قدر کی انھوں نے اسی سے ہدایت حاصل کی۔ اوپر سورۂ مومنون کی جس آیت کا حوالہ گزرا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

کتاب کا ثمرہ

'وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا' یہ اس کتاب کا ثمرہ بیان ہوا ہے کہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ان کو قوموں کی پیشوائی اور قیادت کے منصب پر سرفراز فرمایا اور ان کے اندر ایسے رہنما اٹھائے جو لوگوں کی رہنمائی اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قیادت و امامت کتاب الٰہی کے لازمی ثمرات میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ جس قوم کو اپنی کتاب سے سرفراز فرماتا ہے وہ جب تک اس کتاب پر قائم رہتی ہے اس کو قوموں کی امامت حاصل رہتی ہے اور اس کے دشمن اس کے آگے ذلیل و پامال ہوتے ہیں۔

امامت و قیادت کے اوصاف

'يَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا' یہ اس امامت کے شرائط و اوصاف بیان ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی کتاب عطا کی تھی اس وجہ سے وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہی لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ بغل میں تو اللہ کی کتاب ہو اور آگے پیروی کے لیے سنتِ ابلیس ہو۔

'لَمَّا صَبَرُوْا' یہ اس بنیاد کا ذکر ہے جس پر ساری شریعت قائم ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کی توفیق انھوں نے اس وقت تک پائی جب تک وہ شریعت پر، خوف و طمع سے بے نیاز ہو کر، جمے رہے۔

'وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ' یہ ان کے صبر کی اساس و بنیاد کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو اللہ کی آیات پر پختہ یقین تھا اور وہ جزا و سزا پر مضبوط عقیدہ رکھتے تھے۔ اس وجہ سے وہ صبر کے اس امتحان میں پورے اترے۔

ان آیات پر تدبر کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان میں مسلمانوں کے لیے بشارت اور مستقبل کی عظیم ذمہ داریوں کی یاد دہانی بھی ہے اور وقت کے یہود پر تعریض بھی کہ وہ کیا بنائے گئے تھے اور اب کیا بن کے رہ گئے ہیں!

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۲۵)

یعنی اس دنیا کے بعد ان کا معاملہ خدا کی اخروی عدالت میں بھی پیش ہو گا اور وہ ان تمام چیزوں کے باب میں آخری فیصلہ فرمائے گا جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ 'فیصلہ فرمائے گا' سے مقصود اس کا نتیجہ ہے کہ اس دن یہ اپنے اس اختلاف و نزاع کی سزا بھگتیں گے۔

اَوَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ ط اَفَلَا يَسْمَعُوْنَ (۲۶)

پچھلی قوموں کی طرف اجمالی اشارہ

حضرت موسیٰؑ کے مخالفین کے انجام کی طرف خاص طور پر اشارہ کرنے کے بعد یہ پچھلی قوموں کی طرف بھی اجمالاً اشارہ کر دیا کہ کیا ان کی رہنمائی کے لیے یہ چیز کافی نہیں ہوئی کہ ان سے پہلے ہم کتنی قوموں کو رسولوں کی تکذیب کے جرم میں ہلاک کر چکے ہیں جن کی بستیوں میں یہ چلتے پھرتے ہیں۔ یہ اشارہ عاد و ثمود اور قوم لوط وغیرہ کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں پچھلی سورتوں میں بیان ہو چکی ہیں۔ قریش اپنے تجارتی سفروں میں ان قوموں کی برباد بستیوں پر سے برابر گزرتے تھے۔ 'اَوَلَمْ یَھْدِ لَھُمْ' کے اسلوب کلام سے یہ بات نکلتی ہے کہ آخر یہ اپنے ہی ملک کی تاریخ سے سبق کیوں نہیں لیتے! کیوں یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ ان پر گزرا وہی کچھ ان پر بھی گزر جائے!

'اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ'۔ یعنی ان سرگزشتوں کے اندر نشانیاں ہیں۔ اگر یہ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں تو انھیں ان نشانیوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

— پہلی نشانی اس کے اندر اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعے سے یاددہانی کرتا ہے اگر وہ اس سے اعراض کرتے ہیں تو وہ مجرم قرار پاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے ضرور انتقام لیتا ہے۔

— دوسری نشانی اس کے اندر یہ ہے کہ اس قسم کے مجرموں کو اللہ تعالیٰ اس دنیا میں بھی عذاب دنیا ہے اور اس کے بعد آخرت میں بھی ان کو عذاب دے گا۔

— تیسری نشانی یہ ہے کہ مجرموں کو سزا دینے کے بعد اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو قیادت و امامت کے منصب پر سرفراز فرماتا ہے جو پورے استقلال کے ساتھ حق کا ساتھ دیتے ہیں۔

'اَفَلَا یَسْمَعُوْنَ'۔ یعنی کیا یہ لوگ ان قوموں کی سرگزشتیں سنتے نہیں! مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی تذکیر و تعلیم ہی کی خاطر قرآن نے ان قوموں کی سرگزشتیں نہایت تفصیل کے ساتھ، ان کے نتائج و عبر کی وضاحت کرتے ہوئے سنائی ہیں۔ اگر اب بھی یہ اپنے کان بند کیے ہوئے ہیں تو ان کی بدقسمتی پر افسوس ہے۔ 'سننا' یہاں سمجھنے اور عبرت حاصل کرنے کے مفہوم میں ہے اس لیے کہ اصل سننا درحقیقت وہی ہے۔ گویا فعل یہاں اپنے حقیقی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَی الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ ؕ اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ (۲۷)

'الماء' سے یہاں مراد چونکہ پانی والے بادل ہیں اس وجہ سے اس کے لیے لفظ 'نَسُوْقُ' کا استعمال موزوں ہوا۔ 'ارض جرز' چٹیل اور بنجر زمین کو کہتے ہیں۔

---

[۱] حضرت موسیٰؑ کے ذکر کی خصوصیت کے وجوہ پر ہم دوسرے مقام میں مفصل گفتگو کر چکے ہیں۔

آخرت کے دلائل کی طرف اشارہ

اوپر کی آیات میں ان تاریخی آثار و واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے جو اس دنیا میں خدا کے قانون مجازات کے شاہد ہیں۔ اب یہ آخرت کی طرف توجہ دلائی کہ اس کے وقوع کو بھی بعید از امکان نہ سمجھو، وہ بھی واقع ہو کے رہے گی اور اس دن اللہ تعالیٰ اپنا آخری فیصلہ صادر فرمائے گا۔ فرمایا کہ کیا یہ لوگ خدا کی اس قدرت و ربوبیت کو نہیں دیکھتے کہ ہم پانی سے بوجھل بادلوں کو ہانک کر چٹیل زمینوں کی طرف لے جاتے ہیں اور پھر اس پانی سے مختلف قسم کی فصلیں اگاتے ہیں جو ان کے مویشیوں کے کام بھی آتی ہیں اور خود ان کے کام بھی!

'اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ'۔ اوپر کی آیت میں ان کو عدم سماعت پر ملامت کی ہے۔ یہ ان کی عدم بصارت پر ملامت ہے کہ جس طرح ان کے کان بہرے ہو چکے ہیں اسی طرح ان کی آنکھوں کی بصارت بھی سلب ہو چکی ہے۔ یہ اس زمین کو مردہ اور زندہ ہوتے آئے دن دیکھتے ہیں لیکن پھر بھی یہ اس شک میں مبتلا ہیں کہ خدا ان کو اس سے دوبارہ اٹھا سکنے پر قادر نہیں ہے۔

اس آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور ربوبیت کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔ اور یہ دونوں صفتیں قیامت کے وقوع اور اس کی ضرورت کی نہایت واضح دلیلوں میں سے ہیں۔ ان کی وضاحت پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲۸)

یعنی ان لوگوں کی بے بصیرتی اور بلادت کا حال یہ ہے کہ تاریخ اور آفاق کے ان سارے شواہد و آثار کی طرف جب ان کو توجہ دلائی جاتی ہے تو طنز و استہزاء کے انداز میں یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر سچ مچ اسی طرح کے فیصلہ کا کوئی دن آنا ہے اور تم لوگ اپنے اس دعوے میں سچے ہو تو وہ آخر آ کیوں نہیں جاتا! مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی چیز کو دلائل و شواہد کی روشنی میں ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ اس وقت مانیں گے جب آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔

قُلْ یَوْمَ الْفَتْحِ لَا یَنْفَعُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِیْمَانُهُمْ وَلَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ (۲۹)

یہ ان کے مطالبے کا جواب ہے کہ اگر وہ فیصلہ کے دن کو دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہیں تو ان کو بتا دو کہ اس کے ظہور کے بعد ایمان لانا کسی کے لیے کچھ نافع نہیں ہو گا اور اس کے بعد کسی کو اس بات کی مہلت بھی نہیں دی جائے گی کہ وہ توبہ و اصلاح کر کے تلافیٔ مافات کر سکے۔ 'یوم الفتح' سے مراد فیصلہ کا دن ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو عذابوں سے آگاہ کیا ہے۔ ایک قیامت کے عذاب سے، دوسرے اس عذاب سے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں قوم پر فیصلہ کن عذاب کی شکل میں آتا ہے۔ اوپر جو سنتِ الٰہی بیان ہوئی ہے وہ ان دونوں ہی صورتوں سے متعلق ہے۔ جس طرح قیامت کے ظہور کے بعد کسی کا ایمان نافع نہیں ہو گا اسی طرح فیصلہ کن عذاب کے ظہور کے بعد بھی کسی کا ایمان نافع نہیں ہو گا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول صرف وہ ایمان ہے جو عقل و بصیرت کی رہنمائی میں، اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ، لایا گیا ہو۔ مجبورانہ ایمان کی اس کے ہاں کوئی وقعت نہیں ہے۔ اگر مجبورانہ ایمان اس کو پسند ہوتا تو، جیسا کہ دوسرے مقام میں فرمایا ہے، وہ سب کو ایمان ہی پر پیدا کرتا۔ اس کے لیے ایسا کرنا ذرا بھی مشکل نہیں تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّهُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ (۳۰)

یہ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہے کہ اگر یہ لوگ فیصلہ کا دن دیکھنے ہی کے لیے مچلے ہوئے ہیں تو اب ان سے کوئی مزید بحث و گفتگو بالکل بے سود ہے۔ اب ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ اور تم بھی اسی فیصلہ کے دن کا انتظار کرو جس کے یہ منتظر ہیں۔ اللہ نے جتنی مہلت ان کے لیے مقدر کی ہے اس کے پورے ہو جانے کے بعد یہ گھڑی آجائے گی۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ۔

ہفتہ۔ ۹ بجے دن
۱۷ اگست ۱۹۷۴ء
رحمان آباد

تدبرِ قرآن

۳۳

الاحزاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود، گروپ کے ساتھ اس کا تعلق اور زمانۂ نزول

جس طرح سورۂ نور اپنے گروپ کے آخر میں پورے گروپ کے تکملہ و تتمہ کی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح سورۂ احزاب اپنے پورے گروپ کا جو فرقان سے شروع ہوا ہے، تکملہ و تتمہ ہے۔ یہ گروپ، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، قرآن و رسالت کے اثبات میں ہے۔ اس تعلق سے اس سورہ میں چند باتیں خاص طور پر نمایاں ہوئی ہیں۔

—— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بحیثیت رسول جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی تھی اس کی وضاحت اور بے خوف لومۃ لائم اس کو ادا کرنے کی تاکید۔

—— انبیاء و رسل کے طبقہ کے اندر آپ کو جو امتیاز خاص اور جو مرتبہ و مقام حاصل ہے اس کا بیان۔

—— امت کے ساتھ آپ کے تعلق کی نوعیت اور امت پر آپ کے حقوق اور ان کے مقتضیات کی وضاحت۔

—— حضورؐ کی ازواج مطہراتؓ کا درجہ امت کے اندر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کے تعلق کی مخصوص نوعیت۔

—— اس عظیم امانت کا حوالہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان پر ڈالی گئی ہے اور جس کی وضاحت کے لیے اللہ نے اپنی کتاب نازل فرمائی ہے۔ اس عظیم ذمہ داری کے حقوق و فرائض کی یاد دہانی۔

یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب منافقین و منافقات نے قرآن کی بعض اصلاحات کو بہانہ بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پراپیگنڈے کی ایک نہایت مکروہ مہم چلا رکھی تھی۔ یہاں تک کہ ازواج مطہراتؓ کے ذہن کو بھی انھوں نے مسموم کرنے کی کوشش کی۔ اس میں ان فتنوں کی طرف بھی اشارات ہیں جو منافقین نے غزوۂ احزاب کے دوران، جو ۵ھ میں واقع ہوا، مسلمانوں کو بددل کرنے کے لیے اٹھائے۔ اسی سلسلہ میں حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی اصل نوعیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اس لیے کہ اس واقعہ کو بھی واقعۂ افک کی طرح جس کا ذکر سورۂ نور میں گزر چکا ہے، منافقین نے فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کی تاکید کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر جو کچھ نازل کیا جاتا ہے بے خوف لومۃ لائم اس کی تبلیغ کریں اور کفار و منافقین کے مخالفانہ غوغا کی مطلق پروا نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کا مددگار و کارساز ہے، اس پر بھروسہ رکھیں۔

(۴-۶) ظہار اور منہ بولے بیٹے کے معاملے میں رسومِ جاہلیت کی اصلاح کہ ان رسوم کو عقل و فطرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مخالفین اس اصلاح کے خلاف کتنا ہی ہنگامہ اٹھائیں، ان کے شور و غوغا کی کوئی پروا نہ کی جائے۔ یہ لوگوں کی من گھڑت بدعات ہیں۔ اللہ تعالیٰ معاشرتی زندگی کو ان تضادات سے پاک کر کے اس کو فطرت کی صحیح راہ پر لانا چاہتا ہے۔ مسلمانوں کو اس بات کی ہدایت کہ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں سے منسوب کرو۔ اگر ان کے باپوں کا علم نہ ہو تو ان کو اپنے موالی کے درجہ میں رکھو، اپنے صلبی بیٹوں کا درجہ دینے کی کوشش نہ کرو۔ اب تک رسومِ جاہلیت کے زیر اثر جو کچھ ہوا ہے اس سے اللہ تعالیٰ نے درگزر فرمایا لیکن اب، اس وضاحت کے بعد، اس کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ اسلامی معاشرے میں سب سے اونچا درجہ اور سب سے بڑا حق نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہے۔ اور ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کا درجہ امہات المومنین کا ہے۔ باقی اولوالارحام کا باہمی قرب و بعد اس قانون کے مطابق ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں بیان کر دیا ہے۔

(۷-۸) اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی سے اس بات کا مضبوط عہد کر لیا ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کے دین کی دعوت دیں۔ اس معاملہ میں نہ کسی کا پاس و لحاظ کریں نہ کسی کی مخالفت کی پروا تاکہ یہ چیز کھرے اور کھوٹے، مخلص اور منافق کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بنے اور ہر شخص اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پائے۔

(۹-۲۷) غزوۂ احزاب کے واقعات پر اجمالی تبصرہ جس سے مقصود مسلمانوں کے اندر اس اعتماد علی اللہ اور توکل کو راسخ کرنا ہے جس کی تعلیم پہلی آیت میں دی گئی ہے۔ باوجودیکہ کفار اپنی تمام پارٹیوں کی مجتمعہ قوت کے ساتھ، مدینہ پر پل پڑے تھے اور منافقین نے بھی اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں سے مسلمانوں کے قدم اکھاڑ دینے کے لیے پورا زور لگایا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی غیبی فوجوں سے مسلمانوں کی مدد کی اور دشمنوں کو ذلیل و خوار ہو کر پسپا ہونا پڑا۔ اسی طرح اگر مسلمان مخالفوں کی مخالفت کے علی الرغم اللہ کے دین پر قائم اور اس کے رسول کے وفادار و جاں نثار رہے تو اللہ تعالیٰ ہر محاذ پر ان کی مدد فرمائے گا۔

(۲۸-۳۵) مسلمانوں کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر مجتمع کرنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجؓ کو خطاب کر کے ان پر ان کی منصبی ذمہ داریاں واضح فرمائی گئی ہیں کہ رسول کے ساتھ نسبت رکھنے کے سبب سے ان کے درجے بھی بہت اونچے ہیں اگر وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کریں گی اور ان کے لیے سزا بھی بڑی ہی سخت ہے اگر ان سے کوئی حکم عدولی صادر ہوئی۔ ان کا اصلی فریضہ پیغمبرؐ کی اطاعت و وفاداری اور اس کتاب و حکمت کی روشنی کو پھیلانا ہے جس کی تعلیم ان کو نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مل رہی ہے۔ اس وجہ سے ان کے شایانِ شان بات یہ ہے کہ وہ وقار کے ساتھ اپنے گھروں میں بیٹھیں اور ان منافقین و منافقات کے اثر سے اپنے کو بچائیں جو ان کی کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر ان کے دلوں میں محبت دنیا کی تخم ریزی کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اہلِ بیتِ نبوت کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک اور صرف کتاب و حکمت کی تعلیم و دعوت کے لیے خاص رکھے۔

(۳۶-۴۰) حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی طرف ایک اجمالی اشارہ جس میں سب سے پہلے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ جب کسی معاملہ میں اللہ و رسول کوئی فیصلہ صادر فرما دیں تو کسی مومن یا مومنہ کے لیے اس میں کسی چون وچرا کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اللہ و رسول کا حق سب سے بڑا ہے۔ اس کے بعد حضرت زیدؓ کے واقعہ کا حوالہ ہے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت زینبؓ کے ساتھ ان کا نکاح کر کے ان کی عزت افزائی چاہی لیکن وہ نباہ نہ کر سکے اور آپ کی طرف سے بامرار روکے جانے کے باوجود انھوں نے طلاق دے چھوڑی۔ یہ نکاح حضورؐ ہی نے کرایا تھا جس کے بعد منافقین اور منافقات برابر حضرت زینبؓ کو یہ طعنہ دیتے رہے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ سخت ظلم کیا ہے کہ ایک معزز گھرانے کی خاتون کا عقد ایک آزاد کردہ غلام سے کر دیا ہے۔ ان طعنوں کے باوجود حضرت زینبؓ نہایت صبر و تشکر کے ساتھ حضرت زیدؓ کے ساتھ نباہ کرتی رہیں۔ لیکن حضرت زیدؓ نے محض اپنے ذاتی احساس کی بنا پر، جس کی تفصیل تفسیر میں آئے گی، ان کو طلاق دے دی۔ اس سے فطری طور پر حضرت زینبؓ کو مزید صدمہ پہنچا۔ ان کے اس زخم کے اندمال کی واحد شکل آپؐ کو یہ نظر آئی کہ آپؐ خود ان کو اپنے حبالۂ عقد میں لے لیں لیکن اس سے ایک اور فتنہ کے اُٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ تھا۔ حضرت زیدؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنیٰ کی حیثیت سے متعارف تھے اور متبنیٰ عرب جاہلیت میں حقیقی بیٹوں کی منزلت میں سمجھا جاتا تھا۔ حضرت زینبؓ کے ساتھ آپ کے نکاح کو مخالفین فتنہ انگیزی کا ذریعہ بناتے کہ اس شخص نے اول تو ایک شریف زادی کا نکاح اپنے ایک آزاد کردہ غلام سے کیا جس کو اپنا متبنیٰ بنا رکھا تھا اور اب اپنے متبنیٰ کی بیوی سے خود نکاح رچا لیا۔ علاوہ ازیں ازواج کے باب میں چار تک کی تحدید کا حکم نازل ہو چکا تھا اس وجہ سے بھی آپ اس معاملے میں متردد رہے لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہوا کہ آپؐ ان تمام اندیشوں سے بے پروا ہو کر یہ نکاح کر لیں تاکہ آپ کے عمل سے جاہلیت کی اس رسمِ بد کی اصلاح ہو۔

(۴۱-۴۸) مسلمانوں کو یہ ہدایت کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رکھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت ان پر نازل ہوئی تاکہ انھیں کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکل کر ایمان و اسلام کی روشنی میں آنا نصیب ہو۔ اگر اس روشنی کی انھوں نے قدر کی تو ان کو دنیا اور آخرت دونوں کی سعادت حاصل ہوگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپؐ کے فریضۂ منصبی کی یاددہانی کہ آپ خلق کے لیے اللہ کے دین کی شہادت دینے والے ہیں، جو اس کو قبول کریں ان کو جنت کی بشارت دیں، جو اس کو رد کریں ان کو دوزخ سے آگاہ کر دیں۔ آپؐ اللہ کے داعی اور خلق کو کفر و شرک کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے چراغِ ہدایت ہیں۔ اس فرض کی ادائیگی میں آپ برابر سرگرم رہیں۔ کفار و منافقین کی مخالفتوں اور ان کی ایذا رسانیوں کو خاطر میں نہ لائیں۔

(۴۹-۵۲) اس امر کا اعلان کہ آپ کی تمام ازواج آپ کے لیے جائز ہیں۔ آپ پر چار کی قید اور وہ

پابندیاں نہیں ہیں جو عام امت کے لیے قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔ البتہ بعض دوسری پابندیاں ہیں جو عام امت پر نہیں ہیں۔ اس خصوصیت کے بعض مصالح کی طرف اشارہ۔ ازواج نبی صلعم کو اس فیصلۂ الٰہی کی تعمیل کی ہدایت۔ منافقین کو تنبیہ کہ وہ ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کے معاملے میں ریشہ دوانیاں کر کے پیغمبر صلعم کے لیے اذیت کا سبب نہ بنیں۔

(۵۳-۶۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں بدون اجازت داخل ہونے کی ممانعت۔ گھروں سے باہر نکلنے کی صورت میں آپ کی ازواج اور عام مسلمان خواتین کے لیے پردے کی ہدایت تاکہ منافقین کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی اور مسلمان خواتین کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا کوئی موقع نہ ملے۔ اس سلسلہ میں منافقین کو یہ آخری دھمکی کہ اگر وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو بہت جلد ان کے قلع قمع کے لیے آخری ہدایات نازل ہو جائیں گی اور پھر ان کو کہیں پناہ نہیں ملے گی۔

(۶۳-۷۳) خاتمۂ سورہ جس میں پہلے قیامت کی یاد دہانی ہے کہ اس کو بہت دُور نہ سمجھو۔ وہ سر پر آئی کھڑی ہے۔ اس دن کوئی کسی کے کام آنے والا نہ بنے گا۔ گمراہ لیڈر اور گمراہ پیرو سب ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے۔

منافقین کو تنبیہ کہ ان یہود کی روش کی تقلید نہ کرو جنھوں نے موسیٰؑ کو قدم قدم پر ایذا دی۔ بالآخر اللہ نے موسیٰؑ کو عزت و وقار سے اٹھایا اور ان لوگوں پر لعنت کر دی جنھوں نے ان کو ایذا دی۔ صحیح روش یہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور رسول کی ہر بات پر 'سمعنا واطعنا' کہو۔ اللہ تعالیٰ تمھارے اعمال کو سدھارے گا' تمھارے گناہوں کو بخشے گا۔ یہی راہ فوزِ عظیم کی راہ ہے۔

آخر میں اس عظیم عہد و امانت کی یاد دہانی جس کا اہل تمام مخلوقات میں سے صرف انسان بنایا گیا ہے۔ اسی عہد و امانت پر انسان کے تمام شرف کا انحصار ہے۔ اگر وہ اس کے حقوق ادا کر سکے تو اس سے زیادہ اونچا کوئی نہیں اور اگر وہ اس میں ناکام ہو جائے تو پھر اس سے بڑا بدقسمت بھی کوئی نہیں۔

سُوْرَةُ الْاَحْزَابِ (۳۳)

مَدَنِيَّةٌ ——————— اٰيَاتُهَا ۷۳

آيات ۱ - ۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۙ﴿۱﴾ وَّاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ﴿۲﴾ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَ
كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۳﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَيْنِ فِيْ
جَوْفِهٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَكُمُ الّٰٓـِٔيْ تُظٰهِرُوْنَ مِنْهُنَّ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ
وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ ﴿۴﴾ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ
هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِى
الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ؕ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَاۤ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ
وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵﴾
اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ؕ
وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

وَالْمُهٰجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ۝۶ وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۠ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝۷ لِّيَسْــَٔـلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ ۚ وَاَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۸ ع

ترجمہ آیات ۱ - ۸

اے نبی، اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کی باتوں پر کان نہ دھرو، بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور پیروی کرو اس چیز کی جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے وحی کی جارہی ہے، بے شک اللہ ان تمام چیزوں سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ اور اللہ پر بھروسہ رکھو اور بھروسے کے لیے اللہ کافی ہے۔ ۱-۳

اللہ نے کسی شخص کے سینے میں دو دل نہیں رکھے اور نہ تمہاری ان بیویوں کو جن سے تم ظہار کر بیٹھتے ہو تمہاری مائیں بنایا اور نہ تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے بیٹے بنا دیا۔ یہ سب تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں اور اللہ حق کہتا ہے اور وہ صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت کے ساتھ پکارو۔ یہی اللہ کے نزدیک قرین عدل ہے اور اگر تم کو ان کے باپوں کا پتہ نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے شریک قبیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس باب میں تم سے جو غلطی ہوئی اس پر تم سے کوئی مواخذہ نہیں، البتہ تمہارے دلوں نے جس بات کا عزم کر لیا اس پر مواخذہ ہے۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۴-۵

اور نبی کا حق مومنوں پر خود ان کے اپنے مقابل میں اولیٰ ہے اور ازواج نبی کی حیثیت

مومنین کی ماؤں کی ہے اور رحمی رشتے رکھنے والے آپس میں، دوسرے مومنین و مہاجرین کے مقابل، اَولیٰ ہیں، اللہ کے قانون میں۔ یہ اور بات ہے کہ تم اپنے اولیاء و اقرباء کے ساتھ کوئی حسنِ سلوک کرنا چاہو۔ یہ چیز کتاب میں نوشتہ ہے۔ ۶

اور یاد کرو، جب ہم نے نبیوں سے ان کے عہد لیے اور تم سے بھی اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ ابن مریم سے بھی، اور ہم نے ان سے نہایت محکم عہد لیا تاکہ اللہ راست بازوں سے ان کی راست بازی کی بابت سوال کرے (اور کافروں اور منافقوں سے ان کے کفر و نفاق کی نسبت)، اور کافروں کے لیے اللہ نے ایک دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ۷-۸

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا حَكِیْمًا (۱)

خطاب کی نوعیت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہاں 'یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ' سے جو خطاب فرمایا ہے یہ محض تعظیم و تکریم کے لیے نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ یہ لفظ آپ کے فریضۂ منصبی کی یاددہانی کے لیے یہاں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ کے نبی و رسول ہیں اس وجہ سے آپ کو صرف اپنے رب کی پروا ہونی چاہیے۔ آپ صرف اللہ سے ڈریں، کافروں اور منافقوں کی مخالفتوں سے بالکل بے پروا ہو کر لوگوں کو اللہ کی بات پہنچائیں۔ اسی طرح کا خطاب سورۂ مائدہ میں گزر چکا ہے: 'یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ' (المآئدۃ: ۶۷) (اے رسول، تم اچھی طرح لوگوں کو وہ چیز پہنچا دو جو تم پر تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے)۔

'وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ'۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تنبیہ و تاکید اس لیے نہیں فرمائی گئی کہ خدانخواستہ اس بات کا کوئی اندیشہ تھا کہ آپ کفار و منافقین کی باتوں سے متاثر یا مرعوب ہو جائیں گے بلکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے مخالفین کو تنبیہ کی گئی ہے کہ یہ اشرار کتنا ہی زور لگائیں اور کتنے ہی فتنے اٹھائیں لیکن تم ان کی باتوں پر ذرا کان نہ دھرنا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آگے بعض ایسی باتوں کا ذکر آ رہا ہے جن کو کفار و منافقین نے آپ کے خلاف فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

کفار اور منافقین کا باہمی رشتہ

یہاں کفار و منافقین کا ایک ساتھ ذکر اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ یہ دونوں اصلاً ایک ہی

چھپے بیٹھے ہیں۔ اسلام دشمنی میں دونوں متحد ہیں۔ فرق ہے تو یہ ہے کہ ایک کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے دوسرا اسلام کا کلمہ پڑھتے ہوئے، مسلمانوں کے اندر گھس کر، اسلام کی بیخ کنی کی کوشش کرتا ہے۔ اس وجہ سے انجام کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ قرآن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔

توکل علی اللہ کی دلیل

'اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا'۔ یہ اس بات کی دلیل ارشاد ہوئی ہے کہ کیوں پیغمبر کو اپنے رب کے سوا سب سے بے خوف و بے پروا ہو کر صرف اس بات کی تبلیغ و تعمیل کرنی چاہیے جس کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ فرمایا کہ اللہ علیم و حکیم ہے۔ اس وجہ سے اس نے جس بات کا حکم دیا ہے وہی بات صحیح علم و حکمت پر مبنی ہے۔ اس کے خلاف لوگ جو بکواسیں کر رہے ہیں ان کی خرافات لائق اعتنا نہیں ہیں۔ آگے آیت ۳۹ اور آیت ۴۸ سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

وَاتَّبِعْ مَا یُوْحٰٓی اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۙ۝ وَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ۝ (۲-۳)

اوپر جو بات منفی اسلوب سے فرمائی گئی ہے وہی بات مثبت پہلو سے ارشاد ہوئی ہے کہ اشرار کی تمام شرانگیزیوں سے بالکل بے پروا ہو کر تم اس وحی کی پیروی کرو جو تمھارے رب کی جانب سے آتی ہے اور یہ اطمینان رکھو کہ تمھارے ہر اقدام و عمل سے اللہ اچھی طرح باخبر رہتا ہے۔ اس آیت میں پہلا خطاب واحد سے ہے اور دوسرا 'بِمَا تَعْمَلُوْنَ' جمع سے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو خطاب ہے یہ امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ دین کے معاملے میں یہی روش مسلمانوں کو بھی اختیار کرنی چاہیے۔

'وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا'۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کی ہر بات علم و حکمت پر بھی مبنی ہے اور وہ ہر چیز سے باخبر بھی ہے تو اسی پر بھروسہ رکھو اور اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ اعتماد اور بھروسہ کے لیے اللہ کافی ہے۔ اس کے ہوتے تمھیں کسی دوسرے سہارے کی احتیاج نہیں ہے۔ لفظ 'وکیل' کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں کہ اس سے مراد وہ ذات ہے جس پر پورا اعتماد کر کے اپنے معاملات اس کے حوالہ کر دیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ بندوں سے یہی ہے کہ وہ خدا کے دیے ہوئے احکام کی ہر حال میں تعمیل کریں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھیں کہ اس راہ میں جو مشکلیں پیش آئیں گی ان سے عہدہ برآ ہونے کی وہ توفیق بخشے گا۔

مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ ۚ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَکُمُ الّٰٓیِٴْ تُظٰہِرُوْنَ مِنْہُنَّ اُمَّہٰتِکُمْ ۚ وَمَا جَعَلَ اَدْعِیَآءَکُمْ اَبْنَآءَکُمْ ؕ ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاہِکُمْ ؕ وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَہُوَ یَہْدِی السَّبِیْلَ ۝ (۴)

اوپر کی تمہید کے بعد یہ بعض ایسے امور کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن میں قرآن کی اصلاحات کو کفار و منافقین

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

فکر و ارادہ کا تضاد خلافِ فطرت ہے

'مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ'۔ یہ ٹکڑا بعد کی باتوں کے ذکر کے لیے بطور تمہید ہے۔ چونکہ یہ باتیں فکر و ارادہ کے تضاد کا مظہر ہیں اس وجہ سے ان کے ذکر سے پہلے نفس تضادِ ارادہ پر روشنی ڈالی کہ اللہ تعالیٰ کو اگر منظور ہوتا کہ انسان ہمیشہ متضاد و متناقض ارادوں کی کشمکش ہی میں گرفتار رہے تو اس کو دل بھی ایک سے زیادہ دیتا لیکن اس نے کسی شخص کے پہلو میں دو دل نہیں بنائے۔ جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس نے انسان کے لیے یہ پسند نہیں فرمایا کہ وہ دو بالکل متناقض ارادے اپنے اندر جمع کر رکھے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب کج فہمی ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی ساخت کے بالکل خلاف وہ اپنے اندر متناقض ارادے جمع کر لیتا ہے۔ وہ خدا پر ایمان کا دعویٰ بھی رکھتا ہے اور ساتھ ہی دوسرے شریکوں کی بندگی بھی کرتا ہے۔ رسول سے اطاعت و وفاداری کا عہد بھی باندھتا ہے اور اس کے خلاف اس کے دشمنوں سے ساز باز اور اس کی تعلیمات کے خلاف سرگوشیاں اور سازشیں بھی کرتا ہے۔ حالانکہ اگر دل ایک ہے تو اس کے ارادوں میں تضاد و تناقض نہیں ہونا چاہیے بلکہ تمام ارادے بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہونے چاہئیں۔ اگر معاملہ اس کے خلاف ہو تو یہ دل کی خرابی و بیماری کی دلیل ہے اور ہر عاقل کا فرض ہے کہ وہ اس خرابی کی اصلاح کر کے اپنے ارادوں میں ہم آہنگی پیدا کرے۔

تناقضِ فکر کی ایک مثال

'وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَکُمُ الّٰٓئِیْ تُظٰھِرُوْنَ مِنْھُنَّ اُمَّھٰتِکُمْ'۔ اب یہ اس تضادِ فکر و ارادہ کی مثال کے طور پر ظہار کے معاملہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے ظہار کر بیٹھتا ہے تو اس کی بیوی اس کی ماں نہیں بن جاتی لیکن لوگوں نے زمانۂ جاہلیت میں اس طرح کی عورتوں کو ماؤں کی طرح محرمات میں شامل کر رکھا تھا۔ اب قرآن نے اس جاہلیت کی جو اصلاح کی تو منافقین و کفار جھاڑ کے کانٹوں کی طرح پیغمبر کے پیچھے پڑ گئے ہیں کہ جو عورتیں ماؤں کی طرح حرام ہیں اس شخص نے اپنے پیروؤں کے لیے ان کو بھی جائز کر دیا۔

ظہار

'ظہار' عرب جاہلیت کی ایک اصطلاح ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے یہ کہہ بیٹھتا کہ 'اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ' (اب تو میرے اوپر میری ماں کی پیٹھ کی طرح حرام ہے) تو اس کی بیوی اس کے اوپر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی۔ اسی لفظ 'ظھر' سے جس کے معنی پیٹھ کے ہیں 'ظھار' کی اصطلاح پیدا ہو گئی لیکن اس کا اطلاق انہی الفاظ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ کوئی شخص اپنی بیوی کے کسی اور حصۂ جسم کو بھی، بارادۂ تحریم اپنی محرمات میں سے کسی سے مشابہ قرار دے دے تو اس کا حکم بھی ظہار ہی کا ہو گا۔ عرب جاہلیت میں یہ صورت ایک طلاق مغلظ کی تھی جس کے بعد کسی شخص کے لیے اپنی بیوی سے مراجعت کی کوئی شکل باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ قرآن نے جیسا کہ سورۂ مجادلہ کی آیات ۲-۴ میں تفصیل آئے گی، اس طرح کی بات کو منکر اور جھوٹ قرار دیا اور یہ اجازت دے دی کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو اس طرح کی بات کہہ بیٹھے اور وہ پھر اس کے ساتھ زن و شو کے تعلقات قائم کرنا چاہے تو ایسا کر سکتا ہے اس لیے کہ اس طرح کی بیہودہ بات کہہ دینے سے کسی کی بیوی

اس کی ماں نہیں بن جاتی لیکن اس نے چونکہ ایک منکر اور باطل بات کہی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ ملاقات سے پہلے وہ ایک غلام آزاد کرے، اگر غلام میسر نہ ہو تو لگاتار دو ماہ روزے رکھے اور اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اس اصلاح سے قرآن نے ان لوگوں کی گھریلو زندگی کو درہم برہم ہونے سے بچانے کی راہ بھی کھولی جو غصہ اور جھنجھلاہٹ میں آکر، نتائج پر نگاہ کیے بغیر، فضول باتیں زبان سے نکال دیا کرتے ہیں اور ساتھ ہی آئندہ کے لیے ان کو اور دوسروں کو محتاط رہنے کا سبق بھی دے دیا لیکن کفار و منافقین نے، جو ہمیشہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے لیے کسی شوشے کی تلاش میں رہتے تھے، اس چیز کو بھی فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنا کر لوگوں میں یہ پھیلانا شروع کر دیا کہ اس شخص کو دیکھو، اس نے ماں اور بیوی کے درمیان کوئی فرق ہی باقی نہیں رکھا! اسی چیز کی طرف یہاں آیت میں اشارہ ہے کہ یہ لوگ دودلی اور تضادِ فکر و ارادہ کی بیماری میں مبتلا ہیں ورنہ انھیں سوچنا چاہیے کہ مجرد ایک بدتمیزی و جہالت کی بات کہہ دینے سے کسی کی بیوی اس کی ماں کس طرح بن جائے گی! اس غلطی پر وہ تادیب و اصلاح کا مستحق تو ضرور ہے تاکہ اس کو بھی اور معاشرہ کے دوسرے لوگوں کو بھی سبق حاصل ہو لیکن اس سزا کا مستحق تو وہ نہیں ہے کہ اس کی عائلی زندگی کا شیرازہ بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ یہاں ہم صرف اشارہ پر کفایت کرتے ہیں اس لیے کہ قرآن نے بھی اشارہ ہی کیا ہے۔ ان شاء اللہ سورۂ مجادلہ کی تفسیر میں ہم اس پر مفصل بحث کریں گے اور بتائیں گے کہ اس طریقۂ طلاق میں شریعت کے قرار دادہ طریقہ کے مقابل میں کیا کیا مفاسد موجود ہیں جن کی قرآن نے اصلاح کی ہے۔

تضادِ فکر کی دوسری مثال

'وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ' اسی طرح کے تضادِ فکر میں لوگ منہ بولے بیٹوں کے معاملے میں بھی مبتلا تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں منہ بولے بیٹوں کو بالکل صلبی بیٹوں کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنے متبنّیٰ کی منکوحہ سے اس کی وفات یا طلاق کے بعد نکاح کر سکے۔ یہ چیز اس فطری نظامِ عائلی کے بالکل خلاف تھی جس کو اسلام نے 'اُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ' کے اصول پر قائم فرمایا ہے۔ اس وجہ سے جب اس کی اصلاح کا وقت آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ حضرت زیدؓ کی مطلقہ بیوی حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیں تاکہ اس غلط رسم کا خاتمہ ہو جائے۔ حضرت زیدؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّیٰ کی حیثیت حاصل تھی اس وجہ سے اس رسمِ جاہلی کی اصلاح کا سب سے زیادہ مؤثر طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے اقدام فرمائیں۔ لیکن کفار و منافقین نے اس کو بھی آنحضرت صلعم کے خلاف فتنہ انگیزی کا ذریعہ بنایا کہ اس شخص نے اپنے منہ بولے بیٹے کی منکوحہ سے نکاح کر لیا۔ اسی فتنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ بھی ان لوگوں کی دودلی کا کرشمہ ہے کہ یہ صلبی بیٹے اور منہ بولے بیٹے میں فرق نہیں کر رہے ہیں، دونوں کو ایک ہی درجے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اس واقعہ پر مفصل بحث فصل ۶ میں آگے آ رہی ہے اس وجہ سے ہم یہاں

اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔

قرآن فطرت کی راہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے

ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ۔ یعنی اس قسم کی تمام باتیں تمہاری اپنی زبانوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ ان کو عقل و فطرت اور اللہ کی شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے اس وجہ سے یہ باطل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور اپنی کتاب کے ذریعے سے تمہیں حق بتا رہا ہے اور تمہاری رہنمائی فطرت کی صراطِ مستقیم کی طرف کر رہا ہے تو اس صراطِ مستقیم کو اختیار کرو اور جاہلیت کے رسوم و بدعات سے باہر نکلو۔

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَاۗىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ ۭ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ ۙ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۵)

اسلام کے نظام میں کوئی خلافِ فطرت چیز داخل نہیں ہو سکتی

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَاۗىِٕهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ۔ یعنی منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت کے ساتھ پکارو تاکہ ان کے نسب کا امتیاز باقی رہے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ کے قانون میں حق و عدل سے اقرب و اوفق ہے۔ اگر اس کی خلاف ورزی کر کے منہ بولے بیٹوں کو بالکل بیٹوں کے درجے میں کر دیا گیا تو وہ سارا نظامِ وراثت و قرابت و معاشرت بالکل تلپٹ ہو جائے گا جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ نے رحمی رشتوں اور انسانی فطرت کے جذبات و داعیات پر رکھی ہے۔ اسلام کے تمام احکام و قوانین خواہ وہ کسی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے ہوں، اللہ تعالیٰ نے عدل و قسط پر قائم کیے ہیں اس وجہ سے اس میں کوئی بات اس عدل و قسط کے خلاف داخل نہیں ہو سکتی۔

اہل عرب کا ایک معاشرتی اصول

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ۔ یعنی اگر ان کے باپوں کا پتہ نہ ہو تو ان کی حیثیت دینی بھائیوں اور "موالی" کی ہوگی۔ دینی اخوت کے رشتہ سے تو عربوں کو اول اول اسلام نے آشنا کیا، جاہلیت میں عرب اس سے بالکل ناآشنا تھے لیکن خاندانوں اور قبیلوں کے ساتھ وابستہ ہونے کا ایک طریقہ حلف اور وِلا کا ان کے ہاں موجود تھا۔ خاندان یا قبیلہ سے باہر کا کوئی شخص اگر کسی خاندان یا قبیلہ میں شامل ہونا چاہتا اور اس خاندان والے اس کو شامل کر لیتے تو وہ اس خاندان کا 'مولیٰ' سمجھا جاتا اور جملہ حقوق اور ذمہ داریوں میں شریک خاندان و قبیلہ بن جاتا۔ اگر وہ قتل ہو جاتا تو جس خاندان یا قبیلہ کا وہ مولیٰ ہوتا اس کو یہ حق حاصل ہوتا کہ وہ اس کے قصاص کا مطالبہ کرے۔ اسی طرح اگر وہ کوئی اقدام کر بیٹھتا جس کی بنا پر کوئی ذمہ داری عائد ہونے والی ہوتی تو اس ذمہ داری میں بھی پورے خاندان و قبیلہ کو حصہ لینا پڑتا۔ مولی القوم منهم (قوم کا مولیٰ انہی کے اندر کا ایک فرد شمار ہوگا) عربوں میں ایک مسلّم سماجی اصول تھا اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بھی اس کو برقرار رکھا۔ کسی خاندان کے آزاد کردہ غلام کا وِلا بھی آزاد کرنے والے خاندان کو حاصل ہوتا۔ مثلاً اگر وہ آزاد کردہ غلام مرتا اور اس کا کوئی وارث نہ ہوتا تو وِلا کے تعلق کی بنا پر اس کی وراثت اس کے آزاد کرنے والوں کو پہنچتی۔

آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر کسی کے تبنّٰی کے باپ کا علم نہ ہو تو اس کی حیثیت دینی بھائی اور مولیٰ کی قرار پائے گی لیکن کسی صورت میں اس کو صلبی بیٹے کی حیثیت حاصل نہ ہوگی۔

غلطی اور جرم میں فرق

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَٰكِنْ مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا یعنی اس معاملے میں جو غلطی بر بنائے جہالت اب تک ہوئی ہے اس پر تو کوئی مواخذہ نہیں ہے، اللہ غفور رحیم ہے، لیکن اب اس تنبیہ و تعلیم کے بعد بھی اگر اسی غلط بات پر اصرار قائم رہا تو اس کی نوعیت غلطی کی نہیں بلکہ جرم کی ہوگی اس لیے کہ یہ چیز تمہارے دلوں کے قصد و ارادہ اور دیدہ و دانستہ تعمد کا نتیجہ ہوگی جس پر اللہ تعالیٰ ضرور مواخذہ فرمائے گا۔

اَلنَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ ۖ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ ۗ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُمْ مَعْرُوفًا ۚ كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا (۶)

اسلامی معاشرے میں فرق مراتب

یہ اس فرق مراتب کو واضح فرمایا ہے جو اسلامی معاشرے میں مسلمانوں کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت ہوئی۔ اس وضاحت سے مقصود مسلمانوں کو اس خلطِ مبحث سے بچانا ہے جس کی بعض مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ

اَلنَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ۔ 'اَوْلیٰ' کے معنی احق کے ہیں۔ مثلاً اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ (آل عمران: ۶۸) یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ہر مسلمان پر دوسرے تمام لوگوں سے زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ خود اس کی اپنی جان سے بھی زیادہ ہے۔ اس مضمون کی وضاحت آگے اسی سورہ میں ان الفاظ میں ہوگئی ہے:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ	جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا
إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ	فیصلہ کردیں تو کسی مومن اور مومنہ کے لیے ان
يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ	کے معاملے میں کوئی اختیار باقی نہیں رہ جاتا اور
وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ	جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو
ضَلَالًا مُبِينًا (الاحزاب: ۳۶)	وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول کا کوئی فیصلہ صادر ہوجائے اس میں کسی مومن یا مومنہ کے لیے کسی چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ رسول جو کچھ فرماتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے نمائندے کی حیثیت سے فرماتا ہے اس وجہ سے ایمان کا لازمی تقاضا ہر مرد اور عورت کے لیے یہی ہے کہ وہ رسول کے احکام و ہدایات کی اللہ تعالیٰ کے احکام کی طرح بے چون و چرا تعمیل کرے۔ نہ دوسروں کی مخالفت و مزاحمت کی کوئی پروا کرے نہ اپنے مصالح و مفادات کی اور نہ اپنے جان و مال کی۔

ازواجِ مطہرات کا درجہ

وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ۔ یہ اس تعلق خاص کا قدرتی نتیجہ بیان ہوا ہے جو ہر امتی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ساتھ ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔ اگر اس تعلق میں نفاق کی کوئی آلائش نہ ہو تو فطری طور پر ہر مسلمان کے جذبات ازواج مطہراتؓ کے معاملے میں وہی ہوں گے جو شریف بیٹوں کے اندر اپنی ماؤں کے لیے ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کی بنا پر ان کے لیے دلوں میں ایسا احترام اور ان کی عظمت کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص ان کے ساتھ نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس سے الگ ہو کر اگر سوچ سکتے تھے تو صرف منافقین سوچ سکتے تھے اور وہ اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے، تفصیل آگے آئے گی، ریشہ دوانیاں بھی کرتے رہتے تھے۔ اس آیت نے ان کی ریشہ دوانیوں کا سدِ باب کر دیا اور آگے اسی بنیاد پر صاف الفاظ میں یہ ممانعت آگئی:

'وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا (۵۳)'

(اور تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ اس کے بعد کبھی اس کی بیویوں سے نکاح کرو) یہاں اس اشارے پر قناعت کیجیے۔ آگے ان شاء اللہ ہم ان دینی مصالح پر روشنی ڈالیں گے جو اس ممانعت کے اندر مضمر تھے۔

مومنین کے باہمی حقوق کی بنیاد رحمی رشتوں پر

'وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ'۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہراتؓ کو امت میں جو امتیازی مقام حاصل ہے اور جس پہلو سے حاصل ہے اس کو بیان کرنے کے بعد بقیہ سب کے تعلقات کے لیے اساس اس اصول کو قرار دیا ہے جو سورۂ نساء میں بیان ہو چکا ہے۔ یعنی رحمی رشتے رکھنے والے اقرب فالاقرب کے اصول پر ایک دوسرے کے حقدار ٹھہریں گے۔ 'فِي كِتَابِ اللَّهِ' سے مراد یہاں قرآن کی سورۂ نساء کی آیات ۷-۱۲ ہیں جن میں اسی فطری اصول کے مطابق تقسیم وراثت کا ضابطہ بیان ہوا ہے۔

مہاجرین و انصار کے درمیان حقوق کا جو عارضی نظم قائم کیا گیا تھا وہ ختم کر دیا گیا

'مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ' یعنی دوسرے مومنین و مہاجرین کے مقابل میں اولو الارحام ہی اولیٰ و اقرب ٹھہریں گے۔ اسلامی اخوت کی بنا پر مہاجرین و انصار کے درمیان حقوق میں شرکت کا جو عارضی نظم ابتدا میں قائم کیا گیا تھا اس ٹکڑے نے اس کو بھی ختم کر دیا۔

حسن سلوک کی گنجائش

'إِلَّا أَنْ تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُمْ مَعْرُوفًا كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا'۔ اس کے بعد صرف اتنی گنجائش باقی رہ گئی کہ آدمی کے جو اعزہ و احباب اس کی وراثت کے حقدار نہیں ہیں اگر ان کے ساتھ وہ کوئی حسن سلوک کرنا چاہے تو ان حدود کے اندر کر سکتا ہے جو شریعت نے مقرر کر دیے ہیں۔ ان حدود کی تفصیل بھی سورۂ نساء میں بیان ہو چکی ہے۔ 'کَانَ ذٰلِکَ فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا'، میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَأَخَذْنَا مِنْهُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا (۷)

حضرات انبیاء کا مشترکہ مشن

آیات ۱-۶ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر خوف و اندیشہ سے بے پروا ہو کر صرف وحی الٰہی کی پیروی اور اسی کی دعوت کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے، پیرے کے آخر میں اسی بات کو حضرات انبیاء علیہم السلام کی

تاریخ سے مزید موثق کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو ہدایت ہم تمھیں کر رہے ہیں اسی کی ہدایت ہم نے اپنے تمام نبیوں کو کی اور ان سے یہ عہد لیا کہ اللہ کی طرف سے ان کو جو وحی کی جا رہی ہے خود بھی اس کی پیروی کریں اور بے کم و کاست اس کو لوگوں کو بھی پہنچائیں۔ فرمایا کہ یہ میثاق ہم نے تم سے بھی لیا، نوحؑ سے بھی لیا، ابراہیمؑ سے بھی لیا، موسیٰؑ سے بھی لیا اور عیسیٰ ابن مریمؑ سے بھی لیا۔ عام کے بعد یہ خاص خاص جلیل القدر انبیاء کا حوالہ دے کر انبیاء کی پوری تاریخ سامنے رکھ دی گئی ہے تاکہ یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے کہ اس ذمہ داری کا بارِ گراں ہر نبی اور اس کے ساتھیوں کو اٹھانا پڑا ہے۔ اس خاص فہرست میں سب سے پہلے آنحضرت صلعم کا ذکر اس وجہ سے ہے کہ اصل مقصود آپ ہی کو یاد دہانی ہے۔

اس میثاق کا حوالہ قرآن مجید میں جگہ جگہ مذکور ہے۔ خاص طور پر سورۂ مائدہ میں اس کی پوری تاریخ بیان ہو گئی ہے۔ یہاں ہر میثاق کا حوالہ دینے میں طوالت ہو گی۔ ہم بطور مثال صرف ایک میثاق کا حوالہ دیتے ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے: فَخُذۡهَا بِقُوَّةٍ وَّاۡمُرۡ قَوۡمَكَ يَاۡخُذُوۡا بِاَحۡسَنِهَا (الاعراف ۔ ۱۴۵) (تم خود بھی اس کو مضبوطی سے پکڑو اور اپنی قوم کو بھی حکم دو کہ اس بہترین چیز کو پوری مضبوطی سے اختیار کرے)۔

وَاَخَذۡنَا مِنۡهُمۡ مِّيۡثَاقًا غَلِيۡظًا۔ یعنی اس میثاق کے معاملہ میں ہم نے ذرہ برابر بھی نرمی اور مداہنت نہیں برتی۔ بلکہ ہر ایک سے مضبوط عہد لیا۔ اور اس کو پوری مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم و استوار رہنے کی تاکید در تاکید فرمائی۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ اول تو اس عہد کو میثاق سے تعبیر فرمایا ہے جو خود مضبوط و مستحکم عہد کے لیے آتا ہے پھر اس کے ساتھ 'غلیظ' کی قید بھی لگائی ہے جس سے اس کے اندر مزید استحکام پیدا ہو گیا ہے۔

لِّيَسۡـَٔلَ الصّٰدِقِيۡنَ عَنۡ صِدۡقِهِمۡ ۚ وَاَعَدَّ لِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابًا اَلِيۡمًا (۸)

میثاق لینے کی حکمت

یہ میثاق لینے کی حکمت و مصلحت بیان فرمائی کہ انبیاء علیہم السلام کی اس تبلیغ کے بعد ہی لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اتمامِ حجت ہوا جس کے بعد وہ مستحق ہوئے کہ اللہ تعالیٰ راستبازوں سے ان کی راستبازی سے متعلق اور کافروں اور منافقوں سے ان کے کفر و نفاق کے متعلق پوچھ گچھ کرے اور پھر ہر ایک کو ان کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے۔ اس اتمام حجت کے بغیر اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی گمراہی پر سزا دیتا تو یہ چیز اس کے عدل و رحمت کے خلاف ہوتی اور لوگ قیامت کے دن عذر کر سکتے۔ آگے آیات ۴۲ اور ۷۳-۷۴ کے تحت اس کی مزید وضاحت آئے گی۔ سورۂ نساء کی آیت لِئَلَّا يَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ (۱۶۵) میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے اور وہاں ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔

۲۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۹ - ۲۷

آگے غزوۂ احزاب کے واقعات کا حوالہ ہے اور مقصود اس سے اسی مضمون کو واقعات کی روشنی میں مزید واضح کرنا ہے جو تمہید میں بیان ہوا ہے کہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھیوں کو اللہ کے دین کی راہ میں مخالفوں کی مخالفت اور ان کی سازشوں کی کوئی پروا نہیں کرنی چاہیے بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے، اللہ بھروسے کے لیے کافی ہے ۔ وہ اپنی آنکھوں نصرتِ الٰہی کا یہ کرشمہ دیکھ چکے ہیں کہ ان کے تمام مخالفین اپنی پوری مجتمعہ قوت کے ساتھ ان پر پل پڑے تھے اور اندر سے منافقین نے بھی اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے ان کے قدم اکھاڑ دینے کی پوری کوشش کی لیکن اللہ کی تدبیر سب پر غالب رہی ۔ دشمنوں کو بے نیل مرام پسپا ہونا پڑا ۔

غزوۂ احزاب شوال ۵ھ میں واقع ہوا ۔ یہود بنی نضیر کے کچھ لیڈروں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے خیبر کی طرف جلا وطن کر دیا تھا ۔ انھوں نے مکہ جا کر قریش کے لیڈروں سے فریاد کی اور ان کو آمادہ کیا کہ وہ مدینہ پر حملہ کریں ۔ قریش حملہ کے لیے پہلے سے پر تول رہے تھے، جب ان کو یہود کی شہ بھی حاصل ہو گئی تو گویا مانگی مراد مل گئی ۔ اس کے بعد غطفان اور ہوازن کے لیڈروں کو بھی انھوں نے ہموار کر لیا ۔ اس طرح تقریباً دس ہزار کا ایک لشکر جرار مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا ۔ قریش کا لشکر ابو سفیان کی سرکردگی میں تھا اور غطفان و ہوازن عیینہ بن حصن اور عامر بن طفیل کی قیادت میں نکلے ۔ مزید براں حی بن اخطب نضری نے یہود بنی قریظہ کو بھی اس متحدہ محاذ میں شامل ہونے پر آمادہ کر لیا ۔ اگرچہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدۂ امن و صلح کر رکھا تھا لیکن اس موقع کو انھوں نے غنیمت جانا اور معاہدے کی پروا نہ کی ۔ ان کی تعداد کم و بیش آٹھ سو تھی ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دشمنوں کی ان تیاریوں کی خبر ہوئی تو آپؐ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے سے مسلمانوں کو مدینہ کی ان سمتوں میں خندق کھودنے کا حکم دیا جن سے حملہ کا خطرہ تھا چنانچہ شہر کی شمالی اور مغربی سمت میں ساڑھے تین میل لمبی ایک خندق کھود دی گئی اور یہ کام نہایت سرگرمی کے ساتھ ان تین ہزار مجاہدوں نے انجام دیا جو حضورؐ کے ساتھ تھے اور خود سرورِ عالمؐ نے بھی بہ نفسِ نفیس اس کام میں حصہ لیا ۔

دشمنوں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا اور یہ محاصرہ تقریباً ایک ماہ رہا لیکن اس دوران میں سنگ باری اور تیر اندازی کے اِکّا دُکّا واقعات کے سوا دُو بدُو جنگ کی کوئی نوبت نہیں آئی ۔ دشمن نے یہ اندازہ کر لیا کہ مسلمانوں نے مدافعت کی پوری تیاری کر رکھی ہے ۔ پھر محاذ میں پھوٹ بھی پڑ گئی اور مزید براں ایک طوفانی ہوا نے ان کے خیمے و شامیانے سب اکھاڑ کے پھینک دیے جس کے بعد ان کے حوصلے پست

ہو گئے اور ابوسفیان نے واپسی کا اعلان کر دیا ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹-۲۷

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۚ ﴿۹﴾ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ﴿۱۰﴾ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴿۱۱﴾ وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۛ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ﴿۱۳﴾ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَاۤ اِلَّا يَسِيْرًا ﴿۱۴﴾ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ وَاِذًا لَّا تُمَتَّعُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۶﴾ قُلْ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَعْصِمُكُمْ مِّنَ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَ بِكُمْ سُوْٓءًا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ؕ وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷﴾ قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ

مع

وَلَا يَأْتُوْنَ الْبَأْسَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۸﴾ اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ
الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى
عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ
اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ؕ
وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۹﴾ يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ
وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ
عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ؕ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۲۰﴾ لَقَدْ كَانَ ع ۲ ۱۲ ۱۸
لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ
الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ
قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ز
وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴿۲۲﴾ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ
صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ
مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ
الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ
عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ؕ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ؕ وَكَانَ
اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿۲۵﴾ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ

وَتَأْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ﴿۲۶﴾ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿۲۷﴾

ع ۳ ۱۹

ترجمۂ آیات ۹ - ۲۷

اے ایمان والو! تم اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد رکھو کہ جب تم پر فوجیں چڑھ آئیں تو ہم نے ان پر ایک باد تند بھیجی اور ایسی فوجیں بھی بھیجیں جو تم کو نظر نہیں آئیں۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو برابر دیکھتے رہنے والا ہے۔ یاد کرو جب کہ وہ تم پر آ چڑھے، تمھارے اوپر کی طرف سے بھی اور تمھارے نیچے کی طرف سے بھی، اور جب کہ نگاہیں کج ہو گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے باب میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت اہلِ ایمان امتحان میں ڈالے گئے اور بالکل ہلا دیے گئے۔ ۹ - ۱۱

اور جب کہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے، کہتے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے کیے وہ محض فریب نکلے اور جب کہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب والو، تمھارے لیے ٹکنے کا کوئی مقام نہیں ہے تو تم لوٹ جاؤ اور ان میں سے ایک گروہ نبی سے اجازت کا طلبگار تھا اور کہتا تھا کہ ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں۔ حالانکہ وہ غیر محفوظ نہیں تھے، بس یہ لوگ بھاگنا چاہتے تھے۔ اور اگر ان کے اطراف سے ان پر حملہ ہو جاتا، پھر ان سے ارتداد کا مطالبہ کیا جاتا تو وہ اس پر راضی ہو جاتے اور اس میں بہت ہی کم توقف کرتے۔ حالانکہ اس سے پہلے انھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ وہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی پرسش ہونی ہے۔ کہہ دو اگر تم موت یا قتل سے بھاگو گے تو یہ بھاگنا تمھارے لیے کچھ نافع نہیں ہو گا، تم کو کھانے ملنے کا تھوڑا ہی موقع ملے گا۔ پوچھو، کون ہے جو تم کو خدا سے بچا سکے گا اگر وہ تم کو کوئی گزند پہنچانا

چاہے یا اس کی رحمت کو روک سکے اگر وہ تم پر رحمت کرنا چاہے؟ اور وہ اپنے لیے خدا کے مقابل میں نہ کوئی کارساز پائیں گے نہ کوئی مددگار۔ ۱۲-۱۷

اللہ تم میں سے ان لوگوں کو جانتا رہا ہے جو روکنے والے اور اپنے بھائیوں سے یہ کہنے والے رہے ہیں کہ ہمارے پاس آجاؤ۔ اور وہ جنگ میں بہت کم حصہ لیتے رہے ہیں۔ تم سے جان چراتے ہوئے۔ پس جب خطرہ پیش آجاتا تو تم ان کو دیکھتے کہ وہ تمھاری طرف اس طرح تاک رہے ہیں کہ ان کی آنکھیں اس شخص کی آنکھوں کی طرح گردش کر رہی ہیں جس پر سکراتِ موت کی حالت طاری ہو۔ پھر جب خطرہ دور ہو جاتا تو وہ مال کی طمع میں تم سے بڑی تیز زبانی سے باتیں کرتے۔ یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو اللہ نے ان کے اعمال ڈھا دیے اور یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ یہ لوگ گمان کر رہے ہیں کہ دشمن کی جماعتیں ابھی گئی نہیں ہیں اور اگر جماعتیں پھر آجائیں تو ان کی تمنا یہ ہوگی کہ وہ اہلِ بدو کے ساتھ دیہات میں ہوں اور وہاں سے تمھاری خبریں معلوم کرتے رہیں۔ اور اگر تمھارے ساتھ ہوتے بھی تو جنگ میں برائے نام ہی حصہ لیتے۔ ۱۸-۲۰

اور تمھارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ ان کے لیے جو اللہ کی ملاقات اور روزِ آخرت کی توقع رکھتے ہیں اور اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔ اور جب اہلِ ایمان نے جماعتوں کو دیکھا تو وہ بولے کہ یہ تو وہی چیز پیش آئی جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کر رکھا تھا۔ اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا۔ اور اس چیز نے ان کے ایمان واطاعت ہی میں اضافہ کیا۔ ۲۱-۲۲

اہلِ ایمان میں وہ جانباز بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کر دکھایا۔

سو ان میں سے بعض تو اپنا عہد پورا کر چکے اور بعض منتظر ہیں۔ اور انھوں نے ذرا بھی تبدیلی نہیں کی ہے تاکہ اللہ راستبازوں کو ان کی راست بازی کا صلہ دے اور منافقوں کو عذاب دے اگر چاہے یا ان کی توبہ قبول کرے (اگر وہ توبہ کریں) بے شک اللہ غفور رحیم ہے ۲۳-۲۴

اور اللہ نے کافروں کو ان کے غصہ کے ساتھ، بالکل بے نیل مرام، پسپا کر دیا اور جنگ کے لیے اللہ مسلمانوں کی طرف سے خود کافی ہو گیا اور اللہ قوی و غالب ہے اور اللہ نے ان اہل کتاب کو جھوں نے کافروں کی مدد کی ان کے قلعوں سے اتارا اور ان کے دلوں کو مرعوب کر دیا۔ کچھ کو تم قتل کرتے ہو اور کچھ کو قید۔ اور ان کی زمین، ان کے گھروں اور ان کے مالوں کا وارث تم کو بنایا۔ علاوہ ازیں اور بھی زمین ہے جس پر تمھارے پاؤں ابھی نہیں پہنچے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۵-۲۷

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا (۹)

تائید الٰہی کے کرشموں کی یاددہانی

آیت ۳ میں اللہ ہی پر بھروسہ کرنے کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے اسی مضمون کو موکد کرنے کے لیے یہ تائید الٰہی کے ان کرشموں کی یاددہانی کرائی جا رہی ہے جو ماضی قریب میں مسلمانوں کی نصرت کے لیے ظاہر ہوئے تھے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر تمام عرب مسلمانوں پر امڈ آیا تھا لیکن مسلمانوں کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ دشمنوں کی ٹڈی دل فوجیں اللہ تعالیٰ ہی نے اپنی پھونک سے اڑا دیں اور یہ حقیقت سب کے سامنے آگئی کہ اللہ تعالیٰ اعتماد کے لیے تنہا کافی ہے۔ اگر اس کی مدد حاصل ہو تو ساری دنیا کی مخالفت بھی کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محاصرہ کے آخری دنوں میں ایسی طوفانی آندھی آئی کہ خیموں کی چوبیں اور طنابیں اکھڑ گئیں، دیگیں الٹ گئیں، سواری کے جانور تتر بتر ہو گئے، سردی کی شدت کے باوجود آگ جلانا ناممکن ہو گیا، تاریکی کا یہ عالم کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

اس صورتِ حال نے دشمنوں پر مرعوبیت طاری کردی اور ابوسفیان نے سلامتی اسی میں دیکھی کہ کسی طرح اس آفت سے جان بچا کر گھر کو واپس ہو جائے۔

'وَجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا' یعنی بادِ تند کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسی فوجیں بھی بھیجیں جو مسلمانوں کو نظر نہیں آئیں۔ یہ اشارہ ملائکہ کی افواج کی طرف ہے جو ہمیشہ اہلِ ایمان کے ہم رکاب رہتی ہیں۔ اگرچہ وہ خود نظر نہیں آتیں لیکن ان کے شاندار غیبی کارنامے ظہور میں آتے ہیں جن سے اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور ان کے دشمن مرعوب ہوتے ہیں۔ سورۂ انفال میں بسلسلہ غزوۂ بدر، اس مسئلہ پر ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ 'لَمْ تَرَوْهَا' سے یہ بات تو معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو یہ فوجیں نظر نہیں آئیں لیکن اس سے یہ بات نہیں نکلتی کہ کفار نے بھی ان کو نہیں دیکھا۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ ان کو یہ فوجیں دکھائی دی ہوں جس سے ان کو یہ اندازہ ہوا ہو کہ مسلمانوں کی جمعیت بہت بڑی ہے اور یہ چیز ان کی مرعوبیت کا باعث ہوئی ہو۔

'وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا' یہ وہی مضمون ہے جو اوپر آیت ۲ میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے: 'اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا'۔ اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ بندے کو اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس کو یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ 'خبیر' و 'بصیر' ہے۔ اس کے بندے اس کی راہ میں جو بازیاں کھیلتے اور جو مشقتیں جھیلتے ہیں وہ ان کو دیکھتا اور ان سے اچھی طرح باخبر رہتا ہے۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا (۱۰)

مغربی اور شرقی دونوں سمتوں سے حملہ

'اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ' مدینہ کی مشرقی سمت بلند، مغربی سمت نشیبی ہے۔ چونکہ دشمن کا حملہ دونوں طرف سے تھا اس وجہ سے فوق اور اسفل دونوں کا حوالہ دیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قبیلہ غطفان وغیرہ کا حملہ مشرق کی طرف سے ہوا تھا اور قریش اور ان کے حلیفوں کی فوجیں مغرب کی سمت سے آئی تھیں۔

صورتِ حال کا اثر ضعفائے قلوب پر

'وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ' کوئی منظر ہولناک و دہشت ناک ہو تو نگاہ اس پر نہیں ٹکتی۔ عربی میں اس کو 'زَاغَ الْبَصَرُ' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح خوف و دہشت اور پریشانی کی تعبیر کے لیے 'بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ' کا محاورہ بھی ہے۔ 'کلیجہ منہ کو آنا' ہماری اپنی زبان میں بھی خوف و دہشت اور گھبراہٹ کی تعبیر کے لیے معروف ہے۔

'وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا' یہ بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے لیکن اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ضعفِ ایمان اور نفاق کی بیماری میں مبتلا تھے۔ یہ منظر دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ خدا کی قدرت و نصرت، اس کے وعدوں اور اس کی شانوں کے متعلق اب تک ان کو جو کچھ بتایا اور سکھایا گیا تھا وہ

سب ان کے نزدیک مشکوک ہوگیا۔ کلام کے تدریجی ارتقاء سے یہ بات خود واضح ہوجائے گی کہ یہ اشارہ منعفائے قلوب اور منافقین ہی کی طرف ہے۔ آگے سچے اہلِ ایمان کی عزیمت واستقامت کی تعریف قرآن نے ان الفاظ میں فرمائی ہے: وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ لا قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا (اور جب مومنوں نے دشمن کی پارٹیوں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہ تو وہی صورتِ حال ہمیں پیش آئی ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کر رکھا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات سچی ہوئی، اور اس چیز نے ان کے ایمان اور ان کی اطاعت ہی میں اضافہ کیا) جب سچے مسلمانوں کا یہ حال بیان ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت ایسے ہی سرفروشوں پر مشتمل تھی تو آیت زیرِ بحث کا اشارہ انہی لوگوں کی طرف ہو سکتا ہے۔ جو ضعیف الایمان تھے۔ اس بنا پر ہم ان تفسیری روایات کو بالکل بے سروپا سمجھتے ہیں جن میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ العیاذ باللہ غزوۂ احزاب کے موقع پر ایک آدھ آدمیوں کے سوا اور کوئی شخص مسلمانوں میں عزم و ہمت رکھنے والا نہیں نکلا۔

هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا (۱۱)

یعنی ان حالات نے اہلِ ایمان کو بڑی ہی سخت آزمائش میں ڈال دیا اور وہ نہایت ہی بری طرح جھنجھوڑ دیے گئے۔ ایک طرف ہر جانب سے دشمنوں کی یورش اور دوسری طرف اپنی صفوں کے اندر ایسے لوگوں کا وجود جو ان حالات کو دیکھ کر بالکل ہی ہمت ہار بیٹھے اور طرح طرح کے شبہات ظاہر کرنے لگے۔ لیکن کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کے لیے اہلِ ایمان کو اس قسم کے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا (۱۲)

اب اس اجمال کی تفصیل آرہی ہے جو تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا کے اندر مضمر ہے۔ یعنی جو منافق اور اسلام کے خلاف بغض و عناد رکھنے والے تھے انھوں نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے، ان کے اندر یہ پھیلانا شروع کر دیا کہ اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے جو وعدے کیے وہ سب محض فریب ثابت ہوئے۔ روایات میں اس گروہ کے بعض اشرار کی یہ پھبتی بھی نقل ہوئی ہے کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ہمیں یہ اطمینان دلا رہے تھے کہ ہم کسریٰ و قیصر کے خزانوں پر قبضہ کریں گے اور یہاں حال یہ ہے کہ گھر سے قضائے حاجت کے لیے نکلنا ناممکن ہو رہا ہے۔" غور کیجیے کہ ایک طرف دشمنوں کا ہر سمت سے شہر کا محاصرہ اور دوسری طرف منافقین کا مسلمانوں کے اندر یہ زہریلا پروپیگنڈا! اسی صورتِ حال کو قرآن نے اُبْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

ایک علمی نکتہ

اس آیت میں ایک علمی نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ فرمایا ہے: وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ

مَّرَضٌ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دو گروہوں کا الگ الگ ذکر ہے یا یہ دونوں صفتیں منافقین کے ایک ہی گروہ کی بیان ہوئی ہیں ؟ نظائر قرآن کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ 'مرض' قرآن میں جہاں اخلاقی مرض کے لیے استعمال ہوا ہے، دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک نفاق کے مفہوم میں، دوسرے کینہ و حسد کے مفہوم میں۔ جہاں یہ لفظ 'نفاق' کے ساتھ استعمال ہوا ہے، جس طرح یہاں ہے، تو یہ اپنے دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور اگر تنہا استعمال ہوا ہے تو اس کے مفہوم کا تعین قرینہ سے ہوتا ہے، بعض جگہ تو یہ نفاق کے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور بعض جگہ کینہ و حسد اور بغض و عناد کے مفہوم میں۔ اس دوسرے مفہوم کے لیے نظیر اسی سورہ کی آیت ۳۲ میں موجود ہے اور اس سے زیادہ واضح نظیر سورۂ محمد کی آیت ۲۹ میں ملے گی۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ منافقین میں دو قسم کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو محض ضعفِ عزم و ارادہ کے مریض تھے۔ دوسرے وہ جو اسلام کے خلاف اپنے دلوں میں بغض و عناد رکھتے تھے لیکن دشمنوں کی طرح کھلم کھلا مخالفت کرنے کے بجائے مارِ آستین بن کر اسلام کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ اسی گروہ کو عام منافقین سے ممیز کرنے کے لیے بعض جگہ 'وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ' کی صفت سے ذکر فرمایا ہے۔ جو لوگ ان دونوں گروہوں کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھتے وہ بعض مقامات میں قرآن کے الفاظ کا صحیح زور نہیں سمجھ سکتے۔

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ یٰٓاَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَیَسْتَاْذِنُ فَرِیْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِیَّ یَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُیُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِیَ بِعَوْرَةٍ ۛ اِنْ یُّرِیْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا (۱۳)

منافقینِ اعراب

یہ منافقین کے ایک دوسرے گروہ کا ذکر ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اشارہ منافقینِ اعراب کی طرف ہے۔ مدینہ کے قرب و جوار کے دیہاتوں کے جو لوگ اسلام لائے تھے ان میں ایک گروہ نہایت کٹر منافقین کا تھا۔ ان کا ذکر تفصیل سے سورۂ توبہ کی تفسیر میں ہو چکا ہے۔ ان کے لیے خود قرآن میں 'اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت سے مرعوب ہو کر مسلمان ہونے کے مدعی تو بن بیٹھے تھے لیکن ان کی ساری دلچسپی اپنے مفادات سے تھی۔ کسی غزوہ میں شریک ہونے کا وقت آتا تو اول تو مختلف بہانوں سے کترا جاتے اور اگر محض نمائش کے لیے کسی جنگ میں شریک ہوتے بھی تو اسلام سے زیادہ اسلام کے دشمنوں کی مقصد برآری کا ذریعہ بنتے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر بھی ان میں سے کچھ لوگ اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے آ گئے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنا سارا زور مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے صرف کیا۔ یہاں چند آیتوں میں اسی گروہ کے کردار پر تبصرہ ہے۔

'یٰاَهل یثرب' کے خطاب کے مضمرات

یٰٓاَهْلَ یَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا۔ ان لوگوں کا مدینہ کے مسلمانوں کو 'یٰٓاَهْلَ یَثْرِبَ' کہہ

کے خطاب کرنا اس بات کا نہایت واضح قرینہ ہے کہ ان کا تعلق حوالیٔ مدینہ کے بدوؤں سے تھا۔ اگر یہ خاص مدینہ ہی کے باشندے ہوتے تو اپنے ہی شہر کے بھائیوں کو اس خطاب سے مخاطب کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

'یثرب'، مدینہ منورہ کا سابق نام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد اس کا نام مدینۃ النبی اور پھر مدینہ ہو گیا لیکن دیہاتوں کے لوگ، بالخصوص منافقین، عرصہ تک اس کو یثرب ہی کہتے رہے۔ یہ لوگ دیہاتی بھی تھے اور منافق بھی اس وجہ سے انھوں نے نئے نام کو قبول نہیں کیا تھا۔ ان کو گمان یہ ہو رہا ہو گا کہ اسلام اور مسلمانوں کا قبضہ اس شہر پر عارضی ہے، سابق حالات پھر لوٹ آئیں گے۔ ان کے اس خطاب کا حوالہ دے کر قرآن نے ان کے اس باطن سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

منافقین کی مفسدانہ مساعی کی ایک مثال

'لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا'، یعنی انھوں نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے نہایت خیرخواہانہ انداز میں یہ کہنا شروع کیا کہ دشمنوں کی اس دل بادل فوج کے مقابل میں تمھارے لیے ٹک سکنا ناممکن ہے اس وجہ سے جنگ کے لیے محاذ آرائی بے سود ہوگی۔ اب بہتری اسی میں ہے کہ جنگ کا خیال چھوڑ کر گھروں کو واپس ہو جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ اس صورت میں تو اس بات کا امکان ہے کہ شاید یہ تمھارے دشمن تمھارے ساتھ کچھ نرم معاملہ کریں۔ لیکن نوبت اگر جنگ و قتال کی آگئی تو پھر تمھاری خیر نہیں ہے۔

منافقین کا ایک عذرِ لنگ

'وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ'… الآیۃ۔ 'عورۃ' کے معنی غیر محفوظ کے ہیں۔ انھی منافقین اعراب کے ایک دوسرے گروہ کا یہ کردار بیان ہو رہا ہے کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ عذر پیش کیے کہ چونکہ ان کے گھر تنہا اور غیر محفوظ ہیں اس وجہ سے انھیں اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت دی جائے۔ پہلے گروہ نے مدینہ والوں کو پست ہمت کر کے ان کو محاذ سے ہٹانے کی کوشش کی اور اس گروہ نے خود اپنے لیے راہِ فرار تلاش کرنے کی تدبیر کی تاکہ دشمن کے لیے میدان بالکل صاف ہو جائے۔ اس گروہ کا یہ عذر بھی کہ "ہمارے گھر غیر محفوظ ہیں" اس بات کا قرینہ ہے کہ ان کا تعلق اطرافِ مدینہ کے دیہاتوں سے تھا۔ جہاں تک اہلِ مدینہ کا تعلق ہے ان کے لیے اس قسم کے کسی بہانے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس جنگ سے متعلق جو تفصیلات کتابوں میں مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کا انتظام پہلے سے کر لیا گیا تھا۔

'وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا'۔ فرمایا کہ ان کا یہ عذر بالکل جھوٹا عذر تھا۔ ان کے مکانات غیر محفوظ یا کسی خطرے میں نہیں تھے۔ بلکہ یہ لوگ اس بہانے محاذِ جنگ سے فرار اختیار کرنا چاہتے تھے۔

وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَآ اِلَّا يَسِيْرًا (۱۴)

'اَقْطَارِهَا'، کی ضمیر کا مرجع 'یثرب' بھی ہو سکتا ہے لیکن قرائن کی روشنی میں میرے نزدیک اس کا مرجع 'بیوت' ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گھروں کی حفاظت کا بہانہ تو محض بہانہ ہے۔ اصل مقصد ان کا دین کی حفاظت

مدافعت سے فرار ہے۔ ان کے نزدیک سب سے زیادہ کم وقعت اور ارزاں چیز دین ہے۔ اگر ان کے گھروں کے اطراف سے ان پر اسلام کے مخالفوں کی چڑھائی ہو جائے اور وہ ان سے ارتداد یا مسلمانوں سے جنگ کرنے کا مطالبہ کریں تو یہ ان کے مطالبہ کو بے درنگ مان لیں گے۔ لفظ 'فتنہ' پر ہم جگہ جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہاں اس سے رجعت اور ارتداد یا مسلمانوں کے خلاف جنگ کا مطالبہ مراد ہے۔ صاحب کشاف نے یہی تاویل اختیار کی ہے اور ہمارے نزدیک یہ صحیح ہے۔ سورۂ نساء آیت ۹۱ میں اسی قسم کے منافقین کی طرف اشارہ ہے۔ سَتَجِدُونَ آخَرِينَ يُرِيدُونَ أَن يَأْمَنُوكُمْ وَيَأْمَنُوا قَوْمَهُمْ كُلَّمَا رُدُّوا إِلَى الْفِتْنَةِ۔ یہاں 'فتنہ' سے مراد، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اگر کوئی اسلام دشمن طاقت دباؤ ڈال کر ان سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی کام لینا چاہتی ہے تو بڑی آسانی سے لے لیتی ہے۔ بعینہٖ یہی مضمون آیت زیر بحث میں بیان ہوا ہے۔

وَلَقَدْ كَانُوا عَاهَدُوا اللَّهَ مِن قَبْلُ لَا يُوَلُّونَ الْأَدْبَارَ ۚ وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا (۱۵)

منافقین کی بدعہدی

یوں تو اسلام میں داخل ہونے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کرنے ہی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے مال اور اپنی جان کو اللہ کے دین سے دریغ نہیں رکھ سکتا بلکہ خدا کی راہ میں سب کچھ قربان کر دینے کے عہد کا پابند ہو جاتا ہے لیکن یہ منافقین اس عام عہد کے علاوہ ایک خاص عہد کی پابندی کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے چکے تھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں سے اکثر کا حال یہ تھا کہ پچھلے غزوات میں انھوں نے لاطائل عذرات کی آڑ لے کر شرکت سے گریز کیا تھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو قسمیں کھا کھا کر اطمینان دلایا تھا کہ آئندہ کسی جہاد کی نوبت آئی تو وہ اس میں پورے جوش سے حصہ لیں گے۔ ان لوگوں کی ان اطمینان دہانیوں کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کو ملامت کی ہے کہ پہلے تو انھوں نے بہت بڑھ چڑھ کے وعدے کیے تھے کہ آئندہ جنگ کی نوبت آئی تو وہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے تو اب جب اس کی نوبت آئی تو رخصت کی عرضیاں اور گھروں کے غیر محفوظ ہونے کے بہانے لے کر کیوں اٹھ کھڑے ہوئے! 'وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا' یہ ان کو دھمکی ہے کہ انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ سے کیے ہوئے ہر عہد کی پرسش ہونی ہے۔ پرسش تو ہر جرم کی ہوگی لیکن خاص طور پر اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ سورۂ صف میں ارشاد ہے: 'يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ' (الصف: ۲-۳) (اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں! اللہ کے نزدیک یہ بات زیادہ غضب کی ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں)۔

قُل لَّن يَنفَعَكُمُ الْفِرَارُ إِن فَرَرْتُم مِّنَ الْمَوْتِ أَوِ الْقَتْلِ وَإِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا (۱۶)

موت سے ڈر کر ادائے فرض سے فرار حماقت ہے

مطلب یہ ہے کہ موت یا قتل سے ڈر کر ادائے فرض سے فرار کوئی دانشمندانہ پالیسی نہیں ہے بلکہ یہ نہایت احمقانہ روش ہے۔ زندگی اور موت تمام تر خدا کے اختیار میں ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کے کسی مقرر کیے ہوئے فرض سے اس لیے گریز اختیار کرتا ہے کہ اس میں اس کو موت یا قتل کا اندیشہ ہے تو دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خدا سے فرار اختیار کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا سے بھاگ سکنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر اس طرح بھاگ کر کسی نے اپنی زندگی، اپنی دانست میں، بچائی تو کب تک بچائے رکھے گا، بالآخر اس کو ایک دن مرنا اور اپنے اس رب کو منہ دکھانا ہے جس سے اس نے بھاگنے کی کوشش کی۔ اس آیت کے الفاظ 'وَإِذًا لَّا تُمَتَّعُونَ إِلَّا قَلِيلًا' پر غور کیجیے تو ان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس طرح کے فراریوں کی عمر برکت سے بالکل محروم ہو جاتی ہے۔ وہ اس حیاتِ چند روزہ میں جتنے دن گزارتے ہیں بے برکت زندگی گزارتے ہیں، حالانکہ اگر وہ فرار نہ اختیار کرتے جب بھی وہ اپنی مدتِ حیات پوری کرتے اور اس چند روزہ زندگی کے بدلے حیاتِ جاوداں کی بادشاہی حاصل کرتے۔

قُلْ مَنْ ذَا الَّذِي يَعْصِمُكُم مِّنَ اللَّهِ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ سُوءًا أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً ۚ وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا (۱۷)

حذف کا ایک اسلوب

اس آیت میں عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق 'أَوْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً' سے پہلے جملہ کا ایک حصہ محذوف ہے۔ اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی: 'أَوْ يُمْسِكُ رَحْمَتَهُ إِنْ أَرَادَ بِكُمْ رَحْمَةً' (یا اس کی رحمت کو روک سکے اگر وہ تم پر رحمت کرنا چاہے) عربی میں حذف کے اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں 'متقلدا سیفا ورمحا' میں بھی یہی اسلوب ملحوظ ہے۔ قرآن میں اس کی جو بلیغ مثالیں ہیں ان کی طرف اس کتاب میں ہم اشارہ کرتے آئے ہیں۔ اردو میں یہ اسلوب موجود نہیں ہے اس وجہ سے ترجمہ میں اس حذف کو ہم نے کھول دیا ہے۔

رحمت اور نقمت دونوں صرف خدا کے اختیار میں ہے

'مِنْ دُونِ' مقابل کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ اس کے محل میں اس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم خدا سے جان چراتے ہو تو بتاؤ کہ اگر خدا تم کو کوئی گزند پہنچانا چاہے تو کون ہے جو اس کی پکڑ سے تمھیں بچا سکے، اسی طرح اگر وہ تمھارے دشمنوں کے علی الرغم تم پر اپنی رحمت نازل کرنا چاہے تو کس کی طاقت ہے کہ اس کی رحمت کو روک سکے؟ رحمت ہو یا نقمت دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہے تو خدا سے بھاگنے اور جی چرانے کے کیا معنی!

'وَلَا يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا': یہاں سیاقِ کلام چونکہ تنبیہ کا ہے اس وجہ سے تنبیہ کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں فرمایا کہ یاد رکھیں کہ اگر خدا کی پکڑ میں آ گئے تو اس کے مقابل میں نہ ان کا کوئی کارساز ان کا سفارشی بن سکے گا نہ کوئی حامی و مددگار ان کی حمایت کر سکے گا۔ کسی کی مدد سعی و سفارش کے ذریعہ سے بھی ہو سکتی ہے، جس طرح کی مدد کی توقع مشرکین اپنے معبودوں اور نیز کارداولیاء سے رکھتے تھے،

اور جمعیت و عصبیت کے بل پر بھی ہو سکتی ہے جس کا غرّہ ہر صاحبِ جمعیت کو ہوتا ہے۔ یہاں ان دونوں ہی کی نفی فرما دی۔

قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ الْمُعَوِّقِيْنَ مِنْكُمْ وَالْقَآئِلِيْنَ لِاِخْوَانِهِمْ هَلُمَّ اِلَيْنَا ۚ وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۸)

منافقین کی ایک اور سازش کی طرف اشارہ

'قَدْ يَعْلَمُ اللّٰهُ' میں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں۔ اس میں نہایت سخت قسم کی تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ اللہ تمہارے اندر سے ان لوگوں کو برابر جانتا رہا ہے جو اپنے بھائیوں کو جنگ سے روکتے اور ان سے یہ کہتے رہے ہیں کہ ہمارے پاس آ جاؤ اور یہ لوگ جنگ میں عملاً بہت کم حصہ لیتے رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی ان سازشوں سے کوئی آگاہ نہیں ہے لیکن اللہ ان سے برابر آگاہ رہا ہے اور جب وہ ان سے برابر آگاہ رہا ہے تو ان کو سزا دیے بغیر بھی نہیں چھوڑے گا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ اشارہ ان منافقین کی طرف ہے جو نہ صرف یہ کہ خود دفاع میں کوئی حصہ نہیں لیتے تھے بلکہ اپنے اعتماد و تعلق کے دوسرے لوگوں کو بھی اس سے روکتے اور ان سے کہتے تھے کہ جس جگہ ہم ہیں تم بھی اسی جگہ آ جاؤ تاکہ تم پر کوئی گرفت نہ ہو سکے۔ یہ امر یہاں پیشِ نظر رہے کہ غزوۂ خندق کے موقع پر دفاعی لائن بہت طویل تھی اس وجہ سے منافقین کے لیے دفاع کی ذمہ داریوں سے گریز و فرار کے مواقع بہت تھے۔ وہ خود بھی اس سے گریز کرتے اور اپنے دوسرے ہم خیالوں کو بھی اپنا ساتھی بنانے کی کوشش کرتے۔

'وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا'۔ یہاں بھی مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے اور 'باس' سے مراد دفاع ہے۔ یعنی یہ خود تو دفاع میں برائے نام محض نمائش کے لیے حصہ لیتے اور جو لوگ حصہ لیتے ان کے دل بٹھانے کی کوشش کرتے اور ان کو اپنے مورچوں پر بلاتے کہ ان کو بھی اپنا ساتھی بنا لیں۔

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۖ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۭ اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا (۱۹)

'اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ' کا تعلق اوپر والے جملہ 'وَلَا يَاْتُوْنَ الْبَاْسَ اِلَّا قَلِيْلًا' سے ہے۔ یعنی اول تو وہ دفاع میں حصہ لیتے نہیں تھے اور اگر کبھی حصہ لیتے بھی تو تمہارے لیے جان یا مال کی کوئی قربانی کرنے کے معاملے میں نہایت بخیل تھے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ایک قطرہ خون بہائے بغیر وہ غازی و مجاہد سمجھے جائیں۔

زبان کے سورماؤں کا حال

'فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ

مِنَ الْمَوْتِ' چونکہ یہ کوئی قربانی دینے کے لیے نہیں بلکہ کوئی خطرہ مول لیے بغیر غازیوں کے رجسٹر میں اپنے نام درج کرانے گئے تھے اس وجہ سے جب کبھی محاذ پر کوئی خطرے کی حالت پیش آجاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ ان کی آنکھیں اس طرح گردش کر رہی ہیں گویا ان پر موت کی غشی طاری ہونے لگی ہے۔ موت کا مقابلہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ کرتا ہے جو شہادت کے عزم کے ساتھ گھر سے نکلتا ہے۔ محض نمائش کے لیے نکلنے والوں کا بھرم کوئی معمولی سے معمولی خطرہ بھی کھول دیتا ہے۔

'فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ' 'سلق' کے معنی تیز زبانی اور چرب زبانی سے بات کرنے کے ہیں۔ اسی سے 'خطیب سلاق' اس خطیب کو کہتے ہیں جو نہایت تیز زبان ہو۔

یعنی جب کوئی خطرے کی حالت پیش آجاتی تب تو ایسا معلوم ہوتا کہ ان کے دم خشک ہو رہے ہیں اور ان پر موت کی جان کنی طاری ہے لیکن جب خطرے کی حالت گزر جاتی تو بڑی تیز زبانی سے باتیں کرتے گویا انہی کی شہامت و شجاعت کا یہ کرشمہ ہے کہ دشمن کو آگے قدم بڑھانے کی جرأت نہیں ہوئی ورنہ خطرہ بالکل سر پر آگیا تھا۔

'اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ' یعنی اس ساری تیز زبانی و طلاقت لسانی کا مظاہرہ وہ محض مال کی طمع میں کرتے ہیں کہ اگر تقسیم غنیمت کا موقع آئے تو اس میں زیادہ سے زیادہ حصہ ہتیا سکیں۔

یہ 'اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ' اوپر والے 'اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ' کے بالکل ٹھیک ٹھیک مقابل میں ہے، یہ 'شحیح' کی جمع ہے۔ اس کے معنی بخیل کے بھی آتے ہیں اور حریص کے بھی اور یہ دونوں ہی مفہوم ایک ہی کردار کے دو پہلو ہیں۔ پہلے ٹکڑے میں یہ بخیل کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے دوسرے میں حریص کے مفہوم میں۔ مطلب یہ ہوا کہ تمہارے معاملے میں ان کی بخالت و تنگ دلی کا تو یہ حال ہے کہ تمہاری خاطر نہ وہ ایک قطرہ خون بہانے کو تیار ہیں نہ اپنا کوئی دھیلا خرچ کرنے پر راضی ہیں لیکن اگر مال غنیمت ہاتھ آئے تو اس کی طمع میں یہ زبان کے غازی سب کو ہدفِ مطاعن بنا ڈالیں گے۔

'سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ' کے الفاظ کے اندر چرب زبانی کے ساتھ تند زبانی کا مفہوم بھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ منافقین چونکہ مال ہی کی طمع میں غزوات میں شریک ہوتے اس وجہ سے ان کے حاصل کرنے کے لیے وہ دوسروں کو ہمز و لمز اور طعن و تشنیع کا نشانہ بھی بنانے سے گریز نہ کرتے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات، جیسا کہ سورۂ نساء، سورۂ توبہ اور سورۂ انفال وغیرہ میں گزر چکا ہے، خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تقسیم غنیمت کے معاملے میں یہ جانبداری کا الزام دیتے کہ لڑائی تو ہم جیتتے ہیں لیکن مال غنیمت میں سے حصہ دوسروں کو زیادہ دیا جاتا اور ہم کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

'اُولٰٓئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا' یعنی یہ لوگ چونکہ محض

زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے رہے ہیں حقیقی ایمان ان کو نصیب نہیں ہوا اس وجہ سے اس نمائشی ایمان کے ساتھ انھوں نے جو کام بظاہر دین کے بھی کیے وہ سب اللہ نے حبط کر دیے۔ ان کا کوئی صلہ آخرت میں ان کو ملنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں عمل صرف وہی مقبول ہے جو ایمان کے ساتھ ہو۔

وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا۔ یہ لوگوں کی بعض نہایت شدید قسم کی غلط فہمیوں کا ازالہ ہے۔ بہت سے لوگ ارادے اور نیت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ کسی کا کوئی عمل ان کی نگاہوں میں اچھا ہے تو وہ لازماً آخرت میں بھی اس کے صلہ میں، ان کے نزدیک، مراتبِ عالیہ کا سزاوار ٹھہرے گا۔ حالانکہ یہ بات حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی کے بڑے سے بڑے عمل کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے اگر وہ اس کی رضا کے لیے نہ کیا جائے۔ خدا کسی کے عمل کا محتاج نہیں ہے۔ اپنے عمل کے محتاج خود عمل کرنے والے ہیں۔ ان کا نفع سرتاسر انہی کو پہنچتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ ہر اس عمل کو قبول فرمائے گا جو اس کے احکام کے مطابق اور خالص اس کی رضا جوئی کے لیے کیا جائے گا، خواہ عمل چھوٹا ہو یا بڑا۔ اگر کوئی عمل اس کی رضا جوئی کے سوا کسی اور کی رضا جوئی یا کسی اور غرض کے لیے کیا جائے گا تو ایسے عمل کو اللہ تعالیٰ عمل کرنے والے کے منہ پر پھینک مارے گا کہ اس کا صلہ وہ ان سے لے جن کی خوشنودی کے لیے اس نے کیا ہے، اگرچہ یہ حج اور جہاد کے درجہ ہی کا عمل کیوں نہ ہو۔ فرمایا کہ کوئی اس مغالطہ میں نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایسا کرنا ذرا بھی شاق گزرے گا۔ یہ ذرا بھی اس پر شاق نہیں گزرے گا بلکہ یہ اس کے لیے نہایت سہل ہے۔ وہ کسی کے عمل کا محتاج نہیں ہے کہ ہر قسم کا عمل اپنے کھاتے میں جمع کرتا جائے کہ چلو، یہ بھی غنیمت ہے!

بعض لوگوں کو یہ مغالطہ بھی ہوجاتا ہے کہ خدا بڑا مہربان و کریم ہے اس وجہ سے جو کچھ بھی اور جس طرح بھی کوئی نیکی کا کام کر دے گا وہ اس کو قبول فرمالے گا۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ خدا بڑا ہی مہربان و کریم ہے لیکن ساتھ ہی وہ نہایت غیور و غنی بھی ہے اس وجہ سے لوگوں کے ایسے اعمال کو پامال کر دینا اس پر ذرا بھی گراں نہیں ہوگا جن کا قبول کرنا اس کی غیرت کے منافی ہو۔ یہود کو خدا کی صفتِ کریمی سے جو مغالطے پیش آئے ان کی تفصیل سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

يَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ يَذْهَبُوْا ۚ وَاِنْ يَّاْتِ الْاَحْزَابُ يَوَدُّوْا لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِي الْاَعْرَابِ يَسْاَلُوْنَ عَنْ اَنْۢبَآئِكُمْ ۭ وَلَوْ كَانُوْا فِيْكُمْ مَّا قٰتَلُوْٓا اِلَّا قَلِيْلًا (۲۰)

منافقین کی بزدلی کی مزید وضاحت

ان لوگوں کی بزدلی کا ذکر اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے۔ یہ اسی کی مزید وضاحت ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ جماعتوں کے چلے جانے سے ان کے دلوں کا خوف بھی چلا گیا ہے۔ جماعتیں پسپا ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئیں لیکن ان کی ہیبت اس طرح ان کے دلوں پر مسلط ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ابھی وہ نہیں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔

'وَإِنْ يَأْتِ الْأَحْزَابُ... الآیۃ'۔ یعنی اب کے تو یہ کسی نہ کسی طرح، مارے باندھے، یہاں مدینہ میں رہ گئے لیکن اب اگر دوبارہ حملے کا کوئی اندیشہ ہوا تو ان کی خواہش یہ ہوگی کہ مدینہ میں ٹکنے کے بجائے اہلِ بدو کے ساتھ دیہاتوں میں جا رہیں اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے تمہاری خبریں دریافت کرتے رہیں کہ کیا گزر رہی ہے!

'وَلَوْ كَانُوا فِيكُمْ مَا قَاتَلُوا إِلَّا قَلِيلًا'۔ یہ مسلمانوں کو تسلی ہے کہ اگر یہ ایسا کریں تو اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ اگر یہ تمہارے پاس ہوں گے بھی تو یہ جنگ میں حصہ لینے والے آسامی نہیں ہیں۔ بہتر ہے کہ دور ہی رہیں کہ ان کی چھوت سے دوسرے متاثر نہ ہوں۔ اوپر آیت ۱۸ کے تحت جو کچھ گزر چکا ہے اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا (۲۱)

عزیمت کے لیے نمونہ اور اس کے حصول کی تدبیر

یہ ان بزدلوں کو غیرت دلائی ہے کہ تمہارے اندر ہی محاذ پر خدا کا رسول بھی موجود تھا اور تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نے کس عزم و ہمت کے ساتھ تمام خطرات کا مقابلہ کیا تو آخر تم نے اس بہترین نمونے کی پیروی کیوں نہ کی، اس قدر بزدل اور ڈرپوک کیوں بنے رہے!

'لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا'۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ رسول کے اسوہ کی پیروی ہر مدعی کا کام نہیں ہے۔ اس راہ کی آزمائشوں سے وہی لوگ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو اللہ کی ملاقات اور روزِ آخرت کے منتظر و متوقع اور اللہ کی یاد سے ہر وقت اپنے دل کو آباد و شاداب رکھنے والے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ راہِ حق میں عزیمت و استقامت انہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جن کے اندر خدا اور آخرت پر مضبوط ایمان ہو اور وہ برابر اپنے اس ایمان کو خدا کی یاد سے تازہ رکھیں۔ نیز اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ ان منافقین کے اندر نہ خدا اور آخرت پر ایمان تھا اور نہ یہ خدا کو یاد رکھنے والے تھے اسی وجہ سے ان کے خوف کا یہ حال ہے کہ دشمنوں کے پسپا ہو جانے کے بعد بھی ان کے دلوں پر سے ان کی ہیبت نہیں گئی۔

وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا (۲۲)

منافقین کے بالمقابل مخلصین کا رویہ

اوپر آیت ۱۲ میں منافقوں اور حاسدوں کا قول گزر چکا ہے کہ انھوں نے دشمنوں کے اس ہجوم کو دیکھ کر علانیہ مسلمانوں میں یہ پھیلانا شروع کر دیا کہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جو وعدے ہم سے کیے گئے وہ سب فریب ثابت ہوئے۔ اب ان کے مقابل میں یہ سچے مسلمانوں کا تاثر بیان ہو رہا ہے کہ انھوں نے جب

دشمنوں کے اس نرغہ کو دیکھا تو اپنے ساتھیوں کو تسلی دی کہ یہ تو وہی امتحان ہمیں پیش آیا ہے جس کی اللہ اور اس کے رسول نے پہلے سے ہمیں خبر دے دی تھی ۔ یہ اشارہ قرآن کی ان آیات کی طرف ہے جن میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ کامیابی کی منزل کو پہنچنے سے پہلے ان کو نہایت صبر آزما امتحانوں سے گزرنا پڑے گا ۔ مثلاً سورہ بقرہ میں فرمایا ہے :

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ (البقرۃ : ۲۱۴)

کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں اس طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا ہی نہیں جس طرح کے حالات سے ان لوگوں کو سابقہ پیش آیا جو تم سے پہلے گزرے ۔ ان کو فقر و بیماری کے مصائب پہنچے ۔ اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہو گی ! آگاہ، کہ اللہ کی مدد قریب ہے ۔

اسی سنت کی طرف سورہ عنکبوت میں یوں اشارہ فرمایا ہے ۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۖ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ (۲-۳)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ مجرد یہ کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کی جانچ نہ ہوگی اور ہم نے ان لوگوں کو جانچا جو ان سے پہلے گزرے ! پس اللہ لازماً ممیز کر کے رہے گا ان لوگوں کو جو اپنے دعوائے ایمان میں راستباز ہیں اور ان لوگوں کو جو جھوٹے ہیں ۔

'صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ' یعنی اللہ و رسول کا وعدہ جھوٹا نہیں ثابت ہوا بلکہ بالکل سچا ثابت ہوا۔ جو لوگ اس مرحلے میں ثابت قدم رہیں گے وہ آئندہ ظہور میں آنے والے وعدوں کی صداقت بھی دیکھ لیں گے کہ مسلمان قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے مالک ہوں گے ۔

'وَمَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا' یعنی اس امتحان نے ان کے اندر کوئی کمزوری پیدا کرنے کے بجائے ان کے ایمان و اطاعت کے جذبے میں مزید قوت پیدا کی ۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ راہِ حق میں جو آزمائش بھی پیش آتی ہے وہ جس طرح کمزوری کے کھوٹ کو نمایاں کرتی ہے اسی طرح صادقوں کے صدق کو بھی جلا بخشتی ہے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ٹھہرائی ہوئی سنت ہے ۔

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ ۖ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ

مِّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا (۲۳)

سورۂ اعراف کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ لفظ 'رجال' جب اس طرح استعمال ہوتا ہے تو وہ تفخیم شان پر دلیل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اگر اس کا ترجمہ 'مردانِ حق'، یا 'مردانِ کار' کیا جائے تو یہ ترجمہ لفظ کی روح کے مطابق ہوگا۔

لفظ 'نحب' وسیع معنوں میں آتا ہے۔ عزم و ہمت، عہد و پیمان، نذر، سب اس کے مفہوم میں داخل ہے۔ امام بخاریؒ نے اس کی تفسیر 'عھد' سے کی ہے اور یہ تفسیر لفظ کی روح اور موقع و محل کے مقتضیات کے بالکل مطابق ہے۔

اوپر آیت ۱۵ میں منافقین کا حال بیان ہو چکا ہے کہ انھوں نے اللہ اور رسول سے یہ عہد کیا تھا کہ اب کسی جنگ کا موقع آیا تو وہ پیٹھ نہیں دکھائیں گے لیکن جب موقع آیا تو محاذ سے فرار کے بہانے ڈھونڈنے لگے۔ یہ ان کے مقابل میں اللہ کے وفادار بندوں کا ذکر ہے کہ مسلمانوں کے اندر وہ مردانِ حق بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے باندھے ہوئے عہد کو اس کی راہ میں جانیں دے کر پورا کر دکھایا اور جو ابھی یہ عہد پورا نہیں کر سکے ہیں وہ سر ہتھیلی پر لیے کھڑے ہیں کہ کب موقع آئے کہ وہ اس فرض سے سبکدوش ہوں۔ 'وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا' اور انھوں نے اللہ سے باندھے ہوئے عہد میں سرِمو تبدیلی نہیں کی۔

لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۲۴)

یہاں قرینہ دلیل ہے کہ فعل محذوف ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے احزاب کا یہ طوفان اس لیے اٹھایا کہ یہ راستبازوں اور منافقوں کے درمیان امتیاز کے لیے ایک کسوٹی بنے۔ اس پر پرکھ کر اللہ تعالیٰ اپنے راستباز بندوں کو راستبازی کا صلہ دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے، اور ان کی توبہ قبول کرے اگر وہ توبہ کریں۔

منافقین کو توبہ کی دعوت

'اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ' میں قرآن کے اس معروف اسلوب کے مطابق جس کی مثالیں گزر چکی ہیں، 'يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ' کے بعد بھی 'اِنْ شَآءَ' کے الفاظ ہیں اگرچہ تکرار سے بچنے کے لیے وہ حذف کر دیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اس کی حکمت اور اس کی سنت کے مطابق ہے، اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر وہ توبہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ وہ چاہے گا تو ان کو بخش دے گا۔ اس ٹکڑے میں منافقین کے لیے دعوتِ استغفار ہے کہ ان کے لیے اب بھی گنجائش باقی ہے۔ اگر وہ چاہیں تو استغفار و توبہ کے ذریعہ سے پھر خدا کی رحمت کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ یاددہانی بھی ہے کہ تمام امور کا انحصار اللہ واحد کی مشیت ہی پر ہے اس وجہ سے جھوٹے سہاروں پر تکیہ کرنے کے بجائے وہ اپنے آپ کو اللہ ہی کے حوالہ کریں۔ اس ٹکڑے سے جن لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو چاہے گا توبہ و استغفار کے بغیر ہی بخش دے گا،

انھوں نے توبہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت کو نہیں سمجھا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی مشیت کو کوئی دوسرا روک یا بدل نہیں سکتا لیکن اس نے اپنے عدل و حکمت کے تحت جو قاعدے ٹھہرائے ہیں اس کی مشیت ان قاعدوں کو باطل نہیں کرتی۔

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۚ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ﴿٢٥﴾

دشمنوں کی پسپائی اور اہل ایمان کی حوصلہ افزائی

'الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' سے مراد احزاب کے شرکاء ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ غصہ اور بغض و عناد سے بھرے ہوئے آئے تھے کہ مسلمانوں کو کچا ہی کھا جائیں گے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے غصہ کے ساتھ ہی ان کو پسپا کر دیا، وہ اس کا کوئی حصہ بھی نکال نہ سکے۔ 'لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا' یعنی ان کے منصوبے تو بڑے بڑے تھے لیکن ان کے کسی منصوبے میں ان کو ذرا بھی کامیابی نہیں ہوئی۔

'وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ' یعنی دشمنوں کے اس خطرناک حملہ کے دفاع کے لیے مسلمانوں کو خود کوئی لڑائی نہیں لڑنی پڑی بلکہ ان کی طرف سے لڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کافی ہو گیا۔ اس نے اپنی باد تند اور اپنے ملائکہ کی افواج قاہرہ کے ذریعہ سے دشمنوں کے قدم اکھاڑ دیے اور وہ مایوس و نامراد پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔

'وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا' یہ تمہید کے مضمون 'وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا' کی یاددہانی ہے کہ اللہ تعالیٰ قوی اور غالب و مقتدر ہے، اس وجہ سے اس کے بندوں کو چاہیے کہ اس پر پورا بھروسہ رکھیں۔ اگر وہ اس کے بھروسہ پر اس کی راہ میں اٹھیں گے تو وہ ان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا بلکہ عناصر کائنات اور اپنے ملائکہ کو وہ ان کی مدد کے لیے بھیج دے گا۔

وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۚ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَـُٔوْهَا ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢٦-٢٧﴾

بنو قریظہ کی عہد شکنی اور ان کا انجام

یہ بنو قریظہ کی طرف اشارہ ہے۔ ہم پیچھے ذکر کر آئے ہیں کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ معاہدۂ امن و صلح کر رکھا تھا لیکن جب احزاب نے اپنی مجتمعہ قوت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ کیا کہ ان کو ہمیشہ کے لیے جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے رکھ دیں تو انھوں نے بھی معاہدہ کو بالائے طاق رکھ کر احزاب کا ساتھ دیا۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مشہور یہودی لیڈر حیّ بن اخطب نضری بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد سے ملا اور اس کو ساتھ دینے کے لیے اس نے ابھارا۔ پہلے تو اس نے معاہدہ کے سبب سے کچھ تذبذب کا اظہار کیا لیکن جب حیّ بن اخطب نے یہ پٹی پڑھائی کہ میں تمھی لوگوں کی خاطر تو سارے عرب کو اکٹھا کر کے مدینہ پر چڑھا لایا ہوں، اگر تمھی نے اس مہم میں ساتھ نہ دیا تو پھر میری اس تمام دوڑ دھوپ کا حاصل کیا! مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دینے کا

یہ آخری موقع ہے، اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پچھتاؤ گے اور اس پچھتانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا! حیی بن اخطب کا یہ جادو کارگر ہوگیا اور بنو قریظہ بھی معاہدہ توڑ کر حملہ آوروں میں شامل ہوگئے۔ مسلمانوں کے لیے یہ چیز مزید پریشانی کا باعث ہوئی۔ مدینہ کے بالکل قریب ان کے قلعے اور گڑھیاں تھیں اور لڑنے والے افراد کی بھی ان کے پاس کافی تعداد تھی۔ ان کی شرکت سے دشمنوں کا حوصلہ دوچند ہوگیا اور مسلمانوں کے لیے یہ آزمائش بہت ہی صبر آزما بن گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی تائیدِ غیبی سے جس طرح تمام پارٹیوں کو پسپا ہونا پڑا اسی طرح انھیں بھی پسپا ہونا پڑا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ محاذ سے واپسی کے معاً بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ آپ بنو قریظہ پر حملہ کریں۔ آپ نے مسلمانوں کو فوراً حملہ کر دینے کا حکم دے دیا اور بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ یہ محاصرہ تقریباً ۲۵ دن جاری رہا۔ بالآخر انھوں نے مرعوب ہو کر حضرت سعد بن معاذؓ کو حکم مان لیا کہ وہ جو فیصلہ کر دیں ان کو منظور ہوگا۔ حضرت سعدؓ نے فیصلہ کیا کہ ان کے تمام قابلِ جنگ افراد قتل کر دیے جائیں اور بقیہ کو لونڈی غلام بنا لیا جائے۔ اس فیصلہ کی فوراً تعمیل کی گئی۔ اسی واقعہ کی طرف آیت میں اشارہ ہے۔

'مِنْ صَيَاصِيهِمْ'۔ 'صِيصَة' مرغ کے پنجے کو کہتے ہیں۔ اسی سے جمع 'صَيَاصِي' ہے جو بیل کے سینگوں کے لیے بھی آتا ہے اور پھر ترقی کر کے دفاعی حصارات، قلعوں اور گڑھیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ بنو قریظہ پہلے تو اپنے قلعوں میں محصور ہو گئے لیکن محاصرے سے تنگ آکر بالآخر ان کو مجبوراً ان سے نکلنا پڑا اور اپنے آپ کو اپنے اہل و عیال سمیت مسلمانوں کے حوالہ کرنا پڑا۔ 'وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ' اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس طرح مسلمانوں کا رعب ڈال دیا کہ حضرت سعدؓ کے فیصلہ کے خلاف ان کو چوں کرنے کی بھی جرأت نہ ہو سکی۔ مسلمانوں نے بغیر کسی ادنیٰ مزاحمت کے، ان کے قابلِ جنگ افراد کو قتل کر کے بقیہ کو لونڈی غلام بنا لیا۔

'وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ' اور ان کا پورا علاقہ، ان کے تمام مکانات و حصارات اور ان کے ہر قسم کے اموال و اثاثات کے ساتھ، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے قبضے میں دے دیا۔

مسلمانوں کو بشارت

'وَأَرْضًا لَّمْ تَطَئُوهَا'۔ یہ بشارت ہے مستقبل کی فتوحات کی۔ فرمایا کہ یہ نقدِ عاجل تو جو کچھ تمھیں ہم نے بخشا وہ تم نے دیکھ لیا لیکن ابھی اور بھی علاقے تمھارے قبضہ میں آئیں گے جن تک تمھارے قدم ابھی نہیں پہنچے ہیں لیکن ان کی وراثت ہم نے تمھارے لیے مقدر کر رکھی ہے۔ یہ اشارہ خیبر، مکہ اور روم و شام وغیرہ کی فتوحات کی طرف ہے۔ 'وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا'۔ یعنی یہ جو کچھ تم نے اپنی آنکھوں دیکھا کافی ہے یہ اطمینان پیدا کرنے کے لیے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، کوئی اس کے ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتا اس وجہ سے اہلِ ایمان کو چاہیے کہ اس پر پورا پورا بھروسہ رکھیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۲۸ - ۳۵

اوپر کے پیرے میں عام مسلمانوں کو اللہ اور رسول کی اطاعت پر مجتمع کرنے کے بعد آگے ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ان کو منافقین اور منافقات کے فتنوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین فرمائی ہے کہ ان کی کوشش یہ ہے کہ ازواج نبی (رضی اللہ عنہم) کے دلوں میں بھی طلب دنیا کی بیماری پیدا کریں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے رسول کی رفاقت کے لیے اس لیے چنا ہے کہ وہ اس کتاب و حکمت کی تعلیم کا ذریعہ بنیں جو اللہ کے رسول سے انھیں حاصل ہو رہی ہے۔ اللہ کے ہاں ان کا مرتبہ بہت اونچا ہے اگر انھوں نے اپنے فریضۂ منصبی کی ذمہ داریاں ادا کیں۔ اسی طرح ان کے لیے سزا بھی بہت ہی سخت ہے اگر ان سے کوئی جرم صادر ہوا ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸-۳۵

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا
وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۲۸﴾
وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ
اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ
مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ وَ
كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ

الجزء ۲۲

وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ ۙ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا
كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ
فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ
قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾ وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ
الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ
اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ

تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ
وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَ
الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ
وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ
وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ
مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۳۵﴾

ع ۱

ترجمہ آیات ۲۸ - ۳۵

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کی طالب ہو تو آؤ، میں تمہیں دے دلا کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو اطمینان رکھو کہ اللہ نے تم سے خوبی کے ساتھ نباہ کرنے والیوں کے لیے ایک اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ ۲۸ - ۲۹

اے نبی کی بیویو، تم میں سے جو کسی کھلی بے حیائی کی مرتکب ہو گی تو اس کے لیے دوچند عذاب ہے۔ اور یہ بات اللہ کے لیے آسان ہے۔ اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبردار بنی رہیں گی اور عملِ صالح کریں گی ہم ان کو دُہرا اجر دیں گے اور ہم نے ان کے لیے باعزت رزق تیار کر رکھا ہے۔ ۳۰ - ۳۱

اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو اگر تم تقویٰ اختیار کرو۔ تو تم لہجہ میں نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں بیماری ہے وہ کسی طمعِ خام میں مبتلا ہو جائے اور بات معروف کے مطابق کہو۔ ۳۲

اور اپنے گھروں میں ٹک کے رہو اور سابقہ جاہلیت کے سے انداز اختیار نہ کرو۔ اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اللہ تو بس یہ چاہتا ہے اے اہلِ بیتِ نبی! کہ تم سے آلودگی کو دور کرے اور تمہیں اچھی طرح پاک کرے اور تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات اور حکمت کی جو تعلیم ہوتی ہے اس کا چرچا کرو۔ بے شک اللہ نہایت ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔ ۳۳-۳۴

اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں، راستباز مرد اور راستباز عورتیں، ثابت قدمی دکھانے والے مرد اور ثابت قدمی دکھانے والی عورتیں، فروتنی اختیار کرنے والے مرد اور فروتنی اختیار کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد رکھنے والی عورتیں — ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔ ۳۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا (۲۸-۲۹)

آیات کا پس منظر قرآن کی روشنی میں

ہمارے مفسرین نے ان آیات کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ فتح خیبر کے بعد جب مسلمانوں کو فی الجملہ معاشی کشادگی حاصل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج نے بھی آپ سے مطالبہ کیا کہ ان کو بھی زندگی کی راحتوں

اور زینتوں سے متمتع ہونے کا موقع دیا جائے۔ ان کے اس مطالبہ پر بطور عتاب یہ آیات نازل ہوئیں۔ ہمارے نزدیک کئی پہلوؤں سے یہ بات نہایت کمزور ہے۔

اول تو قرینہ دلیل ہے کہ یہاں جن حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے وہ ہجرت کے چوتھے یا پانچویں سال سے تعلق رکھنے والے ہیں، اور غزوۂ خندق اور بنو قریظہ کے حالات زیر بحث آئے ہیں، آگے حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ان تمام واقعات کا تعلق ۵ھ سے ہے۔ خیبر ابھی فتح نہیں ہوا تھا۔ اوپر آیت ۲۷ کے الفاظ وَاَرۡضًا لَّمۡ تَطَـُٔوۡهَا کے تحت خود مفسرین ہی نے یہ تصریح کی ہے کہ یہ فتح خیبر کی پیشگی بشارت ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ مطالبہ اگر مجرد نان نفقہ میں فی الجملہ توسیع کے لیے تھا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ جس پر ان کو یہ نوٹس دے دیا جائے کہ ان کو دے دلا کر ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا جائے۔ اس طرح کی بات پر اول تو کسی تنبیہ کی سزاوار ہی نہیں تھیں اور اگر تھیں بھی تو زیادہ سے زیادہ اس نصیحت کی مستحق تھیں کہ نبی کی معیت مطلوب ہے تو انھیں صبر و قناعت کی زندگی اختیار کرنی پڑے گی۔

تیسرا یہ کہ امہات المومنینؓ کے متعلق یہ سوءِ ظن نہیں کیا جا سکتا کہ ان پر دنیا کی راحتوں اور زینتوں کا شوق کسی دور میں بھی اتنا غالب آگیا ہو کہ وہ اس کا مطالبہ لے کر اٹھ کھڑی ہوئی ہوں اور معاملہ اتنا سنگین ہو گیا ہو کہ خود اللہ تعالیٰ کو اس میں مداخلت کرنی پڑی ہو اور نوبت اس نوٹس تک پہنچ گئی ہو جو ان آیات میں ان کو دیا گیا۔

بہر حال یہ شانِ نزول ہمارے نزدیک قابلِ توجہ نہیں ہے نہ آیت کے الفاظ سے اس کی تائید ہوتی ہے نہ وقت کے حالات سے۔ ہم یہاں اس سورہ کی روشنی میں وقت کے بعض خاص حالات کی طرف اشارہ کریں گے جن سے ان آیات کا صحیح موقع و محل سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اس پوری سورہ پر تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں منافقین کی ریشہ دوانیاں جس طرح عام مسلمانوں کو اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان و برگشتہ کرنے کے لیے بہت بڑھ گئی تھیں اسی طرح منافقات کے ذریعے سے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے سکون کو درہم برہم کرنے کے لیے بھی بڑی خطرناک مہم چلا رکھی تھی۔ منافق عورتیں امہات المومنینؓ کے گھروں میں جاتیں اور نہایت ہمدردانہ انداز میں ان سے کہتیں کہ آپ لوگ شریف اور معزز گھرانوں کی بیٹیاں ہیں لیکن آپ لوگوں کی زندگی ہر راحت و لذت سے محروم، بالکل قیدیوں کی طرح، گزر رہی ہے۔ اگر آپ دوسرے گھروں میں ہوتیں تو آپ کی زندگی 'بیگمات' کی طرح نہایت عیش و آرام اور ٹھاٹ باٹ کے ساتھ گزرتی۔ ساتھ ہی وہ یہ وسوسہ اندازی بھی کرتیں کہ اگر یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو طلاق دے دیں تو بڑے بڑے رئیس اور سردار آپ لوگوں سے نکاح کریں گے اور آپ لوگوں کی زندگیاں قابلِ رشک ہو جائیں گی۔ آگے کی آیات سے یہ بات بھی سامنے آئے گی کہ منافقین

کو بھی جب کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں جانے اور آپؐ کی ازواجِ مطہراتؓ سے بات کرنے کا موقع ملتا تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان کے اندر کچھ نہ کچھ وسوسہ اندازی کی ضرور کوشش کرتے۔ ان کوششوں سے ان کا اصلی مقصد تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے اندر کوئی اس طرح کا فتنہ کھڑا کرنا تھا جس طرح کا فتنہ انھوں نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے متعلق کھڑا کر دیا تھا، جس کی تفصیلات سورۂ نور میں آپ پڑھ چکے ہیں، ورنہ ادنیٰ درجے میں یہ فائدہ تو ان کو بدیہی طور پر نظر آتا تھا کہ اس سے ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کے اندر بے اطمینانی پیدا ہوگی اور کیا عجب کہ اس طرح کوئی ایسی شکل نکل آئے کہ وہ آپ کی ازواج کے ساتھ نکاح کرنے کا جو مذموم ارادہ رکھتے ہیں وہ پورا ہو جائے۔

منافقین ومنافقات کی ان چالوں سے اگرچہ امہات المومنینؓ بالکل بے خبر نہیں تھیں، بعض تلخ تجربے ان کو ہو چکے تھے، لیکن شریف، کریم النفس اور باحیا لوگوں کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص ان کے سامنے اگر ہمدردی و خیر خواہی کے انداز میں بات کرتا ہے تو وہ اس کے کھوٹ سے واقف ہوتے ہوئے بھی، اس کو جواب نرمی ہی سے دیتے ہیں۔ امہات المومنینؓ بھی اپنی کریم النفسی کے سبب سے ان لوگوں کو نرمی ہی سے جواب دیتیں، جس سے یہ کمینے لوگ اس طمعِ خام میں مبتلا ہو جاتے کہ ان کا پروپیگنڈا کامیاب ہو رہا ہے اور وہ بہت جلد اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یہ حالات تھے جن میں یہ آیات اتری ہیں۔ ان میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں ان کو سنانا تو مقصود ہے دراصل ان منافقین اور منافقات کو جن کی ریشہ دوانیوں کے تار و پود ان میں بکھیرے گئے ہیں، لیکن وہ پسِ پردہ تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کو مخاطب کرنے کے بجائے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کو مخاطب کر کے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔

یہاں بلاغتِ کلام کے اس اسلوب کو یاد رکھیے کہ بسا اوقات ظاہر الفاظ کے اعتبار سے کلام میں خطاب کسی سے ہوتا ہے، لیکن اس میں کوئی عتاب مضمر ہوتا ہے تو اس کا رخ کسی اور طرف ہوتا ہے۔

آیات کا مفہوم

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر اب آیات کے مفہوم پر غور کیجیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے نبی! تم اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کے عیش اور اس کی زینتوں کی طالب ہو تو آؤ، میں تمھیں دے دلا کر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ، اس کے رسول اور دارِ آخرت کی کامرانیوں کی طالب ہو تو یاد رکھو کہ تم میں سے جو اللہ اور اس کے رسول کے حقوق کو اچھی طرح ادا کرنے والی اور آخرت کی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر پہچاننے والی ہوں گی، اللہ نے ان کے لیے اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آزادی کا یہ اختیار نامہ ازواجِ مطہراتؓ کے سامنے رکھ دیا اور سب سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سامنے رکھا جو آپ کو سب سے زیادہ محبوب تھیں۔ آپؐ نے ان کو یہ ہدایت بھی فرمائی کہ وہ اس کے جواب میں جلدی نہ کریں بلکہ اپنے والدین سے بھی مشورہ کرلیں،

اس کے بعد جواب دیں۔ لیکن حضرت صدیقہؓ نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا کہ مجھے اس معاملے میں کسی کے مشورے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں! منافقین نے سب سے زیادہ جادو تو انہی پر چلانے کی کوشش کی ہوگی، جب ان کا جواب ان کی تمام توقعات پر پانی پھیر دینے والا ثابت ہوا تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

اس طرح قرآن نے ایک طرف تو منافقین کی ان ریشہ دوانیوں کا ہمیشہ کے لیے سدِباب کر دیا جو وہ ازواج مطہراتؓ کے درمیان کر رہے تھے دوسری طرف اس امتحان کے ذریعے سے یہ حقیقت بھی واضح کر دی کہ ازواج مطہراتؓ سب بلا استثناء اللہ و رسول اور آخرت کی طالب تھیں۔ اسی چیز نے ان کو اللہ کے رسول کے ساتھ وابستہ کیا تھا اور یہ وابستگی اتنی مستحکم تھی کہ اس دنیا کی کوئی طمع اس کو توڑ نہیں سکتی تھی۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ ان آیات میں ازواج مطہراتؓ پر دنیا طلبی کے جرم میں کوئی عتاب نہیں ہوا ہے جیسا کہ لوگوں نے سمجھا ہے بلکہ یہ اللہ و رسول کی طرف سے ان کو آزادی کا پروانہ دے کر ان کے اعلیٰ کردار کا مظاہرہ کرایا گیا تاکہ ان منافقین کے حوصلے ہمیشہ کے لیے پست ہو جائیں جو اس طمع خام میں مبتلا تھے کہ ازواج نبی (رضی اللہ عنہم) کو دنیا کی کسی طمع کے پھندے میں پھنسا کر اپنی طرف مائل کیا جا سکتا ہے۔ اس اعلانِ تخییر کے بعد گویا ہر ایک کو حوصلہ آزمائی کا موقع دے دیا گیا لیکن سب پر ثابت ہو گیا کہ اہلِ بیتِ رسالت کا انتخاب خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور اس حرم کے اندر کسی کے لیے کسی دراندازی کی گنجائش نہیں ہے۔

'وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا'۔ لفظ 'احسان' یہاں حسن و خوبی اور اخلاص و راستبازی کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے حقوق اور طلبِ آخرت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے مفہوم میں ہے۔ اس آیت میں کچھ مضمون محذوف ہے جس پر اس کا اسلوبِ بیان دلیل ہے۔ اس اسلوب کا پورا حق ادا کیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی طالب اور دارِ آخرت کی کامرانیاں چاہنے والی ہو تو نہایت خوبی اور مستعدی کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور طلبِ آخرت کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں سرگرم رہو اور یہ اطمینان رکھو کہ تم میں سے جو ان حقوق و فرائض کو 'احسان' کے ساتھ ادا کرنے والی ہوں گی اللہ نے ان کے لیے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔ اس سے ضمناً یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کے لیے بھی مجرد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کوئی کام آنے والی چیز نہیں ہے بلکہ اصل چیز عمل و اطاعت ہے اور عمل و اطاعت بھی 'احسان' کے ساتھ۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا۔ (۳۰)

مسئولیت باعتبار مرتبہ

اوپر کی بات تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے کہلائی گئی اس لیے کہ اس کا آپ کی زبان ہی سے کہلایا جانا موزوں تھا۔ اب آگے براہِ راست ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کو مخاطب کر کے ان پر یہ واضح فرمایا گیا ہے کہ نبیؐ کی بیویاں ہونے کے سبب سے اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا درجہ و مرتبہ بھی بہت اونچا ہے اور اس مرتبہ ہی کے اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت بھاری ہیں۔ پہلے ان کی ذمہ داری بتائی کہ وہ اس امر کو یاد رکھیں کہ اگر ان سے کوئی جرم صادر ہوا تو وہ اسی ترازو سے نہیں تولا جائے گا جس سے دوسروں کے جرم تولے جائیں گے بلکہ ان کے اعمال الگ باٹ اور الگ ترازو سے تولے جائیں گے اور دوسروں کی نسبت سے ان کو دونی سزا ملے گی۔

'وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا' یعنی تم میں سے کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ رسول کی زوجیت میں ہونے کے سبب سے تم میں سے کسی کو سزا دینا اللہ پر ذرا بھی شاق گزرے گا۔ اللہ کا قانون بالکل بے لاگ ہے، وہ کسی کے ساتھ کسی نسبت و تعلق کی بنا پر کوئی رعایت نہیں کرے گا۔

اس تنبیہ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ العیاذ باللہ ازواجِ مطہراتؓ سے کسی سنگین نوعیت کے جرم کا اندیشہ تھا۔ یہ محض ان کی ذمہ داری اور ان کے مرتبہ و مقام کی یاد دہانی کر کے ان کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ وہ شیاطین کی وسوسہ اندازیوں سے اچھی طرح ہوشیار رہیں۔ یہاں 'فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ' (کھلی بے حیائی) کے الفاظ جو استعمال ہوئے ہیں وہ منافقین و مفسدین کے مخفی ارادوں کو پیش نظر رکھ کر استعمال ہوئے ہیں۔ وہ رات دن اسی تگ و دو میں تھے کہ اہلِ بیتِ رسالت سے متعلق کوئی سکینڈل (SCANDAL) پیدا کریں، تاکہ ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو اور مسلمانوں کی اخلاقی ساکھ برباد ہو۔ قرآن نے یہ لفظ استعمال کر کے ازواجِ مطہراتؓ کو آگاہ کر دیا کہ منافقین ہمدردی و خیر خواہی کے بھیس میں درحقیقت اپنے بہت بڑے شیطانی منصوبے کی فکر میں ہیں۔

وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا (۳۱)

[illegible] عنایتِ الٰہی

یعنی جس طرح تمہارے کسی جرم کی سزا دگنی ہے اسی طرح تمہاری نیکیوں کی جزا بھی دگنی ہے۔ اس وجہ سے تم میں سے جو اللہ و رسول کی صدقِ دل سے فرمانبرداری اور عملِ صالح کرتی رہیں گی اللہ ان کو دہرا اجر دے گا اور ان کے لیے باعزت رزق اس نے تیار کر رکھا ہے۔ ہم دوسرے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ 'رزق' اللہ تعالیٰ کے فضل و انعام کی تعبیر ہے اور اس کے ساتھ 'کریم' کی صفت اس حقیقت کی تعبیر کے لیے ہے کہ یہ رزق و فضل ان کو بطور صدقہ نہیں ملے گا بلکہ ان کے حق کے طور پر ملے گا اور ہمیشہ کے لیے بلا کسی قید و شرط اور بغیر کسی اندیشۂ احتساب و مواخذہ کے ملے گا۔

ان آیات سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ خدا کے ہاں مواخذہ اتمامِ حجت کے اعتبار سے ہوگا اور

اعمال کا صلہ ان حالات کے اعتبار سے ملے گا جن میں وہ انجام دیے گئے ہیں۔ ازواج نبی رضی اللہ عنہم کو چونکہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی معیت حاصل ہوئی اور رسول اتمام حجت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اس وجہ سے ان سے مواخذہ سخت ہوگا۔ اسی طرح رسول کی رفاقت پوری وفاداری کے ساتھ چونکہ بڑا کٹھن کام ہے اس وجہ سے اس کا صلہ بھی دُگنا ہے۔ جرموں کے مواخذہ اور اعمال کے صلہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے اور یہ بالکل مبنی بر عدل و حکمت ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا (۳۲)

خاص حالات کی بنا پر ایک خاص ہدایت

'خضوع' کے معنی تواضع و خاکساری کے اظہار کے ہیں۔ 'فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ' کے معنی ہوں گے 'بات کہنے میں نرمی و تواضع نہ اختیار کرو'۔ عام حالات میں تو پسندیدہ طریقۂ کلام یہی ہے کہ آدمی تواضع کا انداز اختیار کرے لیکن بعض اوقات حالات و مصالح کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس سے مختلف روش اختیار کی جائے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس دور میں منافقین و منافقات رات دن اس تگ و دَو میں تھے کہ ازواج مطہراتؓ کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے کوئی ایسی بات نکالیں جس کو ایک فتنہ بنا سکیں۔ ان لوگوں کی باتیں ہمدردانہ رنگ میں ہوتی تھیں اس وجہ سے امہات المومنینؓ بھی ان کا جواب اپنی شرافتِ نفس کے سبب سے نرم انداز ہی میں دیتی تھیں جس سے یہ مفسدین دلیر ہوتے جا رہے تھے اور ان کو یہ توقع ہو چلی تھی کہ وہ بہت جلد اپنی سازش میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان خاص حالات کی بنا پر امہات المومنینؓ کو اپنا رویہ بدل دینے کی ہدایت ہوئی۔ فرمایا کہ اے نبی کی بیویو، تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو۔ نبی کے ساتھ نسبت کے باعث تمہاری نیکی اور بدی دونوں کی ایک خاص اہمیت ہے۔ تمہاری نیکی دوسروں کے لیے مثال اور نمونہ بنے گی اور تم سے کوئی غلطی صادر ہوگی تو اس کو بھی اصحاب الاغراض حجت بنائیں گے اس وجہ سے تمہارے لیے احتیاط کی روش اولیٰ ہے۔ اگر منافقین تمہارے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنے کی کوشش کریں تو بر بنائے مروت و شرافت ان کی بات کا جواب نرمی و تواضع سے نہ دو کہ جس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کے خلاف بغض و حسد ہے وہ کوئی غلط توقع کر بیٹھے، بلکہ صاف انداز میں اس سے اس طرح بات کہو کہ اگر وہ اپنے دل میں کوئی برا ارادہ لے کر آیا ہے تو اس کو اچھی طرح اندازہ ہو جائے کہ یہاں اس کی دال گلنے والی نہیں ہے۔

ازواج نبیؐ کا مرتبہ

'لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ' یہ ازواج مطہراتؓ کے مرتبہ کی طرف اشارہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کی بنا پر ان کو دنیا کی تمام عورتوں کے مقابل میں حاصل تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد ان کے ہر قول و فعل کو امت کے لیے نمونہ و مثال کی حیثیت حاصل ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کا درجہ 'امہات المومنین' کا قرار دے دیا۔ 'اِنِ اتَّقَيْتُنَّ' کے الفاظ سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ مرتبۂ عالی

جو ان کو حاصل ہے یہ تقویٰ کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر وہ تقویٰ پر قائم رہیں گی تو یہ سرفرازی ان کو حاصل رہے گی، اور اگر یہ شرط وہ پوری نہ کر سکیں گی تو، جیسا کہ اوپر گزرا، ان کی مسئولیت دوسروں کے بالمقابل دگنی ہے۔

'فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ' میں 'مَرَضٌ' سے وہ کینہ و حسد مراد ہے جو اشرارِ منافقین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنے دلوں میں رکھتے تھے اور جس کے سبب سے رات دن ان کی کوشش یہ تھی کہ آپ کی ازواجِ مطہرات کو کسی طرح بدنام کریں۔ اسی گروہ کے سرغنہ نے 'افک' کا فتنہ کھڑا کیا تھا۔

'وَقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا' میں 'قولِ معروف' سے یہ مراد ہے کہ ایسے لوگوں سے اگر بات کرنے کی نوبت آئے تو بات بالکل صاف و سادہ انداز میں کی جائے جس طرح ایک عام آدمی سے کی جاتی ہے جس میں لگاوٹ کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ یعنی اُن کے ہمدردانہ لب و لہجہ سے متاثر ہو کر ان کے ساتھ کوئی نرم انداز نہ اختیار کیا جائے۔ یہ کمینہ لوگ ہیں اس وجہ سے یہ شرافت سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا (۳۳)

ازواجِ نبیؐ کو خطاب کر کے وقت کی بیگمات پر تعریض

اسی سلسلہ میں یہ مزید ہدایات دی گئی ہیں جن سے مقصود ازواجِ مطہراتؓ کو منافقین و منافقات کے فتنوں سے بچا کر ان کاموں میں لگانا تھا جو ان کے شایانِ شان تھے اور جن کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے ان کا انتخاب فرمایا تھا۔ ان ہدایات کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے اُس بات کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ منافق عورتیں ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہن) کے دلوں میں بھی اسی طرح کے ارمان پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں جس طرح کے ارمان ان کے اپنے دلوں میں تھے۔ مثلاً وہ کہتیں کہ اگر آپ لوگوں کو ان (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی قید سے رہائی حاصل ہو جائے تو وقت کے بڑے بڑے سردار آپ لوگوں کو نکاح کے پیغام دیں گے اور آپ لوگ بھی اسی طرح بن ٹھن کر زیب و زینت کے ساتھ شاپنگ اور سیر سپاٹے کے لیے نکلا کریں گی جس طرح امرا کی بیگمات نکلا کرتی ہیں۔ قرآن نے منافقات کی انہی پس پردہ وسوسہ اندازیوں اور بدآموزیوں کی طرف تلمیح کرتے ہوئے، ازواجِ مطہراتؓ کو یہ تلقین فرمائی کہ تم اپنے گھروں میں ٹِک کے بیٹھو، زمانۂ جاہلیت کی عورتوں کی طرح اپنی زینتوں کی نمائش کرتی نہ پھرو۔ یہ ہدایت بالکل اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت کوئی نیک دل باپ اپنی سعادت مند اولاد کو اس وقت کرتا ہے جب اس کے علم میں یہ بات آتی ہے کہ کچھ برے لوگ اپنی بدآموزیوں سے اس کی اولاد کو غلط راہ پر ڈال رہے ہیں۔ اس وقت اگر وہ اپنے نیک بخت بیٹے سے یہ کہتا ہے کہ تم اپنی ساری توجہ اپنی تعلیم پر مرکوز کرو، آواروں کی طرح سڑکوں پر نعرے لگاتے نہ پھرو تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ فی الواقع اس کا لڑکا آواروں کی طرح سڑکوں پر پھر رہا تھا یا اس کے آوارہ ہونے کا اندیشہ تھا بلکہ یہ

محض وقت کے آواروں پر ایک تعریض اور ان کے طریقہ سے بچانے کے لیے ایک تنبیہ ہوتی ہے۔ اسی طرح کی ہدایت ازواجِ مطہراتؓ کو دی گئی ہے۔ اس میں درحقیقت وقت کی بیگمات کے رویہ پر تعریض اور ان کی تحقیر ہے۔ لیکن بات ان کو خطاب کر کے کہنے کے بجائے ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کو خطاب کر کے کہدی گئی ہے، ورنہ امہات المومنینؓ میں بھلا ایسا کون تھا جس کی نسبت یہ شبہ بھی کیا جا سکے کہ ان کے دل میں گھر سے باہر پھرنے یا جاہلیت کی عورتوں کی طرح اپنے بناؤ سنگار کی نمائش کا ارمان ہوگا!

جاہلی تہذیب کے ختم ہونے کی پیشین گوئی

'جاہلیت' کے ساتھ یہاں 'اولیٰ' کی صفت کی بنا پر ہمارے مفسرین نے اس سے حضرت نوحؑ یا حضرت ادریسؑ کے زمانہ کی جاہلیت مراد لی ہے۔ لیکن اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نہایت بلیغ طریقہ سے اس جاہلی تہذیب کے ختم ہونے کی طرف اشارہ ہے جس کو منافقین و منافقات اب تک اپنے سینوں سے لگائے یہ امید لیے بیٹھے تھے کہ اسلام کے ظہور سے اس کو جو دھکا لگا ہے با یں ہمہ اس کے باوجود یہ باقی رہے گی۔ قرآن نے ان کی اسی امید پر ضرب لگانے کے لیے اس کو 'جاہلیتِ اولیٰ' سے تعبیر فرمایا کہ اب اس کو قصۂ ماضی سمجھو، اس کا دور اب ختم ہو چکا ہے، جو لوگ اس کے از سرِ نو فروغ پانے کے خواب دیکھ رہے ہیں وہ جنت الحمقاء میں بس رہے ہیں۔ اسلام اور اسلامی تہذیب نے اس کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں اور اگر اس کے کچھ آثار باقی ہیں تو وہ بہت جلد مٹ کے رہیں گے۔ اب جو لوگ اس گھر کی دربانی کر رہے ہیں وہ ایک اجڑے گھر کی دربانی کر رہے ہیں۔ اگر انھوں نے اپنے رویہ میں تبدیلی نہ کی تو جس دن یہ گھر گرے گا یہ بھی اس کے نیچے دفن ہو کے رہ جائیں گے۔

کرنے کے کام

'وَاَقِمْنَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ وَاَطِعْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ'۔ یعنی کرنے کا کام وہ نہیں ہے جو جاہلی تہذیب کی علمبردار بیگمات کر رہی ہیں بلکہ یہ ہے کہ نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ ادا کرتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں پوری وفاداری کے ساتھ سرگرم رہو۔ یہاں نماز اور زکوٰۃ اور اطاعت اللہ و رسول کا حوالہ دین کی جامع باتوں کی حیثیت سے آیا ہے، مطلب یہ ہے کہ اپنے دائرۂ کار یعنی گھروں کے اندر اسی نور کو تم پھیلاؤ جس نور کو باہر کی زندگی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ پھیلا رہے ہیں۔

بیگمات جاہلیت کے سامانِ زینت پر طنز

'اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا'۔ یہ اہل بیت کو کمال اہتمام کے ساتھ مخاطب کر کے، نہایت شفقت و محبت کے انداز میں تسلی دی ہے کہ یہ ہدایات جو تمھیں دی جا رہی ہیں ان سے مقصود تمھاری زندگی کو قید و بند میں جکڑنا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ اہلِ بیتِ نبوت سے ہر آلائش کو دور رکھے اور ان کی نہایت اعلیٰ تربیت کر کے ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے رسول کی رفاقت کے لائق بنائے۔ لفظ 'رجس' میں یہاں 'بیگمات' کے سامانِ زینت پر تعریض ہے کہ یہ زینت نہیں بلکہ گندگی کا بوجھ ہے جس کو یہ لادے پھر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ کے

اہل بیت کو اس گندگی سے پاک رکھنا چاہتا ہے۔

چند قابلِ توجہ باتیں

اس آیت کی اصل تعلیم کی وضاحت تو اوپر کی سطروں میں ہو چکی ہے لیکن چند اور باتیں بھی اس میں قابل توجہ ہیں۔

عورت کا اصلی دائرہ کار

ایک یہ کہ عورت کا اصل دائرۂ کار اس کا گھر ہے۔ اس کو اپنی تمام سرگرمیاں اس کے اندر ہی محدود رکھنی چاہئیں اور اگر کبھی اس کو گھر کے حدود سے باہر قدم نکالنے کی ضرورت پیش آئے تو اسے ان حدود کی پابندی کرنی ہوگی جن کی تفصیل اسی سورہ میں آگے آرہی ہے۔

عورتوں کا بناؤ سنگار کر کے باہر نکلنا جاہلیت ہے

دوسری یہ کہ عورتوں کا بناؤ سنگار کر کے گھروں سے باہر نکلنا تہذیب کی ترقی کی نشانی نہیں ہے بلکہ یہ جاہلیت اولیٰ کی طرف رجعت ہے۔

اصل اہل بیت ازواجِ نبیؐ ہیں

تیسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت ہونے کا شرف اصلاً آپ کی ازواج مطہراتؓ کو حاصل ہے، یہ آیت اس باب میں نصِ قطعی کی حیثیت رکھتی ہے۔ قرآن میں اس کی نظیریں بھی موجود ہیں۔ یہاں اہل بیت سے ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہن) کے سوا کسی اور کو مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دوسروں کی شمولیت اس میں ہو سکتی ہے تو اصلاً نہیں بلکہ تبعاً و ضمناً ہو سکتی ہے۔ اس وجہ سے ان غالی فرقوں کی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی جو اصل کے تو منکر ہیں لیکن فروع پر بڑا طوفان کھڑا کرتے ہیں۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ ۚ إِنَّ اللَّهَ كَانَ لَطِيفًا خَبِيرًا (۳۴)

ازواجِ نبیؐ کا اصل مقصدِ زندگی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو ان کا اصل مقصدِ زندگی بتایا گیا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کاموں کے لیے نہیں منتخب فرمایا ہے جن کی دعوت منافقات دے رہی ہیں بلکہ قرآن اور حکمت کی جو تعلیم ان کے گھروں میں دی جا رہی ہے وہ اس کا چرچا کریں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس طرح مردوں کی رہنمائی کے لیے ہوئی تھی اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ہوئی تھی۔ آپ جس طرح باہر لوگوں کو تعلیم دیتے رہتے تھے اسی طرح اپنے گھروں کے اندر بھی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ وحی جس طرح باہر آپ پر نازل ہوتی تھی اسی طرح گھر کے اندر بھی نازل ہوتی تھی۔ نیز جس طرح آپ کا ہر قول لوگوں کے لیے تعلیم و ہدایت تھا اسی طرح آپ کا ہر فعل بھی لوگوں کے لیے اسوہ و نمونہ تھا۔ آپ کی زندگی 'پرائیویٹ' اور 'پبلک' کے الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں تھی بلکہ آپ کی حیات مبارک کا ہر لمحہ امت کی تعلیم و تربیت کے لیے وقف تھا، اس وجہ سے ضروری ہوا کہ جس طرح آپ کی باہر کی زندگی کی ایک ایک ادا کو محفوظ کرنے کے لیے آپ کے جاں نثار سایہ کی طرح آپ کے ساتھ ساتھ رہیں، اسی طرح آپ کے گھر کے اندر کی زندگی کا بھی ایک ایک پہلو محفوظ رکھنے کا انتظام ہو۔ یہ کام ظاہر ہے کہ آپ کی ازواج مطہراتؓ ہی کے ذریعہ سے ممکن تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا علم و عمل جتنا آپ کی ازواج مطہراتؓ کے ذریعے سے پھیلا ہے اس کی مقدار صحابہؓ کے ذریعے پھیلے ہوئے علم سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اور اس آیت سے

یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اس مشن پر آپ کی ازواج مطہراتؓ کو اللہ تعالیٰ نے خود مامور فرمایا تھا کہ ان کا کام دنیا کے خزف ریزے جمع کرنا نہیں بلکہ علم و حکمت کے ان خزانوں کو خلق کے اندر لٹانا ہے جن کی بارش ان کے گھروں کے اندر ہو رہی ہے ـــــ ہمارے نزدیک یہ مصلحت بھی من جملہ ان مصالح کے ہے جن کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعدد ازواج کی خاص اجازت دی گئی۔ اس مسئلہ پر آگے بحث آئے گی۔

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ لَطِیۡفًا خَبِیۡرًا یعنی یہ اطمینان رکھو کہ اگر تمہاری ڈیوٹی گھروں کے اندر سے متعلق ہے تو تمہاری کوئی خدمت تمہارے رب سے مخفی نہیں رہے گی۔ خدا بڑا ہی باریک بین اور بڑا ہی خبر رکھنے والا ہے۔ وہ تمہارے ہر عمل اور تمہاری ہر ضرورت سے اچھی طرح باخبر ہے۔ تم اس کے بھروسہ پر اپنا فرض انجام دو، اللہ تعالیٰ تمہاری ضروریات کا خود کفیل ہے۔

اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَالۡمُسۡلِمٰتِ وَالۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡقٰنِتِیۡنَ وَالۡقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیۡنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیۡنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالۡخٰشِعِیۡنَ وَالۡخٰشِعٰتِ وَالۡمُتَصَدِّقِیۡنَ وَالۡمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیۡنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالۡحٰفِظِیۡنَ فُرُوۡجَهُمۡ وَالۡحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیۡنَ اللّٰهَ كَثِیۡرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةً وَّاَجۡرًا عَظِیۡمًا (۳۵)

مسلمان مردوں اور عورتوں کے سامنے ایک آئینہ

اوپر جو باتیں متفرق طور پر، بعض منفی اور بعض مثبت پیرایہ میں، فرمائی گئی ہیں، آخر میں ان سب کو ایک جامع اسلوب میں سامنے رکھ دیا گیا ہے اور مقصود اس سے یہ بتانا ہے کہ اللہ اور رسول کو جو معاشرہ مطلوب و محبوب ہے اس کی صفات کیا ہونی چاہئیں۔ یہ گویا مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس کو سامنے رکھ کر اپنے آپ کو سنواریں اور ان منافقین و منافقات کے جھکیے میں نہ آئیں جو ان کے چہروں پر جاہلیت کی وہی سیاہی پھر ملنے کی فکر میں ہیں جس کو اللہ کے رسول نے دھونے کی کوشش کی ہے۔ یہ ساری باتیں تعداد میں دس ہیں اور اوپر اس پیرے میں جو ہدایات متفرق طور پر دی گئی ہیں وہ بھی الگ الگ گنیے تو دس نکلیں گی۔ یہاں چونکہ خطاب خاص طور پر ازواج مطہراتؓ سے ہے، نیز مقصود اسلامی معاشرہ کے اجزائے ترکیبی کو بتانا ہے، اس وجہ سے عورتوں کا ذکر ضمناً نہیں بلکہ مردوں کے پہلو بہ پہلو مستقلاً آیا ہے اس لیے کہ عورتیں معاشرے کا بالکل نصف اور مساوی حصہ ہیں اور معاشرے کے بناؤ اور بگاڑ میں ان کا دخل مردوں سے شاید کسر ے زائد ہے:

یہاں جو صفات گنائی گئی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ اسلام	۲۔ ایمان	۳۔ قنوت
۴۔ صدق	۵۔ صبر	۶۔ خشوع
۷۔ صدقہ	۸۔ روزہ	۹۔ عفت و حیا
۱۰۔ ذکر اللہ		

یہ تعداد میں دسؔ ہیں۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسلامی اخلاق و کردار کے تمام پہلو ان کے اندر سمٹ آئے ہیں اور چونکہ ان کا ذکر صفت کے صیغوں سے ہوا ہے اس وجہ سے یہ بحیثیت عادت و صفت کے مطلوب ہیں۔ یعنی معاشرہ کے ہر فرد پر، عورت ہو یا مرد، ان کا رنگ چھایا ہوا ہو۔

ان صفات میں سے کچھ کا تعلق حقوق اللہ سے ہے، کچھ کا تعلق حقوق العباد سے ہے؛ اور کچھ اصلاً اصلاحِ نفس سے تعلق رکھنے والی ہیں۔

اسلام اور ایمان پورے دین کی جامع تعبیر ہے۔ ایمان دین کا باطن ہے، اسلام اس کا ظاہر ہے اور یہ دونوں بیک وقت مطلوب ہیں۔

لفظ 'قنوت' اوپر آیت ۳۱ میں گزر چکا ہے۔ یہ خدا اور رسول کی اس فرمانبرداری کی تعبیر ہے جو دل کی پوری یکسوئی، پوری نیازمندی اور کامل اخلاص کے ساتھ دائماً ہو۔

'صدق'، قول، فعل، ارادہ تینوں کی مطابقت اور استواری کی تعبیر کے لیے آتا ہے۔ اوپر آیت ۲۳ میں صَدَقُوْا مَا عٰهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (اور انھوں نے اللہ سے جو عہد باندھا اس کو پورا کر دکھایا) کے الفاظ گزر چکے ہیں۔ اس پہلو سے یہ نفاق کے بالکل ضد کردار کی تعبیر ہے۔ ہمارے ہاں 'قول مرداں جاں دارد' اس کے اسی پہلو کی تعبیر ہے۔

'صبر' استقامت، استقلال، پامردی کے مفہوم میں آتا ہے۔ جو آدمی ہر خوف و طمع کے مقابل میں، خواہ وہ اس کے اندر سے سر اٹھائے یا باہر سے، موقف حق پر ڈٹا اور اپنے رب سے راضی و مطمئن رہے وہ صابر ہے اور اسی کردار پر درحقیقت تمام دین قائم ہے۔

'خشوع' کا مفہوم فروتنی اور خاکساری ہے۔ یہ چیز خدا کی ہیبت اور اس کی عظمت و جلال کے صحیح تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ صفت آدمی کو اس کے رب کے آگے بھی جھکاتی ہے اور خلق کے لیے بھی اس کو مہربان و حلیم بناتی ہے۔ یہ 'استکبار' کا ضد ہے جو تمام انفرادی و اجتماعی برائیوں کی، خواہ ان کا تعلق حقوق اللہ سے ہو یا حقوق العباد سے، جڑ ہے۔

'تصدّق' کے معنی صدقہ کرنے کے ہیں۔ اس کا تعلق خاص طور پر حقوق العباد سے ہے۔ آدمی جب اپنی خواہشوں کو دبا کر اور اپنی ضروریات میں ایثار کر کے اپنا مال دوسروں کی ضروریات پوری کرنے پر خرچ کرتا ہے تو اس سے اس کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی تصدیق ہوتی ہے اور یہ چیز درجہ بدرجہ اس کے ایمان کو پختہ اور استوار کرتی جاتی ہے۔

'صَوم' ضبطِ نفس اور تربیتِ صبر کی خاص ریاضت ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیات ۱۸۳ - ۱۸۷ کے تحت ہم اس کے اثرات پر بحث کر چکے ہیں۔ انسان کے تمام کردار کی بنیاد صبر پر ہے اور روزہ صبر کی تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

'حفظِ فروج'، عفت کی تعبیر ہے جو ضبطِ نفس کا ثمرہ ہے۔ معاشرے میں خرابی پیدا کرنے کا سب سے زیادہ زود اثر نسخہ شیطان کے ہاتھ میں یہی ہے کہ وہ اپنے پروپیگنڈے کے ذریعے سے عورتوں اور مردوں کے اندر عفت کے احساس کو مردہ کر دیتا ہے۔ یہاں بھی اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے کہ منافقین و منافقات کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہراتؓ کے اندر زیب و زینت کی نمائش کا شوق ابھاریں تاکہ اس طرح مسلمانوں کا پورا معاشرہ بے حیائی کی راہ پر چل پڑے۔

'ذکر اللہ' تمام مذکورہ بالا صفات کا منبع اور ان کا محافظ ہے۔ بندہ جتنا ہی زیادہ اپنے رب کو یاد رکھتا ہے اتنی ہی یہ صفات اس کے اندر راسخ و پختہ ہوتی ہیں۔ سارے دین کی محافظ درحقیقت اللہ کی یاد ہی ہے۔ اور نماز اللہ کے ذکر ہی کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ نماز کا ذکر تمام دینی اخلاق کے محافظ کی حیثیت سے آیا ہے اور ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔

۶۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۳۶-۴۸

آگے حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور یہ بھی درحقیقت اوپر کے سلسلۂ بیان ہی کی ایک کڑی ہے۔ اس واقعہ کو بھی منافقین اور منافقات نے ایک فتنہ بنا لیا تھا جس سے طرح طرح کے سوالات اٹھ کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان سب سوالوں کے جواب دیے جن سے دین کے بعض نہایت اہم پہلو واضح ہوئے۔

مثلاً یہ کہ ....

- ——— اللہ اور رسول کا حق سب سے بڑا ہے اس وجہ سے جب کسی معاملے میں اللہ و رسول کی مرضی واضح ہو جائے تو اس میں آدمی کی اپنی مرضی کالعدم ہو جاتی ہے۔
- ——— رسول کا فریضۂ منصبی اللہ کے احکام کی دعوت اور ان کا اجراء و نفاذ ہے اس وجہ سے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم صادر ہو جائے تو اس کا فرض ہے کہ اس حکم کی تعمیل کرے اور اس معاملے میں کسی کی مخالفت یا ملامت کی مطلق پروا نہ کرے۔
- ——— متبنّیٰ کی بیوی سے متعلق جو تصور زمانۂ جاہلیت سے چلا آ رہا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے عمل سے اس کی اصلاح کی ہدایت اور اس معاملے میں اشرار کے غوغا کی پروا نہ کرنے کی نہایت شدت سے تاکید۔
- ——— نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النبیین ہیں اس وجہ سے ضروری ہوا کہ آپ کے ہاتھوں دین کے ہر شعبہ کی تکمیل ہو جائے۔ اس کے کسی پہلو میں کوئی خلا نہ رہ جائے۔
- ——— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے خلق پر جو عظیم فضل و احسان فرمایا اس کا

بیان اور امت پر آپ کے حقوق کی طرف اشارہ۔

یہ اشارات اگرچہ اس پیرے کے ربط و نظام کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں لیکن ہم بالاجمال حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کا واقعہ بھی ذکر کیے دیتے ہیں تاکہ آیات کے تحت جزئیات سے تعرض کی ضرورت پیش نہ آئے۔

حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کے واقعہ کی صحیح نوعیت

حضرت زید بن حارثہؓ کا تعلق قبیلۂ کلب سے تھا۔ یہ بچپن میں دشمن کی کسی غارت گری میں گرفتار ہوئے اور غلام بنا لیے گئے۔ حکیم بن حزام نے ان کو اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کے لیے خریدا۔ حضرت خدیجہؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عقدِ نکاح میں آئیں تو انھوں نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کر دیا۔ اس طرح ان کو حضورؐ کی غلامی کا شرف حاصل ہوا۔ حضورؐ کی غلامی کی جو قدر و عزت ان کی نگاہوں میں تھی اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب ان کے والد اور چچا نے آنحضرت صلعم سے ان کی آزادی کا مطالبہ کیا تو حضورؐ نے ان کو اختیار دے دیا کہ وہ چاہیں تو اپنے باپ کے پاس چلے جائیں، چاہیں تو حضورؐ کی خدمت میں رہیں۔ اس موقع پر حضرت زیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی محبت کی جو مثال پیش کی وہ تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ انھوں نے آزادی کا اختیار نامہ پا جانے کے باوجود اس آزادی پر حضورؐ کی غلامی کو ترجیح دی۔ خواجہ حافظ نے شاید اسی واقعہ کو سامنے رکھ کر اپنا یہ لاجواب شعر کہا ہو۔

بولائے تو کہ گر بندۂ خویشم خوانی
از سر خواجگیِ کون و مکان برخیزم

اس کے بعد حضورؐ نے ان کو آزاد کر دیا۔ ان سے محبت تو ان کی خوبیوں کے سبب سے حضورؐ کو شروع ہی سے تھی، اس واقعہ کے بعد وہ دوچند ہو گئی۔ یہاں تک کہ حضورؐ کے غیر معمولی التفات و اعتماد کو دیکھ کر لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ آپ نے ان کو منہ بولا بیٹا بنا لیا ہے۔

واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں انتظامی اور فوجی صلاحیتیں بھی تھیں۔ متعدد مواقع پر آپؐ نے ان کو فوجی دستوں کی سرکردگی سپرد کی اور بعض مواقع پر، حضورؐ کی غیبت میں، وہ مدینہ پر امیر بھی رہے۔

حضورؐ نے ان کی عزت افزائی کے لیے ان کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن، حضرت زینب بنت جحشؓ کے ساتھ کر دیا۔ ان کا تعلق خاندان بنی اسد سے تھا۔ ان کی والدہ امیمہ بنت عبدالمطلب تھیں۔ جب حضورؐ نے حضرت زیدؓ کے لیے حضرت زینبؓ کو پیغام دیا تو ان کے عزیزوں کو اس رشتہ پر اعتراض ہوا کہ حضرت زیدؓ ایک آزاد کردہ غلام اور غیر کفو ہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ چاہتے تھے کہ غلاموں سے متعلق لوگوں کے تصورات میں تبدیلی پیدا ہو اس وجہ سے آپ نے اس نکاح پر اصرار فرمایا۔ بالآخر حضرت زینبؓ راضی ہو گئیں اور نکاح ہو گیا۔

نکاح کے بعد منافقین اور منافقات نے فتنہ اٹھایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک معزز گھرانے

کی ایک شریف خاتون کا دامن اپنے ایک آزاد کردہ غلام کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ اس قسم کی معاشرتی اصلاحات کو عوام کا ذہن آسانی سے قبول نہیں کرتا اس وجہ سے اس نکاح کے خلاف ایک مخالفانہ فضا پیدا ہو گئی۔ خاص طور پر منافقات نے حضرت زینبؓ کو ورغلانے کی پوری کوشش کی۔ ان کو غیرت دلائی کہ یہ سخت ظلم ہے کہ ان کو ایک ایسے شخص کے حبالۂ عقد میں دے دیا گیا ہے جو ابھی کل تک ایک زرخرید غلام تھا۔ آخر حضرت زینبؓ بشر ہی تھیں، کوئی فرشتہ نہیں تھیں، اس وجہ سے ان کے دل پر بھی ان باتوں کا اثر پڑا ہو گا۔

حضرت زیدؓ ایک حساس، خود دار، منکسر المزاج آدمی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام دلداریوں کے باوجود اپنی غلامی کے دور کو بھولے نہیں تھے۔ دوسری طرف سیدہ زینبؓ کے مزاج میں فی الجملہ تمکنت اور تیزی تھی۔ عام حالات میں تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو خوش گوار معاشرت میں خلل انداز ہو لیکن منافقین نے چونکہ فضا بدگمانی کی بنا دی تھی اس وجہ سے حضرت زیدؓ کو یہ احساس ہونے لگا کہ حضرت زینبؓ اپنے اندر ایک تفوق کا احساس رکھتی اور اس تعلق کو ناپسند کرتی ہیں۔ بالآخر انھوں نے ارادہ کیا کہ حضرت زینبؓ کو طلاق دے دیں کہ ان کی کبیدگی بھی رفع ہو جائے اور خود ان کے سر کا بوجھ بھی اتر جائے۔ لیکن کوئی اقدام کرنے سے پہلے انھوں نے چاہا کہ حضورؐ کا ایماء بھی معلوم کر لیں اس لیے کہ حضورؐ ہی نے یہ رشتہ کرایا تھا۔ جب حضورؐ سے انھوں کے اپنے ارادہ کا ذکر کیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا ان کی طرف سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی ہے جو تمھیں شک میں ڈالنے والی ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ ایسی کوئی بات ہرگز نہیں ہے لیکن وہ اپنے خاندانی شرف کا احساس رکھتی اور اس کا اظہار بھی کرتی ہیں اور یہ چیز میرے لیے باعثِ اذیت ہے۔ حضورؐ نے اس پر سختی سے ان کو ارادۂ طلاق سے روکا اور خوفِ خدا یاد دلایا۔ اس لیے کہ مجرد اپنا ایک ذاتی احساس اس بات کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ بیوی کو طلاق دے دی جائے۔

حضرت زیدؓ کا یہ ارادہ مختلف وجوہ سے حضورؐ کے لیے پریشانی کا باعث ہوا۔

اوّل تو اس وجہ سے کہ حضورؐ ہی نے، جیسا کہ اوپر گزرا، ایک نہایت اعلیٰ مقصد سے یہ رشتہ کرایا تھا۔ قدرتی طور پر آپ کی آرزو یہی تھی کہ منافقین و منافقات کی ریشہ دوانیوں کے علی الرغم فریقین خوشگواری کے ساتھ نباہ کرتے رہیں اور یہ رشتہ کامیاب ہو۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ اس طلاق سے حضرت زینبؓ کی حیثیت عرفی کو بڑا نقصان پہنچتا اور ان کا غم دُہرا ہو جاتا۔ پہلے تو انھوں نے منافقین و منافقات کے یہ طعنے سنے کہ ایک آزاد کردہ غلام کی بیوی ہیں، اور اس طلاق کے بعد لوگ یہ طعنہ دیتے کہ ایک آزاد کردہ غلام کی مطلّقہ ہیں۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ حضورؐ اس سارے واقعہ کی ذمہ داری اپنے اوپر سمجھتے تھے اس وجہ سے حضرت زینبؓ کی دلداری ضروری خیال فرماتے تھے۔ آپ کے دل میں یہ خیال تھا کہ اگر زیدؓ نے طلاق دے دی تو زینبؓ کی دلداری کی واحد شکل یہ باقی رہ جائے گی کہ حضورؐ ان کو خود اپنے نکاح میں لے لیں۔ لیکن اس صورت میں اس

سے بھی بڑے ایک دوسرے فتنے کے اٹھ کھڑے ہونے کا اندیشہ تھا کہ لوگ کہیں گے کہ آپؐ نے اپنے منہ لیے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کر لیا۔ علاوہ ازیں اس میں یہ مشکل بھی تھی کہ عام مسلمانوں کے لیے ازواج کے باب میں چار تک کی تحدید کا حکم نازل ہو چکا تھا اور اس وقت حضورؐ کے نکاح میں چار بیویاں تھیں۔

ان مختلف وجوہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش یہی تھی کہ حضرت زیدؓ طلاق نہ دیں چنانچہ آپ باصرار ان کو اس ارادہ سے روکتے رہے لیکن حضرت زیدؓ حالات کا مقابلہ نہ کر سکے۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ یہ سارا ہنگامہ ان کے اس نکاح کے سبب سے اٹھا ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ وہ طلاق دے دیں تاکہ حضرت زینبؓ کی جان بھی ضیق سے چھوٹے اور ان کو بھی اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملے۔ چنانچہ انھوں نے طلاق دے دی۔ حضرت زینبؓ کو اس طلاق سے صدمہ ہوا۔ روایات میں آتا ہے کہ ان کو جب اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے 'اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ' پڑھا۔

جب بات یہاں تک پہنچ گئی تو، جیسا کہ اوپر گزرا، حضورؐ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کر لینا چاہا لیکن منہ بولے بیٹے کے معاملے میں جاہلیت کی جو رسم تھی اس کے سبب سے اور تحدید نکاح کے سبب سے بھی آپ متردد رہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ہدایت ہوئی کہ لوگوں کی مخالفت سے بے پروا ہو کر آپؐ یہ نکاح کر لیں تاکہ آپ کے عمل سے ایک غلط رسم کی اصلاح ہو جائے اور دین فطرت کے اندر ایک خلافِ فطرت چیز جو گھسی ہوئی ہے اس کا خاتمہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کے بموجب آپؐ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کر لیا۔

یہ اصل واقعہ ہے جو میں نے تمام روایات کی تحقیق کے بعد، آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اس طول بیان کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ مستشرقین نے اس واقعہ کو اپنی رنگ آمیزیوں سے نہایت مکروہ بنا دیا ہے اور صدمہ کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اس رنگ آمیزی کے لیے سارا مواد ہماری تفسیر و سیرت کی کتابوں ہی سے لیا ہے ـــــ اب اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۶-۴۸

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾ وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ

فَلَمَّا قَضٰى زَيۡدٌ مِّنۡهَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰكَهَا لِكَىۡ لَا يَكُوۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ
حَرَجٌ فِىۡۤ اَزۡوَاجِ اَدۡعِيَآٮِٕهِمۡ اِذَا قَضَوۡا مِنۡهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمۡرُ
اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا ﴿۳۷﴾ مَا كَانَ عَلَى النَّبِىِّ مِنۡ حَرَجٍ فِيۡمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ؕ
سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ قَدَرًا
مَّقۡدُوۡرَا ۙ ﴿۳۸﴾ الَّذِيۡنَ يُبَلِّغُوۡنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخۡشَوۡنَهٗ وَلَا يَخۡشَوۡنَ
اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيۡبًا ﴿۳۹﴾ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ
مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ
شَىۡءٍ عَلِيۡمًا ﴿۴۰﴾ ع يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوا اللّٰهَ ذِكۡرًا كَثِيۡرًا ﴿۴۱﴾
وَّسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا ﴿۴۲﴾ هُوَ الَّذِىۡ يُصَلِّىۡ عَلَيۡكُمۡ وَمَلٰٓٮِٕكَتُهٗ
لِيُخۡرِجَكُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ؕ وَكَانَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَحِيۡمًا ﴿۴۳﴾
تَحِيَّتُهُمۡ يَوۡمَ يَلۡقَوۡنَهٗ سَلٰمٌ ۖۚ وَاَعَدَّ لَهُمۡ اَجۡرًا كَرِيۡمًا ﴿۴۴﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ
اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا ۙ ﴿۴۵﴾ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذۡنِهٖ
وَسِرَاجًا مُّنِيۡرًا ﴿۴۶﴾ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ بِاَنَّ لَهُمۡ مِّنَ اللّٰهِ فَضۡلًا
كَبِيۡرًا ﴿۴۷﴾ وَلَا تُطِعِ الۡكٰفِرِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقِيۡنَ وَدَعۡ اَذٰٮهُمۡ وَتَوَكَّلۡ
عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيۡلًا ﴿۴۸﴾

ع ۵ ۲۰

ترجمۂ آیات ۳۶-۴۸

کسی مومن یا مومنہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو ان کے لیے اس میں کوئی اختیار باقی رہ جائے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔ ۳۶

اور جب کہ تم اس سے، جس پر اللہ نے بھی انعام کیا اور تم نے بھی انعام کیا، یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو روکے رکھو اور اللہ سے ڈرو، اور تم اپنے دل میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کرنے والا تھا، اور تم لوگوں سے ڈر رہے تھے، حالانکہ اللہ زیادہ حق دار ہے اس بات کا کہ تم اس سے ڈرو۔ پس جب زید نے اس سے اپنا رشتہ کاٹ لیا تو ہم نے اس کو تم سے بیاہ دیا کہ مومنوں کے لیے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں، جب کہ وہ ان سے اپنا تعلق بالکل کاٹ لیں، کوئی تنگی باقی نہ رہے۔ اور خدا کا فیصلہ شدنی تھا۔ ۳۷

اور نبی کے لیے اللہ نے جو کچھ فرض کیا اس میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ یہی اللہ کی سنت رہی ہے ان لوگوں کے معاملے میں بھی جو پہلے گزرے ہیں۔ اور اللہ کے فیصلہ کے لیے ایک وقت مقرر تھا۔ وہ اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے تھے اور اسی سے ڈرتے تھے اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ اور اللہ حساب کے لیے کافی ہے۔ ۳۸-۳۹

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔ ۴۰

اے ایمان والو! تم اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو اور اس کی تسبیح کرو صبح اور شام۔ وہی ہے جو تم پر اپنی رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی تاکہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے اور وہ مومنوں پر نہایت مہربان ہے۔ ان کی تحیّت، جس دن وہ اس سے ملیں گے، سلام ہوگی اور اس نے ان کے لیے باعزت صلہ تیار کر رکھا ہے۔ ۴۱-۴۴

اے نبی! ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوش خبری پہنچانے والا اور آگاہ کرنے والا

بنا کر بھیجا ہے۔ اور اللہ کی طرف، اس کے اذن سے، دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر۔ اور مومنوں کو بشارت دو کہ ان کے لیے اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑا فضل ہے اور کافروں اور منافقوں کی بات کا دھیان نہ کرو اور ان کی ایذا رسانیوں کو نظر انداز کرو، اور اللہ پر بھروسہ رکھو، اور اللہ اعتماد کے لیے کافی ہے۔ ۴۵-۴۸

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا (۳۶)

ایک تمہید بطور ایک کلیہ

یہ آگے آنے والے واقعہ کی تمہید ہے اور اس میں جو بات فرمائی گئی ہے اس کا تعلق خاص حضرت زیدؓ و حضرت زینبؓ سے نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت ایک کلیہ کی ہے۔ اوپر آیت ۶ میں فرمایا ہے کہ 'اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ' (نبی کا حق مومنوں پر خود ان کے اپنے مقابل میں زیادہ ہے) اسی کی روشنی میں یہ قطعی اصول بیان فرما دیا کہ جب اللہ اور رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دیں تو اس میں کسی مومن یا مومنہ کے لیے کسی چون و چرا کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اللہ کا رسول جو فیصلہ بھی کرتا ہے وہ اللہ کے اذن سے کرتا ہے اس وجہ سے اس کی حیثیت مطاع مطلق کی ہوتی ہے، پھر کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ اس پر معترض ہو یا اس کی خلاف ورزی کرے۔ جو اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ کھلی ہوئی گمراہی میں پڑا۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ یہ حکم اس صورت سے متعلق ہے جب یہ واضح طور پر معلوم ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بات فرمائی ہے اس کی نوعیت ایک قطعی فیصلہ کی ہے ورنہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ آپؐ نے کوئی بات بطور تجویز یا مشورہ کے پیش کی ہے اور صحابہؓ کو معلوم ہوا ہے کہ یہ بات وحی پر مبنی نہیں ہے بلکہ حضورؐ کی رائے یا تجویز ہے تو صحابہؓ نے اس کے مقابل میں اپنی تجویزیں بھی پیش کی ہیں اور حضورؐ نے بعض اوقات ان کی تجویز مان بھی لی ہے۔

حضرت زیدؓ یا حضرت زینبؓ نے حضورؐ کے کسی فیصلہ کی مخالفت نہیں کی

حضرت زیدؓ و حضرت زینبؓ کے واقعہ کی جو تفصیل ہم نے اوپر پیش کی ہے اس سے یہ امر واضح ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی حضورؐ کے کسی فیصلہ کی مخالفت نہیں کی۔ حضرت زینبؓ کو جب حضورؐ نے حضرت زیدؓ کے لیے پیغام دیا تو ان کو معلوم تھا کہ یہ کوئی حکم نہیں بلکہ ایک پیغام ہے جس میں وہ اپنی پسند یا ناپسند کے اظہار کے لیے آزاد ہیں۔ بعد میں جب ان کو معلوم ہوا کہ حضورؐ کی خواہش یہی ہے کہ یہ رشتہ ہو جائے تو انھوں

نے اس کو منظور فرمالیا۔ اسی سے ملتی جلتی صورت اس وقت پیش آئی جب حضرت زیدؓ کے طلاق کے بعد خود حضورؐ نے اپنے لیے حضرت زینبؓ کو پیغام دیا۔ انھوں نے اس کو بھی کوئی حکم یا فیصلہ نہیں سمجھا بلکہ ایک پیغام ہی تصور کیا اور فرمایا کہ میں اس معاملے میں اپنے رب سے استخارہ کیے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کروں گی۔ چنانچہ استخارہ کے بعد ہی اس کو انھوں نے منظور کیا۔

اسی طرح حضرت زیدؓ نے بھی حضورؐ کے کسی حکم یا فیصلہ کی خلاف ورزی نہیں کی۔ طلاق نہ دینے کے باب میں حضورؐ کے ارشاد کو انھوں نے محض ناصحانہ مشورہ پر محمول کیا، اس کو کوئی فیصلہ نہیں سمجھا۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ اگرچہ حضورؐ کی خواہش یہی ہے کہ طلاق کی نوبت نہ آئے لیکن یہ فیصلہ بہر حال انہی کو کرنا ہے کہ وہ نباہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ جب ان کو محسوس ہوا کہ اب ان کے لیے اس رشتہ کو زیادہ دیر تک نباہنا ممکن نہیں رہا، انھوں نے طلاق دے دی۔

رسولؐ کے کسی فیصلہ کی خلاف ورزی جائز نہیں

ہمارے نزدیک اس حکم کی نوعیت یہاں ایک عام کلیہ کی ہے جس کے بیان کے لیے وقت کے حالات وواقعات نے مناسب فضا پیدا کر دی تھی۔ اس سے یہ بات بالکل واضح طور پر سامنے آگئی کہ رسولؐ کے کسی حکم اور فیصلہ کی خلاف ورزی کسی مومن یا مومنہ کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ بات ایمان کے مقتضیات کے بالکل خلاف ہے اور جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ صریح ضلالت کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایمان کا یہ مقتضیٰ ان منافقین ومنافقات پر واضح کرنا ضروری تھا جن کا رویہ شروع سے اس سورہ میں زیر بحث ہے تاکہ وہ اللہ اور رسول کی کامل اطاعت پر مجتمع ہوں اور اگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہیں تو اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہیں۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَاتَّقِ اللّٰہَ وَتُخْفِیْ فِیْ نَفْسِکَ مَا اللّٰہُ مُبْدِیْہِ وَتَخْشَی النَّاسَ ج وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ ط فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْھَا وَطَرًا زَوَّجْنٰکَھَا لِکَیْ لَا یَکُوْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ حَرَجٌ فِیْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِیَآئِھِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْھُنَّ وَطَرًا ط وَکَانَ اَمْرُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا (۳۷)

حضرت زیدؓ کی عزت افزائی

یہ اصل واقعہ کی طرف اجمالی اشارہ ہے۔ حضرت زیدؓ کا ذکر یہاں اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاَنْعَمْتَ عَلَیْہِ، کی صفت کے ساتھ ہوا ہے یعنی اللہ اور رسول دونوں کے انعام یافتہ اور منظورِ نظر۔ اس صفت کے ساتھ ذکر کرنے کی یہاں خاص وجہ ہے۔ اوپر گزر چکا ہے کہ منافقین ومنافقات نے حضرت زیدؓ کو غلامی کا طعنہ دے کر لوگوں کی نگاہوں میں ان کو گرانے کی پوری کوشش کی تاکہ پیشِ نظر مہم میں ان کو کامیابی حاصل ہو جائے۔ حضرت زیدؓ کو اس سے جو تکلیف پہنچی ہوگی وہ ظاہر ہے لیکن انھوں نے پورے صبر کے ساتھ یہ توہین برداشت کی۔ اس صبر کا صلہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دیا کہ ان کا ذکر اس صفت کے ساتھ کیا تاکہ جن لوگوں نے ان کی توہین کرنے کی کوشش کی ان پر واضح ہو جائے کہ جس کو انھوں نے حقیر ٹھہرایا اس پر

اللہ نے بھی انعام فرمایا ہے اور اس کے رسولؐ نے بھی۔ ظاہر ہے کہ جو اللہ و رسول کا انعام یافتہ ہے وہ کسی دوسرے کی عزت بخشی کا محتاج نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا انعام یوں تو ہر فرد پر ہے۔ بندہ جو کچھ بھی پاتا ہے خدا ہی سے پاتا ہے لیکن حضرت زیدؓ کے حالات پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان کے ساتھ بالکل اس طرح کا معاملہ ہوا جس طرح کا معاملہ حضرت یوسفؑ کے ساتھ ہوا۔ یہ ایک غارت گری میں گرفتار ہوئے (غالباً ایک نصرانی کے غلام رہے) پھر غلام ہو کر بکے، بالآخر درجہ بدرجہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کارسازی سے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دیا جس کے بعد ان کے لیے دین و دنیا کی سعادتوں کے دروازے کھل گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انعام ان پر یہ ہوا کہ آپ کے فیضِ خدمت سے ان کو اسلام کی نعمت حاصل ہوئی۔ آپ نے ان کو محبت و اعتماد کا وہ مقام بخشا کہ لوگ ان کو حضورؐ کا منہ بولا بیٹا سمجھنے لگے۔ آپ نے ان کو غلامی سے آزادی بخشی۔ اپنی حقیقی پھوپھی زاد بہن سے شادی کر دی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ نے ان کو اپنے اہل بیت میں شامل کر لیا جس سے بڑا خاندانی شرف کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

حضورؐ نے حضرت زیدؓ کو طلاق سے باربار روکا

'اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ' سے پہلے 'وَاِذْ تَقُوْلُ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضورؐ نے یہ بات حضرت زیدؓ سے بار بار فرمائی کہ اپنی بیوی کو اپنے نکاح میں باقی رکھو اور اللہ سے ڈرو، اگر یہ بات ایک ہی مرتبہ کہنے کی نوبت آئی ہوتی تو 'قُلْتَ' کافی تھا۔ 'تَقُوْلُ' کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت زیدؓ نے اپنے ارادے کا اظہار حضورؐ کے سامنے کئی بار کیا اور حضورؐ نے ہر بار ان کو اس سے روکا اور خدا کا خوف یاد دلایا۔

'وَاتَّقِ اللّٰهَ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضورؐ نے حضرت زیدؓ کے ارادۂ طلاق کو محض ان کے شدتِ احساس پر محمول فرمایا، کوئی معقول وجہ اس اقدام کے لیے آپ نے نہیں پائی۔ اوپر گزر چکا ہے کہ جب آپؐ نے ان سے یہ سوال فرمایا کہ کیا زینبؓ کی طرف سے کوئی ایسی بات تمھارے سامنے آئی ہے جو شک پیدا کرنے کا موجب ہوئی ہے؟ تو انھوں نے صاف کہا کہ اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کو اگر کوئی شکایت تھی تو خود ان کے الفاظ میں بس یہ تھی کہ 'تَتَعَظَّمُ عَلَيَّ بِشَرَفِهَا' (وہ میرے مقابل میں اپنے شرفِ خاندانی کے باعث تفوق کا احساس رکھتی ہیں) ظاہر ہے کہ مجرد یہ بات بیوی کو طلاق دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس میں حضرت زینبؓ کے رویّہ سے زیادہ خود حضرت زیدؓ کے شدتِ احساس کو دخل ہو سکتا ہے بالخصوص اس فضا میں جو اس وقت منافقین و منافقات نے پیدا کر دی تھی۔ اس وجہ سے حضورؐ نے ان کو خوفِ خدا یاد دلایا کہ وہ اس معاملہ میں جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نہ اٹھائیں بلکہ اللہ سے ڈریں لیکن حضرت زیدؓ مخالفین کے اٹھائے ہوئے طوفان سے متاثر ہو گئے اور اس تاثر میں زیادہ دخل ان کی شرافت اور حضرت زینبؓ کے جذبات کے لحاظ کو تھا انھوں

نے محسوس فرمایا کہ میرے سبب سے حضرت زینبؓ ہدفِ مطاعن بنی ہوئی ہیں، اس کا علاج یہی ہے کہ طلاق دے کر ان کو نکتہ چینوں کی زبان درازیوں سے نجات دلائی جائے۔

آنحضرت صلعم کے دل میں کیا خیال تھا؛

وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ج وَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَاهُ۔ یہ جملہ حال کے محل میں ہے یعنی زیدؓ سے جب تم یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی بیوی کو طلاق نہ دو، اللہ سے ڈرو، تو اس وقت تم اپنے دل میں ایک بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ بہرحال ظاہر کرنے والا تھا۔

اس ٹکڑے کے تحت ہمارے غیر محتاط مفسرین نے فضول قسم کی جو روایات نقل کر دی ہیں ان سے تعرض کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بالکل بے اصل ہیں۔ ابنِ کثیرؒ کا تبصرہ ان پر بالکل صحیح ہے کہ احببنا ان نضرب عنها صفحا لعدم صحتها فلا نوردها (یہ روایات بے اصل ہیں اس وجہ سے ہم نے ان سے صرفِ نظر ہی پسند کیا اور ان کو نقل نہیں کر رہے ہیں) ہمارا قول بھی ان کے باب میں یہی ہے۔ تردید کے لیے بھی ان کو نقل کرنا ہم معصیت سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ابن جریرؒ کو معاف کرے، وہ روایات نقل کرنے کے معاملے میں نہایت ہی غیر محتاط ہیں۔

اصل واقعہ وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ نکاح چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی ایک دینی مصلحت کے تحت کرایا تھا اس وجہ سے آپ کی دلی آرزو یہی تھی کہ یہ کامیاب ہو چنانچہ آپؐ نے حضرت زیدؓ کو ارادۂ طلاق سے بتاکید روکنے کی کوشش کی۔ آپ کے دل میں یہ خیال تھا کہ اگر زیدؓ نے طلاق دے دی تو زینبؓ کو دہرا غم ہوگا کہ انھوں نے اس نکاح کی بدولت دشمنوں کے طعنے بھی سنے اور بالآخر ایک آزاد کردہ غلام کی مطلقہ بن کر اپنی حیثیت عرفی بھی ہمیشہ کے لیے گنوا بیٹھیں۔ ان کی دلداری اور اس نقصان کی تلافی کی واحد شکل پھر صرف یہ رہ جاتی تھی کہ حضورؐ خود ان کو اپنے نکاح میں لے لیں لیکن ایسا کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ منافقین اس کو ایک اور اس سے بھی بڑے فتنہ کا ذریعہ بنا لیتے اور لوگوں میں یہ پھیلاتے کہ آپؐ نے اپنے متبنّٰی کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے۔ آپ اس فتنہ سے بچنا چاہتے تھے اس وجہ سے آپ کی دلی آرزو یہی تھی کہ طلاق کی نوبت نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی تھا کہ یہ نوبت آئے تاکہ آپ کے ہاتھوں جاہلیت کی ایک غلط رسم کی اصلاح ہو اور انبیاء علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری جو ڈالی ہے کہ وہ دین کے معاملے میں کسی کی ملامت و مخالفت کی کوئی پروا نہ کریں، آپ اپنے عمل سے اس کا مظاہرہ کریں۔

اقامتِ دین کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ

'وَتَخْشَى النَّاسَ ج وَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَاهُ' میں اسی اصولی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو پیچھے آیات ۱-۳ اور آیت ۷، میں بیان ہوئی ہے اور آگے آیات ۳۸-۳۹ میں مزید وضاحت آ رہی ہے۔ اقامتِ دین کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ لوگوں کا خوف یا مصالح کا لحاظ ہے اس وجہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ دین کے معاملے میں اپنے رب کے سوا ہر خوف

مصلحت سے بے پروا ہوں، چنانچہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے خود اپنے ہاتھوں اس راہ کے ہر پتھر کو توڑا اور اس مقصد کی خاطر بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کیا اور یہی نمونہ اپنے بعد آنے والے ان لوگوں کے لیے انھوں نے چھوڑا جو ان کے طریقہ پر دین کی خدمت کے لیے اٹھیں۔

حضورؐ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے نکاح کیا۔

'فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا الاٰیۃ' یعنی جو راز تم اپنے دل میں رکھتے تھے لیکن لوگوں کی ملامت کے اندیشہ سے اس سے گریز کرنا چاہتے تھے بالآخر اللہ نے اس کے افشا کا سامان کر دیا کہ جب زیدؓ نے اپنا تعلق زینبؓ سے بالکل منقطع کر لیا تو ہم نے اس کو تمھارے ساتھ بیاہ دیا تاکہ منہ بولے بیٹوں کے معاملے میں ایک خلافِ فطرت رسم جو قائم ہوگئی ہے اس کی اصلاح ہو اور کوئی ناروا قسم کی پابندی لوگوں پر اس معاملے میں باقی نہ رہے۔

'وطر' کے معنی ضرورت و حاجت کے ہیں۔ یہیں سے اس کے اندر تعلق اور وابستگی کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ انسان کو جس چیز کی ضرورت ہو اس کے ساتھ لازماً وابستگی بھی ہوتی ہے۔ 'قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا' کے معنی ہوں گے 'زید نے اس سے اپنا تعلق بالکل منقطع کر لیا'۔ لفظ طلاق سے اس مضمون کو ادا کرنے کے بجائے اس اسلوب سے ادا کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ اس سے زمانۂ عدت کے گزرنے کی طرف بھی اشارہ ہوگیا جس کے گزر جانے کے بعد طلاق دینے والے کا ہر تعلق عورت سے منقطع ہو جاتا ہے۔

'زَوَّجْنٰكَهَا' کا مطلب یہ ہے کہ تم تو لوگوں کے اندیشہ سے اس نکاح کی ذمہ داری سے گریز کرنا چاہتے تھے لیکن ہم نے اپنے حکم سے یہ نکاح تمھارے ساتھ کرا دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ نے یہ نکاح اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت کیا۔ روایات میں آتا ہے کہ عدت گزرنے کے بعد حضورؐ نے حضرت زیدؓ ہی کے واسطہ سے حضرت زینبؓ کو پیغام دیا۔ انھوں نے استخارہ کے بعد اس کو منظور کیا۔ حضرت زینبؓ کے بھائی ابو احمد بن جحشؓ نے حضورؐ کے ساتھ ان کا نکاح پڑھایا اور حضورؐ نے چار سو درہم مہر مقرر فرمایا اور نہایت اہتمام کے ساتھ ولیمہ کیا۔ ــــ بعض لوگوں نے لفظ 'زَوَّجْنَا' سے یہ سمجھا ہے کہ یہ نکاح آسمان ہی پر ہوگیا تھا، زمین پر اس کی رسم ادا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی لیکن ابن ہشام میں وہ ساری تفصیل موجود ہے جو اوپر ہم نے نقل کی ہے اس وجہ سے صحیح بات یہ ہے کہ یہ نکاح اللہ تعالیٰ کے حکم سے بالکل اسی معروف طریقہ کے مطابق ہوا جو اللہ اور رسولؐ نے نکاح کے لیے پسند فرمایا ہے۔

'وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا' یعنی اللہ تعالیٰ نے اس رسمِ جاہلی کی اصلاح کے لیے جو وقت اور جو طریقہ مقرر کر رکھا تھا جب وہ وقت آگیا تو اسی طریقہ کے مطابق اس کی اصلاح ہوگئی اور دشمنوں نے اس راہ میں جو اڑنگے ڈالے اور اس کے خلاف جو فتنے اٹھائے وہ اس خدائی اسکیم میں ذرا بھی خلل انداز نہ ہو سکے۔

مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيْمَا فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ ۭ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ

قَبْلُ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرَاۨ ۝ الَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (۳۸-۳۹)

حضرات انبیاء کے لیے سنتِ الٰہی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ آپ کی زندگی کے پروگرام میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے مراحل جو رکھے ہیں یہ کسی زحمت کے لیے نہیں رکھے ہیں اور نہ یہ تنہا آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں بلکہ سابق انبیاء کو بھی اس طرح کے مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو اس نے اپنی حکمت کے تحت مقرر فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرات انبیاء کو اس طرح کی مشکلات جو پیش آتی ہیں یہ ان کی تربیت اور امتحان کے لیے پیش آتی ہیں اور ٹھیک ٹھیک خدا کے مقرر کردہ پروگرام کے مطابق پیش آتی ہیں۔ انہی امتحانوں سے ان کے اوصاف اجاگر ہوتے ہیں اور انہی سے ان کے پیرووں کا اخلاص یا کھوٹ بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔

'فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ' کا مفہوم 'فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْهِ' سے مختلف ہے۔ 'فَرَضَ اللّٰهُ عَلَيْهِ' کا مفہوم تو یہ ہوتا ہے کہ اللہ نے اس پر فرض کیا ہے اور 'فَرَضَ اللّٰهُ لَهٗ' کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے اس کے لیے مقسوم کیا ہے کہ اس کی زندگی میں یہ یہ احوال و مراحل پیش آئیں گے۔

'سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيْنَ خَلَوْا' میں زبان کا جو اسلوب ہے اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ اس اسلوب کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی سَنَّ اللّٰهُ ذٰلِكَ سُنَّةً فِى الْاَنْبِيَآءِ (یہ اللہ نے اپنے نبیوں کے لیے ایک سنت مقرر کر رکھی ہے)۔

زندگی میں کوئی چیز اتفاق سے نہیں پیش آتی

'وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا' یعنی اللہ نے اپنے فیصلہ کے ظہور کے لیے ایک وقت پہلے سے مقرر فرما دیا تھا، جب وہ وقت آ گیا تو اس کا حکم صادر ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ زندگی میں کوئی چیز بھی اتفاق سے پیش نہیں آ جاتی بلکہ اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے پروگرام کے مطابق پیش آتی ہے اس وجہ سے کسی امر کو اتفاق پر محمول کر کے نہ اس سے پریشان ہونا چاہیے نہ اس کو نظر انداز کرنا چاہیے بلکہ اس کو خدا کی طرف سے سمجھنا اور اس طرح اس کا مواجہہ کرنا چاہیے جو ایمان کا تقاضا ہے۔

حضرات انبیاء کا فرض منصبی

'اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ' یہ 'الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ' یعنی انبیائے سابقین کی صفت ہے کہ وہ اللہ کے پیغاموں کی تبلیغ کرتے رہے ہیں، اس معاملے میں اس کے سوا کسی اور کی پروا انھوں نے نہیں کی۔ مطلب یہ ہے کہ جو ذمہ داری اللہ نے اپنے سابق نبیوں پر ڈالی اور انھوں نے وہ بے خوف لومۃ لائم ادا کی وہی اس نے آپ پر بھی ڈالی ہے اور آپ کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے پیش روؤں کی طرح بے خوف لومۃ لائم اس کو ادا کریں۔

لفظ 'حسیب' کی تفسیر

'وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا' میں 'حَسِيْب' کی تفسیر ابن کثیر اور کشاف نے ناصر اور معین کی ہے یعنی اللہ تمام خطرات سے حفاظت کے لیے کافی ہے۔ اگر یہ تاویل قبول کر لی جائے تو نظم کلام بالکل واضح

ہے اور اگر 'حسیب' کے معنی حساب کرنے والے کے کیے جائیں، جیساکہ معروف ہے، تو یہ ٹکڑا تنبیہ کے مفہوم میں ہو گا کہ اگر اللہ کے پیغام کی تبلیغ میں دوسروں کے خوف یا لحاظ کے سبب سے ادنیٰ کوتاہی بھی ہوئی تو یاد رہے کہ اللہ محاسبہ کے لیے کافی ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۴۰)

نبی صلعم کا اصل مقام اور اس کے تقاضے

یہ خطاب ان لوگوں سے ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زیدؓ کا باپ قرار دے کر اس فتنے کو اٹھانے والے بنے تھے۔ فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول اور خاتم النّبیّین ہیں۔ نبی و رسول کی حیثیت سے ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ انھوں نے ادا کی اور چونکہ یہ خاتم النّبیّین ہیں اس وجہ سے ضروری تھا کہ انہی کے ذریعے سے اس رسم بد کی اصلاح ہو جائے۔ اگر ان کے بعد کوئی اور نبی آنے والا ہوتا تو ہو سکتا تھا کہ اس معاملے کو اللہ تعالیٰ آئندہ پر اٹھا رکھتا لیکن اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، انہی کے ہاتھوں دین کی تکمیل ہونی ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ چیز درست کی جائے گی جو بگڑی ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ان کے معاملات کو اپنے مفروضات کی روشنی میں نہ دیکھو بلکہ ان کے اصل منصب اور اس کی ذمہ داریوں کی روشنی میں دیکھو۔ اگر ان کے اصل منصب کو تم نے نہ پہچانا تو اسی طرح دوسری اور بہت سی باتوں پر بھی تمھیں اعتراض ہوں گے حالانکہ انھیں وہ سارے کام بے خوف لومۃ لائم کرنے ہیں جن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ہدایت ہوگی۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ یہ تمہاری طرف اللہ کے رسول ہیں۔ اگر تم نے ان کی تکذیب کر دی تو اس سنت الٰہی کی زد میں آنے سے نہیں بچ سکو گے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے مکذبین کے لیے مقرر کر رکھی ہے اور جو ہمیشہ ظہور میں آئی ہے۔

'مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ' میں دراصل نفی تو اسی غلط فہمی کی ہے جس میں وہ لوگ مبتلا تھے جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زیدؓ کا باپ بنا رکھا تھا لیکن صرف اتنا ہی نہیں فرمایا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) زیدؓ کے باپ نہیں ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ فرمایا کہ تمہارے مردوں میں سے کسی کے بھی وہ باپ نہیں ہیں۔ اس سے بات زوردار بھی ہو گئی اور یہ بیانِ واقعہ بھی ہے اس لیے کہ حضورؐ کی اولادِ ذکور میں سب کی وفات نابالغی میں ہوئی، 'رجال' کی عمر کو ان میں سے کوئی نہیں پہنچا۔

نبی اور رسول کے درمیان نسبت

'وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ': نبی اور رسول کے فرق پر وضاحت سے ہم اس کتاب میں جگہ جگہ بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ نبی اور رسول کے درمیان نسبت عام اور خاص کی ہے۔ ہر رسول نبی لازماً ہوتا ہے لیکن ہر نبی کا رسول ہونا لازمی نہیں ہے۔ اس وجہ سے اگر حضورؐ خاتم الانبیاء ہیں تو 'خاتم الرسل' بدرجۂ اولیٰ ہوئے۔ بعض گمراہ فرقوں نے یہ شوشہ جو نکالا ہے کہ

قرآن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء بتایا گیا ہے، 'خاتم الرسل' نہیں کہا گیا ہے اس وجہ سے سلسلۂ رسالت کے اجراء کی نفی نہیں ہوئی، یہ محض ان کی جہالت ہے۔

'خاتَم' اور 'خاتِم' دونوں لفظ اہلِ لغت کے نزدیک بالکل ہم معنی ہیں۔ قوم کا آخری فرد، کسی شے کا انجام، خط کے آخر کی مہر، یہ سب چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔

'وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا'۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے سارا غوغا برپا کیا ہے ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ ساری چیزوں سے ان سے زیادہ باخبر ہے۔ وہ زیدؓ کو بھی جانتا ہے، زینبؓ کو بھی جانتا ہے، اپنے پیغمبرؐ سے بھی واقف ہے اور زیدؓ و زینبؓ کے ساتھ ان کے رشتہ کی نوعیت سے بھی باخبر ہے۔ ان باتوں میں سے کسی سے بھی وہ بے علم نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا ہے سب اس کے اذن و ایماء سے ہوا ہے اس وجہ سے اس کے خلاف ہنگامہ برپا کرنا جہالت و حماقت ہے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت پر بھروسہ کیا جائے اور جو اصلاح عمل میں آئی ہے اس کی قدر کی جائے۔ خدا کا محیطِ کل علم ہی ہر چیز کی باریکیوں اور حکمتوں کو سمجھ سکتا ہے، دوسرے اس کی ساری حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (۴۱-۴۲)

مسلمانوں کو ثابت قدمی کی تاکید

یہ مسلمانوں کو منافقین و مفسدین کی اس محاذ آرائی کے مقابل میں ثابت قدم رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے اور اس کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ ان اشرار کے غوغا سے بے پروا ہو کر تم زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر اور صبح و شام اس کی تسبیح کرو۔ یہ امر واضح رہے کہ شیطان اور اس کی ذریات کے مقابل میں مومن کی اصلی سپر اللہ تعالیٰ کی یاد ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں معاندین کے مقابل میں ثابت قدمی کی تلقین کی گئی ہے وہاں نماز کی خاص طور پر تاکید کی گئی ہے۔ صبر اور نماز کے باہمی تعلق پر اس کتاب میں جگہ جگہ ہم بحث کرتے آرہے ہیں۔ (مثلاً دیکھیے سورۂ بقرہ۔ آیت ۴۵ کی تفسیر)۔

'وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا' میں تسبیح، نماز کی تعبیر ہے۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ 'ذکر' تو سانس کی طرح ہر وقت مطلوب ہے لیکن نمازوں کے لیے اللہ اور رسول نے اوقات مقرر فرما دیے ہیں جن کی جامع تعبیر صبح اور شام ہے۔ اس صبح و شام کے نقشہ کے اندر تمام نمازوں کے اوقات منضبط کر دیے گئے ہیں جس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ (دیکھیے سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۸، سورۂ طٰہٰ۔ آیت ۱۳۰)۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (۴۳)

ذکرِ الٰہی کی برکت

یہ اللہ تعالیٰ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرنے کی برکت بیان ہوئی ہے کہ وہ اپنے باایمان بندوں پر

اپنی رحمت نازل فرماتا ہے اور اس کے ملائکہ بھی برابر اہلِ ایمان پر رحمت کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں۔

'لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ' یہ اس رحمت کی برکت بیان ہوئی ہے کہ یہ اسی کا فیض ہے کہ وہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ یہاں تاریکی سے مراد ظاہر ہے کہ عقائد و اعمال کی تاریکی اور روشنی سے مراد ہدایت و شریعت کی روشنی ہے۔ 'وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا' یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے کہ وہ اپنے با ایمان بندوں پر نہایت مہربان ہے۔

'يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ' میں لفظ 'يُصَلِّيْ' اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت سے رحمت کرنے کے مفہوم میں ہوگا اور ملائکہ کی طرف نسبت سے رحمت کی دعا کے مفہوم میں۔ نسبت کے بدل جانے سے الفاظ کے معانی میں تبدیلی کی مثالیں قرآن اور کلامِ عرب میں بہت ہیں۔ یہی لفظ اسی سورہ میں دو مختلف مفہوموں میں استعمال ہوا ہے۔ 'اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ' (بے شک اللہ اپنے نبی پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں تو اے اہلِ ایمان تم بھی اس پر درود بھیجو) آیت کے آخر میں 'وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا' بھی اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں یہ لفظ 'يُصَلِّيْ' اللہ تعالیٰ کے لیے رحمت نازل کرنے ہی کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

اہلِ ایمان کے لیے فرشتوں کا استغفار

اہلِ ایمان کے لیے فرشتوں کے استغفار کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ بھی آیا ہے۔ مثلاً،

اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (المومن: ۷)	وہ جو عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے ارد گرد ہیں اپنے رب کی اس کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور اہلِ ایمان کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تیری رحمت اور تیرا علم ہر چیز کو وسیع ہے، تو ان لوگوں کی مغفرت فرما جنھوں نے توبہ اور تیرے راستہ کی پیروی کی اور ان کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

اسی طرح سورۂ شوریٰ میں بھی ہے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ (الشوریٰ: ۵)	اور فرشتے اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور جو زمین میں ہیں ان کے لیے وہ استغفار کرتے ہیں۔

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ۚ وَاَعَدَّ لَهُمْ اَجْرًا كَرِيْمًا (۴۴)

اہلِ ایمان کے لیے آخرت میں اللہ تعالیٰ کا سلام و پیغام

اوپر کی آیت میں اس رحمت و برکت کا ذکر ہے جو اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے با ایمان بندوں پر نازل ہوتی ہے۔ اس آیت میں اس سلام و پیغام کا ذکر ہے جو آخرت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی طرف سے با ایمان بندوں کے پاس آئے گا۔

فرمایا کہ ان کا خیر مقدم، جس دن وہ اس سے (اپنے رب سے) ملیں گے، سلام سے ہوگا اور اللہ نے ان کے لیے نہایت باعزت صلہ تیار کر رکھا ہے۔

لفظ 'تَحِیّۃ'، یہاں اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے اور اس کا صحیح مفہوم خیر مقدم ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی اس بات کا ذکر ہے کہ اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی سلام آئے گا اور فرشتے بھی ان کا خیر مقدم سلام کے ساتھ کریں گے۔

سورۂ فرقان میں ہے:

وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا (۷۵) — اور اس میں ان کا استقبال تحیت اور سلام کے ساتھ ہوگا۔

سورۂ یٰسٓ آیت ۵۸ میں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان لوگوں کو سلام کہلایا جائے گا:

سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ۝ — اور ان کے لیے سلام ہوگا جو رب رحیم کی طرف سے ان کو کہلایا جائے گا۔

سورۂ زمر آیت ۷۳، میں یہ تصریح ہے کہ جنت کے دربان ملائکہ اہل جنت کا استقبال سلام سے کریں گے:

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝ — اور ان سے جنت کے پاسبان کہیں گے، آپ لوگوں پر سلامتی ہو، خوش ہوں، اس جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جائیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (۴۵-۴۶)

نبی صلعم کا فریضۂ منصبی

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے آپ کا منصب بتایا گیا ہے اور اس منصب کے ساتھ جو ذمہ داریاں وابستہ ہیں ان کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے تاکہ حضورؐ پر بھی یہ واضح ہو جائے کہ آپ کو کیا کام کرنے ہیں اور کس طرح کرنے ہیں اور دوسروں پر بھی آپ کی شخصیت کی اصلی نوعیت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ موافقین و مخالفین دونوں اس روشنی میں اپنے اپنے رویے کا جائزہ لے سکیں۔ فرمایا کہ اے نبی! ہم نے تم کو شاہد، مبشر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ 'شاھد' سے مراد ہے اللہ کے دین اور اس کے احکام و مرضیات کی گواہی دینے والا۔ رسول کی بعثت کا اصلی مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے لوگوں کو یہ بتائے کہ اللہ نے کن باتوں کا حکم دیا ہے، کن باتوں سے روکا ہے۔

'مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا' سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ آپ کے پیغام کو قبول کر لیں ان کو آپ ابدی فوز و فلاح کی خوش خبری دیں اور جو لوگ اس سے اعراض یا اس کی تکذیب کریں ان کو اس کے نتائج سے آگاہ

کردیں۔ اس انذار و تبشیر کے بعد اس شہادت سے متعلق آپ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ اس امر کی آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگوں نے آپ کی دعوت قبول کی یا رد کی اور اگر قبول کی تو یکسوئی کے ساتھ قبول کی یا تذبذب کے ساتھ قبول کی۔ ان تمام امور کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔

'وَدَاعِيًا إِلَى اللهِ بِإِذْنِهِ' یہ اسی مضمون کی مزید وضاحت ہے کہ تم کو اللہ نے اپنے حکم سے اپنی طرف لوگوں کو بلانے کے لیے مامور فرمایا ہے کہ لوگ شیطان اور اس کی ذریات کی پیروی چھوڑ کر اپنے رب کی طرف آئیں۔ اس کے ساتھ 'بِإِذْنِهِ' کی قید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور اطمینان دہانی کے لیے ہے کہ دعوت الی اللہ کی اس مہم پر خود اللہ تعالیٰ نے آپ کو مامور فرمایا ہے اس وجہ سے وہ آپ کو تنہا نہیں چھوڑے گا بلکہ ہر قدم پر آپ کی مدد و رہنمائی فرمائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کوئی خود ساختہ نبی تو نہیں ہیں کہ اللہ آپ کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دے بلکہ یہ ذمہ داری آپ پر اللہ نے ڈالی ہے تو وہ اس کے اٹھانے میں بھی آپ کی مدد فرمائے گا اور آپ مخالفوں کی تمام مخالفانہ سرگرمیوں کے علی الرغم اپنے مشن میں کامیاب ہوں گے۔

'وَسِرَاجًا مُّنِيرًا' یعنی اللہ نے آپ کو ایک روشن چراغ بنایا جو خود بھی علم و حکمت کے نور سے منور ہے اور لوگوں کو بھی تاریکیوں سے نکال کر اللہ کی صراطِ مستقیم کی طرف لانے کے لیے رہنمائی کر رہا ہے۔ اگر لوگ اس سراجِ منیر کی قدر نہیں کریں گے تو آپ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ خود اپنی ہی تباہی کا سامان کریں گے، اس دنیا میں گمراہیوں میں بھٹکتے رہیں گے اور آخرت میں جہنم کے ایندھن بنیں گے۔

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُم مِّنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا (۴۷)

یہ آپ کے 'بشیر' ہونے کا پہلو واضح فرمایا کہ جو لوگ آپ کی دعوت پر ایمان لائیں ان کو خوش خبری دیجیے کہ وہ مخالفوں کی مخالفت اور حالات کی ناسازگاری سے ہراساں نہ ہوں۔ ان پر اللہ کی طرف سے ایک عظیم فضل ہونے والا ہے اگر وہ اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔

وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا (۴۸)

یہ آپ کے 'نذیر' ہونے کے پہلو کی وضاحت ہے لیکن مخالفوں کو مخاطب کر کے ان کو کچھ کہنے یا کہلانے کے بجائے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مخاطب کر کے بتا دیا کہ اس کو ان مخالفوں کے ساتھ آئندہ کے لیے کیا رویہ اختیار کرنا ہے۔ اس رویہ ہی کے اندر وہ انذار مضمر ہے جو پتہ دے رہا ہے کہ مستقبل قریب میں آپ کے یہ مخالفین کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ فرمایا کہ ان کافروں اور منافقوں کی باتوں کا ذرا دھیان نہ کرو، ان کی ایذا رسانیوں کو نظر انداز کرو، اللہ پر بھروسہ رکھو، اللہ اعتماد کے لیے کافی ہے۔ اس آیت کے اندر حضورؐ کے لیے جو تسلی ہے وہ بھی لفظ لفظ سے نمایاں ہے اور مخالفوں کے لیے جو قہر و غضب ہے وہ بھی حرف حرف سے اُبلا پڑ رہا ہے۔

'وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ' میں لفظ 'اِطَاعَة' کسی کی بات کا دھیان کرنے، اس کو اہمیت دینے اور اس

کی پروا کرنے کے مفہوم میں یہاں استعمال ہوا ہے۔ اس معنی میں اس لفظ کا استعمال معروف ہے۔ ہم اس کے محل میں اس مفہوم کی تائید میں شواہد نقل کر آئے ہیں۔

'وَدَعْ اَذٰىهُمْ' میں 'اَذٰی' سے اشارہ منافقین کی اس طرح کی ایذا رسانیوں کی طرف ہے جس کا مظاہرہ انھوں نے حضرت زینبؓ کے معاملہ میں کیا اور اس سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے معاملے میں کر چکے تھے۔ آگے اسی سورہ میں ان کی مزید ایذا رسانیوں کا ذکر آ رہا ہے۔ لفظ 'دَعْ' یہاں تحقیر کے مفہوم پر دلیل ہے یعنی ان کی ان خرافات کو چند سے نظر انداز کرو۔

'وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا' کے اندر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جتنی بڑی تسلی ہے اس سے بڑی کفار و منافقین کے لیے دھمکی ہے کہ اب تم ان کا معاملہ اللہ پر چھوڑ دو، اللہ ان سے نمٹنے کے لیے کافی ہے!

۸۔ مسئلہ ختمِ نبوّت

اس مجموعۂ آیات کی تمام ضروری تعلیمات کی وضاحت آیات کے تحت ہو چکی ہے البتہ آیت ۴۰ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا جو ذکر آیا ہے اس کے بعض پہلو مزید وضاحت کے طالب ہیں۔ ہم یہاں بالاختصار ان کی طرف بھی اشارہ کریں گے۔

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ چیز یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی تاریخ اور ان کی تعلیمات و ارشادات کا جو ریکارڈ قدیم صحیفوں اور قرآن مجید میں یا تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے، اس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سیدنا مسیحؑ تک کسی نبی کے متعلق نہ تو اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ خاتم الانبیاء ہے نہ کسی نبی نے خود اپنے خاتم الانبیاء ہونے کا دعویٰ کیا ہے، بلکہ اس کے برعکس ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی یا نبیوں کی بشارت دی ہے۔ حضرت آدمؑ اور ان کی ذریت کی خلافت پر فرشتوں کو جو اعتراض تھا، بقرہ کی تفسیر میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ ان کے اعتراض کے جواب میں حضرت آدمؑ نے اپنی ذریت میں پیدا ہونے والے انبیاء کے نام ہی گنا کر ان کو قائل کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے انبیاء کے حالات زیادہ تفصیل سے تو کہیں مذکور نہیں ہیں لیکن آپ کے اور آپ کے بعد آنے والے انبیاء کے حالات تورات میں بھی موجود ہیں اور قرآن میں بھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کے دونوں سلسلوں — بنی اسحاق اور بنی اسماعیل — میں انبیاء کی بعثت کے لیے جو دعا کی ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس دعا کی قبولیت کی جو بشارت دی ہے وہ قرآن میں بھی مذکور ہے اور تورات و تالمود میں بھی۔ ان کے حوالے ہم اس کتاب میں، ان کے محل میں، نقل کر آئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد بنی اسرائیل میں نبوت کا جو سلسلہ جاری ہوا اس کی تفصیلات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں یہ روایت رہی

ہے کہ ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی نہ صرف بشارت دی ہے بلکہ اکثر حالات میں خود اس کو، اسرائیلی روایت کے مطابق مسیح کر کے نبی کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے۔ اسرائیلی سلسلہ کے سب سے زیادہ جلیل القدر نبی سیدنا موسیٰ ہیں۔ ان کی پیشین گوئیاں تورات میں بھی موجود ہیں اور قرآن نے بھی ان کی طرف اشارے کیے ہیں۔ انھوں نے حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بھی پیشین گوئی کی ہے جس کا حوالہ ہم سورۂ اعراف آیت ۱۵۷ کی تفسیر میں دے چکے ہیں۔ بنی اسرائیل کے دورِ آخر کے انبیاء میں سے حضرت یحییٰ ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا مشن ہی یہ بتایا کہ "میں اپنے بعد آنے والے کی راہ صاف کرنے آیا ہوں۔" اُن کا یہ اشارہ سیدنا مسیح کی طرف تھا۔ ان کی زندگی ہی میں جب حضرت مسیحؑ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو حضرت یحییٰ علیہ السلام اس وقت جیل میں تھے۔ انھوں نے وہیں سے حضرت مسیح علیہ السلام سے پچھوایا کہ "وہ جس کا انتظار تھا تو ہی ہے یا ہم کسی اور کا انتظار کریں؟" حضرت مسیحؑ نے جواب دلایا کہ "جا کے بتا دو کہ لنگڑے چل رہے ہیں اور اندھے دیکھ رہے ہیں، اب اور کیا چاہیے!" اس جواب کے بعد حضرت یحییٰ کو اطمینان ہو گیا کہ ان کا مشن پورا ہو گیا، وہ جس کی راہ صاف کرنے آئے تھے وہ آ گیا۔ حضرت یحییٰ کے بعد اسرائیلی سلسلے کے آخری نبی و رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، انھوں نے اپنے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بشارت دی اور آپ کے نامِ نامی کی تصریح کے ساتھ بشارت دی۔ سورۂ صف میں اس کا حوالہ یوں آیا ہے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ (الصف: ۶)	اور جب کہ عیسیٰ بن مریم نے دعوت دی کہ اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں ان پیشین گوئیوں کے مطابق جو مجھ سے پہلے سے تورات میں موجود ہیں اور ایک رسول کی خوشخبری دیتا ہوا آیا ہوں جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہو گا۔

انجیلوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جو پیشین گوئیاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق موجود ہیں ان کے حوالے سورۂ اعراف آیت ۱۵۷ کی تفسیر میں گزر چکے ہیں۔ استاذ امام مولانا فراہیؒ کا خیال تو یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے انجیلوں میں آسمانی بادشاہت کی جو بشارت دی ہے اور اس سے متعلق جو تمثیلیں بیان فرمائی ہیں وہ بھی تمام تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور اس کی خصوصیات ہی پر منطبق ہوتی ہیں۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء کی روایت یہی رہی ہے کہ ہر نبی نے اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دی ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر یہ روایت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ نہایت واضح الفاظ میں خود اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو خاتم النبیین قرار دیا اور حضورؐ نے بھی نہ صرف یہ کہ

اپنے بعد کسی آنے والے کی بشارت نہیں دی بلکہ نہایت واضح اور قطعی الفاظ میں بار بار اس حقیقت کا اظہار و اعلان فرمایا کہ آپ آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ ہر معقول آدمی سمجھ سکتا ہے کہ حضورؐ کے بعد اگر کسی نبی کے آنے کی ادنیٰ گنجائش بھی ہوتی تو سابق انبیاء کی روایت کے مطابق حضورؐ اس کی پیشین گوئی فرماتے اور اگر پیشین گوئی نہ فرماتے تو کم از کم اس شدت کے ساتھ اس دروازے کو بند تو نہ کر دیتے کہ جو اس کو کھولنے کی جسارت کرے وہ نقب زن کہلائے۔

۲۔ اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات منقول ہیں ان سب کے نقل کرنے میں طوالت ہوگی۔ ہم صرف بعض حدیثوں کا حوالہ دیں گے جن کی شہرت حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی ہے۔ بخاری میں روایت ہے:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان مثلی	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اور مجھ سے پہلے
ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل	گزرے ہوئے انبیاء کی تمثیل یوں ہے کہ ایک شخص
بنیٰ بیتا فاحسنه واجمله الا موضع لبنة	نے ایک عمارت بنائی، نہایت حسین و جمیل، لیکن اس
من زاویة فجعل الناس یطوفون به	کے ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی۔
ویعجبون له ویقولون هلا وضعت	لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی تحسین کرتے
هذه اللبنة فانا تلك اللبنة وانا	اور کہتے کہ یہ اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی گئی! سو میں
خاتم النبیین (بخاری)	وہی اینٹ ہوں اور میں خاتم النّبیین ہوں۔

اس حدیث کے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ کم و بیش انہی الفاظ میں حضرت مسیحؑ نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی فرمائی تھی۔ ان کا ارشاد ہے کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا بالآخر وہی کونے کا آخری پتھر بنا۔ علمائے یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں پر جن جن طریقوں سے پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے ان کی تفصیلات سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہیں لیکن ان کی ان تمام کوششوں کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے لیے جو مقام مقدر فرمایا تھا وہ آپ کو حاصل ہو کے رہا۔ آپ قصرِ شریعت کے کونے کی آخری اینٹ بھی بنے اور انبیاء و رسل کے مبارک سلسلہ کے خاتم بھی۔

یہ ختم نبوت اس تکمیل دین کا لازمی اور بدیہی تقاضا ہے جس کا ذکر اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ والی آیت میں ہوا ہے۔ اگر دین کوئی ایسی چیز ہوتا جس کی تکمیل کبھی ہونے والی ہی نہ ہوتی تب تو بے شک نبوت و رسالت کا سلسلہ بھی جاری رہتا لیکن جب دین کی تکمیل ہو چکی ہے اور اس بدیہی حقیقت کے انکار کی جرأت کوئی بھی نہیں کر سکتا تو پھر اس کے اس لازمی نتیجہ کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ اسی حقیقت کو حضورؐ نے اس حدیث میں واضح فرمایا ہے اور اتنے مختلف طریقوں سے واضح فرمایا ہے کہ کسی معقول آدمی کے لیے اس میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے۔

ترمذی میں روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رسالت اور
ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت	نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا۔ اب میرے بعد نہ کوئی رسول
فلا رسول بعدی ولا نبی۔	ہوگا اور نہ کوئی نبی۔

جس مشہور حدیث میں آپ نے تمام انبیاء کے مقابل میں اپنے چھ فضائل گنائے ہیں آخری فضیلت ان میں یہ مذکور ہوئی ہے کہ ختم بی النبیون (مجھ پر انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا)۔

اسی طرح ایک روایت میں آپ نے اپنے مختلف اسماء کا ذکر فرمایا ہے جن میں آخری نام آپ نے 'عاقب' بتایا ہے اور اس کی خود ہی یہ شرح فرمائی کہ 'الذی لیس بعدہ نبی' (جس کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئے گا)۔

۲- یہ امر بھی واضح رہے کہ نبوت کی بہت سی قسمیں نہیں ہیں۔ نبوت کی صرف ایک ہی قسم ہے جو اپنے تمام شرائط و خصوصیات کے ساتھ قرآن و حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ البتہ نبی اور رسول میں ایک فرق ہے جس کی طرف ہم اوپر بھی اشارہ کر چکے ہیں اور اس کتاب کے دوسرے مقامات میں بھی پوری تفصیل سے اس کی وضاحت ہوئی ہے۔ بعض گمراہ فرقوں نے نبوت کے حرم میں نقب لگانے کے لیے اپنے جی سے نبوت کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں جس نبوت کے ختم ہونے کا ذکر ہے وہ الگ چیز ہے اور جس نبوت کے مدعی وہ ہیں وہ دوسری چیز ہے۔ نبوت کی یہ تقسیم ان کی طبع زاد ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کا کوئی ذکر تو درکنار اس کا کوئی ادنیٰ اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔ اس تقسیم سے انھوں نے بظاہر اپنے کفر کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ درحقیقت 'زیادۃٌ فی الکفر' ہے یعنی اپنے کفر کو انھوں نے اور زیادہ غلیظ بنا دیا ہے۔ اس لیے کہ اس تقسیم نے نبوت کے اس نظام ہی کو بالکل تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے جس پر سارے دین کی عمارت قائم ہے لیکن ہمارے لیے یہاں اس مسئلہ سے تعرض کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ بس اتنی بات یاد رکھیے کہ حضورؐ نے جس صراحت کے ساتھ اپنے بعد نبوت کے ختم ہونے کا اعلان فرمایا ہے، اسی وضاحت کے ساتھ اس سوال کو بھی صاف کر دیا ہے کہ آپ کے بعد نبوت کا کوئی جزو باقی رہے گا یا نہیں؟ اور اگر باقی رہے گا تو اس کی نوعیت کیا ہوگی اور اس میں حصہ پانے والے کون لوگ ہوں گے۔

انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد
ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت	رسالت و نبوت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب نہ کوئی رسول
فلا رسول بعدی ولا نبی قال	آئے گا اور نہ کوئی نبی۔ راوی کہتے ہیں کہ یہ بات لوگوں کے
نشق ذٰلک علی الناس فقال ولٰکن	دلوں پر شاق گزری تو حضورؐ نے فرمایا کہ 'مبشرات' باقی

المبشرات قالوا یارسول اللہ وما المبشرات؟	رہیں گی۔ لوگوں نے سوال کیا کہ یہ مبشرات کیا ہیں
قال رویا الرجل المسلم وھی جزء من	یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا کہ کسی مسلم مرد کے خواب
اجزاء النبوۃ۔	اور یہ چیز نبوت کے اجزا میں سے ایک جزء ہے۔

بعض روایات میں 'مبشرات' کی وضاحت 'الرویا الحسنۃ' اچھے خواب یا 'الرویا الصالحۃ' نیک خواب سے بھی وارد ہوئی ہے۔

اس حدیث سے چند باتیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں۔

ایک یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وحی کا سلسلہ بالکل بند ہو گیا۔ اب نبوت کے اجزاء میں سے صرف ایک جزء رویائے صالحہ کا باقی رہ گیا ہے۔ جو لوگ الہام اور مکاشفہ و مخاطبہ وغیرہ کے مدعی ہیں ان کی بھی اس حدیث سے تردید ہو جاتی ہے۔

دوسری یہ کہ یہ رویائے صالحہ کسی بھی مومن و مسلم کو نظر آسکتے ہیں۔ یہ کسی کے لیے خاص نہیں ہیں۔ اس قسم کی رویائے صالحہ دیکھنے والے کو نبوت کا کوئی مقام حاصل نہیں ہو جاتا اور نہ اس قسم کے خواب کسی پر کوئی حجت ہوتے۔ ان کی حیثیت بس یہ ہوتی ہے کہ اگر خواب دیکھنے والے نے اچھے خواب دیکھے ہیں تو ان سے ایک قسم کی خوش خبری اور فال نیک حاصل کرے۔ اس سے زیادہ ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

تیسری یہ کہ ظلی اور بروزی نبوت کی اصطلاحات بالکل شیطانی ہیں۔ اگر ان کی کوئی حقیقت ہوتی تو اس موقع پر لوگوں کو اطمینان دلانے کے لیے حضور ضرور یہ فرماتے کہ لوگ نبوت کے ختم ہونے سے زیادہ ہراساں نہ ہوں، میرے بعد ظلی اور بروزی انبیاء آتے رہیں گے۔

۴۔ قرآن مجید کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو انتظام فرمایا وہ بھی درحقیقت ختم نبوت ہی کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام آئے ان کی تعلیمات کی حفاظت کے لیے وہ انتظام نہیں کیا گیا جو قرآن کی حفاظت کے لیے کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء کی بعثت کا سلسلہ جاری تھا۔ اگر سابق نبی کی تعلیم کو اس کی قوم فراموش کر دیتی یا اس میں تحریف کر دیتی تو بعد میں آنے والا نبی اس کی بھی تجدید کر دیتا اور اس میں اللہ تعالیٰ جو اضافہ فرماتا اس سے بھی لوگوں کو آگاہ کر دیتا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور دین بھی کامل ہو گیا اس وجہ سے ضروری ہوا کہ قرآن مجید کو اس طرح محفوظ کر دیا جائے کہ قیامت تک شیاطین جن و انس اس میں کوئی دراندازی نہ کر سکیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ اس میں کسی زیر زبر کے فرق ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں رہا۔ حق و باطل کے امتیاز کے لیے اصل خدائی کسوٹی قرآن ہے۔ اگر وہ محفوظ ہے تو اب کسی وحی و الہام اور کسی مخاطبہ و مکالمہ کی حاجت باقی نہیں رہی اور نبی کی اصل چونکہ اسی پہلو سے ہوتی ہے اس وجہ سے اب نبی کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔ رہا 'شہادت علی الناس'

کافر لیفہ اور لوگوں میں پیدا ہونے والی خرابیوں کی اصلاح تو یہ ذمہ داری اصلاً اس امت پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتی ہے اور اس کے لیے عنداللہ مسئول علما رہوں گے۔ اور احادیث میں یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ اس امت میں ایسے علمار و مصلحین برابر پیدا ہوتے رہیں گے جو مفسدین کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کرتے رہیں گے اگرچہ ان کی تعداد کتنی ہی کم ہو۔

۵۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اب قیامت تک کسی نبی کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ بات قرآن و حدیث کے نصوص سے بھی ثابت ہے اور عقل و فطرت کی شہادت بھی یہی ہے۔ اگر روایات و آثار میں کوئی ایسی چیز آپ کے سامنے آئے جو ان قطعی نصوص کے خلاف نظر آئے تو اس پر غور کیجیے۔ اگر تاویل کی راہ سے باہم توفیق و تطبیق ہو جائے تو فبہا، اگر توفیق و تطبیق نہ ہو سکے تو ترجیح بہرحال قرآن کے نصوص اور دین کے مسلمات کو حاصل ہوگی۔ میں نے اس پہلو سے تمام روایات و آثار کو جانچا ہے۔ میرے نزدیک ان کی تطبیق اس بنیادی اصول کے ساتھ نہایت عمدہ طریقے پر ہو جاتی ہے لیکن یہاں اس بحث کی تفصیلات میں جانے کا محل نہیں ہے۔

۹۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۹-۵۲

آیات ۴۹-۵۲ اس مجموعۂ آیات کے پس منظر کو بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے اس لیے کہ اس میں بھی بڑا ایجاز ہے جس کے سبب سے مفسرین کو بڑی الجھنیں پیش آئی ہیں۔

کا پس منظر یہ آیات درحقیقت سورۂ نساء کی آیت ۳ پر، جس میں عام مسلمانوں کے لیے تحدید ازواج کا حکم بیان ہوا ہے، استدراک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نساء کی مذکورہ آیت کے نزول کے بعد جن مسلمانوں کے نکاح میں چار سے زیادہ بیویاں تھیں انھوں نے زائد بیویوں کو طلاق دے دی لیکن حضورؐ سے متعلق کسی بیوی کو طلاق دینا ثابت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت حضورؐ کے نکاح میں چار ہی بیویاں تھیں۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کیا تو منافقین نے اس پہلو سے بھی اس پر اعتراض کیا کہ انھوں نے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے اور شریعت بنا رکھی ہے۔ ان منافقین کا منہ بند کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس خاص اجازت کی وضاحت فرمائی جو ازواج کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔

اس اجازتِ خاص کے نمایاں پہلو یہ ہیں:

- آپ کی وہ ازواج جن کے مہر آپ ادا کر چکے ہیں، بلا استثنا آپ کے لیے جائز کی گئیں۔
- ملکِ یمین جو بطور فے آپ کو حاصل ہوں، اگر آپ ان میں سے کسی کو آزاد کر کے ان سے نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔
- آپ کے قریبی رشتہ کی خواتین میں سے اگر کسی نے دین کی خاطر اپنے عزیزوں، رشتہ داروں کو چھوڑ کر آپ

کے ساتھ ہجرت کی ہے، آپ ان میں سے بھی کسی سے نکاح کر سکتے ہیں۔

- اگر کوئی مومنہ اپنے آپ کو ہبہ کر دے اور آپ اس کو اپنے نکاح میں لینا چاہیں تو اس کی بھی آپ کو اجازت ہے۔
- یہ نکاح چونکہ تمام تر مصلحتِ دین وملت کی خاطر ہیں، اس وجہ سے حقوقِ زوجیت کے معاملے میں آپ پر سے وہ پابندیاں اٹھالی گئیں جو دوسروں پر تھیں۔

ان آزادیوں کے ساتھ حضورؐ پر دو پابندیاں بھی عائد کی گئیں جو دوسروں پر نہیں تھیں:

- ایک یہ کہ اس دائرہ سے باہر آپ کوئی نکاح نہیں کر سکتے۔
- دوسری یہ کہ ان ازواج کو دوسری ازواج سے بدل نہیں سکتے۔

یہ آزادی اور پابندی جن مصالح پر مبنی ہے چند اصولی باتیں ان سے متعلق بھی سمجھ لیجیے۔

حضورؐ نے جتنے نکاح بھی کیے حظِ نفس کے لیے نہیں بلکہ دعوتِ دین، تالیفِ قلب، دلداری اور مصالحِ ملت کی خاطر کیے۔ آیت ۲۸ کے تحت آپ پڑھ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس مشن کی ذمہ داری آپ پر ڈالی تھی اس میں ازواجِ مطہراتؓ بھی شریک کی گئی ہیں، گویا یہی وہ اصل مقصد تھا جس کی خاطر اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبیؐ کی معیت کے لیے منتخب فرمایا۔ اس فرض کو ازواجِ مطہراتؓ نے جس اہتمام اور جس خوبی کے ساتھ انجام دیا اس پر ہماری حدیث و سیرت کی کتابیں شاہد ہیں۔ خاص طور پر حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت میمونہؓ کا حصہ اس خدمت میں اگر مردوں سے زیادہ نہیں تو ان سے کم بھی نہیں ہے۔ عورتوں سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات زیادہ تر انہی سیداتؓ کے ذریعے سے پھیلی ہیں اور انہی کے ذریعے سے پھیل سکتی تھیں۔

حضرت زینبؓ سے آپؐ نے جن حالات میں اور جن مصالح کے تحت نکاح کیا ان کی تفصیلات آپ پڑھ آئے ہیں۔ انھوں نے ایک اہم معاشرتی اصلاح کی خاطر اپنے بھائی اور دوسرے عزیزوں کی رائے کے خلاف اپنے آپ کو ہدفِ مطاعن بنانا گوارا کیا لیکن حضورؐ کی بات نہیں ٹالی۔ ان کی اس قربانی کا اگر کوئی صلہ ہو سکتا تھا تو یہی ہو سکتا تھا کہ حضرت زیدؓ کے طلاق دینے کے بعد حضورؐ خود ان کو اپنے رشتۂ زوجیت کا شرف بخشیں۔ پھر حضرت زیدؓ کی طرح حضورؐ کے ساتھ بھی ان کا نکاح ایک عظیم معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنا اور اس میں بھی ان کو منافقین و منافقات کی یاوہ گوئیوں کا ہدف بننا پڑا لیکن انھوں نے اللہ اور رسول کی خاطر یہ تمام باتیں برداشت کیں۔

ازواجِ مطہراتؓ میں سے حضرت ام حبیبہؓ کے نکاح کا واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے قریش کے ظلم وستم سے تنگ آکر اپنے شوہر عبید اللہ کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی۔ وہاں ان کو یہ افتاد پیش آئی کہ کچھ عرصہ بعد ان کے شوہر نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اس عالمِ غربت میں انھوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر کے

تنہائی و بے کسی کی زندگی بسر کرنا گوارا کی لیکن اپنے ایمان پر ثابت قدم رہیں۔ ان کی اس عزیمت و استقامت کے صلہ میں حضورؐ نے ان کو نکاح کا پیغام دیا۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ اس استقامت کا کوئی صلہ اس دنیا میں اگر ہو سکتا تھا تو یہی ہو سکتا تھا کہ حضورؐ ان کو یہ عزت بخشیں۔

حضرت جویریہؓ اور حضرت صفیہؓ کے ساتھ آپؐ کے نکاح کی نوعیت یہ ہے کہ غزوۂ بنی مصطلق اور غزوۂ خیبر میں یہ بطور فَے حضورؐ کے حصہ میں آئیں۔ یہ سرداروں کی بیٹیاں تھیں۔ ان کی خاندانی وجاہت کو ملحوظ رکھ کر حضورؐ نے ان کو لونڈیوں کی حیثیت سے رکھنا پسند نہیں فرمایا بلکہ ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ ان نکاحوں کی دینی و سیاسی مصلحت بالکل واضح ہے۔

بعض صحابیاتؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف شرف نسبت کی خواہشمند تھیں اور وہ اپنے تئیں حضورؐ کو ہبہ کر دینا چاہتی تھیں۔ اس قسم کی خواتین میں سے حضرت میمونہؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ حضورؐ نے ان کی درخواست منظور فرمائی اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس درخواست کی منظوری میں زیادہ دخل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کی سفارش کو تھا۔

اس سے ملتا جلتا حال حضرت سودہؓ کا بھی ہے۔ ان کے حالات شاہد ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نسبت کے سوا اور کوئی خواہش ان کے اندر نہیں تھی۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ حضورؐ کے معاملہ کی نوعیت ایسی نہیں تھی کہ در باب نکاح و طلاق آپ کو اس تحدید کا پابند کر دیا جائے جو عام مسلمانوں کے لیے تھی۔ ایسا کرنے میں بہت سے مصالح کے فوت ہونے کا اندیشہ تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے ایک ایسا ضابطہ نازل فرمایا جس میں فی الجملہ وسعت بھی ہے تاکہ وہ دینی مصالح ملحوظ رکھے جا سکیں جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا اور ساتھ ہی اس میں حضورؐ پر بعض پابندیاں بھی ہیں جو دوسرے مسلمانوں پر نہیں ہیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ حضورؐ کو جو آزادی بخشی گئی وہ تمام تر مصالح پر مبنی تھی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۹-۵۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا ۚ فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ﴿۴۹﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَ

بَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۫ وَ امْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۗ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْۤ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۰﴾ تُرْجِيْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِيْۤ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَيْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَاۤ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ﴿۵۱﴾ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَاۤ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ رَّقِيْبًا ﴿۵۲﴾

ع ۶ / ۱۲ / ۳

ترجمۂ آیات ۴۹-۵۲

اے ایمان والو، جب تم مومنہ عورتوں سے نکاح کرو پھر ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو ان کے بارے میں تم پر کوئی عدّت واجب نہیں ہے جس کا تمھیں لحاظ کرنا ہو۔ پس ان کو کچھ دے دلا دو اور خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دو۔ ۴۹

اے نبی، ہم نے تمھاری ان بیویوں کو تمھارے لیے جائز کیا جن کے مہر تم دے چکے ہو اور تمھاری ان مملوکات کو بھی تمھارے لیے حلال کیا جو اللہ نے تم کو بطورِ غنیمت عطا فرمائیں اور تمھارے چچا کی بیٹیوں اور تمھاری پھوپھیوں کی بیٹیوں اور تمھارے ماموں کی بیٹیوں اور تمھاری خالاؤں کی بیٹیوں میں سے بھی ان کو حلال ٹھہرایا جنھوں نے تمھارے

ساتھ ہجرت کی ہے اور اس مومنہ کو بھی جو اپنے تئیں نبی کو ہبہ کر دے بشرطیکہ پیغمبر اس کو اپنے نکاح میں لانا چاہیں۔ یہ خاص تمہارے لیے ہے، مسلمانوں سے الگ۔ ہم کو اچھی طرح معلوم ہے جو کچھ ہم نے ان پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے باب میں فرض کیا ہے تاکہ تم پر کوئی تنگی نہ رہے اور اللہ غفور رحیم ہے۔ تم ان میں سے جن کو چاہو دور رکھو اور ان میں سے جن کو چاہو اپنے پاس رکھو اور اگر تم ان میں سے کسی کے طالب بنو جن کو تم نے دور کیا تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ یہ اس بات کے قرین ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غمگین نہ ہوں اور وہ اس پر قناعت کریں جو تم ان سب کو دو۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ علم رکھنے والا اور بُردبار ہے۔ ان کے علاوہ جو عورتیں ہیں وہ تمہارے لیے جائز نہیں ہیں اور نہ یہ جائز ہے کہ تم ان کی جگہ دوسری بیویاں کر لو اگرچہ ان کا حُسن تمہارے لیے دل پسند ہو۔ بجز ان کے جو تمہاری مملوکہ ہوں اور اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھنے والا ہے۔ ۵۰-۵۲

۱۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا نَكَحْتُمُ ٱلْمُؤْمِنَٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا ۖ فَمَتِّعُوهُنَّ وَسَرِّحُوهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (۴۹)

ایک ضمنی سوال کا جواب

آگے آیت ۵۰ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہاں جو وضاحت فرمائی گئی ہے اس کی نوعیت درحقیقت اس حکم پر استدراک کی ہے جو سورۂ نساء میں عام مسلمانوں کو تحدید ازواج سے متعلق دیا گیا ہے۔ اصل استدراک سے پہلے یہ آیت بطور تمہید ہے جس میں ایک ضمنی سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ اگر کسی نے ایک عورت سے نکاح کیا لیکن رخصتی اور ملاقات کی نوبت آنے سے پہلے ہی اس کو طلاق دے دی تو اس کے معاملے میں عدت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ سوال خاص طور پر اس زمانے میں اس وجہ سے پیدا ہوا ہوگا کہ تحدید ازواج کے حکم کی تعمیل میں طلاق کے واقعات بکثرت پیش آئے ہوں گے اور طلاق

دینے والوں نے زیادہ اولیٰ یہی سمجھا ہوگا کہ اپنی ان منکوحات کو طلاق دیں جن سے ازدواجی تعلقات ابھی قائم نہیں ہوئے ہیں۔ اس آیت نے ان کے لیے نہایت بہتر بدل سہولت مہیا کردی۔ ایسے لوگوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ اس قسم کی عورتوں کے معاملے میں عدت کے لحاظ کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ان کو حسبِ استطاعت دے دلا کر باعزت طریقہ سے رخصت کر دیا جائے۔ اس دینے دلانے کی تفصیل بقرہ کی آیات ۲۳۶-۲۳۷ میں گزر چکی ہے۔ وہاں ہم نے 'سراح جمیل' کی اہمیت بھی واضح کی ہے کہ اسلام میں مطلوب یہ ہے کہ میاں بیوی میں جدائی کی نوبت بھی آئے تو حتی الامکان یہ خوبصورتی کے ساتھ ہو۔ فریقین کے لیے کسی فضیحتے کا موجب نہ ہو۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّآ اَفَاۗءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ ۡ وَامْرَاَةً مُّؤْمِنَةً اِنْ وَّهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِيُّ اَنْ يَّسْتَنْكِحَهَا ۤ خَالِصَةً لَّكَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُوْنَ عَلَيْكَ حَرَجٌ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۵۰)

حضرت زینبؓ کے نکاح پر منافقین کا ایک اور اعتراض

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جس وقت تحدید ازدواج کا حکم نازل ہوا ہے قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے نکاح میں چار ہی بیویاں ـــــ حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت ام سلمہؓ ـــــ تھیں[1]۔ اس وجہ سے نہ حضورؐ کے لیے کسی بیوی کو طلاق دینے کا سوال پیدا ہوتا تھا اور نہ اس باب میں منافقین یا معترضین کے لیے کسی نکتہ چینی کی گنجائش تھی۔ لیکن ۵ھ میں حضورؐ نے جب حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح کیا تب معلوم ہوتا ہے کہ منافقین نے جس طرح یہ فتنہ اٹھایا کہ آپ نے اپنے متبنّٰی کی منکوحہ سے نکاح کر لیا اسی طرح یہ اعتراض بھی اٹھایا کہ آپ نے اپنے لیے الگ شریعت بنا رکھی ہے، دوسرے مسلمانوں کو تو بیویوں کے معاملے میں چار تک کی قید سے پابند کر دیا گیا ہے لیکن آپ نے اپنے آپ کو اس پابندی سے بالا رکھا۔

نکاح کے باب میں نبی صلعم کے امتیازات

حضرت زینبؓ کے واقعہ کی تفصیلات اوپر گزر چکی ہیں جس سے آپ کو یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ حضورؐ نے یہ نکاح اپنی خواہش سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا[2]۔ لیکن معترضین اس بات کو کب ماننے والے تھے اس وجہ سے انھوں نے اعتراض اٹھایا ہوگا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے پوری تفصیل کے ساتھ بتایا کہ نکاح کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسرے مسلمانوں کے مقابل میں کیا امتیازات حاصل ہیں۔

'يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْٓ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ'۔ سب سے پہلے ان ازواج کے متعلق

---

[1] یہ واضح رہے کہ حضرت زینب بنت خزیمہؓ کی وفات ۴ھ میں ہو چکی تھی۔ [2] ملاحظہ ہوں آیات ۳۷-۳۸: الاحزاب۔

جو آیت کے نزول کے وقت آپ کے نکاح میں تھیں، فرمایا کہ ہم نے تمہاری ان بیویوں کو جن کے مہر تم ادا کر چکے ہو، تمہارے لیے جائز ٹھہرایا۔ 'جائز ٹھہرایا' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی پہلو سے ان کو حرمت لاحق ہو گئی تھی، وہ دور کر دی گئی بلکہ یہ بات منافقین و معترضین کا منہ بند کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے کہ وہ جو ژاژخائی چاہیں کرتے رہیں تم ان کی پروا نہ کرو۔ تمام قرائن دلیل ہیں کہ یہ آیات سنہ ۵ھ میں نازل ہوئی ہیں۔ مکی زندگی سے لے کر سنہ ۵ھ تک جو سیدات حضورؐ کے عقدِ نکاح میں آئیں ان میں سے حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینب بنت خزیمہؓ کا تو جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا، انتقال ہو چکا تھا البتہ حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت ام سلمہؓ حیات تھیں۔ اور ان میں نیا اضافہ حضرت زینب بنت جحشؓ کا ہوا تھا۔ گویا ان سب کے باب میں ارشاد ہوا کہ اللہ نے ان کو تمہارے لیے جائز کیا۔ 'اٰتَيۡتَ اُجُوۡرَهُنَّ' کے الفاظ سے ان کا تعارف اس لیے فرمایا ہے کہ اس کے بعد ان خواتین کا ذکر آ رہا ہے جو بطریق فے آپ کو حاصل ہوں۔ ان الفاظ نے آپ کی ان ازواج مطہراتؓ کو ان سے فی الجملہ ممتاز کر دیا اس لیے کہ مملوکات کے معاملے میں مہر کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔

بطریق فے حاصل شدہ خواتین کا حکم

'وَمَا مَلَكَتۡ يَمِيۡنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ' یعنی غنیمت کی راہ سے آپ کو جو ملکِ یمین حاصل ہوں ان کو بھی اللہ نے آپ کے لیے جائز کیا۔ یہاں 'وَمَا مَلَكَتۡ يَمِيۡنُكَ' کے بعد 'مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيۡكَ' کے الفاظ خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عام لونڈیاں مراد نہیں ہیں بلکہ جنگ و جہاد میں جو عورتیں قید ہو کر آئیں وہ مراد ہیں۔ ان اسیرات میں لبا اوقات شریف خاندانوں اور سرداروں کی بہوئیں اور بیٹیاں بھی ہوتی تھیں۔ ان کے ساتھ فی الجملہ امتیازی سلوک کی روایت زمانۂ جاہلیت میں بھی تھی اور اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا چنانچہ اس طرح کی عورتیں تقسیم کے وقت عموماً سرداروں ہی کو دی جاتی تھیں۔ حضرت جویریہؓ اور حضرت صفیہؓ اسی طریقہ سے علی الترتیب غزوۂ بنی مصطلق اور غزوۂ خیبر کے موقع پر حضورؐ کے حصہ میں آئیں۔ آپؐ ان کو لونڈیوں کی حیثیت سے بھی رکھ سکتے تھے لیکن آپ نے ان کی خاندانی وجاہت کا لحاظ فرمایا اور آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ یہ نکاح آپ نے اسی اجازتِ خاص کے تحت کیے جو اس آیت میں آپ کو دی گئی۔ اگر یہ اجازت آپ کو حاصل نہ ہوتی تو آپ ان دونوں سیدات کو لونڈیوں کی حیثیت سے تو رکھ سکتے تھے لیکن بیویوں کی حیثیت سے نہیں رکھ سکتے تھے اس لیے کہ اس صورت میں ازواج کی تعداد اسلام کے عام ضابطہ سے متجاوز ہو جاتی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک قسم کی تنگی ہوتی جو آپ کے منصب کے اعتبار سے بعض اخلاقی و سیاسی مصالح میں مخل ہوتی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس طرح کی عورتوں سے نکاح کی اجازت دے دی۔ یہ دونوں نکاح بالترتیب سنہ ۶ھ اور سنہ ۷ھ میں ہوئے۔ اس طرح سنہ ۷ھ تک آپ کی ازواج کی تعداد سات ہو گئی۔

'وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيۡ هَاجَرۡنَ مَعَكَ' یہ حضورؐ کے

نہایت قریبی رشتہ کی خواتین کی تفصیل ہے کہ تمھارے چچا اور پھوپھیوں، ماموؤں اور خالاؤں کی بیٹیوں میں سے اگر کسی نے دین کی خاطر اپنے خویش واقارب اور خاندان و قبیلہ کو چھوڑا اور تمھارے ساتھ ہجرت کی ہو اور تم اس قربانی کی قدردانی اور حوصلہ افزائی کے طور پر ان میں سے کسی کو اپنے عقدِ نکاح میں لینا چاہو تو لے سکتے ہو۔ حضرت زینبؓ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو نکاح کا حکم دیا اس میں جہاں جاہلیت کی ایک رسمِ بد کی اصلاح مدنظر تھی وہیں یہ بات بھی مدنظر تھی کہ وہ آپ کی پھوپھی کی لڑکی اور دین کی راہ میں اپنی قربانیوں کے اعتبار سے آنحضرت صلعم کی دلداری کی مستحق تھیں۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ کے ساتھ بھی آپ نے اسی اجازت کے تحت نکاح کیا۔ وہ آپ کے رشتہ کے چچا کی صاحبزادی تھیں اور دین کی راہ میں ان کی قربانیوں اور جانبازیوں کا جو حال تھا اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

ننھیالی رشتوں میں اگرچہ حضورؐ کا کوئی نکاح ثابت نہیں لیکن ان کے اندر بھی اگر حضرت زینبؓ اور حضرت ام حبیبہؓ جیسی کوئی مثال موجود ہوتی تو اس آیت کے تحت آپ اس رشتہ کے اندر بھی نکاح کر سکتے تھے۔

ایثارِ نفس کی حوصلہ افزائی

'وَامْرَاَۃً مُّؤْمِنَۃً اِنْ وَّھَبَتْ نَفْسَھَا لِلنَّبِیِّ اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْکِحَھَا' کسی خاتون کا اپنے آپ کو کسی کے لیے ہبہ کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ہر حق سے دست بردار ہو کر اپنے تئیں اس کے حوالہ کر دے اور حقوق زوجیت میں سے جو کچھ وہ بخش دے وہ اس پر قانع و راضی رہے۔ یہ ایک انتہائی ایثارِ نفس کی صورت ہے جس کا جذبہ، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محض شرفِ نسبت حاصل کرنے کے لیے متعدد صحابیاتؓ کے اندر موجود تھا اور انھوں نے حضورؐ سے اس کا اظہار بھی کیا۔ حضورؐ کی گھریلو زندگی ہر شخص کو معلوم ہے کہ فقر و فاقہ کی زندگی تھی۔ اوپر آپ پڑھ آئے ہیں کہ امہات المومنینؓ کی غریبانہ زندگی ہی کی بنا پر منافقات ان کے اندر وسوسہ اندازی کرتی رہتی تھیں کہ اگر وہ طلاق حاصل کر لیں تو وقت کے بڑے بڑے سرداران کو نکاح کے پیغام دیں گے اور ان کی یہ فقر و فاقہ کی زندگی عیش و عشرت کی زندگی سے بدل جائے گی۔ اس طرح کی غریبانہ زندگی کے لیے ظاہر ہے کہ کوئی عورت دنیا کی کوئی طمع پیشِ نظر رکھ کر یہ بازی نہیں کھیل سکتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو ہبہ کر دے! یہ قربانی تو وہی خواتین کر سکتی تھیں جن کے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عقیدت و فدویت کا ایسا جذبہ ہو کہ وہ حضورؐ کی خدمت کی سعادت حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگی کا ہر ارمان قربان کر دینے کے لیے تیار ہوں۔ یہ جذبہ ایک نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ جذبہ تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کا لحاظ فرمایا اور حضورؐ کو یہ اجازت دی کہ اگر کوئی مومنہ اپنے آپ کو اس طرح ہبہ کر دے اور حضورؐ اس کو اپنے عقدِ نکاح میں لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں۔ 'اِنْ اَرَادَ النَّبِیُّ اَنْ یَّسْتَنْکِحَھَا' کی قید سے یہ بات نکلتی ہے کہ ہرچند یہ جذبہ نہایت محمود اور پاکیزہ ہے لیکن اس کی حوصلہ افزائی

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے زیادہ ممکن نہیں ہے اس وجہ سے یہ معاملہ کلیۃً آپ کی صوابدید پر منحصر ہے کہ کسی کی اس طرح کی پیش کش کو آپ قبول کریں یا نہ کریں۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس طرح کی صرف ایک پیش کش، حضرت میمونہؓ کی، آپؐ نے قبول فرمائی۔ یہ نکاح عمرۃ القضاء کے موقع پر سرف میں ہوا۔ اس کے بعد آپ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔

'خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ' یعنی یہ چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت خاص تمہارے لیے ہے، دوسرے مسلمانوں کے لیے اس کی اجازت نہیں ہے۔

نبی صلعم کے لیے خاص اجازت کی حکمت

'قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِي أَزْوَاجِهِمْ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ لِكَيْلَا يَكُونَ عَلَيْكَ حَرَجٌ'۔ یہ سورۂ نساء کی آیت ۳ کی طرف اشارہ ہے جس میں مسلمانوں کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتے۔ فرمایا کہ ہم نے عام مسلمانوں پر ان کی بیویوں اور لونڈیوں کے باب میں جو کچھ فرض کیا ہے وہ ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کے باوجود ہم تم کو یہ خاص اجازت اس لیے دے رہے ہیں کہ تم پر اس باب میں کوئی تنگی باقی نہ رہے یعنی اللہ نے جن دینی و ملی مصالح کی خاطر یہ اجازت آپ کو عطا فرمائی ہے ان مصالح کو آپ بغیر کسی زحمت کے پورا کر سکیں۔ ان مصالح کی طرف ہم اوپر اشارہ کرتے آئے ہیں۔

'وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا'۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگرچہ اس اجازت نے آپ کے اوپر حقوق و فرائض سے متعلق بہت بھاری ذمہ داریاں عائد کر دی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، وہ ان تقصیرات سے درگزر فرماتا ہے جو بلا قصد و ارادہ صادر ہو جایا کرتی ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس آیت کے متعلق، بعض روایات کی بنا پر لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ حضورؐ کے تمام نکاحوں کے بعد نازل ہوئی اور اس کے ذریعہ سے گویا آپ کو یہ اطمینان دلا دیا گیا کہ آپؐ نے جتنے نکاح کیے سب جائز ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔

پہلی قابل توجہ بات یہ ہے کہ تحدید ازواج کا صریح حکم نازل ہو جانے کے بعد حضورؐ کے لیے یہ ممکن کس طرح تھا کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر آپ کوئی نکاح اس ضابطہ کے خلاف کرتے۔ آپ کے شایانِ شان بات تو یہی تھی کہ آپ اس حکم پر سب سے بڑھ کر عمل کرنے والے بنتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اتنی ہی بات کہنی تھی کہ آپ کے سب نکاح جائز ہیں تو یہ رشتوں اور عورتوں کی اقسام کی تفصیل کی کیا ضرورت تھی۔ پھر تو یہ مختصر سا فقرہ بالکل کافی ہوتا کہ اب تک آپؐ نے جتنے نکاح کیے سب اللہ نے جائز کر دیے۔ اس پر کسی کو اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے۔

بہرحال یہ رائے نہایت کمزور ہے۔ ہمارے نزدیک اصل صورتِ واقعہ وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جس وقت تحدید ازواج والی آیت نازل ہوئی ہے اس وقت تو آپ کے نکاح میں چار ہی بیویاں تھیں، اس وجہ سے کسی کو طلاق دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ البتہ بعد میں جب آپ نے

حضرت زینبؓ سے نکاح کیا تو یہ چیز معترضین کے لیے وجہ اعتراض بنی ہوگی اور اس اعتراض سے دوسرے نیک نیت لوگوں کے اندر بھی شبہات پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس امکان کے سدباب کے لیے اللہ تعالیٰ نے نہایت تفصیل سے واضح فرما دیا کہ حضرت زینبؓ سے نکاح اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے کرایا ہے اور اس معاملے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے عام مسلمانوں سے الگ ضابطہ ہے۔ وہ فلاں فلاں اقسام کی خواتین سے آئندہ بھی نکاح کر سکتے ہیں۔ اس طرح حضرت زینبؓ کے نکاح کو بھی جائز فرما دیا اور آئندہ کے لیے ایک ضابطہ بھی مقرر کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ ہمارے نزدیک یہ آیت ۵ھ میں حضرت زینبؓ کے نکاح کے بعد نازل ہوئی ہے۔

تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْۤ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا (۵۱)

حقوق زوجیت کے معاملے میں آزادی

اوپر تفصیل سے یہ بات گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ سارے نکاح اصلاً مصلحت دین کے لیے تھے اس وجہ سے جس طرح ازواج کی تعداد کے معاملے میں آپ کو عام ضابطہ سے مستثنیٰ رکھا اسی طرح حقوقِ زوجیت کے معاملے میں بھی آپ کو آزادی دے دی کہ یہ چیز تمام تر آپ کی صوابدید پر ہے۔ آپ جس کو چاہیں اپنے پاس بلائیں، جس کو چاہیں نہ بلائیں۔ اگرچہ بیویوں کے درمیان عدل کا معاملہ بڑی اہمیت رکھنے والا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پابندی سے بھی آزاد کر دیا اور اس کی دو وجہیں تھیں۔

اول تو وہی جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ آنحضرت صلعم کے نکاحوں میں نکاح کے عام مقصد کی حیثیت بالکل ضمنی اور ثانوی تھی۔ اصل مقصد دین تھا اور اس مقصد کے لیے ان حدود و قیود کی پابندی کی ضرورت نہیں ہے جو عام میاں بیوی کے لیے مقرر ہیں۔

دوسری یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ اندیشہ نہیں تھا کہ آپ اس آزادی سے کوئی غلط فائدہ اٹھائیں گے۔ چنانچہ آپ کے تمام سیرت نگار اس بات پر متفق ہیں کہ اس آزادی کے باوجود آپؐ نے اپنے اوپر عدل کی پوری پابندی قائم رکھی اور آخر عمر تک کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں کی۔

وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ یعنی آپ کو اس کی بھی اجازت ہے کہ آپؐ اپنی ازواج میں سے کسی کو چاہیں تو ازدواجی تعلق سے بالکل معزول رکھنے کے بعد پھر ان سے تعلق کو بحال کر لیں۔ اس معاملے میں بھی نہ آپ پر کوئی پابندی ہے اور نہ آپ کی ازواج میں سے کسی کو اس پر اعتراض کا حق ہوگا۔

ازواج نبیؐ کو تشفی

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَاۤ اٰتَیْتَهُنَّ ؕ یہ ازواج مطہراتؓ کو تشویق و ترغیب ہے کہ وہ اپنے اوپر پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تعلق کو عام میاں بیوی کے تعلق کی کسوٹی پر نہ پرکھیں۔

بلکہ پیغمبرؐ کی اصل ذمہ داری اور اپنی اصل حیثیت کو سامنے رکھ کر جانچیں۔ اصل چیز زاویۂ نگاہ ہے۔ اگر اس میں تبدیلی ہو جائے گی اور وہ یہ سمجھ جائیں گی کہ پیغمبرؐ کے ساتھ ان کا اصل تعلق صرف میاں بیوی کا نہیں بلکہ خدمت دین کا ہے تو پھر حقوق کے معاملے میں نہ باہم ازواج میں کوئی رقابت ہوگی اور نہ پیغمبرؐ ہی سے کوئی گلہ و شکوہ رہے گا بلکہ اپنے مصروف لمحات میں سے پیغمبرؐ جو کچھ جس کو بخش دیں گے وہ اسی پر قناعت کریں گی۔ زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کے بعد دینی خدمت کے اعتبار سے جس کا مرتبہ بلند ہوگا اس کی قدر جس طرح نبی کی نظروں میں ہوگی اسی طرح آپ کی ازواج کی نگاہوں میں بھی ہوگی اور باہمی رشک و رقابت کی تمام تلخیاں کافور ہو جائیں گی۔

'وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِکُمْ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا'۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواجؓ کو یاددہانی ہے کہ ہر ایک کو یہ حقیقت مستحضر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے لیکن وہ واقف ہونے کے ساتھ علیم اور بُرد بار بھی ہے اس وجہ سے وہ درگزر بھی فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس علم و حلم کو مستحضر رکھنے ہی سے خدا کی خشیت اور اس کے عفو کا وہ صحیح تصور انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے جو امید و بیم دونوں کے اندر توازن پیدا کر کے انسان کی زندگی کو صحیح منہاج پر قائم رکھتا ہے۔

لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَکَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکَ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا (۵۲)

درباب نکاح آنحضرت صلعم کے لیے پابندی

مذکورہ بالا اصناف کی خواتین کے سوا دوسری تمام عورتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حرام کر دی گئیں۔ ابن کثیرؒ نے ایک پورے گروہ کی، جس میں ابی بن کعب، مجاہد، عکرمہ، ضحاک، ابورزین، ابوصالح، حسن، قتادہؒ اور دوسرے رحمہم اللہ جیسے اکابر تفسیر شامل ہیں، یہ رائے نقل کی ہے کہ 'ما سوی ذلک من اصناف النساء فلا یحل لک' (اور ان کے سوا دوسری اقسام کی جو خواتین ہیں وہ تمھارے لیے جائز نہیں ہیں) گویا آنحضرتؐ کے لیے ایک خاص دائرہ جو آیت ۵۰ میں مذکور ہے، مخصوص کر دیا گیا اس سے باہر کوئی نکاح آپ نہیں کر سکتے تھے۔

'وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَکَ حُسْنُهُنَّ'۔ اور اس کی اجازت بھی آپ کو نہیں تھی کہ اپنی ان ازواج میں سے کسی کو الگ کر کے ان کی جگہ دوسری بیوی آپ لائیں، اگرچہ وہ آپ کی نظروں میں کتنی ہی پسندیدہ ہوں۔ اس کے بعد صرف ملک یمین کی اجازت باقی رہ گئی چنانچہ اسی اجازت کے تحت حضرت ماریہؓ آپ کے قبضہ میں آئیں جن کے بطن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی ولادت ہوئی۔

'وَکَانَ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ رَّقِیْبًا'۔ یہ آیت ظاہر ہے کہ بطور تذکیر و تنبیہ ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مخاطب یہاں حضورؐ ہیں۔ اوپر والی آیت میں آپ نے دیکھا کہ اسی نوع کی تذکیر ازواج مطہراتؓ کو کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں ہر ایک مسئول ہے اور جو جتنا ہی بڑا ہے اتنا ہی زیادہ مسئول ہے۔ اس

وجہ سے ہر ایک کے لیے ضروری ہوا کہ خدا کے مواخذہ سے پہلے اپنا محاسبہ کرتا رہے اور یہ اس یقین کے ساتھ محاسبہ کرتا رہے کہ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی خدا کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔

اس آزادی اور اس پابندی پر، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اوپر کی آیات میں بیان ہوئی ہے، غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ ازواج کے معاملے میں چار کی قید سے آزاد کر دیا گیا لیکن دوسری طرف آپ پر جو پابندیاں عائد کر دی گئیں وہ ایسی ہیں کہ نکاح و طلاق دونوں ہی کے معاملے میں حضورؐ دوسرے مسلمانوں کے مقابل میں کہیں زیادہ پابند تھے۔

ایک عام مسلمان کو تو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ چار کی حد کو ملحوظ رکھتے ہوئے محرمات کے دائرے سے باہر، جس عورت سے چاہے نکاح کرے اور اپنی منکوحات میں سے جس کو چاہے طلاق دے کر اس کی جگہ کوئی دوسری بیوی اپنی پسند کی بیاہ لائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آزادی حاصل نہیں تھی۔ آپ اس حکم کے نازل ہونے کے بعد اگر نکاح کر سکتے تھے تو صرف تین قسم کی عورتوں سے۔

- اپنے نہایت قریبی رشتہ کی کسی ایسی خاتون سے جنھوں نے آپ کے ساتھ ہجرت کی ہو۔
- کسی جہاد کے نتیجہ میں بطور غنیمت حاصل شدہ کسی خاتون سے۔
- کسی ایسی خاتون سے جو اپنے آپ کو حضورؐ کو ہبہ کر دیں اور حضورؐ ان سے نکاح کرنا پسند فرمائیں۔

اس دائرے سے باہر نہ آپ کوئی نکاح کر سکتے تھے اور نہ ان ازواج میں، مجرد پسند و ناپسند کی بنا پر، کوئی ردو بدل فرما سکتے تھے۔ یہ اجازت جن دینی مصالح کی بنا پر آپ کو دی گئی ان کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

۱۱- آگے کا مضمون۔ آیات ۵۳-۶۲

آگے منافقین کی ریشہ دوانیوں اور ایذا رسانیوں کے سدِ باب کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو بھی اور عام مسلمانوں کی بہوؤں بیٹیوں کو بھی پردے سے متعلق بعض ہدایات دی گئی ہیں۔ کچھ احکام سورۂ نور میں بھی پردے سے متعلق بیان ہو چکے ہیں۔ اس سورہ میں اس باب کی تکمیل کر دی گئی ہے تاکہ اشرار و مفسدین کی دراندازی کے لیے کوئی رخنہ باقی نہ رہے۔ آخر میں منافقین کو یہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر اب بھی وہ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے تو ان کے بارے میں ایسے احکام دے دیے جائیں گے کہ ان کے لیے اس سرزمین میں سر چھپانا ناممکن ہو جائے گا ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے

آیات ۵۳-۶۲

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَدْخُلُوا۟ بُيُوتَ ٱلنَّبِىِّ إِلَّآ أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرَ نَٰظِرِينَ إِنَىٰهُ وَلَٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَٱدْخُلُوا۟

فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ
يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ؗ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ؕ وَاِذَا
سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ
لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ؕ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ
تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا ؕ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ
عَظِيْمًا ﴿٥٣﴾ اِنْ تُبْدُوْا شَيْـًٔا اَوْ تُخْفُوْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيْمًا ﴿٥٤﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْهِنَّ فِيْۤ اٰبَآئِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآئِهِنَّ وَلَآ اِخْوَانِهِنَّ
وَلَآ اَبْنَآءِ اِخْوَانِهِنَّ وَلَآ اَبْنَآءِ اَخَوٰتِهِنَّ وَلَا نِسَآئِهِنَّ وَلَا مَا
مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ ۚ وَاتَّقِيْنَ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
شَهِيْدًا ﴿٥٥﴾ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٥٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ
وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا
مُّهِيْنًا ﴿٥٧﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا
فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿٥٨﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ ع ٦
لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ
جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٥٩﴾ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ

فِيهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿٦٠﴾ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا ﴿٦١﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿٦٢﴾ معانقة ۱۲

الربع

ترجمۂ آیات ۵۳-۶۲

اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں نہ داخل ہو مگر یہ کہ تم کو کسی کھانے پر آنے کی اجازت دی جائے۔ نہ انتظار کرتے ہوئے کھانے کی تیاری کا۔ ہاں جب تم کو بلایا جائے تو داخل ہو، پھر جب کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ اور باتوں میں لگے ہوئے بیٹھے نہ رہو۔ یہ باتیں نبی کے لیے باعث اذیت تھیں لیکن وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے' اور اللہ حق کے اظہار میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ اور جب تم کو ازواجِ نبی سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگو، یہ طریقہ تمہارے دلوں کے لیے بھی زیادہ پاکیزہ ہے اور ان کے دلوں کے لیے بھی، اور تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم اس کی بیویوں سے کبھی اس کے بعد نکاح کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک بڑی سنگین باتیں ہیں۔ تم کسی چیز کو ظاہر کرو، خواہ چھپاؤ، اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ ۵۳-۵۴

ان پر ان کے باپوں کے معاملے میں کوئی گناہ نہیں ہے اور نہ ان کے بیٹوں کے بارے میں اور نہ ان کے بھائیوں کے بارے میں اور نہ ان کے بھتیجوں کے بارے میں اور نہ ان کے بھانجوں کے بارے میں اور نہ اپنے میل کی عورتوں کے بارے میں اور نہ ان کی لونڈیوں کے باب میں ہی اور اللہ سے ڈرتی رہو۔ بے شک اللہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ ۵۵

بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو، تم بھی اس پر درود و سلام بھیجو اچھی طرح۔ بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں،

اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت دونوں میں لعنت کی اور ان کے لیے اس نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ مومنین اور مومنات کو ان چیزوں کے باب میں ایذا دیتے ہیں جن کا انھوں نے ارتکاب نہیں کیا، انھوں نے اپنے سر صریح بہتان اور گناہ کا بار لیا۔ ۵۶-۵۸

اے نبی! اپنی بیویوں، اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کر دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی بڑی چادروں کے گھونگھٹ لٹکا لیا کریں۔ یہ اس بات کے قرین ہے کہ ان کا امتیاز ہو جائے، پس ان کو کوئی ایذا نہ پہنچائی جائے۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۵۹

یہ منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے اور جو مدینہ میں سنسنی پھیلانے والے ہیں اگر باز نہ رہے تو ہم تم کو ان پر اکسا دیں گے، پھر وہ تمھارے ساتھ رہنے کا بہت ہی کم موقع پائیں گے۔ ان پر پھٹکار ہوگی، جہاں ملیں گے پکڑے جائیں گے اور بے دریغ قتل کیے جائیں گے۔ یہی اللہ کی سنت رہی ہے ان لوگوں کے بارے میں جو پہلے ہو گزرے ہیں اور تم اللہ کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔ ۶۰-۶۲

۱۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّآ اَنْ يُّؤْذَنَ لَكُمْ اِلٰى طَعَامٍ غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ وَلٰكِنْ اِذَا دُعِيْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ ۡ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ ۭ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَاۗءِ حِجَابٍ ۭ ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ ۭ وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا ۭ اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمًا (۵۳)

پردے کے احکام کی وضاحت

مسلمانوں کے لیے ایک دوسرے کے گھروں میں آنے جانے سے متعلق ضروری آداب سورۂ نور میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں سے متعلق انہی آداب کی مزید وضاحت ہو رہی ہے اور اس وضاحت مزید کی ضرورت انہی منافقین کی وجہ سے پیش آئی جن کا رویہ اس سورہ میں زیر بحث ہے۔

منافقین کی بعض شرارتیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً فوقتاً صحابہ رضی اللہ عنہم کو کسی تقریب سے اپنے ہاں کھانے پر بلاتے رہتے۔ ایسے مواقع پر ان لوگوں کو بھی آپ ازراہِ کریم النفسی و تالیفِ قلب بلاتے جو مبتلائے نفاق تھے۔ اور اگر نہ بھی بلاتے تو بھی ان میں سے بعض ناخواندہ مہمان بن کر خود ہی پہنچ جاتے۔ یہ لوگ حضورؐ کی کریم النفسی سے نہایت غلط فائدہ اٹھاتے۔ اوّل تو یہ لوگ دعوت کا بہانہ پاکر کھانے کے وقت سے بہت پہلے ہی وہاں ڈیرا جما کر بیٹھ جاتے، پھر کھانا کھا چکنے کے بعد بھی وہاں سے کھسکنے کا نام نہ لیتے بلکہ باتوں میں لگے بیٹھے رہتے اور مزید شرارت یہ کرتے کہ کسی چیز کے مانگنے کے بہانے دراتے ہوئے ازواجِ مطہراتؓ کے سامنے چلے جاتے۔ مقصود ان ساری حرکتوں سے ان کا وہی ہوتا جس کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں کہ کوئی موقع ان کو ازواجِ مطہراتؓ کے اندر وسوسہ اندازی و ریشہ دوانی کا ہاتھ آئے۔ حضورؐ ان لوگوں کی ان حرکتوں کو محسوس فرماتے اور اس سے آپ کو تکلیف بھی پہنچتی لیکن آپ لحاظ و مروّت کے سبب سے نظر انداز فرماتے۔ لیکن نظر انداز کیے جانے کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ لوگ اس کریم النفسی کے سزاوار نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اس باب میں نہایت واضح احکام بھی دے دیے اور یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ اب بھی اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو اپنی قضائے مبرم کو دعوت دینے والے بنیں گے۔

بعض ضروری آداب متعلق دعوت

'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَدۡخُلُوۡا بُیُوۡتَ النَّبِیِّ اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡذَنَ لَکُمۡ اِلٰی طَعَامٍ غَیۡرَ نٰظِرِیۡنَ اِنٰىهُ'

خطاب اگرچہ عام ہے تاکہ اس تعلیم کا فائدہ عام رہے لیکن اس کے پس پردہ وہی منافقین ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابھی اس مرحلہ میں ان کا پردہ اٹھانا نہیں چاہا اس وجہ سے بات عام صیغہ ہی سے فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا کہ اے ایمان والو، نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو مگر یہ کہ تم کو کسی کھانے میں شرکت کے لیے اجازت دی جائے۔ 'یُؤۡذَنَ لَکُمۡ اِلٰی طَعَامٍ' کے اسلوب میں دو باتیں مضمر ہیں۔ ایک یہ کہ گھروں میں بدون اجازت نہ داخل ہوا اور دوسری یہ کہ دعوت میں بن بلائے نہ جا دھمکو۔ 'غَیۡرَ نٰظِرِیۡنَ اِنٰىهُ' یہ تیسری شرط ہے۔ 'نٰظِرِیۡنَ' کے معنی 'مُنۡتَظِرِیۡنَ' کے اور 'اِنٰی' کے معنی کسی چیز کی تیاری اور پکنے کے وقت کے ہیں۔ یعنی یہ بھی جائز نہیں ہے کہ دعوت کا بہانہ ہاتھ آگیا ہے تو کھانے کی تیاری کے انتظار میں وہیں دھونی رما کر بیٹھ رہو۔ اول تو یہ چیز آدمی کی طماعی اور سفلہ پن کی دلیل ہے۔ ثانیاً اس زمانے میں عام طور پر صورت یہ تھی کہ زنانہ مکانوں کے ساتھ مردانہ بیٹھکیں نہیں تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کا حال بھی یہی تھا۔ اس وجہ سے وقت سے پہلے لوگوں کا مجتمع ہو جانا اہلِ خانہ اور صاحبِ خانہ دونوں کے لیے موجبِ زحمت و اذیت تھا۔

'وَلٰکِنۡ اِذَا دُعِیۡتُمۡ فَادۡخُلُوۡا فَاِذَا طَعِمۡتُمۡ فَانۡتَشِرُوۡا وَلَا مُسۡتَاۡنِسِیۡنَ لِحَدِیۡثٍ' یہ صحیح طریقہ ارشاد ہوا کہ جب بلائے جاؤ تو وقت کے وقت داخل ہو اور جب کھا چکو تو وہاں سے منتشر ہو جاؤ، باتوں میں لگے ہوئے وہاں بیٹھے نہ رہو۔ 'اِذَا دُعِیۡتُمۡ' میں اسی مضمون کو کھول دیا ہے جو 'اِلَّاۤ اَنۡ یُّؤۡذَنَ لَکُمۡ اِلٰی طَعَامٍ'

میں مضمر ہے۔ یعنی صرف اس صورت میں جانا چاہیے جب بلایا جائے، بن بلائے مہمان بننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ 'وَلَا مُسْتَأْنِسِيْنَ لِحَدِيْثٍ' بالکل اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح کی ہدایت اوپر 'غَيْرَ نٰظِرِيْنَ اِنٰىهُ' والے ٹکڑے میں دی گئی ہے۔ یعنی جس طرح یہ بات ناپسندیدہ ہے کہ کھانے کی تیاری کے انتظار میں پہلے سے جا بیٹھو اسی طرح یہ بات بھی ناپسندیدہ ہے کہ کھانا کھا چکنے کے بعد کسی بات میں لگ کر وہیں جمے رہو۔

'اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيٖ مِنْكُمْ وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ' 'ذٰلِكُمْ' سے اشارہ ان ساری ہی باتوں کی طرف ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔ فرمایا کہ یہ باتیں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے باعثِ زحمت و اذیت تھیں لیکن وہ شرم و لحاظ کے سبب سے تم کو ٹوکتے نہیں تھے لیکن اللہ کو حق کے معاملے میں کسی کا لحاظ نہیں ہے اس وجہ سے وہ تم کو ان باتوں سے آگاہ فرما رہا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی کمزوری کا ذکر نہیں فرمایا ہے بلکہ آپ کی ایک پسندیدہ خصلت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ آپ نہایت کریم النفس و ذی مروّت ہیں اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ان غلطیوں پر متنبہ فرما دیا ہے اور لحاظ و مروّت کو بالائے طاق رکھ کے نبی کو بھی ان کا اعلان کرنا ضروری ہوا۔

دل کی صحت کے لیے اہتمام

'وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ' ضمیر کا مرجع ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) ہیں۔ اوپر 'بُيُوْتَ النَّبِيِّ' کا ذکر ہو چکا ہے اس وجہ سے ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کے ذکر کے لیے نہایت واضح قرینہ موجود تھا۔ فرمایا کہ اگر کسی کو ان سے کوئی چیز مانگنے کی ضرورت پیش آئے تو یہ نہ کرے کہ دندناتا ہوا ان کے سامنے چلا جائے بلکہ پردے کی اوٹ سے مانگے 'ذٰلِكُمْ اَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ' (یہی طریقہ تمہارے دلوں کو بھی زیادہ پاکیزہ رکھنے والا ہے اور ان کے دلوں کو بھی) یہ ایک دفع دخل مقدر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر یہ بات ایک غیر ضروری تکلّف محسوس ہوتی ہے کہ کسی کو ان سے ایک گلاس پانی مانگنے کی بھی ضرورت پیش آئے تو اس کے لیے بھی پردہ کا اہتمام کرے لیکن یہ کوئی تکلّف نہیں بلکہ دل کو آفات سے محفوظ رکھنے کی ایک نہایت ضروری تدبیر ہے۔ انسان کا دل جس نے بنایا ہے وہ اس کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کن کن مخفی راستوں سے یہ دل برے اثرات قبول کرتا ہے اور دل ہی وہ چیز ہے جس پر انسان کی تمام اخلاقی صحت کا انحصار ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ جن کو اپنے دل کی صحت مطلوب ہو وہ اس کو ان تمام چیزوں سے محفوظ رکھیں جو اس کو غبار آلود کر سکتی ہیں۔ اس زمانے کے مدعیانِ تہذیب اپنے کپڑوں کی صفائی کا تو بڑا اہتمام رکھتے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ ان پر ایک شکن یا ایک دھبہ بھی پڑنے دیں لیکن ان کے دل جس گندگی سے بھی لت پت رہیں ان کی انھیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاقی و روحانی صحت کی ان کے ہاں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ حالانکہ اصلی اہمیت رکھنے والی چیز یہی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے: 'مضغۃ فی الجسد اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب' (انسان کے جسم میں ایک ٹکڑا گوشت کا ہے، اگر وہ تندرست ہے تو سارا جسم تندرست

ہے اور جب اس میں فساد پیدا ہو جاتا ہے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے، آگاہ ہو کر سن لو کہ وہ دل ہے!) انسان کے جسم میں جو چیزیں جتنی ہی نازک اور قدر و قیمت رکھنے والی ہیں اتنی ہی زیادہ ان کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ دل سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھنے والا اور سب سے زیادہ حسّاس ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا سب سے زیادہ اہتمام فرمایا۔

منافقین کو ایک تنبیہ

'وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُؤْذُوا رَسُولَ اللَّهِ وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا' فرمایا کہ تمھارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اپنی اس قسم کی حرکتوں سے، جو اوپر بیان ہوئیں، اللہ کے رسول کو اذیت پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد کبھی بھی ان کی ازواج سے نکاح کرو۔

اس ٹکڑے نے تدریجی انکشاف کے اصول پر ان لوگوں کے چہروں سے نقاب اٹھا دی جن کو پیش نظر رکھ کر یہ احکام دیے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ منافقین ہی تھے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اذیت پہنچانے کے لیے اس طرح کی حرکتیں کرتے تھے اور وہی تھے جو اپنے دلوں میں یہ ارمان بھی رکھتے تھے کہ آپ کی ازواج سے نکاح کریں تاکہ اس کو اللہ اور رسول کے خلاف فتنہ انگیزیوں کا ذریعہ بنائیں۔ اس آیت کا انداز، تنبیہ کا ہے اس وجہ سے اس میں حضورؐ کا ذکر 'رسول اللہ' کے لفظ سے ہوا ہے حالانکہ اوپر کی آیات میں بار بار آپ کا ذکر 'نبی' کے لفظ سے ہوا ہے۔ اس کی وجہ اس تنبیہ کی شدّت کو ظاہر کرنا ہے۔ اس لیے کہ رسول، جیسا کہ ہم اس کتاب میں بار بار واضح کر چکے ہیں، اپنی قوم کے لیے خدا کی عدالت ہوتا ہے۔ وہ جب آتا ہے تو صرف وعظ سنانے کے لیے نہیں آتا، بلکہ قوم کے نیکوں اور بدوں کے درمیان فیصلہ کر دینے کے لیے آتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے ساتھ مذاق یا اس کو اذیت پہنچانا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ کھیل کھیل رہے ہیں وہ آگ سے کھیل رہے ہیں۔ اس کے اس انجام کو وہ سامنے رکھیں۔

ازواج نبیؐ کا درجہ

'وَلَا أَنْ تَنْكِحُوا أَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ أَبَدًا' یہ ان کے اس ارمان پر بھی آخری ضرب لگا دی ہے جو ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہن) سے نکاح کے لیے وہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ فرمایا کہ تمھارے لیے یہ بات بھی جائز نہیں ہے کہ تم نبیؐ کی بیویوں سے آج یا کبھی بھی نکاح کرو۔ اوپر آیت ۶ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کی حیثیت امت کی ماؤں کی ہے اور ان کے ساتھ تعلق کی یہی نوعیت فطری بھی ہے اور عقلی بھی۔ فطری اس وجہ سے کہ حضورؐ کی ازواج کے لیے ہر امتی کے دل کے اندر (اگر اس کے اندر ایمان کی رمق ہے) احترام و عقیدت کا جذبہ اپنی ماں کے مقابل میں بھی بدرجہا زیادہ ہوتا ہے۔ اس جذبے کے ہوتے کوئی امتی ان کے ساتھ نکاح کے تصور کو اپنی ماں کے ساتھ نکاح کے تصور سے بھی بدرجہا گراں اور شرم انگیز محسوس کرتا ہے۔ اگر کسی کے اندر ان کے ساتھ نکاح کا جذبہ ابھرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ایمان میں فتور اور اس کی فطرت میں بگاڑ پیدا ہو چکا ہے۔

عقلی اس وجہ سے کہ ازواج نبی (رضی اللہ عنہن) کی حیثیت، جیسا کہ آیت ۳۴ میں گزر چکا ہے، اس

امت کے ذکور واناث، سب کے لیے، معلمات کی ہے اور اس منصب پر ان کو خود اللہ تعالیٰ نے مامور فرمایا ہے۔ اس منصب کا تقاضیٰ یہ ہے کہ ان کو ماؤں ہی کے درجے میں رکھا جائے۔ اسی درجے پر رہتے ہوئے ہی وہ اپنے اس فریضۂ منصبی کو صحیح طور پر ادا کرسکتی ہیں۔ اگر اس درجے سے ان کو گرا دیا جائے تو نہ وہ اپنے صحیح وقار کو قائم رکھ سکتی ہیں، نہ دوسرے ان سے اس طرح کسب فیض کرسکتے ہیں جس طرح معلمات امت سے کیا جانا چاہیے۔

ایک تنبیہ

'اِنَّ ذٰلِکُمۡ کَانَ عِنۡدَ اللّٰہِ عَظِیۡمًا'۔ یہ تنبیہ ہے اور بڑی ہی سخت تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی ہی سنگین ہیں۔ یہاں اس کے وبال کی وضاحت نہیں فرمائی اور اس ابہام کے اندر جو تہدید و تخویف مضمر ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

اِنۡ تُبۡدُوۡا شَیۡئًا اَوۡ تُخۡفُوۡہُ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا (۵۴)

یہ بھی تنبیہ ہے جو اوپر والی تنبیہ کو مزید موکد کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا چونکہ دلوں کے بھید سے بھی واقف ہے اس وجہ سے اس سے کوئی بات چھپائی نہیں جاسکے گی۔ اس دنیا میں تو اپنی کسی نازیبا سے نازیبا حرکت کے لیے بھی نہایت حسین عذر تراشے جاسکتے ہیں لیکن یہ عذرات خدا کے ہاں نہیں کام آئیں گے۔ وہ دلوں کے مخفی کھوٹ بھی سب کے سامنے رکھ دے گا۔

لَا جُنَاحَ عَلَیۡہِنَّ فِیۡۤ اٰبَآئِہِنَّ وَ لَاۤ اَبۡنَآئِہِنَّ وَ لَاۤ اِخۡوَانِہِنَّ وَ لَاۤ اَبۡنَآءِ اِخۡوَانِہِنَّ وَ لَاۤ اَبۡنَآءِ اَخَوٰتِہِنَّ وَ لَا نِسَآئِہِنَّ وَ لَا مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُہُنَّ ۚ وَ اتَّقِیۡنَ اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدًا (۵۵)

ان لوگوں کا ذکر جن کے لیے پردے کے معاملے میں رعایت ہے

یہ آیت اسی محل میں ہے جس محل میں سورۂ نور کی آیت ۳۱: 'وَلَا یُبۡدِیۡنَ زِیۡنَتَہُنَّ الآیۃ' ہے۔ دونوں میں الفاظ بھی اکثر مشترک ہیں۔ اوپر والی آیت میں ازواج نبی رضی اللہ عنہن کے گھروں میں دوسروں کے داخل ہونے پر جو پابندیاں عائد کی گئی ہیں، ان پابندیوں سے جو لوگ مستثنیٰ ہیں یہ ان کی تفصیل ہے۔ خاص اہم رشتوں کا ذکر کر دیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ جو رشتہ دار ان کے حکم میں داخل ہیں وہ سب اس پابندی سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے اوپر صرف وہی پابندیاں ہوں گی جو سورۂ نور میں مذکور ہوئی ہیں۔

'وَاتَّقِیۡنَ اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدًا'۔ یہ آخر میں ازواج نبیؐ کو بھی اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہات دوسروں کے لیے اوپر گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان احکام و ہدایات کی صرف خانہ پری مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ ان کی تعمیل پوری خدا ترسی اور تقویٰ کے ساتھ کی جائے اور یہ حقیقت ہمیشہ دل میں مستحضر رہے کہ اللہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ کوئی جگہ بھی ایسی نہیں ہے جہاں انسان خدا سے چھپ سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوۡنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا صَلُّوۡا عَلَیۡہِ وَ سَلِّمُوۡا تَسۡلِیۡمًا (۵۶)

درود کی اہمیت و حقیقت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذاء و آزار پہنچانے کے بجائے اہلِ ایمان کو حضورؐ کے معاملے میں جو رویہ اختیار کرنا چاہیے، یہ اس کی ہدایت ہے۔ فرمایا کہ اللہ اپنے نبیؐ پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے بھی اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ اس وجہ سے اہل ایمان کے لیے بھی صحیح روش، خدا اور اس کے فرشتوں سے ہم آہنگ و ہم رنگ، یہی ہے کہ وہ بھی نبیؐ پر زیادہ سے زیادہ درود و سلام بھیجیں نہ کہ اس کو ایذاء پہنچانے کی تدبیریں سوچیں۔

اس آیت سے کئی حقیقتیں سامنے آتی ہیں جو نگاہ میں رکھنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ جس نبیؐ کا مرتبہ اللہ اور اس کے فرشتوں کی نظروں میں یہ ہے کہ اللہ اس پر رحمت نازل فرماتا ہے اور فرشتے اس پر رحمت کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں، حیف ہے اگر انسانوں میں سے کچھ لوگ اس کے درپے آزار ہوں درآنحالیکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی احسان انسانوں ہی پر ہے نہ کہ خدا اور اس کے فرشتوں پر۔

دوسری یہ کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجتے ہیں وہ نبی صلعم پر کوئی احسان نہیں کرتے۔ بلکہ خدا اور اس کے فرشتوں کی ہمنوائی کر کے وہ اپنے کو سزاوارِ رحمت بناتے ہیں۔ جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق ہے جب آپ کو اللہ کی رحمت اور فرشتوں کی دعائیں حاصل ہیں تو وہ دوسروں کی دعاؤں کے محتاج نہیں ہیں۔

تیسری یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجنا مرضِ نفاق کا علاج ہے۔ اس لیے کہ یہاں جس محل میں اس کی ہدایت فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ منافقوں کی طرح نبی کو ایذاء پہنچانے کے بجائے اہلِ ایمان کو نبی پر درود بھیجنا چاہیے۔ اس سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ جو لوگ درود کا اہتمام رکھتے ہیں ان کے اندر نفاق راہ نہیں پاتا۔

چوتھی یہ کہ مقصود درود و سلام کی تکثیر ہے۔ موقع و محل بھی اس مفہوم کا متقاضی ہے اور آیت کے الفاظ بھی اسی کے شاہد ہیں۔ اس لیے کہ 'سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا' میں مصدر تاکید و تکثیر کے مفہوم پر دلیل ہے اس وجہ سے ہم ان فقہاء کی رائے کو صحیح نہیں سمجھتے جو کہتے ہیں کہ اگر عمر بھر میں ایک مرتبہ بھی کوئی درود پڑھ لے تو اس آیت کا حق ادا ہو جائے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا (۵۷)

رسول کو ایذاء پہنچانے والوں کا انجام

یہ ان لوگوں کا انجام بیان فرمایا جو اللہ کے رسول کی دل آزاری اور توہین کے مرتکب ہو رہے تھے۔ فرمایا کہ رسول کو ایذاء پہنچانا خود اللہ کو ایذاء پہنچانا ہے۔ رسول خدا کا محبوب اور اس کا نمائندہ ہوتا ہے اور خدا اور اس کے فرشتے اس پر رحمت بھیجتے ہیں تو جن کا رویہ اس کے خلاف ہو گا وہ لازماً

خدا اور اس کے فرشتوں کے مخالف اور خدا کو ایذاء پہنچانے والے ٹھہرے۔ ان کی اس حرکت کی پاداش میں ان پر دنیا اور آخرت دونوں میں اللہ کی لعنت ہے۔ یہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوں گے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب تیار ہے۔ یہ امر یہاں خاص طور پر ملحوظ رہے کہ ان کو آخرت کے عذاب سے پہلے اس دنیا میں بھی عذاب کی دھمکی دی گئی ہے۔ یہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جو رسولوں کے مخالفین کے لیے بیان ہو چکی ہے۔ اس کی وضاحت آگے آیات ۶۰-۶۱ میں آرہی ہے۔ یہ بعینہٖ وہی سزا ہے جو یہود کو دی گئی اور ان کا بھی اصلی جرم یہی تھا کہ انھوں نے اللہ کے رسولوں کو ایذا پہنچائی۔ اس کی مزید وضاحت ان شاء اللہ سورۂ صف کی تفسیر میں آئے گی۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا (۵۸)

مسلمانوں کی اخلاق ساکھ مجروح کرنے کے لیے منافقین کی مہم

اوپر کی آیات میں منافقین کا وہ رویہ زیر بحث آیا ہے جو انھوں نے خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اختیار کر رکھا تھا۔ اب یہ عام مومنین و مومنات کو متہم کرنے کے لیے جو شرارتیں کر رہے تھے وہ ان کی طرف اشارہ ہے۔ سورۂ نور کی تفسیر میں ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ ان منافقین کے دلوں پر یہ بات بہت شاق تھی کہ مسلمانوں کو دوسرے تمام گروہوں کے مقابل میں غیر معمولی اخلاقی برتری حاصل ہے جو ان کی دعوت کی مقبولیت میں بڑے اہم عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے حسد کے جنون میں اس کا توڑ یہ نکالا کہ مسلمان مردوں اور عورتوں کے خلاف بے سر و پا الزامات تراشیں اور لوگوں میں ان کو پھیلائیں تاکہ مسلمانوں کی اخلاق ساکھ مجروح اور ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہو۔ واقعۂ افک کی تفصیلات سورۂ نور کی تفسیر میں بیان ہو چکی ہیں۔ وہ فتنہ بھی اسی مقصد سے اٹھایا گیا تھا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کی اسی سعیٔ نامراد کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو لوگ مسلمان مردوں اور عورتوں کو جھوٹے الزامات میں ملوث کر رہے ہیں وہ صریح بہتان اور کھلے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی اس روش سے اگر یہ باز نہ آئے تو اس کا انجام دیکھیں گے!

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۵۹)

گھروں سے باہر نکلنے کی صورت میں پردے کے آداب

منافقین و اشرار کی ایذارسانیوں سے محفوظ کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو بھی اور عام مسلمان خواتین کو بھی یہ ہدایت کر دی گئی کہ جب انھیں کسی ضرورت سے گھروں سے باہر قدم نکالنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ اپنی بڑی چادروں کا کچھ حصہ اپنے چہروں پر لٹکا لیا کریں۔ اس طرح ان کے اور دوسری غیر مسلم عورتوں اور لونڈیوں کے درمیان امتیاز ہو جائے گا اور کسی کو ان سے تعرض کے لیے بہانہ ہاتھ نہیں آئے گا۔

سورۂ نور میں، یاد ہوگا، اعزہ و اقرباء سے متعلق یہ ہدایت دی گئی ہے کہ جب وہ اجازت کے بعد گھروں میں داخل ہوں گے تو گھر کی خواتین سمٹ سمٹا کر رہیں، اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ کریں اور اپنے

سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بُکل مار لیا کریں۔[۱] یہاں یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اپنی بڑی چادروں (جلابیب) کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں۔ اس کو اپنے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان بڑی چادروں سے گھونگٹ نکال لیا کریں۔ یہ واضح قرینہ اس بات کا ہے کہ یہ ہدایت اس صورت سے متعلق ہے جب عورتوں کو کسی ضرورت سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے۔ اس قرینہ کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ اس کا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ 'ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ' یہ اس بات کے قرین ہے کہ ان کا امتیاز ہو جائے اور ان سے تعرض نہ کیا جائے) ظاہر ہے کہ یہ مقصد باہر نکلنے ہی کی صورت میں مدنظر ہو سکتا ہے۔ اس کا دوسرا واضح قرینہ یہ ہے کہ یہاں لفظ 'خمار' نہیں بلکہ 'جلباب' استعمال ہوا ہے۔ 'جلباب' کی تشریح اہلِ لغت نے یوں کی ہے کہ 'ھو الرداء فوق الخمار'۔ 'جلباب' اس بڑی چادر کو کہتے ہیں جو اوڑھنی کے اوپر لی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بڑی چادر کے لینے کی ضرورت گھروں کے اندر نہیں پیش آتی تھی بلکہ شرفائے عرب کی خواتین اس وقت اس کو لیتی تھیں جب انھیں گھروں سے باہر نکلنے کی ضرورت پیش آتی۔ شعرائے جاہلیت کے کلام سے یہ بات ثابت ہے کہ شرفائے عرب میں 'جلباب' کا رواج تھا۔ یہاں بہت سے اشعار نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ قبیلۂ ہذیل کی ایک شاعرہ کا ایک شعر ہمارے دعوے کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔ وہ اپنے کسی مقتول کے مرثیہ میں کہتی ہے:

تمشی النسور الیہ وھی لاھیۃ مشی العذاری علیھن الجلابیب

اس شعر میں جو نادر تشبیہ ہے اس پر گفتگو کا تو یہاں محل نہیں ہے، بات دوسرے گوشوں میں نکل جائے گی۔ بس اتنی بات یاد رکھیے کہ زمانۂ جاہلیت میں سب 'متبرجات' اور 'بیگمات' ہی نہیں تھیں بلکہ شرفا کے خاندانوں کی بہوئیں بیٹیاں بھی تھیں جو باہر نکلنے کی صورت میں اپنی اوڑھنیوں کے اوپر 'جلباب' ڈالا کرتی تھیں۔ قرآن نے اس 'جلباب' سے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ مسلمان خواتین گھروں سے باہر نکلیں تو اس کا کچھ حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں تاکہ چہرہ بھی فی الجملہ ڈھک جائے اور انھیں چلنے پھرنے میں بھی زحمت پیش نہ آئے۔ یہی 'جلباب' ہے جو ہمارے دیہاتوں کی شریف بڑی بوڑھیوں میں اب بھی رائج ہے اور اسی نے فیشن کی ترقی سے اب برقع کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس برقعہ کو اس زمانے کے دلدادگانِ تہذیب اگر تہذیب کے خلاف قرار دیتے ہیں تو دیں لیکن قرآن مجید میں اس کا حکم نہایت واضح الفاظ میں موجود ہے جس کا انکار صرف وہی برخود غلط لوگ کر سکتے ہیں جو خدا اور رسول سے زیادہ مہذب ہونے کے مدعی ہوں۔

مسلمان خواتین کے لیے ایک علامتِ امتیاز

'ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ'۔ یہ مسلمان خواتین کے لیے ایک علامتِ امتیاز مقرر کر دی

---

[۱] وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (النور: ۳۱) (اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے بکل مار لیا کریں۔)

گئی تاکہ جہاں کہیں بھی وہ نکلیں ہر شخص ان کو دور ہی سے پہچان لے کہ یہ مسلمان خواتین ہیں اور تعرض کی جرأت نہ کرے اور اگر کرے تو اس کے عواقب دور تک سوچ کر کرے۔ اس زمانہ میں مدینہ میں غیر مسلم عورتیں بھی تھیں جن کے ہاں پردہ کی پابندیاں نہیں تھیں نیز لونڈیاں بھی تھیں جن کا معیارِ زندگی اور معیارِ اخلاق دونوں پست تھا اس وجہ سے شریر لوگوں کے لیے عذر کے مواقع بہت تھے۔ اگر وہ کسی مسلمان خاتون پر راہ چلتے کوئی فقرہ چست کرتے یا اس سے کوئی بات کرنے کی کوشش کرتے اور ان پر گرفت ہوتی تو وہ یہ جواب دے دیتے کہ ہم نے سمجھا کہ یہ فلاں کی لونڈی ہے، اور اس سے فلاں بات ہم نے معلوم کرنی چاہی تھی۔ اس علامتِ امتیاز کے قائم ہو جانے کے بعد اس قسم کے بہانوں کی راہ مسدود ہو گئی۔

ایک غلط فہمی

اس ٹکڑے سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ یہ ایک وقتی تدبیر تھی جو اشرار کے شر سے مسلمان خواتین کو محفوظ رکھنے کے لیے اختیار کی گئی اور اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اوّل تو احکام جتنے بھی نازل ہوئے ہیں سب محرکات کے تحت ہی نازل ہوئے ہیں لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ محرکات نہ ہوں تو وہ احکام کالعدم ہو جائیں، دوسرے یہ کہ جن حالات میں یہ حکم دیا گیا تھا کیا کوئی ذی ہوش یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس زمانے میں حالات کل کی نسبت ہزار درجہ زیادہ خراب ہیں البتہ حیا اور عفت کے وہ تصورات معدوم ہو گئے جن کی تعلیم قرآن نے دی تھی۔

'وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا' یہ فقرہ اس حکم تسہیل کے لیے ارشاد ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خواتین اپنی حد تک یہ احتیاط ملحوظ رکھیں۔ اگر اس کے باوجود کوئی بھول چوک ہو گئی تو اللہ غفور رحیم ہے۔

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۚ مَّلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا (۶۰-۶۱)

منافقین کو آخری تنبیہ

یہ ان اشرار و منافقین کو دھمکی دی ہے کہ اگر یہ اپنی ان شرارتوں سے باز نہ آئے تو ان کے باب میں چشم پوشی و مسامحت کا جو رویہ اب تک رہا ہے وہ یکسر بدل جائے گا اور ہم تم کو (خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے) ہر قدم پر ان کے محاسبہ و تعاقب کا حکم دے دیں گے۔ پھر ان کو اس شہر میں بہت کم رہنا نصیب ہوگا ـــ اس کے بعد جتنے دن بھی یہ یہاں جئیں گے ملعون ہو کر زندگی گزاریں گے۔ ہر قدم پر ان کی دار و گیر ہو گی۔ یہ پکڑے جائیں گے اور نہایت عبرت انگیز طریقوں سے قتل ہوں گے۔

'وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ' میں 'مرض' سے، جیسا کہ دوسرے محل میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے، حسد، کینہ اور بغض و عناد مراد ہے۔ منافقین کا یہ گروہ صرف ضعفِ عزم و ارادہ ہی کا مریض نہیں تھا بلکہ اس کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام اور مسلمانوں پر سخت حسد تھا۔ لیکن بزدلی کے سبب سے اس نے کفار کی طرح کھلم کھلا مخالفت کرنے کے بجائے مسلمانوں کے اندر گھس کر اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کیں۔

'الْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ' سے اشارہ منافقین کے اس گروہ کی طرف ہے جو مدینہ میں سنسنی پھیلانے اور بری افواہیں اڑانے میں نہایت شاطر تھا۔ ان افواہوں سے اس کا مقصد مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنا اور ان کی اخلاقی ساکھ کو گرانا ہوتا تھا۔ پیچھے جنگِ احزاب اور حضرت زیدؓ و حضرت زینبؓ کے معاملے میں اس گروہ کا جو کردار بیان ہوا ہے وہ اس 'اِرجاف' کی نہایت واضح مثال ہے۔ لغت میں 'اِرجاف' کے معنی لوگوں کے اندر اضطراب و بے چینی پھیلانے کے ارادے سے بری اور فتنہ انگیز خبروں کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ 'ارجاف' کے ماہرین صرف اسی دور کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ اس کے بڑے بڑے ائمہ ماضی میں بھی گزر چکے ہیں۔

'لَنُغْرِیَنَّکَ بِهِمْ' کے لغوی معنی تو یہ ہوں گے کہ ہم تم کو ان کے خلاف اکسا دیں گے، بھڑکا دیں گے، ابھار دیں گے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اب تک تو ہم نے تم کو ان کے معاملے میں عفو و صفح کی روش اختیار کرنے کی ہدایت کر رکھی ہے لیکن یہ اس کی قدر کرنے کے بجائے دن پر دن دلیر ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ اپنی اس شرارت سے باز نہ آئے تو ہم تم کو ان کی داروگیر کے احکام دے دیں گے جس کے بعد مدینہ کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہو جائے گی۔ اول تو ان کو تمہارے دامنِ امن میں پھٹکنا ہی بہت کم نصیب ہوگا اور اگر کچھ ہوگا بھی تو خدا کی لعنت اور پھٹکار کے ساتھ ہوگا۔ 'اَیْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا' اسی ملعونیت کی تصویر ہے۔ چنانچہ بعد کے ادوار میں ان منافقین کو اسی حشر سے سابقہ پیش آیا۔ ان میں سے جنھوں نے اپنی روش کی اصلاح نہیں کی ان کا انجام وہی ہوا جو قریش اور یہود کے اشرار کا ہوا۔ اس کی تفصیل سورۂ انفال اور سورۂ توبہ میں گزر چکی ہے۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا (۶۲)

یہ بعینہٖ وہی اسلوبِ کلام ہے جو آیت ۳۸ میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء کی مخالفت کرنے والے اس سے پہلے جو منافقین و کفار گزر چکے ہیں ان کے ساتھ بھی اللہ نے یہی معاملہ کیا تو اللہ کی اس سنت کو تم پیشِ نظر رکھو، یہی معاملہ اللہ تمہارے ان دشمنوں کے ساتھ بھی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

۱۳۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۶۳-۷۳

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں پہلے قیامت کی یاددہانی فرمائی ہے کہ مجرد اس بنا پر کہ اس کا وقت پیغمبر نہیں بتا سکتے یا لوگوں کے مطالبہ پر اس کو دکھا نہیں سکتے اس کو مذاق سمجھنا نہایت ناعاقبت اندیشانہ روش ہے۔ وہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کے ظہور کا وقت اگرچہ اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن وہ آکے رہے گی اور اس دن کوئی کسی کا حامی و شفیع نہ بن سکے گا بلکہ ہر شخص اپنے اعمال اور اپنی ذمہ داریوں

سے متعلق خود مسئول ہو گا۔ اس دن کسی کا یہ عذر نافع نہیں ہوگا کہ اس نے اپنے لیڈروں اور بڑوں کی پیروی کی اور انھوں نے اس کو گمراہ کیا۔

اس کے بعد مسلمانوں بالخصوص منافقین کو تنبیہ فرمائی ہے کہ اپنے رسول کے معاملے میں ایذا رسانی کی وہ روش نہ اختیار کرو جو یہود نے حضرت موسیٰؑ کو ایذا پہنچانے کے لیے اختیار کی ورنہ اس کا انجام وہی ہوگا جس سے یہود کو دوچار ہونا پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ہر الزام سے بری کیا اور ان کے مخالفین پر ہمیشہ کے لیے لعنت کردی۔ مسلمانوں کے لیے صحیح روش، جو دنیا و آخرت دونوں کی کامرانیوں کی ضامن ہے، یہ ہے کہ وہ رسولؐ کے ہر حکم پر 'سمعنا و اطعنا' کہیں۔

آخر میں یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنے عظیم شرف سے نوازا ہے کہ اس کو اپنی اس امانت کا امین بنایا ہے جس کا اہل آسمان و زمین میں اس نے صرف اسی کو ٹھہرایا۔ اس امانت کی ذمہ داریاں ادا کرنے ہی پر اس کے تمام شرف کا انحصار ہے۔ اگر وہ اس کا حق ادا کرے تو وہ فرشتوں کا مسجود ہے اور اگر حق نہ پہچانے تو پھر وہ اسفل سافلین کا سزاوار ہے۔ اس امانت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک دن وہ اس کی بابت مسئول ہو وہ اس کی سزا بھگتیں اور جنھوں نے اس کی نگہداشت کی ہو وہ اس کا صلہ پائیں ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۳-۷۳

يَسْـَٔلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۭ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَمَا
يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا ﴿۶۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ
وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ﴿۶۴﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا
وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۶۵﴾ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ
اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا
وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ﴿۶۷﴾ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ
الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ﴿۶۸﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا
كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ
وَجِيْهًا ﴿۶۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۷۰﴾

ع ۸ ۵

يُّصۡلِحۡ لَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ ؕ وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ فَقَدۡ فَازَ فَوۡزًا عَظِيۡمًا ﴿۷۱﴾ اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ﴿۷۲﴾ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ وَالۡمُشۡرِكٰتِ وَيَتُوۡبَ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۷۳﴾

ع ۹ ۵ ۶

ترجمۂ آیات ۶۳-۷۳

لوگ تم سے قیامت کے وقت کو پوچھتے ہیں۔ کہہ دو، اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے۔ اور تمھیں کیا پتہ، شاید قیامت قریب ہی آ لگی ہو۔ ۶۳

بے شک اللہ نے کافروں پر لعنت کر چھوڑی ہے اور ان کے لیے اس نے آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ وہاں نہ ان کا کوئی کارساز ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔ جس دن ان کے چہرے آگ میں اُلٹے پلٹے جائیں گے۔ وہ کہیں گے، اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی! اور کہیں گے، اے ہمارے رب! ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کی بات مانی تو انھوں نے ہماری راہ ماری۔ اے ہمارے رب! ان کو دونا عذاب دے اور ان پر بہت بھاری لعنت کر! ۶۴-۶۸

اے ایمان والو، ان لوگوں کے مانند نہ بنو جنھوں نے موسیٰ کو ایذا پہنچائی تو اللہ نے اس کو ان لوگوں کی تہمتوں سے بری کیا اور وہ اللہ کے نزدیک با وقار ٹھہرا۔ اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو، اللہ تمھارے اعمال سدھارے گا اور تمھارے گناہوں کو بخشے گا اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہیں گے تو انھوں نے بہت بڑی

کامیابی حاصل کی۔ ۶۹-۷۱

اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے۔ تاکہ اللہ منافقین و منافقات اور مشرکین و مشرکات کو سزا دے اور مومنین و مومنات کو اپنی رحمت سے نوازے، اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۷۲-۷۳

۴- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَسْئَلُكَ النَّاسُ عَنِ السَّاعَةِ ۖ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا (۶۳)

قیامت ایک حقیقت ہے اگرچہ اس کا وقت معلوم نہیں۔

یعنی ان اشرار و مفسدین کو جب قیامت سے ڈرایا جاتا ہے تو یہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں کہ ہم نہ جانے کب سے اس کا ڈراوا سن رہے ہیں لیکن نہ وہ آئی، نہ کبھی آئے گی۔ اگر اس کو آنا ہے تو آخر وہ آ کیوں نہیں جاتی؛ اس کے آنے کا وقت کب آئے گا! مطلب یہ ہے کہ یہ محض ایک دھونس ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اور ہم اس دھونس میں آنے والے نہیں ہیں۔

'قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ' فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ جہاں تک اس کے آنے کے وقت کا تعلق ہے اس کا علم تو بس اللہ ہی کو ہے۔ کائنات کے اس بھید کو صرف خدا ہی جانتا ہے۔ نہ اس کو میں جانتا ہوں اور نہ کسی اور کو اس کا علم ہے۔ البتہ اس کا آنا یقینی ہے، جس سے میں تمھیں آگاہ کر رہا ہوں۔ اگر میں اس کا وقت نہیں بتا سکتا تو اس سے اس کی نفی نہیں ہو سکتی۔ دوسرے مقام میں اس بات کی وضاحت اس طرح فرما دی کہ کسی چیز کے ظہور کا وقت نہ معلوم ہونے سے نفس اس شے کا انکار ایک احمقانہ منطق ہے۔ قیامت تو درکنار ہماری روزمرہ کی زندگی کی کتنی عامۃ الورود حقیقتیں ہیں جن کا وقت اگرچہ معلوم نہیں ہوتا لیکن کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کرتا۔ انسان کے علم کی رسائی بہت محدود ہے۔ وہ ہر چیز کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے اندر قیامت کی شہادت موجود ہے تو مجرد اس بنا پر اس کا مذاق اڑانا کہ اس کا وقت نہیں بتایا جا سکتا، محض ابلہی و خود فریبی ہے۔

'وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا' یہ اسلوبِ کلام کسی شے کی عظمت، اہمیت اور اس کی

ہونا ہی کو ظاہر کرتا ہے۔ مخالفین کے سوال میں جو طنز و استہزاء مضمر ہے یہ اس کا جواب ہے کہ مجرد اس بنا پر کہ تم قیامت کا وقت نہیں بتا سکتے لوگ تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں، تمہیں کیا خبر، شاید وہ قریب ہی آ لگی ہو! — اس فقرے میں یہ بھی اشارہ فرما دیا گیا کہ اب اس کے ظہور میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور قیامت کا مذاق اڑانے والوں کے لیے نہایت سخت انذار و تنبیہ ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی ہیں اس وجہ سے آپ کی بعثت کے بعد دنیا کی عدالت کے لیے آخری مرحلہ اب قیامت ہی کا باقی رہ گیا۔ اس پر مفصل بحث اس کے محل میں ان شاء اللہ آئے گی۔

اِنَّ اللّٰہَ لَعَنَ الْکٰفِرِیْنَ وَاَعَدَّ لَہُمْ سَعِیْرًا ۙ خٰلِدِیْنَ فِیْہَآ اَبَدًا ۚ لَا یَجِدُوْنَ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا (۶۴-۶۵)

منکرین قیامت کو انذار

اوپر کی آیت میں جو انذار مضمر تھا یہ اس کو کھول دیا کہ آج جو لوگ قیامت کا انکار کر رہے ہیں وہ کان کھول کر سن لیں کہ اللہ نے ان پر لعنت کر دی ہے اور ان کے لیے اس نے دوزخ کا عذاب تیار کر رکھا ہے جس میں ان کو ہمیشہ رہنا ہے اور اس میں کوئی ان کا کارساز و مددگار نہ بن سکے گا۔ نہ ان کے وہ شرکاء و شفعاء ان کے کچھ کام آنے والے نہیں گے جن کے اعتماد پر وہ پختنت بیٹھے ہیں اور نہ ان کی یہ جماعت و جمعیت ہی ان کی کچھ مدد کر سکے گی جس پر اس دنیا میں ان کو بڑا ناز ہے۔

یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْہُہُمْ فِی النَّارِ یَقُوْلُوْنَ یٰلَیْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰہَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ۝ وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَکُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا ۝ رَبَّنَآ اٰتِہِمْ ضِعْفَیْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْہُمْ لَعْنًا کَبِیْرًا (۶۶-۶۸)

'تَقْلِیْبُ' کے معنی الٹنے پلٹنے کے ہیں۔ گوشت کو آگ پر بھونتے ہیں تو اس کو کبھی ایک جانب سے بھونتے ہیں کبھی دوسری جانب سے۔ فرمایا کہ یہی گت ان کی بننے والی ہے۔ یہ دوزخ کی آگ میں اپنے چہروں کے بل اس طرح گھسیٹے جائیں گے کہ دونوں طرف سے ان کے چہرے بھن جائیں گے۔ چہرے کا ذکر خاص طور پر اس وجہ سے فرمایا کہ اعترافِ حق سے اعراض و استکبار کی رعونت کا سب سے زیادہ نمایاں مظہر وہی ہوتا ہے جب اس کا حشر یہ ہونا ہے تو دوسری چیزیں اسی کے توابع میں داخل ہیں۔ فرمایا کہ آج جس قیامت کا یہ مذاق اڑا رہے ہیں جب اس طرح اس کی حقیقت ان کے لیے بے نقاب ہوئی تب وہ نہایت حسرت کے ساتھ یہ تمنا کریں گے کہ اے کاش! ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی اور اپنے لیڈروں اور بڑوں کے چکمے میں آ کر اپنے لیے یہ شامت نہ بلائی ہوتی! اس دن یہ کھلم کھلا اپنی گمراہی کی ساری ذمہ داری اپنے لیڈروں اور بزرگوں پر ڈالیں گے کہ ہم نے ان کی بات مانی اور انھوں نے صحیح راہ سے ہم کو بھٹکایا اور خدا سے یہ درخواست کریں گے کہ اے رب! چونکہ یہی ہماری گمراہی کے باعث ہوئے ہیں اس وجہ سے تو ان کو ہمارے مقابل میں دونا عذاب دے اور جو لعنت ان کے سبب سے ہم پر ہوئی ہے اس سے بڑی

لعنت کران پر کر۔ یہاں صرف ان لوگوں کی درخواست کا حوالہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس درخواست کا جو جواب دے گا اس کا ذکر سورۂ اعراف آیت ۳۸ میں آیا ہے کہ لِكُلٍّ ضِعْفٌ' تم اور تمہارے لیڈر دونوں ہی دونے عذاب کے سزاوار ہو۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

کسی کی تقلید آنکھ بند کر کے جائز نہیں

یہاں 'سَادَتَنَا' اور 'كُبَرَآءَنَا' کے دو لفظ آئے ہیں۔ 'سادۃ' سے مراد تو ظاہر ہے کہ لیڈر اور سردار ہیں اور 'کبرآء' سے مراد ان کے خاندانی و مذہبی پیشوا ہیں۔ ان میں سے کسی کی بھی آنکھ بند کر کے اطاعت کرنا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کو حق و باطل میں امتیاز کے لیے عقل عطا فرمائی ہے۔ اس وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اس کسوٹی سے کام لے۔ جو اس سے کام لے گا اگر وہ کہیں ٹھوکر بھی کھائے گا تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو سہارا دے اور معاف فرمائے لیکن جو شخص آنکھیں بند کر کے اپنی باگ دوسروں کے ہاتھ میں پکڑا دے گا اس کا حشر وہی ہو گا جو اس آیت میں بیان ہوا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَىٰ فَبَرَّأَهُ اللَّهُ مِمَّا قَالُوا ۚ وَكَانَ عِنْدَ اللَّهِ وَجِيهًا (۶۹)

انبیاء کو ایذا پہنچانا یہود کی سنت ہے

قیامت کا ذکر بیچ میں تذکیر و تنبیہ کے طور پر آگیا تھا اوپر سے ذکر ان منافقین کا چل رہا تھا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین و مومنات کو اپنی ریشہ دوانیوں اور تہمت تراشیوں سے روحانی و قلبی اذیتیں پہنچانے میں سرگرم تھے۔ اس تنبیہ کے بعد اسی مضمون کو از سر نو لے لیا اور مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ ان یہودیوں کی روش کی تقلید نہ کرو جنھوں نے قدم قدم پر حضرت موسیٰؑ کو اپنی تہمتوں، شکایتوں اور در پردہ سازشوں سے اذیتیں پہنچائیں لیکن اللہ نے ان کو ہر الزام و تہمت سے بری، نہایت عزت و آبرو کے ساتھ، اس دنیا سے اٹھایا البتہ وہ لوگ دنیا اور آخرت دونوں میں ذلیل و خوار ہوئے جنھوں نے ان کو ایذا پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن خاص طور پر منافقین کی طرف ہے۔

یہود کے ایذا کی بعض مثالیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل نے جو اذیتیں پہنچائی ہیں اس کا شکوہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی بھی قرآن مجید میں مذکور ہے۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ لِمَ تُؤْذُونَنِي وَقَدْ تَعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ (الصف ۶۱ - ۵)	اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میری قوم کے لوگو، تم مجھے کیوں دکھ پہنچاتے ہو درآنحالیکہ تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں۔

تورات کی کتاب تثنیہ باب ۹ میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے جب بنی اسرائیل کو فلسطین پر چڑھائی کے لیے ابھارا اور انھوں نے اپنی روایت کے مطابق بزدلی دکھائی تو حضرت موسیٰؑ نے ان کو ان الفاظ میں ملامت کی۔

"تو (خطاب بنی اسرائیل سے ہے) اس بات کو یاد رکھ اور کبھی نہ بھول کہ تو نے خداوند اپنے خدا کو بیابان میں کس کس طرح غصہ دلایا بلکہ جب سے تم ملک مصر سے نکلے ہو تب سے اس جگہ پہنچنے تک تم برابر خداوند سے

بغاوت ہی کرتے رہے ہوں۔

تورات میں بار بار اس بات کا ذکر آتا ہے کہ بنی اسرائیل کو جب کوئی آزمائش پیش آتی تو وہ اس کا الزام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ڈال کر ان کو ہدفِ ملامت بناتے۔ مثال کے طور پر ہم یہاں بعض واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مصر میں حضرت موسیٰ کی دعوت کے بعد جب بنی اسرائیل کو آزمائشوں سے سابقہ پیش آیا تو انھوں نے ان سب کا سبب حضرت موسیٰ کو ٹھہرایا اور کہا کہ اس شخص کی بدولت ہم اس کی پیدائش سے پہلے بھی آفتوں میں مبتلا رہے اور اس کی پیدائش کے بعد بھی ہدفِ مصائب رہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب ان کو ملکِ مصر سے لے کر نکلے اور مصریوں نے ان کا تعاقب کیا تو ساری قوم نے بڑبڑانا شروع کیا کہ یہ دیکھو، اس شخص نے ہمیں کہاں لا کر ہمارے مروانے کا سامان کیا ہے۔

دریا پار کرنے کے بعد جب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر تورات لینے گئے تو قوم کے ایک بہت بڑے حصہ نے یہ کہنا شروع کیا کہ یہ شخص تو ہمیں یہاں چھوڑ کر معلوم نہیں کہاں غائب ہو گیا اور اب وہ آنے والا نہیں ہے۔ چنانچہ انھوں نے سامری سے ایک بچھڑا بنوایا اور اس کی پرستش شروع کر دی۔

قارون نے اپنی ایک پارٹی بنائی اور لوگوں میں یہ فتنہ پھیلایا کہ یہ شخص (حضرت موسیٰ) تنہا سارے دین کے جاننے اور لوگوں کی پیشوائی کا اجارہ دار بن بیٹھا ہے حالانکہ خداوند کی نظر میں سب برابر ہیں۔ اس شخص کو ہم پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے۔

بیابان کی زندگی کے دور میں جب کھانے پینے کی تکلیف ہوئی تو انھوں نے علانیہ حضرت موسیٰ کو ملامت کی کہ کیا مصر میں ہمارے لیے قبروں کی جگہ نہیں تھی کہ تو نے ہمیں بھوک پیاس سے مرنے کے لیے یہاں بیابان میں لا کر ڈال دیا ہے۔

بیابان میں جب کھانے کے لیے منّ و سلویٰ اور پانی کے لیے اکٹھے بارہ چشموں کا انتظام ہو گیا تو انھوں نے پھر بڑبڑانا شروع کیا کہ اس منّ و سلویٰ سے تو ہماری جان سوکھ گئی، ہمیں تو مصر کے کھیرے، ککڑیاں اور لہسن پیاز یاد آتے ہیں۔

حضرت موسیٰ نے جب ان کو فلسطین پر حملہ کرنے کے لیے ابھارا تو انھوں نے کہا کہ تم وہاں کے زور آور اور جبار باشندوں کی تلواروں سے ہمارا قیمہ کرانا چاہتے ہو۔ ہم اس کے لیے تیار نہیں ہیں۔ لڑنا ہے تو تم اور تمہارا خداوند دونوں جا کر لڑو۔ ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

بنی اسرائیل کی اس روش پر حضرت موسیٰ نے جن دردانگیز الفاظ میں بار بار اپنے رنج و غم کا اظہار فرمایا ہے ان کو تورات میں پڑھیے تو کچھ اندازہ ہو گا کہ انھیں اپنی قوم کے ہاتھوں کیا کیا دکھ جھیلنے پڑے ہیں۔

بنی اسرائیل کی اسی طرح کی ایذا رسانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں مسلمانوں کو نصیحت فرمائی ہے کہ تم اپنے

رسول کے ساتھ اس طرح کا معاملہ نہ کرو جس طرح کا معاملہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کیا ورنہ اسی انجام سے دوچار ہوگے جس انجام سے وہ دوچار ہوئے۔

'فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا' یعنی اللہ تعالیٰ نے بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہر الزام سے بری کیا۔ ہر تہمت کے مقابل میں ان کی سچائی، نیک نیتی اور راست بازی آشکارا ہوئی اور ان کے دشمن ذلیل و رسوا ہوئے۔ وہ اللہ کے نزدیک باوقار، باآبرو اور سُرخ رُو ٹھہرے۔ ان کی وجاہت دنیا میں بھی چمکی اور آخرت میں بھی روشن ہوگی۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بالواسطہ بشارت ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۙ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا (۷۰-۷۱)

صحیح روش جو ایمان کا تقاضا ہے

یہود کی روش سے احتراز کرنے کی ہدایت کے بعد اس صحیح روش کے اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی جو اللہ اور رسول پر ایمان کا تقاضا ہے۔ فرمایا کہ اللہ سے ڈرو۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچانے والے نہ بنو۔ وہ مجرموں کو پکڑتا دیر میں ہے لیکن جب پکڑتا ہے تو کوئی اس کی پکڑ سے نہ بھاگ سکتا ہے، نہ کوئی اس سے رہائی دلا سکتا ہے۔

'وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا' یعنی ایمان لانے کے مدعی بنے ہو تو وہ بات کہو جو اس ایمان کا براہِ راست تقاضا ہے اور اس کا سیدھا سادہ لازمی مطالبہ ہے۔ یہ اشارہ 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کے اعتراف و اقرار کی طرف ہے۔ اسی اقرار سے ایمان کی تصدیق ہوتی ہے اور آگے کے لیے ہدایت کی راہیں کھلتی ہیں۔ اس میں یہود کے قول 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' پر ایک لطیف تعریض بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہود کی بات بالکل الٹی تھی۔ وہ ایمان کے مدعی تھے لیکن ان کا کلمہ گویا 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' (ہم نے سنا اور نافرمانی کی) تھا۔ تم ایمان کی سیدھی روش اختیار کرنا چاہتے ہو تو اپنا کلمہ اور شعار 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' (ہم نے سنا اور مانا) بناؤ۔

صحیح روش اختیار کرنے کا ثمرہ

'يُصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ' یہ اس 'قول سدید' کا ثمرہ بتایا ہے کہ اگر تم اپنے قول و عمل کے تضاد کو دور کرلو گے تو اللہ تمہارے اعمال کو برومند کرے گا، تمہاری ہر کل سیدھی ہوجائے گی اور تمہارا ہر قدم صحیح سمت میں اٹھے گا۔ اس صورت میں اگر تم سے کوئی غلطی بھی صادر ہوگی تو اللہ تعالیٰ تمہاری غلطیوں سے درگزر فرمائے گا۔ اللہ ان لوگوں کو نفس اور شیطان کے حوالے نہیں کرتا جو سیدھی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

'وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا' اس ٹکڑے نے کلام کے تدریجی ارتقاء کے اصول پر واضح کر دیا کہ 'قول سدید' سے مراد 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا اقرار ہی ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ سمع و طاعت کا اقرار کرنے کے بعد زندگی کے ہر مرحلے میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں

وہ بہت بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ یہ ابدی بادشاہی کی کلید ہے تو جس کو بازی جیتنی ہو وہ جیتے۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (۷۲-۷۳)

انسان کا اصلی شرف

اب یہ انسان کا اصلی شرف واضح فرمایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عہدِ اطاعت کا امین ہے۔ یہ عہد، اختیار و ارادہ کی آزادی پر مبنی ہے اس وجہ سے وہی اس کا سزاوار ٹھہرا۔ اس لیے کہ عہد کا اہل وہی ہوتا ہے جس کو اختیار و ارادہ کی آزادی حاصل ہو۔ جو مخلوقات مجبور و مقہور ہیں ان سے کسی عہد و میثاق کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ نے تمام ذریتِ آدم سے لیا ہے اور یہی عہد اس خلافت کی بنیاد ہے جو اس زمین میں آدمؑ اور ذریتِ آدم کو حاصل ہوئی اور اسی خلافت کے مقتضیات کو بروئے کار لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے اپنی ہدایت اور کتاب و شریعت نازل کرنے کا وعدہ فرمایا اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرمائی کہ جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے وہ جنت کے وارث ٹھہریں گے اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے وہ سب جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی وعدے کو پورا کرنے کے لیے اپنے نبی و رسول بھیجے جنھوں نے اپنی اپنی امتوں سے اس عہدِ اطاعت و بندگی کی تجدید کرائی اور اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس کے نتائج سے آگاہ کیا۔

اس عہد کی بنیاد چونکہ انسان کے ارادہ کی آزادی پر ہے اس وجہ سے اس کی حیثیت شمشیرِ دو دم کی ہے۔ اگر انسان اپنے ارادہ کی آزادی کے ساتھ اپنے رب کی بندگی کے عہد کو پورا کرے تو اللہ کے نزدیک اس سے کوئی اونچا نہیں اور اگر وہ اس عہد کو پورا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے خدا کی بخشی ہوئی سب سے بڑی عزت کو اپنے لیے سب سے بڑی ذلت بنا لیا۔

• ہر عہد ایک امانت ہے اور ہر امانت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اس کی بابت امانت رکھنے والا ایک دن پرسش کرے کہ اس کی امانت کا حق ادا کیا گیا ہے یا اس میں خیانت کی گئی ہے۔ یہ چیز ایک روزِ جزاء و سزا کو مستلزم ہوئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ایک دن سب کو اکٹھا کرے گا اور ان کے اعمال کے ریکارڈ ان کے سامنے رکھ کر فیصلہ فرمائے گا کہ کون کون افراد منافق ہیں جو دوزخ کے سزاوار ہیں اور کون مومن و مخلص ہیں جو جنت کے حق دار ہیں۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اطاعت بالاختیار کی یہ امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے سامنے بھی پیش کی تھی لیکن وہ اس عظیم ذمہ داری کے اٹھانے سے ڈرے اور اپنی معذرت پیش کر دی کہ ان

کو اس بارِ گراں سے معاف رکھا جائے۔ آسمانوں وزمین اور پہاڑوں کی یہ معذرت زبانِ حال سے بھی ہو سکتی ہے اور زبانِ قال سے بھی۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کی زبانِ حال وقال دونوں سمجھتا ہے۔ قرآن میں اس بات کی تصریح ہے کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے لیکن ان کی تسبیح کو صرف اللہ تعالیٰ ہی سمجھتا ہے، دوسرے اس کو نہیں سمجھتے۔

اسی طرح ہر ذمہ داری کے تحمل کے لیے ایک خاص صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ اگر وہ صلاحیت موجود نہ ہو تو اس کا تحمل ممکن نہیں ہے۔ آپ ہر زمین میں ہر چیز کی کاشت نہیں کر سکتے۔ زمین کا ایک معمولی ٹکڑا آپ کے ایک تخم کا امین بن جاتا ہے اور وہ آپ کی امانت کو نہ صرف محفوظ رکھتا ہے بلکہ اس کو نشوونما اور فروغ دیتا ہے۔ لیکن وہی تخم اگر آپ ایک وسیع سمندر، ایک عظیم پہاڑ یا ایک لق و دق صحرا میں ڈال دیں تو وہ اس کو نشوونما نہیں دے سکتے بلکہ وہ تخم ضائع جائے گا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر کسی چیز کے اندر ایک چیز کے قبول کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو وہ اس سے لازماً ابا کرے گی۔ مثلاً ہماری آنکھ ایک خاص درجے کی روشنی کا تحمل کر سکتی ہے، اگر روشنی کی مقدار اس سے بڑھ جائے تو نگاہ خیرہ ہو جائے گی۔ اسی طرح ہمارا جسم ایک خاص درجے کی حرارت یا برودت برداشت کر سکتا ہے، اگر حرارت یا برودت اس سے زیادہ ہو جائے تو ہمارا جسم اس کو قبول کرنے سے ابا بھی کرے گا اور اس سے ڈرے گا بھی۔ ہمارے معدے میں خاص طرح کی چیزوں کے قبول کرنے کی صلاحیت ہے، اگر ہم ان کے سوا کوئی دوسری چیز اس میں ڈالنے کی کوشش کریں تو، خواہ بجائے خود وہ کتنی ہی قیمتی چیز ہو، معدہ اس کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ یہی حال آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کا اس امانت کے معاملے میں ہوا۔ ان کے اندر اس کے اٹھانے کا ظرف نہیں تھا اس وجہ سے انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا۔

'وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ' یہ انسان کا شرف بیان ہوا ہے کہ جس بارِ امانت کو آسمان وزمین، دریا اور پہاڑ نہ اٹھا سکے اس کو انسان نے اٹھا لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان اگرچہ اپنے وجودِ مادی کے اعتبار سے اس کائنات کی ایک نہایت حقیر ہستی ہے لیکن اپنی معنوی صلاحیتوں کے اعتبار سے آسمانوں سے اونچا، زمین سے وسیع اور پہاڑوں سے زیادہ مضبوط وسربلند ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز اس کے لیے مسخر کی گئی لیکن وہ کسی کے لیے بھی مسخر نہیں کیا گیا، بلکہ ربِّ کائنات کے سوا کسی کے آگے اُس کا جھکنا اس کے لیے باعثِ ننگ قرار پایا۔

'اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا' یہ انسان کی اس صلاحیت کی طرف اشارہ ہے جس کی بنا پر وہ اس امانت کا اہل قرار پایا۔ وہ یہ ہے کہ یہ امانت مقتضی تھی کہ انسان کے اندر متضاد داعیے موجود ہوں تاکہ اس کی آزمائش ہو سکے کہ وہ ان متضاد داعیوں کی کشاکش کے اندر اپنے رب کی اطاعت بالاختیار کے عہد کو کس طرح نباہتا اور اس کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ 'ظلوم' و 'جہول' بنایا گیا۔

'ظلم' عدل وحق کا ضد ہے اور 'جہل' علم اور حلم کا ضد ہے۔ 'ظلوم' اس کو کہیں گے جو عدل وحق کا شعور رکھتے ہوئے ظلم کا مرتکب ہونے والا ہو۔ اسی طرح 'جہول' اس کو کہیں گے جو علم وحلم کی صلاحیت کے باوصف جہل اور جذبات سے مغلوب ہوجانے والا ہو۔ یہی کشاکش انسان کی آزمائش ہے اور یہی اس کے تمام شرف کی بنیاد ہے۔ اگر وہ ظلم کی راہ اختیار کرنے کی آزادی رکھنے کے باوجود محض اپنے رب کی رضا کی خاطر عدل کی راہ پر استوار رہتا ہے اور اپنے سفلی جذبات کے اتباع کی آزادی کے باوجود، محض اپنے رب کے خوف سے، اپنے جذبات پر قابو رکھتا ہے تو لاریب اس کا مرتبہ فرشتوں سے بھی اونچا ہوا اس لیے کہ ان کو خدا کی بندگی کی راہ میں کسی کشمکش سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ ان کا راستہ بالکل ہموار اور ان کا مزاج ظلم وجہل کے دواعی سے بالکل ناآشنا ہے لیکن انسان اگر بندگی کرتا ہے تو ہر قدم پر وہ اپنے نفس اور شیطان سے لڑ کر کرتا ہے اس وجہ سے اس کی بندگی فرشتوں کی بندگی سے اونچی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس انسان اپنے اس اختیار کے سبب سے جس طرح سب سے زیادہ اونچا ہے اسی طرح وہ سب سے زیادہ نیچا بھی ہوجائے گا اگر وہ اپنے اس اختیار کی ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا نہ کرسکے۔ یہی حقیقت سورۂ تین میں اس طرح واضح فرمائی گئی ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ	اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا،
تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰـهُ اَسْفَلَ	پھر اس کو اسفل سافلین میں گرا دیا البتہ وہ لوگ
سٰفِلِیْنَ ۙ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ	اس سے محفوظ رہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۴-۶)	نیک اعمال کیے۔

لِّیُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِیْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِیْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَیَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ یہ نتیجہ بیان ہوا ہے اس امانت کا کہ اس کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں انسان اس امانت سے متعلق مسئول ہو کہ اس نے اس کا حق ادا کیا یا نہیں۔ تاکہ وہ لوگ جنھوں نے اس کے معاملے میں منافقت کی روش اختیار کی ہو یا شرک کے مرتکب ہوئے ہوں وہ اپنی اس خیانت و بدعہدی کی سزا بھگتیں، خواہ مرد ہوں یا عورتیں اور وہ لوگ جنھوں نے رسوخ ایمان کے ساتھ اس کا حق ادا کیا ہو وہ اپنے رب کی رحمت کے سزاوار ٹھہریں، عام اس سے کہ وہ مردوں میں سے ہوں یا عورتوں میں سے۔

حاملِ امانت ہونے کا لازمی نتیجہ

ہم دوسرے مقام میں یہ وضاحت کرچکے ہیں کہ 'توبہ' کا صلہ جب 'علیٰ' کے ساتھ آتا ہے تو یہ 'رحم' کے مفہوم پر بھی متضمن ہوجاتا ہے۔ اس وجہ سے یہ اہلِ ایمان کے لیے بشارت ہے کہ ہرچند یہ ذمہ داری ہے تو بہت بھاری لیکن اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اس نے اپنے باایمان بندوں اور بندیوں کے لیے توبہ کی راہ بھی کھلی رکھی ہے۔ اگر وہ اپنی کسی کمزوری کے سبب سے کسی ظلم یا جہل کے مرتکب ہوں گے

اور پھر توبہ کرلیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرکے ان پر رحم فرمائے گا۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ یہ سورہ قرآن حکیم کی مشکل سورتوں میں سے ہے اور میں اس پر قلم اٹھانے سے گھبراتا رہا ہوں۔ اگرچہ اس کی مشکلات، اپنے علم کے حد تک، میں نے بہت پہلے حل کر لی تھیں لیکن یہ تردد برابر دامن گیر رہا کہ دل و دماغ میں جو کچھ ہے قلم اس کو ادا بھی کر سکے گا یا نہیں۔ اب یہ فیصلہ تو کتاب کے صاحب نظر قارئین کر سکیں گے کہ میں مشکلات سے عہدہ برآ ہو سکا یا نہیں اور ہو سکا تو کس حد تک لیکن میں نے کوشش بہت کی ہے۔ میری خواہش تھی کہ ابھی اس پر مزید غور و فکر جاری رکھوں، لیکن اب اس امانت کے ادا کرنے کا آخری وقت آچکا تھا اس وجہ سے جو کچھ ذہن میں تھا اس کو سپرد قرطاس کر دیا ہے۔ جو باتیں صحیح معلوم ہوں ان کو قبول کیجیے اور جہاں کوئی لغزش محسوس ہو اس کو نظر انداز فرمائیے۔ انسان بہرحال ظلوم و جہول ہے۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، اس سے التجا ہے کہ غلطیوں سے درگزر فرمائے۔ وآخر دعونا ان الحمد للہ رب العلمین۔

رحمان آباد ——— ۱۷رشوال ۱۳۹۴ھ

۳رنومبر ۱۹۷۴ء

اتوار ——— ۹ بجے صبح

تدبرِ قرآن

۳۴

سبا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورتوں کا پانچواں گروپ

سورۂ سبا سے سورتوں کا پانچواں گروپ شروع ہو رہا ہے جو سورۂ حجرات پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں ۱۲ سورتیں ـــــ از سبا تا الاحقاف ـــــ مکی ہیں۔ آخر میں تین سورتیں ـــــ محمد، الفتح، الحجرات ـــــ مدنی ہیں۔

ب۔ گروپ کا جامع عمود

مطالب اگرچہ اس گروپ میں بھی مشترک ہیں یعنی قرآنی دعوت کی تینوں اساسات ـــــ توحید، قیامت، رسالت ـــــ پر جس طرح پچھلے گروپوں میں بحث ہوئی ہے اسی طرح اس میں بھی یہ تمام مطالب زیر بحث آئے ہیں! البتہ نہج استدلال اور اسلوب بیان مختلف اور جامع عمود اس کا اثباتِ توحید ہے جو اس مجموعہ کی تمام سورتوں میں نمایاں نظر آئے گا۔ دوسرے مطالب اسی کے تحت اور اسی کے تضمنات کی وضاحت کے طور پر آئے ہیں۔

ج۔ سورۂ سبا کا عمود اور اس کے مطالب کا تجزیہ

اس گروپ کی پہلی سورہ، سورۂ سبا ہے۔ اس کا عمود اثباتِ توحید و قیامت ہے۔ بنیاد اس کی شکر اور اس کے تقتضیات پر ہے اور مخاطب مُترفینِ قریش ہیں۔ ذیل میں ہم بالاجمال اس کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں جس سے اس کے تمام اجزاء کا ربط عمود کے ساتھ واضح ہو جائے گا۔

(۱-۹) تمہید، جس میں اللہ تعالیٰ ہی کے سزاوارِ شکر ہونے کی دعوت ہے۔ اس لیے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور آخرت میں بھی تمام اختیار و اقتدار اسی کا ہوگا۔ اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس وجہ سے نہ کسی کا کوئی عمل اس سے مخفی رہے گا، نہ کوئی کسی کو اپنی باطل سفارش سے چھڑا سکے گا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت نہیں ہے وہ سخت گمراہی میں ہیں۔ آخرت ایک حقیقت اور خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے۔ جن کے اندر علم کی رمق ہے وہ جانتے ہیں کہ قرآن جس توحید و قیامت کی دعوت دے رہا ہے وہ بالکل حق ہے، صرف بے فکرے اور لاابالی لوگ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ان کی اصلی بیماری یہ ہے کہ انابت اور عبرت پذیری کی صلاحیت ان کے اندر مفقود

ہے۔ اگر یہ صلاحیت ان کے اندر ہوتی تو وہ دیکھ لیتے کہ خدا ان کو جب چاہے اور جہاں سے چاہے پکڑ سکتا ہے۔

(۱۰-۱۴) حریفِ قریش کی تنبیہ کے لیے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی مثال کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تمام نعمتیں عطا فرمائیں لیکن وہ غرور واستکبار میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ اپنے رب کے شکر گزار وفرمانبردار رہے۔ انھوں نے دنیا کے فتنہ میں مبتلا ہوکر شیاطین کی پیروی نہیں کی بلکہ شیاطین سے بھی اپنی پیروی کرائی۔ جو اپنے رب کی فرمانبرداری کرتے ہیں اللہ تعالیٰ شیاطین کو بھی ان کی غلامی میں دے دیتا ہے اور جو اپنے رب کی ناشکری کرتے ہیں شیاطین ان پر مسلط ہو جاتے ہیں اور ان کو شیاطین کی غلامی کرنی پڑتی ہے۔

(۱۵-۲۱) ملکِ سبا کی مثال جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خدا کی نعمتیں پاکر جو قومیں خدا کی ناشکر گزاری کے بجائے طغیان و فساد میں مبتلا ہو جاتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو نہایت عبرت انگیز سزا دیا کرتا ہے۔ اہلِ سبا نے اپنے بارے میں ابلیس کے گمان کو سچا ثابت کر دیا جس کی پاداش میں اللہ نے ان کو اپنے تمام افضال سے محروم کرکے ایک افسانۂ پارینہ بنا دیا۔

(۲۲-۲۷) شرک، شرکا اور شفاعتِ باطل کے عقیدے کی تردید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کہ اگر یہ مشرکین بے دلیل، محض اپنی انانیت کے غرور میں، اپنی ضد پر اڑے رہنا چاہتے ہیں تو ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو، تم نے اپنی دعوت پہنچا دی۔ اب ان کا فیصلہ اللہ کرے گا۔ وہ ہر چیز سے باخبر اور ہر معاملے کا دوٹوک فیصلہ کرنے والا ہے۔

(۲۸-۳۳) مخالفین کے اس معارضہ کا جواب کہ ہم اس وقت تک اس قرآن کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک وہ عذاب نہ دکھا دیا جائے جس کی ہم کو دھمکی دی جا رہی ہے۔

(۳۴-۳۹) منکرین کے اصل سببِ انکار کی طرف اشارہ کہ ان کو اس دنیا میں جو مال و جاہ حاصل ہے اس کو وہ خدا کے منظورِ نظر ہونے کی دلیل بنائے بیٹھے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جس طرح اس دنیا میں وہ کامیاب ہیں اسی طرح آخرت میں بھی (اگر وہ ہوئی) وہی فائز المرام رہیں گے۔ حالانکہ اس دنیا کی نعمتیں اللہ تعالیٰ جس کو دیتا ہے آزمائش کے لیے دیتا ہے کہ وہ اس کو پاکر خدا کا شکرگزار بندہ بنتا ہے یا ناشکرا۔ آخرت میں اس کے ساتھ اللہ کا معاملہ اس کے عمل کے مطابق ہوگا۔

(۴۰-۴۳) یہ تنبیہ کہ اپنے جن معبودوں کی حمایت میں یہ لوگ قرآن اور پیغمبر کی مخالفت کے لیے آج آستینیں چڑھائے ہوئے ہیں ان میں سے ملائکہ کا حال یہ ہوگا کہ جب خدا قیامت کے دن ان سے سوال کرے گا کہ کیا یہ لوگ تمھاری پوجا کرتے رہے ہیں تو وہ اس سے فوراً اظہارِ براءت کریں گے اور جواب دیں گے کہ یہ جنوں کو پوجتے رہے ہیں، ہم اس سے بالکل بری ہیں۔

(۴۴-۵۴) خاتمۂ سورہ جس میں پہلے تو اس عظیم احسان کی طرف توجہ دلائی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی صورت میں ان لوگوں پر فرمایا جو اس سے پہلے قرآن و کتاب سے بالکل ناآشنا تھے پھر نہایت ناصحانہ انداز میں ان کو معاملے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرکے فیصلہ کرنے کی دعوت دی اور آخر میں یہ دھمکی دی کہ اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر ہمیشہ کے لیے پچھتاؤ گے لیکن گزرا ہوا وقت ہاتھ نہیں آئے گا۔

سُوْرَۃُ سَبَاٍ (۳۴)

مَکِّیَّۃٌ ——— اٰیَاتُھَا ۵۴

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱-۹

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَۃِ ؕ وَھُوَ الْحَکِیْمُ الْخَبِیْرُ ﴿۱﴾ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا ؕ وَھُوَ الرَّحِیْمُ الْغَفُوْرُ ﴿۲﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَاْتِیْنَا السَّاعَۃُ ؕ قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتَاْتِیَنَّکُمْ عٰلِمِ الْغَیْبِ ۚ لَا یَعْزُبُ عَنْہُ مِثْقَالُ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَلَآ اَصْغَرُ مِنْ ذٰلِکَ وَلَآ اَکْبَرُ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳ۙ﴾ لِّیَجْزِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّرِزْقٌ کَرِیْمٌ ﴿۴﴾ وَالَّذِیْنَ سَعَوْ فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ ﴿۵﴾ وَیَرَی الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ھُوَ الْحَقَّ ۙ وَیَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ ﴿۶﴾ وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھَلْ نَدُلُّکُمْ عَلٰی رَجُلٍ یُّنَبِّئُکُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّکُمْ لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ ﴿۷ۚ﴾ اَفْتَرٰی عَلٰی

اللّٰهِ كَذِبًا أَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۗ بَلِ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ فِي الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِيْدِ ۝ أَفَلَمْ يَرَوْا إِلٰى مَا بَيْنَ أَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ ۗ إِنْ نَّشَأْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْأَرْضَ أَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ۗ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝ ع

ترجمۂ آیات ۱ - ۹

شکر کا حقدار وہ اللہ ہی ہے جس کا وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور اسی کی حمد آخرت میں بھی ہوگی اور وہی حقیقی حکیم و خبیر ہے۔ وہ جانتا ہے ہر اس چیز کو جو زمین کے اندر داخل ہوتی ہے اور جو اس سے برآمد ہوتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے اور وہی رحم فرمانے والا اور بخشنے والا ہے۔ ۱-۲

اور جنھوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آنے کی۔ کہہ دو، ہاں میرے خداوند عالم الغیب کی قسم، وہ ضرور تم پر آکے رہے گی! اس سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں ہے، نہ آسمانوں اور نہ زمین میں، اور نہ اس سے کوئی چھوٹی چیز اور نہ بڑی۔ مگر وہ ایک واضح کتاب میں مرقوم ہے، تاکہ وہ ان لوگوں کو صلہ دے جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے۔ وہی لوگ ہیں جن کے لیے مغفرت اور رزقِ کریم ہے۔ اور جو ہماری آیات کو زک پہنچانے کی سعی میں سرگرم ہیں وہی ہیں جن کے لیے دردناک عذاب کا خاص حصہ ہوگا۔ ۳-۵

اور جن کو علم عطا ہوا ہے وہ، اس چیز کو جو تمھاری طرف تمھارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے، سمجھتے ہیں کہ یہی حق ہے اور وہ خدائے عزیز و حمید کے راستہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ۶

اور جنھوں نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ کیا ہم تم کو ایک ایسا آدمی دکھائیں جو تم کو یہ خبر دے رہا ہے کہ جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو از سرِ نو ایک نئی خلقت میں اٹھائے جاؤ گے! کیا اس

نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے یا اس کو کسی قسم کا جنون ہے! بلکہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہی عذاب اور نہایت دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ ۷-۸

کیا انھوں نے اپنے آگے اور پیچھے آسمان و زمین پر نظر نہیں ڈالی! اگر ہم چاہیں تو ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں یا ان پر آسمان سے ٹکڑے گرا دیں! بے شک اس کے اندر ہر اس بندے کے لیے بہت بڑی نشانی ہے جو متوجہ ہونے والا ہو!

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَلَهُ الْحَمْدُ فِی الْاٰخِرَةِ وَهُوَ الْحَكِیْمُ الْخَبِیْرُ (۱)

اس سورہ کی بنیاد شکر اور اس کے مقتضیات پر ہے

اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی بنیاد شکر اور اس کے لوازم و مقتضیات پر ہے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی ہے کہ شکر ہی پر توحید اور پھر پورے دین کی عمارت قائم ہے۔ منعم کے شکر کا واجب ہونا انسانی فطرت کی بدیہیات میں سے ہے۔ انسان پر جس کا بھی کوئی احسان ہوتا ہے وہ اس کا ممنون و شکر گزار ہوتا ہے۔ اگر کوئی اپنے محسن کا شکر گزار نہ ہو تو وہ لئیم و کمینہ ہے۔ اسی اصل پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آسمان و زمین کی تمام نعمتیں، جن سے انسان ہر لحظہ متمتع ہو رہا ہے اور جن کے اوپر ہی اس کے بقا کا انحصار ہے، کس کی پیدا کردہ اور کس کے قبضۂ قدرت میں ہیں؟ یہ سورج، یہ چاند، یہ ابر، یہ ہوا، یہ ستارے اور سیارے کس کے بنائے ہوئے ہیں؟ یہ زمین، یہ دریا، یہ پہاڑ، یہ چرند و پرند، یہ اشجار و انہار اور یہ سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان سوالوں کا صحیح جواب یہی ہے کہ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کی پیدا کردہ، اسی کی مملوک اور اسی کے دستِ تصرف میں ہیں۔ پچھلی سورتوں میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ ان سوالوں کا یہی جواب قرآن کے کٹر سے کٹر مخالفین بھی دیتے تھے۔ اس آیت میں قرآن نے اسی بدیہی حقیقت کی یاد دہانی کی ہے کہ وہی اللہ جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز کا خالق و مالک ہے وہی ان تمام مخلوقات کے شکر کا حقیقی سزاوار بھی ہے جو اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں سے متمتع ہو رہی ہیں۔ اس شکر کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ سب اسی کی عبادت و اطاعت کریں اور اس عبادت و اطاعت میں کسی دوسرے کو شریک نہ کریں اس لیے کہ کسی دوسرے کو ان چیزوں کے خلق یا ان کی تدبیر میں کوئی دخل نہیں ہے۔ دوسروں سے انسان کو کوئی فیض

پہنچتا ہے تو محض ایک واسطہ و ذریعہ کی حیثیت سے پہنچتا ہے۔ اس وجہ سے اگر ان کا کوئی حق انسان پر قائم بھی ہوتا ہے تو وہ خدا کے حق کے تحت ہوتا ہے نہ کہ خدا کے حق سے بالاتر یا اس کے برابر۔

شکر کے لوازم کا ظہور آخرت میں

'وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْاٰخِرَةِ': اوپر کے ٹکڑے میں اللہ تعالیٰ کے اس حق کا ذکر تھا جو اس دنیا کی زندگی میں اس کے ہر بندے پر قائم ہوتا ہے۔ اب اس ٹکڑے میں اس کے اس حق کا ذکر ہے جو آخرت میں آشکارا ہوگا۔ فرمایا کہ اسی کی حمد آخرت میں بھی ہوگی۔ اس ٹکڑے سے کئی باتیں واضح ہوئیں۔

ایک یہ کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ربوبیت کا جو اہتمام فرمایا ہے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعد آخرت کا ظہور ہو۔ اگر آخرت نہ ہو تو یہ تمام ربوبیت بالکل بے معنی و بے غایت ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت متعدد مقامات میں ہو چکی ہے اس وجہ سے یہاں اشارے پر کفایت کیجیے۔

دوسری یہ کہ یہ اہل ایمان کے اس ترانۂ حمد کی طرف اشارہ ہے جو آخرت میں تمام حقائق کے ظہور اور اللہ تعالیٰ کے جملہ وعدوں کے ایفاء کے بعد ان کی زبانوں سے بلند ہوگا۔ اس کی طرف سورۂ یونس میں اشارہ ہے:

'وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (یونس: ۱۰)' (اور ان لوگوں کی آخری صدا یہ ہوگی کہ شکر کا حقیقی سزاوار اللہ، عالم کا خداوند، ہے)۔

تیسری یہ کہ یہ شرکاء و شفعاء کی کلی نفی ہے کہ یہ تمام مزعومہ دیوی دیوتا جن کی شفاعت کی امید پر مشرکین نچنت بیٹھے ہیں، آخرت میں سب ہوا ہو جائیں گے۔ ان میں سے کوئی کسی کے کام آنے والا نہیں بنے گا۔ اس دن مشرکین اپنے معبودوں پر لعنت کریں گے اور معبود اپنے پجاریوں سے اعلانِ براءت کریں گے۔ سب کی پیشی اللہ واحد کے حضور میں ہوگی۔ اسی کا فیصلہ ناطق ہوگا اور سب پر یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ سزاوارِ حمد صرف اللہ رب العالمین ہے۔ اس حقیقت کی طرف سورۂ قصص میں یوں اشارہ فرمایا گیا ہے:

'لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ز وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (القصص: ۷۰)' (وہی حمد کا حق دار ہے دنیا میں اور اسی کی حمد ہوگی آخرت میں اور اسی کے اختیار میں تمام امور کا فیصلہ ہے اور اسی کے آگے تمھاری پیشی ہونی ہے)۔

مذکورہ بالا باتوں کی دلیل صفاتِ الٰہی سے

'وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ': یہ اوپر کے تمام دعاوی کی دلیل اللہ تعالیٰ کی صفات سے پیش کی گئی ہے کہ وہ حکیم و خبیر ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں اپنے شکر گزار بندوں کو ان کی شکر گزاری کا صلہ دے اور ناشکرے اپنی ناسپاسی کی سزا بھگتیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ دنیا ایک بازیچۂ اطفال بلکہ ایک نہایت ظالمانہ کھیل بن کے رہ جاتی ہے اور (العیاذ باللہ) یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا خالق حکیم نہیں بلکہ ایک کھلنڈرا ہے حالانکہ اس کائنات کا ذرہ ذرہ یہ شہادت دے رہا ہے کہ اس کا خالق ایک حکیم ہے۔ اسی طرح اس کے حکیم ہونے کا یہ بھی تقاضا ہے کہ اس کے بے لاگ عدل کو کسی کی سفارش باطل نہ کر سکے اس لیے کہ اس صورت میں بھی اس کے حکیم ہونے کی نفی ہو جاتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ خبیر بھی ہے اس لیے کہ

جب اس نے ہر چیز پیدا کی ہے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ایک ایک ذرّہ اور ایک ایک حرکت و سکون سے باخبر بھی ہو چنانچہ فرمایا ہے "اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ" (الملک: ۱۴) (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے سب کچھ بنایا ہے) اس کے اس محیطِ کُل علم کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی کے معاملے کا فیصلہ کرتے وقت نہ کسی دوسرے کے علم و خبر کا محتاج ہو اور نہ کوئی اس کو اپنی جھوٹی سفارش سے فریب دے سکے۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ ان تمام باتوں کو حصر کے اسلوب میں فرمایا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جب حقیقی خالق و مالک اور حقیقی حکیم و خبیر وہی ہے تو اس کے سوا کوئی دوسرا حمد و شکر کا سزاوار کس طرح ہو سکتا ہے۔

یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَمَا یَخۡرُجُ مِنۡهَا وَمَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعۡرُجُ فِیۡهَا ؕ وَهُوَ الرَّحِیۡمُ الۡغَفُوۡرُ (۲)

خدا کی صفت خبیر کی وضاحت

یہ اسی صفت 'خبیر' کی وضاحت ہے کہ اس کا علم اس کائنات کے ایک ایک ذرے اور ایک ایک حرکت و سکون کو محیط ہے۔ جو دانہ زمین میں ڈالا جاتا ہے وہ اس سے بھی باخبر ہوتا ہے اور جو پودا اس سے برآمد ہوتا ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے۔ اسی طرح آسمان سے جو خیر و شر نازل ہوتا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہوتا ہے اور جو چیزیں اس میں صعود کرتی ہیں ان سے بھی وہ آگاہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا علم تمام کلیات و جزئیات کو محیط ہے اور وہ ہر چیز کی نگرانی فرما رہا ہے۔ اس کی مملکت میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی نہ تو اس کے دائرۂ علم سے باہر ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ اس کے کسی گوشے میں اس کے علم و اذن کے بغیر کوئی کسی قسم کی نقل و حرکت یا دراندازی کر سکے۔ علمِ الٰہی کے اس احاطہ کی وضاحت اس مقصد سے کی گئی ہے کہ شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل مشرکین کا یہ مغالطہ ہے کہ بھلا اتنی ناپیدا کنار کائنات کے ہر کونے اور گوشے، ہر ایک کے قول و عمل اور ہر ایک کے دکھ اور درد سے خدا ہر لمحہ کس طرح واقف رہ سکتا ہے! اس وجہ سے اپنے تصور کے مطابق اس کائنات کے مختلف حصوں کو انھوں نے الگ الگ دیوتاؤں میں تقسیم کیا۔ اس کا تقرب حاصل کرنے اور اس کو اپنی ضروریات سے آگاہ کرنے کے لیے وسائل و وسائط ایجاد کیے۔ جنوں کو آسمان کی خبریں لانے والا مان کر ان کی پرستش کی، فرشتوں کو شفاعت کرنے والا سمجھ کر ان کو دیویوں کا درجہ دیا۔ اس آیت نے ان تمام توہمات پر ضرب لگائی کہ خدا کا علم ہر چیز کو محیط ہے اس وجہ سے کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ وہ اپنی پوری کائنات کے سارے نظام پر خود حاوی اور تنہا کافی ہے۔

مشرکین کے ایک مغالطہ کا ازالہ

'وَهُوَ الرَّحِیۡمُ الۡغَفُوۡرُ' یعنی خدا کوئی ظالم اور غیر منصف بھی نہیں ہے کہ اس کو راضی کرنے یا اس کی آفتوں سے اپنے کو بچانے کے لیے کسی دوسرے کی سعی و سفارش کی ضرورت پیش آئے بلکہ وہ نہایت مہربان اور نہایت بخشنے والا ہے۔ اس کی رحمت کو متوجہ کرنے اور اس کی مغفرت حاصل کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ بندہ اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے اور توبہ و اصلاح کرے۔ یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ شرک

کے عوامل میں سے ایک اہم عامل مشرکوں کا یہ مغالطہ بھی ہے کہ انھوں نے خدا کا تصور ایک نہایت ہولناک ہستی کی حیثیت سے کیا اور پھر اس کو راضی رکھنے کے لیے انھوں نے اپنے تصور کے مطابق وسائل و ذرائع ایجاد کیے۔ اس ٹکڑے نے اسی واہمہ پر ضرب لگائی ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۖ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ عَالِمِ الْغَيْبِ ۖ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَلَا أَصْغَرُ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ (۳)

قیامت خدا کی صفات کا لازمی تقاضا ہے

یعنی جب اللہ حکیم و خبیر ہے، اس کا علم ہر چیز کا احاطہ بھی کیے ہوئے ہے تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ قیامت ضرور آئے لیکن جو ہٹ دھرم ہیں وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اور بڑے غرور کے ساتھ انکار کرتے ہیں کہ قیامت ہرگز نہیں آئے گی۔

'قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ' جس طنطنہ کے ساتھ منکرین کا انکار تھا اسی زور کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بقید قسم، جواب دلوایا کہ ان کو سنا دو کہ ہاں، میرے رب کی قسم! وہ تم پر ضرور آکے رہے گی۔

'عَالِمِ الْغَيْبِ ۖ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ الآية' 'عالم الغیب'، 'ربی' سے بدل واقع ہے یعنی میرے اس رب کی قسم جو تمام غیب سے واقف ہے، جس سے آسمانوں اور زمین میں، ذرہ کے برابر بھی کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ بلکہ ہر چیز ایک نہایت واضح رجسٹر میں درج ہے۔

اس آیت میں علم الٰہی کی وسعت کا بیان منکرین کی تہدید کے مقصد سے ہے کہ وہ جو کتنے ہوں کہ اس ڈھٹائی سے وہ قیامت کا جو انکار کر رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ نہ صرف یہ کہ وہ آئے گی بلکہ ہر ایک کو اپنے ایک ایک قول و عمل کا، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، حساب بھی دینا ہے۔ ساتھ ہی اس میں ایک مغالطہ کا ازالہ بھی ہے وہ یہ کہ منکرین کے نزدیک قیامت کے استبعاد کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ اتنی وسیع دنیا کے ایک ایک شخص کے ہر قول و فعل کا علم کسے ہو سکتا ہے کہ وہ سب کا حساب کرنے بیٹھے گا! ان کے اس مغالطہ کو دور کرنے کے لیے یہاں بھی اللہ تعالیٰ کے محیط کل علم کا حوالہ دیا جس طرح اوپر توحید کے سلسلہ میں دیا ہے۔

لِيَجْزِيَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝ وَالَّذِينَ سَعَوْا فِي آيَاتِنَا مُعَاجِزِينَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مِنْ رِجْزٍ أَلِيمٌ (۴-۵)

قیامت کا آنا کیوں ضروری ہے

یہ قیامت کی ضرورت واضح فرمائی کہ اس کا آنا کیوں ضروری ہے۔ فرمایا کہ اس لیے ضروری ہے کہ وہ نہ آئے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کے نزدیک نیک و بد دونوں یکساں ہیں حالانکہ یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے اس وجہ سے لازمی ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس میں اللہ تعالیٰ ایمان و عمل صالح والوں کو ان کی نیکیوں کا صلہ اور جنھوں نے اللہ کی باتوں کو شکست دینے کی کوشش کی ان کو

ان کی اس سعیِ نامراد کی سزا دے۔

قیامت کا اصل مقصد اہلِ ایمان کو صلہ دینا ہے مجرموں کو سزا دینا اس کے لوازم میں سے ہے

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قیامت کا اصل مقصد اہلِ ایمان کو صلہ دینا بتایا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کا اصل مقصود در حقیقت یہی ہے۔ مجرمین کو سزا دینا اس کے مقاصد میں سے نہیں بلکہ اس کے لوازم و نتائج میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا رحمت کے لیے بنائی ہے اور اس رحمت ہی کے لیے اس نے آخرت کا دن بھی رکھا ہے لیکن اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی نکلے گا کہ جو لوگ اپنے آپ کو اس رحمت کا سزاوار نہیں بنائیں گے وہ اس کی نقمت کے سزاوار ٹھہریں گے۔

اہلِ ایمان کے لیے دو چیزوں کا یہاں ذکر فرمایا ہے۔ ایک مغفرت، دوسری 'رزقِ کریم'۔ 'مغفرت' سے مراد یہ ہے کہ ایمان و عملِ صالح کی زندگی بسر کرتے ہوئے ان سے جو کوتاہیاں اور غلطیاں صادر ہوئی ہوں گی اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرمائے گا۔ 'رزقِ کریم' ان تمام افضال و عنایات کی ایک جامع تعبیر ہے جن کے وہ جنت میں وارث ٹھہریں گے۔

کفر کے سرغنوں کا انجام

کفار کا ذکر یہاں 'الَّذِیۡنَ سَعَوۡ فِیۡۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیۡنَ' کی صفت کے ساتھ فرمایا ہے۔ 'معاجزۃ' کے معنی ایک دوسرے کو شکست دینے کے قصد سے باہم مسابقت کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کی تگ و دو رات دن اللہ کی آیات اور اس کی باتوں کو شکست دینے کے لیے وقف رہی ہے ان کو اللہ تعالیٰ 'رجز الیم' کے عذاب میں سے حصہ دے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ کفر کے سرغنوں کی طرف ہے جن کے لیے عذاب بھی مخصوص ہوگا۔ اسی مخصوص عذاب کو 'عَذَابٌ مِّنۡ رِّجۡزٍ اَلِیۡمٌ' سے تعبیر فرمایا۔ 'رجز' اس عذاب کو کہتے ہیں جو نہایت ہولناک ہو۔

وَیَرَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ الَّذِیۡۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ ہُوَ الۡحَقَّ ۙ وَیَہۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ (۶)

عاقلوں کی تائید آدمی کے اطمینان کے لیے بس ہے

یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو علمِ حقیقی کی روشنی عطا ہوئی۔ عام اس سے کہ وہ ان اہلِ کتاب میں سے ہوں جنھوں نے اپنے نبیوں اور صحیفوں کے علم کو محفوظ رکھا یا ان سلیم الفطرت لوگوں میں سے ہوں جن کے قلوب ان کی سلامت روی کے باعث قرآن کی روشنی میں مُستنیر ہوئے[1]۔ فرمایا کہ یہ لوگ اس چیز کو بالکل حق سمجھتے ہیں جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے۔ یعنی تم جس توحید کی دعوت دے رہے ہو اور جس قیامت سے لوگوں کو ڈرا رہے ہو، وہ اس کی تائید کر رہے ہیں کہ یہی حق ہے اور جو لوگ اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کے بل پر بڑے طنطنہ کے ساتھ توحید اور قیامت کی تکذیب کر رہے ہیں وہ یکسر باطل پر ہیں۔ یہ بات یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کے لیے فرمائی گئی ہے کہ اگر یہ بے فکرے اور لاأبالی لوگ تمھاری مخالفت کر رہے ہیں تو اس کی پروا نہ کرو، تمھارے اطمینان کے لیے یہ چیز بس کافی ہے کہ جن کے اندر علم و معرفت کی روشنی

---

[1] اہلِ عرب میں جو لوگ حنیفیت کے پیرو تھے وہ بھی اسی زمرے میں شامل ہیں۔

ہے وہ تمھارے مؤید ہیں۔ آدمی کو پروا عاقلوں کی ہونی چاہیے نہ کہ احمقوں اور لاخیروں کی۔

'وَیَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ' یعنی یہ اہلِ علم اس حقیقت کو برملا تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کتاب لاریب خدائے عزیز و حمید کے راستہ کی طرف رہنمائی کرنے والی ہے۔ یعنی دوسروں نے جو دین گھڑ رکھے ہیں وہ تو تمام تر ضلالت اور ہلاکت کے کھڈ میں گرانے والے ہیں البتہ یہ کتاب خدا کی راہ دکھانے والی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی دو صفتیں مذکور ہوئی ہیں، ایک 'عَزِیْز' دوسری 'حَمِیْد'۔ 'عَزِیْز' سے اس کی عزت و قدرت کا اظہار ہو رہا ہے اور 'حمید' سے دنیا اور آخرت دونوں میں اسی کا سزاوارِ حمد ہونا۔ اور یہ دونوں صفتیں توحید اور قیامت کو متلزم ہیں، جیسا کہ اوپر کے مباحث سے واضح ہو چکا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں حقیقی علم

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ حقیقی علم، قرآن کی اصطلاح میں، صرف خدا کی معرفت اور آخرت کا علم ہے۔ اگر یہ علم کسی کے اندر نہ ہو تو دوسرے کتنے ہی علوم وہ پڑھ ڈالے اس کا یہ سارا علم اس کے لیے بار اور دوسروں کے لیے خطرہ ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے 'علما' صرف انھی کو کہا ہے جن کو خدا اور آخرت کی معرفت حاصل ہو:

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ (فاطر: ۲۸)	اللہ سے اس کے بندوں میں سے بس وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں اور بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا، بخشنے والا ہے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھَلْ نَدُلُّکُمْ عَلٰی رَجُلٍ یُّنَبِّئُکُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّکُمْ لَفِیْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (۷)

کفار کا رویہ آنحضرت صلعم کی مخالفت میں

اہلِ ایمان کی روش کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اب یہ ان لوگوں کی روش بیان ہو رہی ہے جو علم کی روشنی سے محروم، کفر کے اندھیرے میں، بھٹک رہے ہیں۔ فرمایا کہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ تمھارا اور تمھاری دعوت کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لوگوں سے کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمھیں ایک ایسا سرپھرا دکھائیں جو خدا کا رسول بن کر یہ منادی کرتا پھر رہا ہے کہ لوگ مر کر جب بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو وہ از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے! ——— گویا ان کے نزدیک یہ بات اس قابل بھی نہیں کہ اس کی تردید میں کوئی دلیل دی جائے۔

اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمْ بِہٖ جِنَّۃٌ ؕ بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ فِی الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِیْدِ (۸)

یہ ان کے اسی استہزا کی مزید تفصیل اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا برمحل جواب ہے۔

'اَفْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَمْ بِہٖ جِنَّۃٌ' یعنی وہ کہتے ہیں کہ اس شخص کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو یہ مانا جائے کہ اس نے یہ خدا پر جھوٹ باندھا ہے کہ خدا نے اس کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس کی طرف سے کہہ رہا ہے یا پھر یہ مانا جائے کہ یہ بھی جنون کی ایک قسم ہے جس میں

یہ شخص مبتلا ہو گیا ہے! مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں بیک وقت اس شخص میں موجود ہیں۔ یہ مفتری بھی ہے اور مجنون بھی!

'بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ الاٰیۃ'۔ ان متمردین کے اس استہزاء کا جواب قرآن نے فوراً دیا اور دیکھیے کتنا باوقار اور موثر جواب دیا ہے۔

متمردین کے استہزاء کا باوقار جواب

فرمایا کہ ان لال بجھکڑوں نے تشخیص بہت غلط کی۔ خرابی نہ داعی میں ہے نہ دعوت میں بلکہ ساری خرابی خود ان لوگوں کے اندر ہے جو آخرت پر ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ وہ عذاب اور نہایت دور کی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ یعنی ایک گمراہی تو وہ ہوتی ہے جس سے پلٹ کر آنے اور اصلاح کا امکان باقی رہتا ہے، ہزار خرابی کے بعد بھی۔ لیکن جو آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوا اس کی بازگشت کا پھر کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا۔ اس کے لیے امید کے تمام دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے اس انجام کو مستقبل کے صیغہ سے بیان کرنے کے بجائے حال کے اسلوب میں بیان فرمایا اس لیے کہ ان کا یہ انجام ان کے رویہ کے اندر ہی مضمر ہے۔ گویا آج ہی وہ اپنی رعونت کے سبب سے اس سے دوچار ہیں۔

اَفَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِھِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَیْھِمْ کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّکُلِّ عَبْدٍ مُّنِیْبٍ (۹)

اس کائنات کی کسی چیز کا نفع رسانی بالاضطرار نہیں بلکہ خدا کے حکم سے ہے

اس مجموعۂ آیات کی پہلی آیت میں جو مضمون بیان ہوا ہے مجموعہ کے آخر میں اسی مضمون کا ایک نئے اسلوب سے اعادہ ہے۔ پہلی آیت میں فرمایا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے اس وجہ سے دنیا میں بھی شکر کا حقیقی سزاوار وہی ہے اور آخرت میں بھی اسی کی حمد ہوگی۔ یہاں فرمایا کہ کیا ان متکبرین نے اس حقیقت پر کبھی غور نہیں کیا کہ یہ آسمان جو ان کے سروں پر شامیانے کی طرح تنا ہوا ہے اور یہ زمین جو ان کے قدموں کے نیچے فرش کی طرح بچھی ہوئی ہے اور جن کے فوائد و برکات سے یہ متمتع ہو رہے ہیں، یہ ان کے تھامے ہوئے نہیں تھمے ہیں بلکہ ان کو اللہ ہی نے تھام رکھا ہے؛ اگر اللہ نے ان کو نہ تھام رکھا ہوتا تو یہ دونوں ان کے لیے نعمتوں کے بجائے نقمتوں کا ذریعہ بن جاتے۔ فرمایا کہ ہم جب چاہیں ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں اور جب چاہیں اسی آسمان سے ابر رحمت برسانے کے بجائے ان پر پتھر برسا دیں! اس کائنات کی کوئی چیز بھی انسان کو بالاضطرار نفع نہیں پہنچا رہی ہے بلکہ خدا کے حکم سے پہنچا رہی ہے اور کوئی چیز بھی براہ راست انسان کے اختیار میں نہیں ہے بلکہ خدا کے حکم سے وہ اس کی نفع رسانی میں سرگرم ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جو انسان پر واجب کرتی ہے کہ وہ کسی نعمت پر اترائے نہیں بلکہ اپنے اس رب کا شکرگزار رہے جس نے اس کو یہ نعمت بخشی ہے اور اس کو خدا کی نافرمانی اور اس سے بغاوت کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کو اسی کی خوشنودی اور فرمانبرداری میں استعمال کرے۔

یہی مضمون آگے والی سورہ ——— سورۂ فاطر ——— میں، جو اس کا مثنیٰ ہے، یوں

ارشاد ہوا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یُمۡسِکُ السَّمٰوٰتِ وَ	بے شک اللہ ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے
الۡاَرۡضَ اَنۡ تَزُوۡلَا ۚ وَلَئِنۡ زَالَتَاۤ	کہ وہ لڑھک نہ جائیں اور اگر وہ دونوں لڑھک جائیں
اِنۡ اَمۡسَکَہُمَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنۡۢ	تو کسی کی تاب نہیں کہ وہ خدا کے چھوڑ دینے کے بعد
بَعۡدِہٖ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حَلِیۡمًا	ان کو تھام سکے۔ بے شک وہ نہایت بردبار اور
غَفُوۡرًا (فاطر: ۴۱)	بخشنے والا ہے۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّکُلِّ عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ ۔ یعنی آسمانوں اور زمین کے اس پہلو پر اگر غور کرتے تو اس کے اندر اس بات کی بہت بڑی دلیل موجود ہے جس کی قرآن ان کو دعوت دے رہا ہے لیکن اس دلیل تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر حقیقت کی طلب، عبرت پذیری کی صلاحیت اور متوجہ ہونے والا دل ہو۔ جن کے اندر یہ اوصاف نہ ہوں ان کے لیے کوئی نشانی بھی کارگر نہیں ہو سکتی۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۰-۲۱

آگے تاریخ سے دو مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ پہلی مثال حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کی ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے عظیم بادشاہی، عظیم علم و حکمت اور آسمان و زمین کی بے شمار نعمتوں سے نوازا اور وہ ان نعمتوں کو پا کر طغیان و فساد میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ برابر اپنے رب کے شکر گزار اور فرماں بردار رہے۔ ان کی اس شکر گزاری کا صلہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دیا کہ ان کے لیے نعمتوں میں برابر اضافہ پر اضافہ ہوتا رہا۔

دوسری مثال اہل سبا کی ہے۔ ان کو بھی ایک نہایت آباد و زرخیز ملک کی حکومت ملی لیکن وہ اس کو پا کر طغیان و فساد میں مبتلا ہو گئے بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سیلاب بھیج کر اس طرح ان کو تباہ کر دیا کہ وہ ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ گئے۔

یہ دونوں مثالیں قریش کے مُترفین و متکبرین کے سامنے پیش کی گئی ہیں کہ ان کے سامنے بھی یہ دونوں راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ وہ چاہیں تو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرح خدا کے شکر گزار رہ کر اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں کا حقدار بنا سکتے ہیں اور چاہیں تو اہلِ سبا کی روش اختیار کر کے اس کے قہر کو بھی دعوت دے سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس میں یہ تذکیر بھی ہے کہ جب اس دنیا میں خدا کے قانونِ مجازات کے ظہور کی یہ مثالیں موجود ہیں تو آخرت میں اس کے ظہور کو کیوں مستبعد خیال کرتے ہو! —— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰-۲۱

وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضۡلًا ؕ یٰجِبَالُ اَوِّبِیۡ مَعَہٗ وَالطَّیۡرَ ۚ وَاَلَنَّا لَہُ الۡحَدِیۡدَ ﴿۱۰﴾ اَنِ اعۡمَلۡ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرۡ فِی السَّرۡدِ وَاعۡمَلُوۡا

صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۱﴾ وَ لِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ غُدُوُّهَا
شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ ۚ وَ اَسَلْنَا لَهٗ عَیْنَ الْقِطْرِ ؕ وَ مِنَ الْجِنِّ مَنْ
یَّعْمَلُ بَیْنَ یَدَیْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ؕ وَ مَنْ یَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ
مِنْ عَذَابِ السَّعِیْرِ ﴿۱۲﴾ یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ
وَ تَمَاثِیْلَ وَ جِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَ قُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ ؕ اِعْمَلُوْۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ؕ
وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ ﴿۱۳﴾ فَلَمَّا قَضَیْنَا عَلَیْهِ الْمَوْتَ مَا
دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا
خَرَّ تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ الْغَیْبَ مَا لَبِثُوْا فِی الْعَذَابِ
الْمُهِیْنِ ؕ ﴿۱۴﴾ لَقَدْ كَانَ لِسَبَاٍ فِیْ مَسْكَنِهِمْ اٰیَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ
یَّمِیْنٍ وَّ شِمَالٍ ؕ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَ اشْكُرُوْا لَهٗ ؕ بَلْدَةٌ طَیِّبَةٌ
وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ ﴿۱۵﴾ فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ سَیْلَ الْعَرِمِ وَ بَدَّلْنٰهُمْ
بِجَنَّتَیْهِمْ جَنَّتَیْنِ ذَوَاتَیْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّ شَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ
قَلِیْلٍ ﴿۱۶﴾ ذٰلِكَ جَزَیْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ؕ وَ هَلْ نُجٰزِیْۤ اِلَّا الْكَفُوْرَ ﴿۱۷﴾
وَ جَعَلْنَا بَیْنَهُمْ وَ بَیْنَ الْقُرَى الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا قُرًى ظَاهِرَةً
وَّ قَدَّرْنَا فِیْهَا السَّیْرَ ؕ سِیْرُوْا فِیْهَا لَیَالِیَ وَ اَیَّامًا اٰمِنِیْنَ ﴿۱۸﴾
فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَیْنَ اَسْفَارِنَا وَ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ
اَحَادِیْثَ وَ مَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ
شَكُوْرٍ ﴿۱۹﴾ وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَیْهِمْ اِبْلِیْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِیْقًا
مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۲۰﴾ وَ مَا كَانَ لَهٗ عَلَیْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا لِنَعْلَمَ

مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِيْ شَكٍّ ؕ وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ﴿۲۱﴾

ع ۲ / ۱۲ / ۸

ترجمۂ آیات ۱۰ - ۲۱

اور ہم نے داؤد کو اپنے خاص فضل سے نوازا۔ اے پہاڑو، تم بھی اس کے ساتھ تسبیح میں شرکت کرو! اور یہی حکم ہم نے پرندوں کو بھی دیا۔ اور ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا کہ ڈھیلی ڈھالی زرہیں بناؤ اور ان کے جوڑ پیوستہ رکھو اور سب نیک عمل کرو، بے شک تم جو کچھ کرتے ہو میں اس کو اچھی طرح دیکھ رہا ہوں۔ ۱۰-۱۱

اور ہم نے سلیمان کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا۔ اس کا جانا بھی مہینہ بھر کا ہوتا اور آنا بھی مہینہ بھر کا ہوتا اور ہم نے اس کے لیے تانبے کا چشمہ بہا دیا اور جنات میں سے بھی اس کے لیے مسخر کر دیے جو اس کے رب کے حکم سے اس کے حضور خدمت کرتے (اور ان کے لیے ہمارا حکم یہ تھا کہ) جو ان میں سے ہمارے حکم سے سرتابی کرے گا تو ہم اس کو دوزخ کا عذاب چکھائیں گے۔ وہ اس کے لیے بناتے جو وہ چاہتا، محرابیں، مجسمے، حوضوں کے مانند لگن، اور لنگر انداز دیگیں ـــــ اے آلِ داؤد، شکر گزاری کے ساتھ عمل کرو اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔ ۱۲-۱۳

پس جب ہم نے اس پر موت کا فیصلہ نافذ کیا تو ان کو اس کی موت سے نہیں آگاہ کیا مگر زمین کے کیڑے نے جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا پس جب وہ گر پڑا تب جنوں پر واضح ہوا کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں نہ پڑے رہتے۔ ۱۴

اور اہلِ سبا کے لیے بھی ان کے مسکن میں بہت بڑی نشانی موجود تھی۔ دہنے بائیں دونوں جانب باغوں کی دو قطاریں۔ اپنے رب کے بخشے ہوئے رزق سے متمتع ہو اور اس کے شکر گزار رہو! زمین شاداب و زرخیز اور پروردگار بخشنے والا ہے!! تو انھوں نے سرتابی

کی تو ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے باغوں کو دو ایسے باغوں سے بدل دیا جن میں بدمزہ پھل والے درخت اور جھاؤ اور بیری کی کچھ جھاڑیاں رہ گئیں۔ یہ ہم نے ان کی ناشکری کا بدلہ دیا اور ہم برا بدلہ ناسپاسوں ہی کو دیا کرتے ہیں! ۱۵ - ۱۷

اور ہم نے ان کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان، جن میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں، سر راہ بستیاں بھی آباد کیں اور ان کے درمیان سفر کی منزلیں ٹھہرا دیں۔ ان میں رات دن بے خوف و خطر سفر کرو۔ پس انھوں نے کہا، اے رب ہمارے سفروں میں دوری پیدا کر دے اور انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے تو ہم نے ان کو افسانۂ پارینہ بنا دیا اور ان کو بالکل تتر بتر کر چھوڑا۔ بے شک اس کے اندر نشانیاں ہیں ہر صبر کرنے والے، شکر کرنے والے کے لیے۔ ۱۸ - ۱۹

اور ابلیس نے ان کے اوپر اپنا گمان سچ کر دکھایا۔ سو انھوں نے اس کی پیروی کی۔ صرف اہل ایمان کا ایک گروہ اس سے بچ سکا۔ اور اس کو ان کے اوپر کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔ بس یہ کہ ہم ممیز کر دیں ان لوگوں کو جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان لوگوں سے جو اس کی بابت شک میں ہیں اور تمھارا رب ہر چیز کا نگران ہے۔ ۲۰ - ۲۱

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۖ یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَہٗ وَالطَّیْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَہُ الْحَدِیْدَ (۱۰)

حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ پر اللہ تعالیٰ نے جو فضلِ خاص فرمایا اس کی تفصیل سورۂ انبیاء اور سورۂ نمل میں گزر چکی ہے۔ یہاں ہم اپنی بحث صرف ضروری حد تک محدود رکھیں گے۔

حضرت داؤدؑ کا سوزِ گدازِ

'یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَہٗ وَالطَّیْرَ'۔ یہ اشارہ ہے اس سوز و گداز کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کو عطا فرمایا تھا کہ جب وہ پہاڑوں کے دامن میں بیٹھ کر اپنے خاص لاہوتی لحن میں اپنے رب کی حمد کا ترانہ چھیڑتے اور اپنی منظوم مناجاتیں پڑھتے تو شجر و حجر اور چرند پرند سب جھوم اٹھتے اور ان کی ہم نوائی کرتے۔

پہاڑوں اور پرندوں کی طرف سے ہم نوائی

'تَأْوِيْبٌ' کے اصل معنی 'ترجیع' کے ہیں یعنی کسی کے سُر میں اپنا سُر ملانا، اس کی آواز کو دہرانا، اس کی ہم آہنگی اور ہم نوائی کرنا۔ یوں تو اس کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے اور جب وہ تسبیح کرتی ہے تو لازماً تسبیح کرنے والوں کی ہم نوائی بھی کرتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت داؤد کو خاص نوع کا لِّن گلہ اور خاص قسم کا لحن عطا فرمایا تھا اسی طرح اپنے خاص حکم سے پہاڑوں اور پرندوں کو یہ حکم بھی دیا تھا کہ جس وقت حضرت داؤد اپنے رب کی حمد و تسبیح کریں، وہ بھی ان کے ساتھ اس میں شریک ہوں۔ سورۂ انبیاء میں یہی مضمون یوں ادا ہوا ہے: 'وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ وَالطَّيْرَ (۷۹)' (اور ہم نے داؤد کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا اور پرندوں کو بھی)۔

بزم کے بعد ان کی رزم کا حال

'وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ'۔ ان کی بزم کا حال بیان کرنے کے بعد یہ ان کی رزم کا حال بیان ہو رہا ہے کہ ہم نے اس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا۔ اس کی وضاحت سورۂ انبیاء میں ہو چکی ہے کہ انھوں نے لوہے کو پگھلانے اور اس سے نہایت باریک کڑیوں کی زرہیں بنانے کے فن کو اتنی ترقی دی کہ لوہے کی زرہیں ایسی ڈھیلی ڈھالی بننے لگیں کہ معلوم ہوتا کہ کسی کپڑے سے بنائی گئی ہیں جن کا پہننا نہایت آسان ہوتا اور حفاظت کے پہلو سے وہ لوہے کا کام دیتیں۔

أَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ إِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱)

لوہے کی صنعت میں اولیت کا امتیاز

'سٰبِغٰتٌ' ڈھیلے ڈھالے لباس کو کہتے ہیں جو پورے جسم کو ڈھانک لے۔ یہاں یہ ڈھیلی ڈھالی زرہوں کی صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ 'قَدِّرْ فِي السَّرْدِ'، میں 'سَرْد' کے معنی بناوٹ کے اور 'تَقْدِيْر' کے معنی بناوٹ میں پورے تناسب کو ملحوظ رکھنے کے ہیں۔

لوہے سے ایسا لباس تیار کر لینا جو ڈھیلا ڈھالا بھی ہو اور اس کی کڑیوں میں پورا تناسب بھی ملحوظ رہ سکے بغیر اس کے ممکن نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد پر لوہے کے پگھلانے کی ایسی اعلیٰ سائنس کا انکشاف فرمایا، جس کی اولیت کا سہرا انہی کے سر ہے۔ اپنی اس ایجاد سے انھوں نے دفاعی اسلحہ میں ایک نہایت بیش قیمت اضافہ کیا جس سے ان کی فوجی قوت ان کے حریفوں کے مقابل میں بہت بڑھ گئی۔

اس فن کا اخلاقی تقاضا

'وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ إِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ'۔ اوپر کے ٹکڑے میں اس فن کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے حوصلہ افزائی فرمائی گئی ہے۔ اس ٹکڑے میں اس فن کا اخلاقی تقاضا بیان ہوا ہے کہ اس کو پا کر بہک نہ جانا اور اس کو زمین میں فساد کا ذریعہ نہ بنانا بلکہ اس بات کو برابر یاد رکھنا کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ یہ ہدایت اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور ان کے تمام آل و اتباع کو فرمائی۔ اس کا ذکر بار بار زبور اور امثال میں بھی آیا ہے۔

زمانۂ حال میں سائنس کی ترقی کے دو پہلو

اس زمانے میں انسان نے سائنس میں جو ترقی کی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے بڑے بڑے فائدے پہنچے ہیں اور پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن دو باتیں

انسان بھول گیا ہے۔ ایک یہ کہ سائنس کا ہر انکشاف جو ہوا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے ہوا ہے۔ دوسری یہ کہ ہر نعمت اور ہر قوت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ انسان اس کو خدا کی امانت سمجھے اور یہ یاد رکھتا ہوا اس کو استعمال کرے کہ جس خدا نے یہ بخشی ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ میں اس کو کہاں استعمال کرتا ہوں۔ ان دو حقیقتوں کے فراموش کر دینے کی وجہ سے اب سائنس انسان کے لیے ایک عظیم خطرہ بن گئی ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ انسان اپنے ہی ایجاد کیے ہوئے اسلحہ سے کب خودکشی کر لے۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ ۭ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۭ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ (۱۲)

حضرت سلیمانؑ کی بحری قوت

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح لوہے کے استعمال کا نہایت اعلیٰ فن تعلیم فرمایا جس سے انھوں نے اپنی بری قوت میں بے مثال اضافہ فرمایا اسی طرح حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہوا کے کنٹرول کرنے کا فن عطا فرمایا جس سے انھوں نے اپنے بحری بیڑے کو اس قدر ترقی دی کہ ان کے جہازات مہینوں کا سفر بے روک ٹوک جاری رکھتے۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۸۱ کے تحت ہم ذکر کر آئے ہیں کہ ان کے بادبانی جہازات نہایت دور دور کے سواحل تک سفر کرتے اور ان کے بادبان ایسے سائنٹیفک طریقہ پر بنائے گئے تھے کہ ہوا کی قلت یا شدت یا مخالفت سے ان کے سفر میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا۔ سورۂ صٓ میں ہے: فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَاۗءً حَيْثُ اَصَابَ (۳۶) (پس ہم نے ہوا کو اس کی خدمت میں لگا دیا تھا وہ نہایت سازگاری کے ساتھ اس کے حکم سے چلتی جہاں وہ پہنچنا) سورۂ انبیاء میں ہے: وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا (۸۱) (اور ہم نے سلیمان کے لیے بادِ تند کو بھی مسخر کر دیا تھا جو چلتی تھی اس کے حکم سے اس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں)۔

آیت زیر بحث میں انہی جہازوں کے طولِ سفر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ان کی ایک ایک ٹرپ مہینہ مہینہ بھر کی طویل مدت پر ممتد ہوتی۔ ذکر اگرچہ ہوا کا ہے لیکن مقصود جہازوں ہی کا جانا اور آنا ہے۔ گویا اصل عامل کا ذکر کر کے معمول کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس لیے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا اصل تصرف ہواؤں ہی میں ظاہر ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ لمبے لمبے سفر اسی صورت میں ممکن تھے جب یہ جہازات نہایت بڑے بڑے بھی ہوں اور ان کے ساتھ ہوا کے کنٹرول کرنے کا نظام اتنا اعلیٰ اور مستحکم ہو کہ وہ ہر قسم کے سمندروں کے اندر ہر نوع کی ہواؤں کا نہایت خوبی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ فصیح عربی میں 'غدو' اور 'رواح' کے الفاظ صبح اور شام کی قید سے مجرد ہو کر صرف جانے اور آنے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَھْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ (آل عمران: ۱۲۱) (اور جب کہ تم نکلے اپنے گھر سے مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں میں مامور کرنے)۔ اسی طرح لفظ 'رواح' پر صاحبِ اقرب الموارد نے لکھا ہے کہ 'وقد یستعمل لمطلق المضی والذھاب' (یہ لفظ مطلق آنے اور جانے کے مفہوم میں بھی

استعمال ہوتا ہے)۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ ہوا کی تسخیر سے مراد مجرد ہوا کی تسخیر نہیں بلکہ جس طرح اوپر حضرت داؤد کے لیے لوہے کو نرم کرنے سے مقصود ان کی اسلحہ سازی اور جنگی قوت کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت بھی فرما دی ہے: 'وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ' (الانبیآء ۲۱: ۸۰) (اور ہم نے اس کو ایسے لباسوں کی صنعت سکھائی جو تمھاری جنگوں میں تمھیں محفوظ رکھے)، اسی طرح حضرت سلیمان کے لیے ہوا کی تسخیر سے مقصود ان کے بحری بیڑے کی قوت و شوکت کی طرف اشارہ مقصود ہے اور ان کے بحری بیڑے کی وسعت کا جو حال تھا اس کی طرف ہم سورۂ انبیاء کی تفسیر میں اشارہ کر چکے ہیں۔

تانبے کی صنعت

'وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ'۔ 'قطر' تانبے کو کہتے ہیں۔ تانبے کو تمدنی ترقی میں جو دخل حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں تانبے کی بھی بہت بڑی مقدار برآمد ہوئی اور اس کو انھوں نے اپنی تمدنی و تعمیری ترقیوں میں نہایت خوبی کے ساتھ استعمال کیا۔ آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تانبا سیال شکل میں برآمد ہوتا اور پھر منجمد ہو کر مختلف ضرورتوں میں استعمال ہوتا۔ آگے بڑی بڑی دیگوں اور لگنوں کا ذکر آ رہا ہے، ظاہر ہے کہ وہ اسی کی بنتی تھیں۔ ہیکل کی تعمیر میں بھی، جیسا کہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس دھات کا بہت استعمال کیا۔ آج عربوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے تیل کے چشمے جاری کر دیے ہیں، حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اس نے تانبے کا چشمہ جاری کر دیا تھا۔ زمین کے جتنے خزانے بھی ماضی میں دریافت ہوئے یا آج دریافت ہو رہے ہیں یا مستقبل میں دریافت ہوں گے وہ سب اللہ ہی کی بخشی ہوئی رہنمائی سے دریافت ہوئے اور ہوں گے۔ جن کی نگاہیں حقیقت بین ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر چیز کا منبع اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن جن کی نگاہوں کو سائنس نے خیرہ کر رکھا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کی اپنی کارستانی ہے۔

تسخیر جنات کا علم

'وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ'۔ سورۂ نمل کی تفسیر میں ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا علم بھی عطا فرمایا تھا جس کے ذریعے سے وہ شریر جنوں کو قابو میں کر کے ان کو اپنے مختلف کاموں میں استعمال کرتے تھے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جن براہ راست حضرت سلیمان علیہ السلام کے تصرف میں نہیں ہوتے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ ان کی اطاعت کرتے تھے۔ اور اگر ان سے کوئی عدول حکمی صادر ہوتی تو اللہ تعالیٰ ہی ان کو سزا دیتا تھا۔ 'وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ' (ان میں سے جو ہمارے حکم کی سرتابی کرے گا تو ہم اس کو آگ کا عذاب چکھائیں گے)۔ بعض لوگوں نے جنوں سے دیو ہیکل اور طاقتور آدمی مراد لیے ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ سورۂ نمل میں صاف تصریح ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا لشکر جنوں، انسانوں اور پرندوں سب پر مشتمل تھا۔ 'وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ' (اور سلیمان کے ملاحظہ کے لیے اس کا لشکر — جنوں، انسانوں

اور پرندوں پر مشتمل ـــــ اکٹھا کیا گیا) اگر جن سے مراد انسان ہی ہوتے تو یہاں جنوں کے الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

یَعْمَلُوْنَ لَہٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَ تَمَاثِیْلَ وَجِفَانٍ کَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِیٰتٍ ط اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُکْرًا ط وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ (۱۳)

حضرت سلیمانؑ نے جنات سے تعمیری کام لیے

یہ ان کاموں کی تفصیل ہے جن میں حضرت سلیمانؑ ان مسخر جنوں کو استعمال کرتے تھے۔ یہ سارے کام تعمیری، تمدنی اور اصلاحی ہیں۔ یہود اپنے دورِ زوال میں جب علوم سفلیہ میں مبتلا ہوئے تو ان خرافات کو انھوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا۔ یہاں قرآن نے واضح فرمایا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے جنات کو جس علم سے مسخر کیا وہ اللہ تعالیٰ نے خاص اپنے فضل سے ان کو بخشا تھا، اس کو سفلی علوم سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جنات سے جو کام انھوں نے لیے وہ سب تعمیری اور تمدنی کام تھے۔ ان کو انھوں نے فاسد اغراض کے لیے استعمال نہیں کیا۔ اس مضمون کی تفصیل سورۂ بقرہ میں آیت 'وَمَا کَفَرَ سُلَیْمٰنُ ... الآیۃ' کے تحت گزر چکی ہے۔

'محاریب'، 'تماثیل'

'مِنْ مَّحَارِیْبَ وَتَمَاثِیْلَ' یعنی ان جنوں سے حضرت سلیمان علیہ السلام محرابیں اور مجسمے بھی بنواتے تھے۔ 'محراب' میرے نزدیک اپنے معروف معنی ہی میں یہاں استعمال ہوا ہے اس کے خاص طور پر ذکر کی وجہ یہ ہے کہ کسی عمارت کا سب سے زیادہ نمایاں حصہ اس کی محرابیں ہی ہوتی ہیں جو دیکھنے والوں کو سب سے پہلے نظر آتی ہیں۔ اس وجہ سے تعمیری آرٹ کا سب سے زیادہ مظاہرہ انہی پر ہوتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی تعمیر کرائی ہوئی عمارتوں میں سے ہیکل اور ان کے محل کی تعمیر کی تفصیل کتاب سلاطین میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی محرابوں پر تعمیری آرٹ کا پورا کمال صرف کیا گیا تھا۔ ان پر نہایت خوبصورت پھولوں کے نقش ابھارے گئے تھے۔

'تماثیل'، 'تمثال' کی جمع ہے۔ 'تمثال' کسی چیز کی مصور یا کندہ کی ہوئی صورت، شبیہ یا اس کے پیکر اور مجسمہ کو کہتے ہیں۔ یہ صورت بے جان چیزوں کی بھی ہو سکتی ہے، مثلاً کسی دریا، پہاڑ، درخت، جھاڑی پھول وغیرہ کی اور حقیقی یا فرضی جاندار چیزوں کی بھی ہو سکتی ہے، مثلاً انسان، فرشتے، جنات اور حیوانات وغیرہ کی ـــــ تورات کی کتاب سلاطین سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ان دونوں ہی قسموں کی تماثیل بنوائیں۔ مثلاً ان کے محل کے ذکر کے سلسلہ میں ہے:

"اور ان حاشیوں پر جو پٹڑوں کے درمیان تھے شیر اور بیل اور کروبی بنے تھے۔" سلاطین ۱: ب - ۲۹

اسی طرح ہیکل کی تعمیر کے بیان میں ہے۔

"اور الہام گاہ میں اس نے زیتون کی لکڑی کے دو کروبی دس دس ہاتھ اونچے بنائے اور کروبی کا ایک بازو پانچ ہاتھ کا اور دوسرا بازو بھی پانچ ہی ہاتھ کا تھا۔"

"اور اس گھر کے اندر دیوار تھا جس پر لٹو اور کھلے ہوئے پھول کندہ کیے گئے تھے۔" سلاطین: باب ۶-۱۸

"اس گھر کی سب دیواروں پر گرداگرد، اندر اور باہر کروبیوں اور کھجور کے درختوں اور کھلے ہوئے پھولوں کی صورتیں کندہ کیں۔" سلاطین: ب ۶-۳۰

ایک اشکال کا جواب

جہاں تک بے جان چیزوں کی صورتوں اور مورتوں کا تعلق ہے ان کے جواز میں تو کوئی اختلاف رائے نہیں ہے لیکن جاندار چیزوں، بالخصوص فرشتوں کی مورتوں کا معاملہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو کس طرح جائز سمجھا۔ اگر اس کا جواب یہ دیا جائے، جیسا کہ عام طور پر ہمارے مفسرین نے دیا ہے، کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں یہ چیزیں حرام نہیں تھیں تو یہ جواب تورات سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ تورات میں ان چیزوں کی حرمت نہایت واضح الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔ خروج - ۲۰: ۲ - ۵ میں ہے:-

"خداوند تیرا خدا جو تجھے زمینِ مصر سے، غلامی کے گھر سے، نکال لایا، میں ہوں۔ میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہووے۔ تو اپنے لیے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت، جو اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں زمین کے نیچے ہے مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر کیونکہ میں تیرا خدا غیور خدا ہوں۔"

دیکھیے اس میں نہایت واضح الفاظ میں صورت یا مورت بنانے کی ممانعت ہے۔ اس وجہ سے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ پچھلی شریعتوں میں یہ چیزیں جائز تھیں، صرف اسلام میں یہ حرام قرار دی گئی ہیں۔ یہ چیزیں پہلے بھی ناجائز تھیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے تورات کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس وجہ سے ہمارا خیال یہ ہے کہ انھوں نے اسی قسم کی تماثیل بنوائی ہوں گی جن کا تعلق کلچر و آرٹ سے ہے اور مذہبی تقدس کا جن کے اندر کوئی شائبہ نہیں تھا۔ لیکن جب یہود میں مورت پرستی کا رواج ہوا ہوگا تو اس قسم کی چیزیں ان کے بادشاہوں نے بنوائی ہوں گی اور ان کو سندِ جواز دینے کے لیے ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا گیا ہوگا۔ آخر تمام علومِ سفلیہ بھی تو حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کی طرف یہود نے منسوب کیے جس کی تردید سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اسی طرح کی خرافات ان کی طرف کتاب سلاطین میں بھی منسوب کر دی گئی ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ یہود نے حضرت سلیمانؑ کو ایک پیغمبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بالکل دنیا دار بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کی سیرت ہر پہلو سے انھوں نے داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت سلیمانؑ کا جود و کرم

'وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ'۔ 'جفان' 'جفنة' کی جمع ہے جس کے معنی تھال اور لگن کے ہیں اور 'جوابی'، 'جابیة' کی جس کے معنی حوض کے ہیں۔ 'راسیات' پہاڑوں کی صفت کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ ان بڑی بڑی دیگوں کے لیے آیا ہے جو اتنی بھاری بھرکم ہوتیں کہ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کی جا سکتی تھیں۔ وہ ایک ہی جگہ چولہوں پر نصب رہتیں اور بیک وقت منوں کے حساب سے

ان میں کھانا پکتا۔

اوپر کے ٹکڑے میں سلیمانی تمدن کے آرٹ کے پہلو کو نمایاں کیا گیا تھا۔ اس ٹکڑے میں ان کے جود وکرم کو نمایاں کیا گیا ہے کہ جنات حضرت سلیمانؑ کے لیے بڑے بڑے لگن بناتے جو حوضوں کے مانند ہوتے اور بھاری بھرکم دیگیں بناتے جو ایک ہی جگہ لنگر انداز رہتی تھیں۔ یہ حوضوں کے مانند لگن اور بھاری بھرکم دیگوں کا ذکر حضرت سلیمانؑ کے جود وکرم کی تعبیر کے لیے ہے۔ اگر آپ کو یہ کہنا ہو کہ فلاں شخص بڑا فیاض ہے، اس کے خوانِ کرم سے ایک خلقِ عظیم کی پرورش ہو رہی ہے تو فصیح عربی میں اس کی تعبیر کے لیے یہ دو حرف کافی ہوں گے کہ لَہٗ قُدُوْرٌ رّٰسِیٰتٌ۔ عرب شعرائنے حاتم اور اپنے دوسرے فیاضوں کے لیے یہی استعارہ استعمال کیا ہے۔

رحمانی تمدن اور شیطانی تمدن

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں جو تمدن وجود میں آیا اس میں صرف سائنس، آرٹ اور شوکت کی نمائش ہی نہیں تھی بلکہ اس کے پہلو بہ پہلو اس میں غربا پروری کا نہایت وسیع اور فیاضانہ اہتمام بھی تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس تمدن کی تحسین فرمائی۔ جس تمدن میں یہ دونوں پہلو، پورے توازن کے ساتھ موجود ہوں وہ مبارک تمدن ہے۔ اس کے برعکس جس تمدن میں آرٹ اور طمطراق کی نمائش تو ہو لیکن غربا فاقے کریں وہ تمدن شیطانی ہے۔

نعمت کا حق خدا کی شکرگزاری ہے

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا۔ یہ اس فضل وانعام کا حق بیان ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمانؑ پر فرمایا۔ ان کو ہدایت ہوئی کہ اس علم وسائنس اور ان ارضی وسماوی برکات کو پاکر بہک نہ جانا بلکہ اپنے رب کی شکرگزاری کے ساتھ ہر چیز اس کے صحیح محل میں برتنا اور ہر قدم صحیح سمت میں اٹھانا۔ یہ نصیحت یوں تو اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت زبانِ حال سے بھی کرتی ہے لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام پیغمبر تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے بھی ان کو اس کی ہدایت فرمائی۔ اس کا ذکر زبور اور امثال دونوں میں بار بار آتا ہے۔ یہاں 'اٰلَ دَاوٗدَ' سے خطاب کے اندر حضرت سلیمان علیہ السلام، ان کے آل واولاد اور ان کے تمام اتباع کے لیے یہ یاددہانی ہے کہ خدا کی شکرگزاری میں اپنے باپ کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا اس لیے کہ یہ تمام عظمت و حشمت تم نے انہی سے وراثت میں پائی ہے اور ان کو اللہ نے یہ سب کچھ ان کی شکرگزاری کے صلہ میں عطا فرمایا تھا۔

ایک نہایت اہم تنبیہ

وَقَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ۔ یہ ایک مزید تنبیہ اور نہایت اہم تنبیہ ہے کہ شکر کی راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے بلکہ نہایت کٹھن راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں بخشتا بہتوں کو ہے لیکن ان کو پاکر ان کا حق ادا کرنے والے بہت تھوڑے نکلتے ہیں۔ زیادہ ایسے ہی نکلتے ہیں جو خدا کے باغی و نافرمان بن جاتے ہیں۔ اس سے حکمتِ دین کا یہ نکتہ واضح ہوا کہ صبر اور شکر میں سے زیادہ مشکل امتحان شکر کا امتحان ہے۔ حضرت مسیحؑ کے ارشادات سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے اسی حقیقت کو یوں واضح فرمایا

کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا آسان ہے پر دولت مند خدا کی بادشاہی میں نہیں داخل ہو سکتا۔'

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ ۖ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَن لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ (۱۴)

جنات کے پاس علم غیب کا کوئی ذریعہ نہیں ہے

اوپر کی آیات سے ان لوگوں کی پوری پوری تردید ہو گئی جو اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ حضرت سلیمانؑ کی ساری کارفرمائیاں نعوذ باللہ جنات کی رہینِ احسان تھیں۔ اب آخر میں یہ اشارہ بھی فرما دیا کہ جنات کے پاس غیب کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ وہ اس سے اسی طرح بے خبر ہیں جس طرح دوسری مخلوقات بے خبر ہیں۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے حضرت سلیمانؑ کی وفات کے واقعہ کا حوالہ دیا ہے کہ جس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات ہوئی وہ اپنے مسخر جنوں کے کام کی نگرانی کر رہے تھے لیکن جنات کو ان کی موت کی خبر نہیں ہوئی۔ وہ بدستور اپنی بیگار میں جتے رہے۔ بالآخر ایک طویل وقفہ کے بعد ان کو پتہ چل سکا کہ حضرت سلیمانؑ کی وفات ہو چکی ہے، تب وہ ان کی غلامی سے رہائی حاصل کر سکے۔

واقعہ کی صورت

واقعہ کی صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ اپنے اہم کاموں کی نگرانی، خصوصاً جو جنات کے ہاتھوں انجام پاتے، بنفسِ نفیس فرماتے۔ چنانچہ وہ اپنی عصا کی ٹیک لگائے ہوئے کسی تعمیری کام کی نگرانی کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں ان کی موت کا وقت آ گیا اور فرشتۂ اجل نے ان کی روح قبض کر لی لیکن وہ جس طرح عصا کے سہارے کھڑے تھے اسی طرح بدستور قائم رہے اور جنات اس ڈر سے اپنے کام میں لگے رہے کہ حضرت سلیمانؑ موجود ہیں۔ بالآخر ان پر ایک عرصہ گزر گیا اور اس اثنا میں دیمک نے عصا کو نیچے سے کھا لیا، جس کے بعد ان کا جسد مبارک زمین پر گرا۔ تب جنات کو یہ احساس ہوا کہ اگر ان کو غیب کا علم ہوتا تو وہ اتنی دیر تک اس بیگار کی ذلت میں گرفتار نہ رہتے۔

'دآبۃ الارض'

'دَابَّةُ الْأَرْضِ' کا ذکر یہاں جن قرائن کے ساتھ ہوا ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد دیمک ہے، 'منساۃ' عصا کو کہتے ہیں۔ یہ تصریح تو یہاں نہیں ہے کہ حضرت سلیمانؑ اس حالت میں کتنی دیر کھڑے رہے لیکن نہ اس طرح جسم کا قائم رہنا ذرا مستبعد ہے اور نہ دیمک کا اس طرح عصا کو کھا جانا ذرا مستبعد ہے۔ دیمک بڑی ظالم چیز ہے۔ اگر یہ کسی چیز کو لگ جائے تو بہت جلد اس کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے، عصا تو ایک معمولی چیز ہے، بالخصوص ایسی جگہوں میں جہاں یہ زیادہ ہو۔ پھر یہاں تو معاملے کی نوعیت بھی بالکل مختلف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ حضرت سلیمانؑ کی موت اس طرح واقع ہو کہ لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ حضرت سلیمانؑ جو ہوا اور جنات پر تصرف رکھتے تھے، وہ بھی اپنے تئیں مرگِ ناگہانی سے نہ بچا سکے اور جنات کے دماغ سے بھی یہ خبط نکل جائے کہ وہ غیب جانتے یا جان سکتے ہیں۔ ان حقائق کو واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی موت کو یہ شکل دی اور اللہ تعالیٰ جس کام کو کرنا چاہے وہ اس کو جس طرح چاہے کر سکتا ہے۔

جنات پر کشفِ حقیقت

'تَبَیَّنَتِ الْجِنُّ الآیۃ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اشرار جن، غیب کی ٹوہ میں ہمیشہ رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے وہ آسمانوں میں بھی، جیسا کہ سورۂ جن اور قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، استراقِ سمع کے لیے بیٹھتے رہے ہیں۔ اور اپنے دامِ فریب میں آئے ہوئے انسانوں پر انھوں نے یہ دھونس بھی جما رکھی تھی کہ ان کے پاس غیب کے اسرار سے واقف ہونے کے ذرائع موجود ہیں لیکن اس واقعہ نے ان کی آنکھیں کھول دیں اور ان پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آسمان تو بہت دور رہے انھیں تو اپنے سر پر کے اتنے بڑے واقعہ کی بھی خبر نہ ہو سکی جس کے باعث انھیں غلامی کے رسوا کن عذاب میں کچھ عرصہ مزید گرفتار رہنا پڑا۔

اس ٹکڑے سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنی بیگار میں صرف شریر جنوں کو لگایا تھا اور ان کے علمِ تسخیر کا تعلق صرف انہی سے تھا۔

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ ۚ جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ ۚ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ (۱۵)

ناشکروں کا کردار اور ان کا انجام

'سبا' کا ذکر سورۂ نمل کی آیت ۲۲ کے تحت گزر چکا ہے۔ جو علاقہ اب یمن کہلاتا ہے وہی پہلے سبا کا علاقہ تھا۔ یہ نہایت زرخیز و شاداب خطہ تھا۔ اس کی اصل شاہراہ کے دونوں جانب نہایت شاداب باغوں کا سلسلہ تھا جو پورے علاقہ پر پھیلا ہوا تھا لیکن اس کے باشندوں نے اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر نہیں کی، جس کی پاداش میں اللہ نے ان پر ایک سیلاب بھیجا جس سے پورا ملک تباہ ہو کر رہ گیا۔ اوپر حضرت داؤد و حضرت سلیمان علیہما السلام کا کردار شکر گزار بندوں کے کردار کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اب یہ ناشکروں کا کردار اور ان کا انجام پیش کیا جا رہا ہے۔ سورۂ نحل کی آیات ۱۱۲-۱۱۳ میں بھی ان کی مثال سے قریش کو عبرت دلائی گئی ہے۔

سبا اور اہلِ سبا

'لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ'۔ 'سَبَا' سے مراد یہاں اہلِ سبا ہیں۔ اور 'مسکن' یہاں خطہ اور علاقہ کے مفہوم میں ہے۔ لفظ 'اٰیۃ' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ سبا کے لیے ان کے علاقے میں خدا کی رحمت و ربوبیت اور اس کے فضل و انعام کی بہت بڑی نشانی موجود تھی لیکن انھوں نے اس کی قدر نہیں کی۔ اس سے ان کو جو سبق حاصل کرنا تھا وہ سبق انھوں نے حاصل نہیں کیا۔

'جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ'۔ یہ اس نشانی کی وضاحت ہے کہ ان کے دونوں جانب، دہنے اور بائیں، باغوں کی دو قطاریں تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ کے وسط سے ان کی مرکزی شاہراہ گزرتی تھی اور اس شاہراہ کے دونوں جانب باغوں کی قطاریں تھیں۔ 'جَنَّتٰن' یہاں دو باغوں کے مفہوم میں نہیں بلکہ باغوں کی دو قطاروں کے مفہوم میں ہے۔ مثنّٰی کے اس طریق استعمال کی مثالیں عربی میں موجود ہیں اور یہاں اس کا قرینہ واضح ہے۔

'كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ'۔ خدا کی اس عظیم نشانی سے جو درس حاصل ہوتا ہے

اور جو اہلِ سبا کو حاصل کرنا تھا یہ اس کا بیان ہے کہ یہ عظیم رحمت و رفاہیت اپنی زبانِ حال سے ان کو درس دے رہی ہے کہ اپنے رب کے اس عظیم خوانِ کرم سے بہرہ مند ہوں اور اس کے شکرگزار رہیں۔

نعمت کا حق منعم کی شکرگزاری ہے

'بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّرَبٌّ غَفُوْرٌ' ۔ 'طَيِّبَة' یہاں زرخیز و شاداب کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے ـــــ یہ اسی درس کی مزید توضیح ہے کہ اگر وہ کھلی آنکھوں سے اپنے ملک کو دیکھتے تو اس وسیع خوانِ کرم کو، جس پر اس فیاضی کے ساتھ ان کے لیے نعمتیں چنی گئی تھیں، دیکھ کر ان پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی کہ جس نے یہ خوانِ کرم بچھایا ہے وہ بڑا ہی غفار و ستار آقا ہے جس نے بلا کسی استحقاق کے، ان کی ناقدریوں اور ناشکریوں کے باوجود، ان کے لیے اپنی نعمتوں کے یہ انبار لگا دیے ہیں ـــــ یہ حقیقت اس کتاب میں ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ نعمت پا کر منعم کی شکرگزاری کا شعور انسانی فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔ یہ چیز حیوانات کی جبلت میں بھی داخل ہے۔ اگر کوئی انسان اس شعور سے عاری ہے تو وہ حیوانات سے بھی بدتر ہے۔

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ اُكُلٍ خَمْطٍ وَّاَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ (۱۶)

سدِ مآرب

'عَرِم' کے معنی بعض اہلِ لغت نے زوردار بارش کے لکھے ہیں اور بعض نے اس کو 'عَرِمَة' کی جمع بتایا ہے، جو تہ بہ تہ اکٹھا کیے ہوئے پتھروں کے لیے آتا ہے۔ پھر یہیں سے یہ اس سد یا بند کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جو کسی وادی کے درمیان پانی کو روکنے کے لیے بنایا جاتا ہے۔ اقرب الموارد میں ہے 'مُسدّ یعترض به الوادی' (وہ بند جو وادی کے بیچ میں بنایا جائے) جس طرح ہمارے منگلا اور تربیلا ڈیم ہیں۔ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح کا ایک کئی میل لمبا چوڑا ڈیم اہلِ سبا کا بھی تھا جو ان کو سیلاب کے خطرات سے محفوظ بھی کیے ہوئے تھا اور آب پاشی کے لیے بھی بقدرِ ضرورت اس سے ان کو پانی حاصل ہوتا تھا۔ تاریخوں میں اس کا ذکر سدِ مآرب کے نام سے آتا ہے۔ 'مآرب' سبا کا دار السلطنت تھا۔ یہ بند غالباً ۵۴۲ء میں ٹوٹا اور اس کے ٹوٹنے سے سارا ملک تباہ ہو گیا۔

ناشکری کا انجام

'فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ نعمتیں دیں تو ان کو پا کر وہ خدا کے شکرگزار رہنے کے بجائے طغیان و فساد میں مبتلا ہوئے۔ سورۂ نحل کی آیت ۱۱۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو انذار کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک رسول بھیجا لیکن انھوں نے اس کی پروا نہ کی بالآخر ان پر خدا کا عذاب اس شکل میں آیا کہ ایک عظیم سیلاب نے ان کے بند کو توڑ دیا جس سے ان کا سارا ملک تاراج ہو کر رہ گیا۔

'وَبَدَّلْنٰهُمْ الآیۃ' ۔ 'خمط' بدمزہ، کڑوے کسیلے پھلوں کو کہتے ہیں۔ یعنی اس سیلاب نے ان کے ملک کو اس طرح تلپٹ کر کے رکھ دیا کہ شاداب باغوں کی جگہ کڑوے کسیلے پھلوں کے کچھ درخت اور کچھ جھاؤ اور بیری کی جھاڑیاں رہ گئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیلاب نے صرف ان کے باغ ہی ویران نہیں کیے

بلکہ ان کے پورے علاقے پر کسی ایسی مٹی یا ریت کی تہ جما دی جس نے بچے کھچے درختوں کے مزاج بھی بدل دیے اور پورا علاقہ صرف جنگلی جھاڑیوں ہی کے لیے موزوں رہ گیا۔

ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا ۭ وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ (۱۷)

'مجازات' کے معنی بدلہ دینے کے ہیں۔ بدلہ برا بھی ہوتا ہے اور اچھا بھی۔ اس وجہ سے اس کے صحیح مفہوم کا تعین موقع و محل سے ہوتا ہے۔ یہاں موقع برے بدلہ کا ہے اس وجہ سے یہاں یہ لفظ اسی معنی میں لیا جائے گا۔ فرمایا کہ ہم نے ان کو یہ سزا ان کے کفرانِ نعمت کی پاداش میں دی اور اس قسم کی سزائیں ہم ناشکروں کے سوا کسی اور کو نہیں دیتے۔

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ ۭ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ (۱۸)

اہلِ سبا کی رفاہیت کی مزید تفصیل

'اَلْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا' سے ملک شام وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جن کے ساتھ اہلِ سبا کے تجارتی تعلقات تھے۔ یہ ملک بہت زرخیز تھے اس وجہ سے ان کی صفت 'بٰرَكْنَا فِيْهَا' آئی ہے۔ زرخیز ممالک سے تجارتی تعلقات بجائے خود آمدنی اور رفاہیت کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

'قُرًى ظَاهِرَةً' سے مراد وہ شہر اور قصبات ہیں جو اس شاہراہ پر واقع تھے جس کے دونوں جانب باغوں کی قطاریں تھیں۔ یعنی ان بستیوں کے علاوہ جو اندرونِ ملک واقع تھیں موزوں فاصلوں سے اس شاہراہ پر بھی بستیاں آباد تھیں جو ان کے لیے منزلوں کا کام دیتی تھیں۔ وہ ان میں بے خوف و خطر ٹھہرتے، آرام کرتے اور پھر آگے کی منزل کے لیے سفر کرتے۔

'وَقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ' یعنی یہ بستیاں ایسے مناسب فاصلوں پر واقع تھیں کہ گویا قدرت نے خود اپنے اہتمام سے ان کے لیے منزلیں مقرر کر دی تھیں۔

'سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ' یہ ان آسائشوں کی زبانِ حال کی تعبیر ہے کہ قدرت نے یہ سارا اہتمام کر کے گویا ان کے لیے ہر منزل پر یہ کتبہ لگا دیا کہ تمھاری خاطر یہ اہتمام ہم نے اس لیے کیا ہے کہ تم راتوں میں بھی اور دنوں میں بھی بے خوف و خطر سفر کر سکو ـــــ یہاں اتنی بات حذف ہے کہ 'اور اپنے اس رب کے شکرگزار رہو جس نے تمھارے لیے یہ سارا اہتمام کیا ہے' ـــــ اس کو حذف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر انعام کا یہ فطری تقاضا ہے اور اوپر آیت ۱۵ میں اس کا بیان ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے اس کو دہرانے کے بجائے بعد والی آیت میں ان کے اس رویہ کی طرف اشارہ فرما دیا جو انھوں نے اختیار کیا اور جس کے نتیجہ میں وہ ان تمام نعمتوں سے محروم ہوئے۔

اس زمانے کی عام گمراہی کا اصلی سبب

یہاں یہ حقیقت ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان تمام آسائشوں اور رفاہیتوں کے اہتمام کو براہِ راست اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ یہ حقیقت نفس الامری کا بیان ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو فتوحات بھی حاصل

ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن انسان اپنی ناشکری کے باعث ہر چیز کو اپنی سعی و تدبیر کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس زمانے کی عام گمراہی کا اصلی سبب انسان کی یہی بے بصیرتی ہے اور سائنس کی ایجادات نے اس غرور میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ اب اللہ ہی اس کو دور کر سکتا ہے۔

فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ (۱۹)

زبانِ حال کی تعبیر

یہ ان کے زبانِ قال کی نہیں بلکہ زبانِ حال کی تعبیر ہے کہ انھوں نے یہ رفاہیتیں پا کر رویہ جو اختیار کیا اس سے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ ان آسائشوں کے حقدار نہیں ہیں بلکہ اس بات کے سزاوار ہیں کہ ان کی بستیاں ویران ہو جائیں، ان کی منزلیں کٹھن ہو جائیں اور ان کی یہ ساری رفاہیتیں ان سے چھین لی جائیں۔ زبانِ حال کی تعبیرات کی مثالوں کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی نظیریں پیچھے گزر چکی ہیں اور یہ حقیقت بھی ہم واضح کر چکے ہیں کہ اصل شہادت زبانِ حال ہی کی ہوتی ہے نہ کہ زبانِ قول کی۔ یہود کا قول 'سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا' بھی ان کے حال ہی کی تعبیر ہے۔

'وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ'، یعنی انھوں نے خدا کی ناشکری و نافرمانی کی اور اس طرح خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھائے کہ خدا کے قہر و غضب کو دعوت دی۔ خدا کا انھوں نے کچھ نہیں بگاڑا۔

'فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ'۔ یہ ان کی ناشکری کا انجام بیان ہوا ہے کہ بالآخر وہ اس طرح پامال ہوئے کہ حاضر کے صفحہ سے مٹ کر صرف ماضی کی ایک داستانِ پارینہ بن کے رہ گئے۔ 'وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ' یعنی جو سیلاب کی آفت سے بچے بھی وہ بھی ملک کی معیشت برباد ہو جانے کے باعث بالکل پراگندہ ہو گئے۔ کوئی کہیں گیا کوئی کہیں۔

ایک قابلِ غور نکتہ

'اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ'۔ اوپر آیت ۱۷ میں جس طرح اس سرگزشت کے اصل سبق کی طرف 'وَهَلْ نُجٰزِيْٓ اِلَّا الْكَفُوْرَ' سے توجہ دلائی ہے اسی طرح یہاں اسی حقیقت کی طرف 'لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ' کے الفاظ سے توجہ دلائی ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اہلِ سبا کی سرگزشت یہاں دو مرتبہ دہرائی گئی ہے اور دونوں مرتبہ ان کے عبرت انگیز انجام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ پہلے ان کے علاقے کی زرخیزی و شادابی کے ذکر کے بعد ان کی ناشکری اور اس کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا پھر ان کی تمدنی و تجارتی ترقیوں کے ذکر کے بعد ان کے کفرانِ نعمت کے نتیجہ میں ان کے انتشار کی طرف۔ یہ اسلوب بیان اس لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ اصل مقصود جس کے لیے یہ سرگزشت سنائی جا رہی ہے نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ قرآن میں اس اسلوبِ بیان کی متعدد نہایت بلیغ مثالیں موجود ہیں۔

'صبر' اور 'شکر' کی شانیں

'صبر' اور 'شکر' دونوں توام ہیں۔ یہ دونوں بیک وقت مطلوب ہیں۔ جس کے اندر صبر نہ ہو وہ شکر کا حق ادا نہیں کر سکتا اور جس کے اندر شکر نہ ہو وہ صبر نہیں کر سکتا اور اس دنیا کے دارالامتحان میں ہر قدم پر بندے کا

امتحان ان دونوں ہی چیزوں میں ہوتا رہتا ہے اور اسی امتحان پر اس کی اُخروی کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے۔ فرمایا کہ اس سرگزشت میں صبر و شکر کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ مثلاً

- اس دنیا میں جو نعمتیں بھی حاصل ہوتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ ہوتی ہیں اس وجہ سے ان کو پا کر غرور میں مبتلا ہونے کے بجائے انسان کو اپنے رب کا شکر گزار اور اس کا فرمانبردار رہنا چاہیے۔
- جو نعمتیں بھی ملتی ہیں وہ کسی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ امتحان کے طور پر ملتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو دے کر دیکھتا ہے کہ اس کے بندے اس کے شکرگزار رہتے ہیں یا ناشکری کرتے ہیں۔
- اس امتحان میں جو قومیں ناکام ہو جاتی ہیں وہ قومی حیثیت سے اس دنیا میں اس کا انجام دیکھ لیتی ہیں۔ آخرت میں ہر شخص کے سامنے انفرادی حیثیت سے اس کا انجام آئے گا۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (۲۰)

ناشکرے لوگ ابلیس کی توقعات پوری کرتے ہیں

یہ ابلیس کے اس گمان کی طرف اشارہ ہے جس کا اظہار اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس وقت کیا تھا جب آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا اس کو حکم دیا گیا اور اس نے اس کی تعمیل سے انکار کیا۔ اس وقت اس نے یہ کہا تھا کہ میں اولادِ آدم پر اس طرح گھیرے ڈالوں گا کہ ان کی اکثریت تیری جگہ میری پیروی کرے گی ﴿فَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ﴾ (الاعراف: ۱۷) (اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکرگزار نہیں پائے گا)۔ یہاں اس کا حوالہ دینے سے مقصود اس کے انجام کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ جب انھوں نے اپنے بارے میں ابلیس کے گمان کو سچا ثابت کر دیا تو لازماً ان کے سامنے اس کا انجام بھی آیا اور آئے گا، یعنی اس دنیا میں یہ سیلاب کے عذاب سے دوچار ہوئے اور آخرت میں یہ جہنم کے عذاب میں جھونک دیے جائیں گے۔ قرآن میں جہاں ابلیس کی مذکورہ بالا دھمکی کا ذکر ہے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ جواب بھی مذکور ہے کہ 'جو تیری پیروی کریں گے خواہ جنوں میں سے ہوں یا انسانوں میں سے، میں ان سب کو جہنم میں بھر دوں گا'۔

'اِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ' پیچھے سورۂ نحل کی آیت ۱۱۳ کے حوالہ سے ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اہلِ سبا کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک رسول بھی بھیجا تھا۔ اس آیت سے واضح ہوا کہ ان کی اکثریت نے اس رسول کی تکذیب کر دی۔ صرف تھوڑے سے لوگ ان پر ایمان لائے اور وہی اس عذاب سے محفوظ رہے جو ان کی قوم پر آیا۔

وَمَا كَانَ لَهُ عَلَيْهِم مِّن سُلْطَانٍ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يُؤْمِنُ بِالْآخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ مِنْهَا فِي شَكٍّ وَرَبُّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَفِيظٌ (۲۱)

ایک شبہ کا ازالہ

یہ ایک دفعِ دخلِ مقدر یعنی برسرِ موقع ایک شبہ کا ازالہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ مبتلا رہے کہ شیطان کو لوگوں پر کوئی اختیار حاصل ہے کہ وہ جس کو چاہے گمراہ کر دے۔ فرمایا کہ شیطان کو اس طرح کا کوئی اختیار اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر نہیں دیا ہے۔ اس کو صرف اس بات کی مہلت ملی ہے کہ وہ لوگوں کو بدی کے راستہ کی دعوت دے سکتا ہے اور یہ مہلت اس کو اس لیے دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا امتحان کرنا

چاہتا ہے کہ کون آخرت پر ایسا مضبوط ایمان رکھتا ہے کہ شیطان کی ترغیبات کے باوجود جادۂ حق پر استوار رہتا ہے اور کون شک میں مبتلا ہے کہ شیطان کے بہکانے سے اس کی راہ پر لگ جاتا ہے۔ 'لِنَعْلَمَ' سے پہلے کوئی فعل 'انظرناہ' یا 'امھلناہ' کے معنی میں محذوف ہے اور اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ' یعنی اللہ تعالیٰ اس رزم گاہِ امتحان میں شیطان اور انسان کو آمار کر خود الگ تھلگ ہو کر نہیں بیٹھ رہا ہے بلکہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ شیطان اپنے حدود سے متجاوز ہو سکے اور ممکن نہیں ہے کہ انسان اپنی کسی دادرسی سے محروم رہ جائے۔ اگر انسان اپنا فرض اپنے امکان کی حد تک ادا کرنے کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی اس دنیا میں بھی مدد فرمائے گا اور آخرت میں بھی اس کی ہر سعی کا بھرپور صلہ دے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان اور اس کی ذریات کے غلبہ سے مایوس ہو کر ادائے فرض سے دستکش ہونا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو مہلت تو ضرور دی ہے لیکن اپنی دنیا اس کے حوالے نہیں کر دی ہے۔ بلکہ ہر چیز کی نگرانی وہ خود فرما رہا ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۲ - ۲۷

اوپر کی آیات میں یہ حقیقت واضح فرمائی کہ تمام رحمت و نعمت اللہ ہی کے اختیار میں ہے اس وجہ سے شکرگزاری اور بندگی کا حقیقی سزاوار وہی ہے۔ اب آگے مشرکین کو چیلنج کیا ہے کہ تم اپنے جن معبودوں کو خدا کا شریک بنائے بیٹھے اور ان کی سفارش کی امید پر خدا کی پکڑ سے بے فکر ہو ان کے حق میں کوئی دلیل اپنے پاس رکھتے ہو تو اس کو پیش کرو۔ ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرایا ہے کہ اگر تمھارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، محض ضد اور مکابرت کی وجہ سے اپنی بات پر اڑے ہوئے ہو تو تمھارے ساتھ بحث میں ہم اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے بلکہ معاملہ اللہ کے حوالہ کرتے ہیں۔ وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۲ - ۲۷

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ﴿۲۲﴾ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۭ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ ﴿۲۳﴾ قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ قُلْ لَّا تُسْــَٔـلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْــَٔـلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ؕ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ﴿۲۶﴾ قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ؕ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۲۷﴾

ترجمۂ آیات ۲۲-۲۷

بلاؤ ان کو جن کو تم نے خدا کے سوا معبود گمان کر رکھا ہے! وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کوئی اختیار رکھتے ہیں اور نہ زمین میں۔ اور نہ ان دونوں میں ان کا کوئی ساجھا ہے اور نہ ان میں سے کوئی اس کا مددگار رہے۔ اور اس کے ہاں کوئی شفاعت کارگر نہیں ہوگی مگر اس کے لیے جس کے لیے وہ اجازت دے۔ یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے دہشت دور ہوگی وہ پوچھیں گے کہ تمھارے رب نے کیا حکم فرمایا؟ وہ جواب دیں گے کہ بالکل حق ارشاد ہوا! اور وہ نہایت عالی مقام اور عظیم ہے! ۲۳

ان سے پوچھو، تم کو آسمانوں اور زمین سے کون رزق بہم پہنچاتا ہے؟ کہو، اللہ! اور ہم ہیں اور تم ہیں سے کوئی ایک ہدایت پر ہے یا کھلی ہوئی گمراہی میں! کہہ دو، نہ ہم نے جو جرم کیے ان کی بابت تم سے پرسش ہونی ہے اور نہ تمھارے اعمال سے متعلق ہم سے سوال ہوگا۔ کہہ دو، ہمارا رب ہم سب کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان بالکل انصاف کے مطابق فیصلہ فرمائے گا اور وہی فیصلہ فرمانے والا اور علم والا ہے۔ ۲۴-۲۶

کہو، ذرا مجھے ان کو دکھاؤ تو جن کو تم نے شریک بنا کر اس کے ساتھ جوڑ رکھا ہے! ہرگز نہیں! بلکہ وہ اللہ عزیز و حکیم ہے! ۲۷

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ (۲۲)

مشرکین کو کھلا ہوا چیلنج

یہ مشرکین کو کھلا ہوا چیلنج ہے کہ جن کو تم نے خدا کا شریک گمان کر رکھا ہے ذرا ان کو بلاؤ، ہم بھی ان کی صورت دیکھیں وہ کیسے اور کہاں ہیں! اس قسم کا چیلنج مخاطب کو اس وقت دیا جاتا ہے جب اس کا دعویٰ بالکل ہی بے سر و پا ہو اور ہر پہلو سے اس پر حجت تمام کی جا چکی ہو۔ یہی اندازِ خطاب آگے آیت ۲۷ میں ہے: قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ۚ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (ان سے کہو، ذرا مجھے ان کو دکھاؤ جن کو تم نے شریک بنا کر خدا کے ساتھ جوڑ رکھا ہے! ہرگز نہیں! بلکہ وہ اللہ عزیز و حکیم ہے)۔

'لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ'۔ یہ اسی چیلنج کی مزید وضاحت ہے کہ تم نے ان کو شریکِ خدا گمان کر رکھا ہے حالانکہ نہ وہ آسمانوں میں ذرہ برابر کوئی اختیار رکھتے نہ زمین میں۔ یہی بات اسی سورہ کی پہلی ہی آیت میں اس طرح واضح فرمائی گئی ہے 'لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ' (اسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے)۔

'وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ'۔ یعنی ان دونوں کی خلقت میں ان کا کوئی بھی ساجھا نہیں ہے۔ دوسرے مقام میں فرمایا ہے: 'مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' (الکہف ۵۱) (میں نے آسمانوں اور زمین کی خلقت کے وقت ان میں سے کسی کو نہیں بلایا کہ ذرہ برابر وہ میرا ہاتھ بٹائیں)۔

'وَمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ'۔ یعنی زمین و آسمان کے انتظام و انصرام میں بھی خدا نے ان میں سے کسی کو اپنا معین و مددگار نہیں بنایا ہے بلکہ اپنی ساری خدائی کا انتظام تنہا وہ خود ہی سنبھالے ہوئے ہے اور یہ چیز ذرا بھی اس پر بار نہیں ہے۔ یہ مشرکین کے اس وہم کی تردید ہے کہ زمین چونکہ خدا کی مملکت کا نہایت دور دراز علاقہ ہے اس وجہ سے اس کا انتظام اس نے اپنے دوسرے شریکوں کے سپرد کر رکھا ہے۔

وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا الْحَقَّ ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ (۲۳)

مشرکین کے مزعومہ تصورِ شفاعت کی نفی

حق و اختیار کی نفی کے بعد یہ ان کے مزعومہ تصورِ شفاعت کی بھی نفی کر دی۔ فرمایا کہ اگر ان کی شفاعت کی امید پر بیٹھے ہو تو یاد رکھو کہ خدا کے حضور میں کسی کی شفاعت کسی کے لیے نافع نہیں ہوگی مگر اس کے لیے جس کے لیے خدا اجازت دے یعنی اول تو خدا کے اذن کے بدون کوئی کسی کی شفاعت کی جرأت

ہی نہیں کرے گا، پھر اجازت کے بعد بھی وہ شفاعت صرف اسی کے لیے کرے گا جس کے لیے اس کو اجازت مرحمت ہوئی ہوگی۔ کسی ایسے کے بارے میں وہ زبان نہیں کھول سکے گا جس کے لیے اس کو اجازت نہ ملی ہو۔ دوسرے مقامات میں یہ وضاحت بھی فرما دی گئی ہے کہ وہ وہی بات کہے گا جو حق ہوگی۔ خدائے علام الغیوب کے آگے نہ کوئی کسی باطل کو حق بنا سکے گا اور نہ کوئی بات حق کے خلاف زبان سے نکال سکے گا۔

یہ مشرکین کے اس گمان کی تردید ہے جو وہ اپنے معبود فرشتوں سے متعلق رکھتے تھے کہ وہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں اس وجہ سے وہ اپنے باپ سے جو بات چاہیں منوا سکتی ہیں اور خدا کو ان کی ناز برداری میں ان کی ہر بات ماننی پڑتی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا فُزِّعَ عَنۡ قُلُوۡبِہِمۡ قَالُوۡا مَاذَا ۙ قَالَ رَبُّکُمۡ ؕ قَالُوا الۡحَقَّ ۚ

'تفزیع' کے اصل معنی ڈرا دینے اور دہشت زدہ کر دینے کے ہیں لیکن جب اس کا صلہ 'عن' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی دہشت دور کر دینے کے ہو جاتے ہیں۔ 'فُزِّعَ عَنۡ قُلُوۡبِہِمۡ' کے معنی ہوں گے 'جب ان کے دلوں سے دہشت دور کر دی جائے گی'۔

قیامت کے روز فرشتوں کا حال

یہ حال بیان ہوا ہے قیامت کے دن فرشتوں کا کہ اس دن آگے بڑھ کر ناز و تدلل کے ساتھ کسی کی شفاعت کرنا تو الگ رہا تمام خلق کی طرح ان پر بھی اس دن ایسا ہول طاری ہوگا کہ انھیں کچھ خبر نہیں ہوگی کہ لوگوں کے باب میں رب العزت کی بارگاہ سے کیا حکم صادر ہوا۔ جب ان کی دہشت دور ہوگی تو وہ دوسروں سے سوال کریں گے کہ تمھارے رب کی طرف سے کیا حکم صادر ہوا؟ وہ جواب دیں گے کہ بالکل بجا حکم صادر ہوا ہے۔

فرشتوں سے متعلق مشرکین کے اسی تصور کی تردید کرتے ہوئے سورۂ زمر میں یوں ارشاد فرمایا ہے:

وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖ ٭ۖ وَ الۡاَرۡضُ جَمِیۡعًا قَبۡضَتُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ السَّمٰوٰتُ مَطۡوِیّٰتٌۢ بِیَمِیۡنِہٖ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ﴿﴾ وَ نُفِخَ فِی الصُّوۡرِ فَصَعِقَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰہُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِیۡہِ اُخۡرٰی فَاِذَا ہُمۡ قِیَامٌ یَّنۡظُرُوۡنَ ﴿﴾ (الزمر ۶۷-۶۸)	اور انھوں نے اللہ کی صحیح شان نہیں پہچانی! اور وہ زمین کو قیامت کے دن مٹھی میں لے لے گا اور آسمانوں کی بساط بھی اس کے ہاتھ میں لپیٹی ہوئی ہوگی۔ وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور صور پھونکا جائے گا تو جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں بے ہوش ہو کر گر پڑیں گے، مگر جن کو اللہ محفوظ رکھنا چاہے۔ پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب اٹھ کھڑے ہوں گے، تاکتے ہوئے۔

یہ باتیں احوالِ قیامت سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ ان کا صحیح تصور اس دنیا میں ممکن نہیں ہے لیکن یہ دونوں

آیتیں ایک ہی موقع ومحل کی ہیں اس وجہ سے اگر آیت زیرِ بحث کا مفہوم سورۂ زمر کی مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ بات نکلتی ہے کہ جب پہلی دفعہ صور پھونکا جائے گا تو آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات سب بے ہوش ہو کر گر پڑیں گی۔ صرف وہی لوگ اس سے محفوظ رہ سکیں گے جن کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ انہی لوگوں کا ذکر دوسرے مقام میں یوں آیا ہے: لَا یَحْزُنُھُمُ الْفَزَعُ الْاَکْبَرُ (الانبیاء ۱۰۳) (ان کو سب سے بڑے ہول کا غم لاحق نہیں ہوگا) پھر جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب لوگ اٹھ کھڑے ہوں گے اور حیرت و دہشت کے ساتھ دیکھیں گے کہ یہ کیا ہو گیا اور کیا ہونے والا ہے! معلوم ہوتا ہے اسی مرحلے میں فرشتے وہ سوال کریں گے جو 'مَاذَا قَالَ رَبُّکُمْ' کے الفاظ سے یہاں مذکور ہے۔ اس سوال سے ان کی سراسیمگی اور دہشت زدگی کا اظہار ہو رہا ہے کہ نازو اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ کر کسی کی سفارش کرنا تو درکنار، صورتِ حال ایسی ہوگی کہ خود ان کے اپنے اوسان بجا نہیں رہیں گے۔ وہ دوسروں سے پوچھیں گے کہ بارگاہِ الٰہی سے کیا حکم صادر ہوا ہے؟ دوسرے جواب میں صرف یہ کہیں گے کہ جو حکم ہوا ہے وہ بالکل حق ہے۔ 'الحق' فعل محذوف سے منصوب ہے۔ یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے بھی ہو سکتا ہے جن کے معاملات کا اس دن فیصلہ ہوگا اس لیے کہ اس دن حق اس طرح واضح ہو جائے گا کہ کوئی بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کر سکے گا کہ اس کے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہے اور امکان اس کا بھی ہے کہ یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے ہو جو اس دن کے ہول سے محفوظ رکھے جائیں گے اور جن کی طرف سورۂ زمر کی مذکورہ بالا آیت میں 'اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اگر یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے مانا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دن اکثریت کا حال تو یہ ہوگا کہ ان کو خود اپنی پڑی ہوگی وہ دوسروں کی سفارش کیا کریں گے اور جو اس دن کے ہول سے امان میں رکھے جائیں گے ان کا حال یہ ہوگا کہ وہ پکاریں گے کہ ربِّ عادل و کریم نے جو فیصلہ فرمایا ہے وہ بالکل حق فرمایا ہے ــــــ مطلب یہ ہے کہ جب اصل حقیقتِ حال یہ ہے تو وہ کون لوگ ہیں جن کی شفاعت پر مشرکین تکیہ کیے ہوئے ہیں!

'وَھُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی ہی بلند و ارفع اور بڑی باعظمت و باجبروت ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے آگے اس کے اذن کے بغیر زبان کھول سکے اور نہ کسی کی یہ شان ہے کہ اس تک اس کی رسائی ہو سکے۔

فرشتوں میں سب سے زیادہ عالی مقام حضرت جبریل امین ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ تک رسائی کے معاملے میں ان کی بے بسی کا بھی یہ حال ہے کہ

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

اس مسئلہ پر مزید بحث ان شاء اللہ اگلی سورہ میں آئے گی۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ۙ وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۲۴)

ایک مسلّم حقیقت

یعنی ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین سے کون تم کو روزی دیتا ہے؟ کون آسمانوں سے پانی برساتا، سورج چمکاتا اور موسمی تغیرات پیدا کرتا ہے اور کون زمین سے بیجوں کو اگاتا، سبزوں کو نشو و نما دیتا اور فصلوں کو بارآور کرتا ہے؟

قُلِ اللّٰهُ۔ فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے اور آسمانوں اور زمین کی یہ سازگاری اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ ان دونوں کے اندر ایک ہی خدائے قادر و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے۔

یہاں سوال کرنے کے بعد اس کا جواب بھی خود ہی دے دیا ہے۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ اس جواب سے مخاطب کے لیے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اہلِ عرب کے عقائد سے متعلق یہ بات ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں کہ وہ اپنی دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کو خالق یا رازق نہیں مانتے تھے بلکہ صرف سفارشی اور ذریعۂ تقرب مانتے تھے۔ قرآن میں یہ تصریح موجود ہے کہ اگر ان سے پوچھو کہ تم کو آسمانوں اور زمین سے کون روزی دیتا ہے تو جھٹ جواب دیں گے کہ اللہ! چونکہ یہ بات مخاطب کو تسلیم تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہی مسلّمہ حقیقت یہاں ان کے سامنے رکھ دی ہے۔

ضدی مخاطب سے موادعت کا اعلان

وَاِنَّآ اَوْ اِيَّاكُمْ لَعَلٰى هُدًى اَوْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ مطلب یہ ہے کہ اسی مسلّمہ حقیقت پر ہماری دعوت کی بنیاد ہے۔ اگر تم اس پر ہم سے جھگڑ رہے ہو تو مزید کسی بحث و جدال کی ضرورت نہیں ہے۔ یا تو ہم ہدایت پر ہیں اور تم کھلی ہوئی گمراہی میں ہو یا تم ہدایت پر ہو اور ہم ضلالت پر ہوئے ــــ مطلب یہ ہے کہ جب تم ضد میں اس حد تک دھاندلی پر اتر آئے ہو کہ ایک ہی سانس میں ایک حقیقت کو مانتے ہو، پھر اسی کو جھٹلاتے ہو تو تم سے مزید بحث جاری رکھنا بے سود ہے۔ اب تمہارا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہی فیصلہ فرمائے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون ضلالت پر! ہمارے نزدیک یہ ٹکڑا موادعت کے مفہوم میں ہے نہ کہ ملاطفت کے مفہوم میں، جیسا کہ عام طور لوگوں نے سمجھا ہے۔

قُلْ لَّا تُسْـَٔـلُوْنَ عَمَّآ اَجْرَمْنَا وَلَا نُسْـَٔـلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲۵)

یہ وہی قطعِ محبّت کا مضمون، جو اوپر والی آیت میں ہے، دوسرے الفاظ میں ہے۔ فرمایا کہ اگر تمہارے نزدیک ہم تمہارے معبودوں اور تمہارے آبائی رسوم کی مخالفت کے مجرم ہیں تو عند اللہ اس جرم کی مسئولیت ہمارے ہی اوپر ہے، تمہارے اوپر نہیں ہے۔ اسی طرح تم جو کچھ کر رہے ہو اس کی پرسش ہم سے نہیں ہونی ہے، تمہی سے ہونی ہے۔ ہمارے اوپر حق کو پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی، یہ فرض ہم نے ادا کر دیا۔ اب مزید بحث و جدال سے کچھ حاصل نہیں۔ تم اپنی راہ چلو، ہم اپنی راہ چلتے ہیں۔ کل کو اللہ تعالیٰ کے حضور فیصلہ ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ یہی مضمون سورۂ شوریٰ کی آیتِ ذیل میں

یوں آیا ہے:

لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ (۱۵) ہمارے ساتھ ہمارے اعمال ہوں گے اور تمھارے ساتھ تمھارے اعمال، اب ہمارے اور تمھارے درمیان کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

یہی قطع بحث کا مضمون سورۂ کافرون میں ہے 'لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ' (۶) (تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین)۔ قرآن مجید میں یہ مضمون، مختلف اسلوبوں سے، جگہ جگہ آیا ہے اور اس کا ایک خاص محل ہے۔ وہ یہ کہ جب مخاطب نے اپنی ضد اور مکابرت سے بالکل واضح حقائق کو جھٹلا دینے کی کوشش کی ہے تو اس سے یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اب بحث و مناظرہ سے کچھ حاصل نہیں، تم اپنا کام کرو، ہم اپنا کام کرتے ہیں۔ اس طرح کی آیات کو عام طور پر لوگوں نے مخاطب کے ساتھ اظہارِ رواداری کے مفہوم میں لیا ہے لیکن یہ اظہارِ رواداری کے مفہوم میں نہیں بلکہ اظہارِ بیزاری کے مفہوم میں ہیں۔ سیاق و سباق پر نگاہ نہ رکھنے کے سبب سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ۚ وَهُوَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ (۲۶)

یعنی ان سے کہہ دو کہ اگر یہاں تم ہماری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہو تو نہ مانو، ایک ایسا دن آنے والا ہے جس میں ہمارا رب ہم کو اور تم کو، دونوں کو، جمع کرے گا اور پھر بالکل ٹھیک ٹھیک فیصلہ فرمائے گا کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پر۔ وہ بہت بڑا فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس کے فیصلہ کے خلاف کوئی دھاندلی مچانا کسی کے بس میں نہ ہوگا اور وہ ہر چیز کا پورا پورا علم رکھنے والا ہے۔ کوئی چیز اس سے مخفی نہیں ہے۔

قُلْ اَرُوْنِيَ الَّذِيْنَ اَلْحَقْتُمْ بِهٖ شُرَكَآءَ كَلَّا ۚ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲۷)

ایک طنزیہ سوال اور اس کا جواب

وہی مضمون جو اس مجموعۂ آیات کی پہلی آیت میں آیا ہے آخر میں دوسرے اسلوب سے پھر ارشاد ہوا ہے۔ اس کا انداز طنز و تحقیر اور تہدید و وعید کا ہے۔ فرمایا کہ ان سے کہو کہ ذرا مجھے ان کو دکھاؤ تو سہی جن کو تم نے شریکوں کی حیثیت سے خدا کے ساتھ چپکا رکھا ہے! آخر وہ کون اور کہاں ہیں جو ایسے عالی مقام ہیں کہ وہ خدا کی خدائی میں ساجھی بنا دیے گئے ہیں!

'كَلَّا ۚ بَلْ هُوَ اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'۔ سوال کے بعد خود ہی اس کا جواب دے دیا کہ ہرگز نہیں! کسی کا بھی یہ درجہ و مرتبہ نہیں ہے کہ اس کو خدا کا شریک قرار دیا جا سکے۔ اس کے بعد اس نفی کی دلیل اللہ تعالیٰ کی مسلّمہ صفات سے دی ہے۔ فرمایا کہ وہ 'عزیز' و 'حکیم' ہے۔ 'عزیز' یعنی سب کی رسائی سے بالاتر اور ہر چیز پر غالب و مقتدر۔ 'حکیم' یعنی اس کا ہر فعل غایت و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ ان صفات کا ذکر حصر کے اسلوب میں فرمایا ہے یعنی وہ ان صفات سے کمال درجہ متصف ہے اور جب وہ ان سے کمال درجہ متصف ہے تو ان کے ساتھ شرک کا کوئی جوڑ نہیں ہے اس لیے کہ اگر کسی کو اس کا شریک

اس پہلو سے مانا جائے کہ اس کائنات کے خلق و تدبیر میں خدا اس کا محتاج ہے تو یہ اس کے 'عزیز' ہونے کی نفی ہے اور اگر اس پہلو سے مانا جائے کہ کوئی اپنی رسائی و تقرب سے اس کے بے لاگ عدل پر اثر انداز ہو سکتا ہے تو یہ اس کے 'حکیم' ہونے کی نفی ہوئی۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ مشرکین کے شرک میں اصلی عامل کی حیثیت انہی دونوں غلط فہمیوں کو حاصل تھی۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفتوں کا حوالہ دے کر ان دونوں غلط فہمیوں کی بنیاد ڈھا دی۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۸-۳۹

آگے کی آیات میں مخالفین کے ان مطالبات و اعتراضات سے تعرض فرمایا ہے جو وہ قرآن کی دعوت اور اس کے انذار کی تکذیب کے لیے پیش کر رہے تھے۔ اعتراضات و مطالبات کے جواب بھی دیے ہیں اور اس انجام کی طرف بھی اشارہ فرمایا ہے جس سے وہ لوگ لازماً دوچار ہوں گے جو ان لاطائل اعتراضات و شبہات کی آڑ لے کر حقیقت کو جھٹلائیں گے۔ ــــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۸-۳۹

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۹﴾ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ؕ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚۖ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰكُمْ عَنِ الْهُدٰى بَعْدَ اِذْ جَآءَكُمْ بَلْ كُنْتُمْ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا بَلْ مَكْرُ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّكْفُرَ بِاللّٰهِ وَنَجْعَلَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ؕ

وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِيْۤ اَعْنَاقِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ
مُتْرَفُوْهَاۤ ۙ اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾ وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ
اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۳۵﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ
الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۶﴾
وَمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰۤى اِلَّا مَنْ
اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ؗ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا
وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ
اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ
شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۳۹﴾

ترجمۂ آیات ۲۸-۳۹

اور ہم نے تو تم کو سب لوگوں کے واسطے بس بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جان رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ دھمکی کب ظاہر ہوگی، اگر تم لوگ سچے ہو! ان کو بتا دو کہ تمھارے لیے ایک خاص دن کی میعاد مقرر ہے جس سے نہ ذرا پیچھے ہٹو گے اور نہ آگے بڑھو گے۔ ۲۸-۳۰

اور جن لوگوں نے کفر کیا، وہ کہتے ہیں، نہ تو ہم اس قرآن پر ایمان لانے کے اور نہ اس چیز ہی پر جس کی وہ آگے کو خبر دے رہا ہے اور اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب کہ یہ ظالم اپنے رب کے حضور کھڑے کیے جائیں گے! ان کے آپس میں تو تکار ہو رہی ہوگی۔ جو لوگ دبا کے رکھے گئے وہ ان لوگوں سے جنھوں نے تکبر کیا، کہیں گے کہ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو ہم ضرور

ایمان لانے والوں میں سے ہوتے ۔ وہ لوگ جو بڑے بنے، ان لوگوں کو جو دبا کے رکھے گئے، جواب دیں گے کہ کیا ہم نے تم کو ہدایت سے روکا جب کہ وہ تمھارے پاس آچکی تھی! بلکہ تم خود ہی مجرم ہو۔ اور دبے ہوئے لوگ متکبرین سے کہیں گے، بلکہ تمھاری رات دن کی سازشیں تھیں (جو قبولِ حق میں مانع ہوئیں) جب کہ تم ہمیں سمجھاتے تھے کہ ہم اللہ کا کفر کریں اور اس کے شریک ٹھہرائیں۔ اور وہ دلوں میں نادم ہوں گے جب دیکھیں گے عذاب کو۔ اور ہم کافروں کی گردنوں میں طوق ڈالیں گے۔ یہ وہی بدلہ میں پائیں گے جو وہ کرتے رہے تھے۔ ۳۱۔۳۳

اور ہم نے جس بستی میں بھی کوئی نذیر بھیجا تو اس کے اغنیاء نے یہی کہا کہ ہم تو اس پیغام کے منکر ہیں جو دے کر تم بھیجے گئے ہو۔ اور انھوں نے کہا کہ ہم تو تم سے مال و اولاد میں بڑھ کر ہیں، اور ہم کبھی مبتلائے عذاب ہونے والے نہیں ہیں۔ ان سے کہہ دو۔ میرا رب ہی ہے جو رزق کشادہ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے، لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔ اور تمھارے مال اور تمھاری اولاد وہ چیز نہیں ہے جو تم کو ہمارا مقرب بنا دینے والی ہو۔ البتہ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے وہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے ان کے اعمال کا مضاعف صلہ ہوگا اور وہ بالا خانوں میں چین سے براجماں ہوں گے۔ ۳۴۔۳۷

اور جو زک دینے کے لیے ہماری آیات کے ابطال کی راہ میں سرگرم ہیں وہ لوگ عذاب میں داخل کیے جائیں گے۔ ۳۸

کہہ دو، میرا رب ہی ہے جو رزق کو کشادہ کرتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے اس کے لیے (اگر چاہتا ہے) اور جو کوئی چیز بھی تم خرچ

کرو گے تو وہ اس کا بدلہ دے گا اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔ ۳۹

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲۸)

رسول کی ذمہ داری صرف انذار اور بشارت ہے

یہ اظہارِ افسوس ہے ان لوگوں کی حالت پر جو قرآن کی دعوتِ توحید اور اس کے انذارِ عذاب و قیامت کی تکذیب کے لیے عذاب کا مطالبہ کرتے تھے تاکہ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کر سکیں۔ فرمایا کہ ہم نے تم کو عذاب لانے والا نہیں بلکہ لوگوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے کہ تم ان لوگوں کو نجات اور رحمت کی بشارت دے دو جو تمھاری دعوت پر ایمان لا کر ایمان و عملِ صالح کی زندگی اختیار کر لیں گے۔ اور ان لوگوں کو خدا کے اس قہر و غضب سے آگاہ کر دو جس سے تمھاری تکذیب کی صورت میں ان کو لازماً سابقہ پیش آئے گا۔ تمھاری ذمہ داری اس انذار و بشارت کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ عذاب لانے یا نہ لانے کا معاملہ ہم سے متعلق ہے۔ جب اس کا وقت آجائے گا تو ہم یہ چیز بھی ان کو دکھا دیں گے۔

'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ'۔ یہ لوگوں کی بدبختی پر اظہارِ افسوس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو عذاب سے پہلے ایک آگاہ کرنے والا بھیج دیا کہ لوگ چاہیں تو ایمان و عملِ صالح کی زندگی اختیار کر کے اپنے لیے ابدی رحمت کی ضمانت حاصل کر لیں، لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ رحمت کی جگہ عذاب ہی کے طالب ہیں۔ ان کو اس حقیقت کی خبر نہیں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کی طرف رسول بھیج دیتا ہے تو اس پر اللہ کی حجت تمام ہو جاتی ہے۔ اگر وہ قوم رسول کی تکذیب کر دیتی ہے تو سنتِ الٰہی کے بموجب وہ لازماً تباہ کر دی جاتی ہے۔ آگے والی سورہ، سورۂ فاطر میں اس حقیقت کی وضاحت یوں فرمائی گئی ہے:

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ	تم تو بس ایک آگاہ کر دینے والے ہو۔ ہم نے
بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۭ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ	تو تم کو حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور آگاہ
اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ وَاِنْ	کرنے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی
يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ	نہیں ہوئی ہے جس میں ایک نذیر نہ آیا ہو۔ اور اگر
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ	یہ تم کو جھٹلاتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ	سے پہلے جو قومیں گزری ہیں انھوں نے بھی جھٹلایا۔
وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝ ثُمَّ اَخَذْتُ	ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیاں، صحیفے اور
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ	روشن کتاب لے کر آئے۔ پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑا

نَكِيْرِ ٥ (۲۲-۲۰) جنھوں نے کفر کیا تو دیکھو کیسی ہوئی میری پھٹکار۔

اہلِ کتاب کو ایک برمحل تنبیہ

اس آیت میں 'كَآفَّةً لِّلنَّاسِ' کے الفاظ بھی قابلِ غور ہیں۔ آنحضرتؐ سے پہلے جو رسول آئے وہ صرف اپنی اپنی قوموں ہی کے لیے نذیر بن کر آئے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم الانبیاء و خاتم الرسل ہیں اس وجہ سے آپ کی بعثت تمام خلق کی طرف ہوئی۔ یہ حقیقت قرآن میں بھی مختلف پہلوؤں سے واضح فرمائی گئی ہے اور سابق صحیفوں میں آپ کی نسبت جو پیشین گوئیاں وارد ہیں، ان میں بھی آپ کی یہ حیثیت نمایاں ہے۔ ان کے حوالے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم نقل کر آئے ہیں۔ یہاں اس بات کی یاددہانی سے مقصود اہلِ کتاب کو متنبہ کرنا ہے۔ دعوت کے اس دور میں انھوں نے بھی درپردہ قریش کی پشت پناہی شروع کر دی تھی، اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفت کا حوالہ دے کر ان کو بھی آگاہ کر دیا گیا کہ جس رسول کی مخالفت میں وہ اپنی ذہانت و قابلیت صرف کر رہے ہیں وہ صرف قریش ہی کے لیے منذر و مبشر بن کر نہیں آیا ہے بلکہ اس کے ذریعے سے خود ان کی قسمت کا بھی فیصلہ ہونا ہے اس وجہ سے اگر وہ یہ خطرناک کھیل کھیلنا چاہتے ہیں تو اس کے نتائج بہت دُور تک سوچ لیں۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۹)

استہزا کرنے والوں کو جواب

یعنی وہ رسول کے انذار بالعذاب سے متنبہ ہونے اور اس سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کرنے کے بجائے رسول اور اس کے ساتھیوں کا استخفاف کرتے اور باندازِ طنز سوال کرتے ہیں کہ اگر تم لوگ اپنے انذار میں سچے ہو تو یہ بتاؤ کہ یہ دھمکی کب ظہور میں آئے گی؟ مطلب یہ ہے کہ یا تو اس کو دکھاؤ یا اس کا وقت متعین کر دو ورنہ ہم اس کو محض لاف زنی سمجھتے ہیں۔

قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ (۳۰)

فرمایا کہ ان کو جواب دے دو کہ اس چیز کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ اس کے ظہور کے لیے ایک خاص وقت مقرر ہے۔ جب وہ وقت آ جائے گا تو پھر نہ تو اس سے پیچھے ہٹ سکو گے اور نہ آگے ہی بڑھ سکو گے۔ یہ حقیقت ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نافرمانوں اور باغیوں کو بھی اتنی مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لیں تاکہ ان کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور یہ بات صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کسی قوم کا پیمانہ کب لبریز ہوا۔ اس بھید سے اللہ کا رسول بھی واقف نہیں ہوتا۔ لفظ 'یوم' یہاں وقت کے مفہوم میں ہے اور لفظ 'ساعۃ' لمحہ، پل اور وقتِ قلیل کے مفہوم میں۔

اس اسلوبِ بیان کے اندر سوال کرنے والوں کے طنز کے جواب میں یہ طنز بھی مضمر ہے کہ آخر کس برتے پر اس عذاب کا وقت معلوم کرنا چاہتے ہو، وہ اٹل وقت جب آ جائے گا تو پھر کسی کے ٹالے نہ ٹل سکے گا!

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ښ يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِۨ الْقَوْلَ ۚ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا

لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ (۳۱)

الذی بین یدیہ کی تاویل

'وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ' کی دو تاویلیں لوگوں نے کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد قرآن سے پہلے نازل ہونے والے آسمانی صحیفے ہیں، دوسری یہ کہ یہ اس عذاب اور قیامت کی طرف اشارہ ہے جس سے قرآن ان کو آگاہ کر رہا تھا۔ ہمارے نزدیک یہ دوسرا قول سیاق و سباق سے زیادہ اوفق ہے۔ یعنی یہ کفار نہایت ڈھٹائی کے ساتھ قرآن کے انذار کا یہ جواب دیتے ہیں کہ نہ تو ہم اس قرآن ہی پر ایمان لانے والے ہیں اور نہ اس عذاب اور قیامت ہی کو ماننے کے لیے تیار ہیں جس کی وہ آگے کو خبر دے رہا ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم سے یہ بات منوانی ہے تو ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ یہ چیز ہمیں دکھا دی جائے۔ اگر یہ دکھائی نہیں جاتی تو پھر ہم اس دھونس میں آنے والے نہیں ہیں!

حذف کا ایک اسلوب

'وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ مَوْقُوْفُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ'۔ 'ظٰلِمُوْنَ' سے مراد یہی شامت زدہ لوگ ہیں جو خدا کی رحمت کو ٹھکرا کر اس کی نقمت کا مطالبہ کر رہے تھے۔ جوابِ شرط یہاں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق محذوف ہے۔ حذف کا یہ طریقہ ان مواقع میں اختیار کیا جاتا ہے جہاں صورتِ حال تعبیر و تصویر سے ماوراء ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ شامت زدہ لوگ قرآن اور اس کے بعد آنے والی قیامت کا نہایت جسارت سے انکار کر رہے ہیں لیکن اگر تم کہیں ان کی اس حالت کو دیکھ پاتے جب کہ یہ اپنے رب کے حضور میں کھڑے کیے جائیں گے تو .... اس 'تو' کے بعد اس منظر کا ذکر حذف کر دیا ہے جس سے یہ بات نکلی کہ اس کی ہولناکی تعبیر و تصویر کے حدود سے باہر ہے۔

لیڈروں اور اس کے پیروؤں کی تو تکار

'يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ ۨالْقَوْلَ' کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ وہ آپس میں تو تکار کریں گے۔ اس کی تفصیل آگے کی آیات میں آ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو ان کے لیڈر اور پیرو دونوں قرآن اور قیامت کی مخالفت پر متفق ہیں۔ لیڈر مخالفت کے لیے پیش پیش ہیں اور عوام ان کی تائید کرتے ہوئے ان کے جھنڈے اٹھائے پھر رہے ہیں لیکن جب خدا کے حضور میں ان کی پیشی ہوگی تو پیرو لیڈروں کو اپنی گمراہی کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے اور لیڈر پیروؤں کو ملامت کریں گے کہ تم اپنی شامت کے خود ذمہ دار ہو کہ حق کے واضح ہو جانے کے بعد تم نے حق کے بجائے ہماری پیروی کی۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو لیڈر عوام کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ وہ ان کی صوابدید پر اعتماد کریں، خیر و شر کی ذمہ داری ان پر ہے اور عوام آنکھ بند کر کے ان کے پیچھے چل رہے ہیں کہ کوئی خطرہ پیش آیا تو ان کے لیڈر اس سے ان کو بچا لیں گے لیکن جب اصل مرحلہ سامنے آئے گا تب معلوم ہوگا کہ ہر ایک اپنے عمل کا خود ذمہ دار ہے، کوئی دوسرا کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں بنے گا۔

'يَقُوْلُ الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا لَوْلَآ اَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِيْنَ' یہ اوپر والی بات کی وضاحت ہو رہی ہے۔ 'الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا' سے مراد وہ غرباء اور عوام ہیں جو اپنی غربت اور بے مائگی

کے سبب سے بڑوں اور سرمایہ داروں کے زیر دست اور ان کے آلۂ کار بنے رہے۔ اَلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا سے ان کے سرمایہ دار لیڈر اور سردار مراد ہیں جنھوں نے اپنی ذات کو حق و باطل کا معیار بنا کر لوگوں کو اپنے پیچھے چلایا یہاں تک کہ اللہ و رسول کی مخالفت کے لیے بھی ان کو استعمال کیا۔ فرمایا کہ اس دن غربا اور عوام اپنے لیڈروں اور سرمایہ داروں کو الزام دیں گے کہ یہ تم ہو کہ تمھاری بدولت ہم اس بدبختی سے دوچار ہوئے، تم نے ہماری راہ نہ ماری ہوتی تو ہم ضرور ایمان لانے والوں میں سے بنتے۔ مطلب یہ ہے کہ حق تو ہم سے مخفی نہیں رہا تھا اور ہمارے اندر اس کے اختیار کرنے کا جذبہ بھی ابھرتا تھا لیکن تمھارا دباؤ ہمارے اس جذبے کو دبا دیتا تھا اور ہم اپنی خواہش کے خلاف ایمان کی سعادت سے محروم رہ گئے اور بالآخر اس انجام کو پہنچے۔

قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْٓا اَنَحْنُ صَدَدْنٰکُمْ عَنِ الْھُدٰی بَعْدَ اِذْ جَآءَکُمْ بَلْ کُنْتُمْ مُّجْرِمِیْنَ (۳۲)

لیڈر اپنے پیرؤوں کو جھٹ جواب دیں گے کہ تمھارا الزام بالکل غلط ہے کہ تم کو ہم نے اللہ کی ہدایت سے روکا بلکہ مجرم تم خود ہو کہ نہایت واضح ہدایت آ جانے کے بعد بھی تم ہمارے پیرو بنے رہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق نہ تو ہم پر مخفی تھا نہ تم پر۔ اللہ کے رسول نے حجت تمام کر دی تھی۔ یہ بات نہ ہوتی ہوتی تب تو کسی حد تک ہم کو الزام دینے میں تم بجانب حق ہوتے لیکن جب تم نے پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی تو ہم کو مجرم ٹھہرانے کے بجائے اپنے سر پیٹو۔ ہم بھی مجرم ہیں اور ہماری ہی طرح تم بھی مجرم ہو ـــــــ یہ بات ہے تو کفار کی لیکن قرآن نے یہ ایک سچی بات کی حیثیت سے نقل کی ہے اور اس میں ہر دور کے عوام کے لیے درسِ عبرت ہے کہ حق و ہدایت کے معاملے میں کوئی شخص مجرد اس عذر پر عند اللہ بری نہیں ہو سکتا کہ اس کو دوسروں نے گمراہ کیا بلکہ حق کی جستجو ہر شخص کی اپنی ذمہ داری ہے اور اس کے واضح ہونے کے بعد اس کی پیروی تا حدِ امکان ہر فرد پر لازم ہے۔ اس کے بغیر کوئی عند اللہ بری نہیں ہو سکتا۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا بَلْ مَکْرُ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ اِذْ تَاْمُرُوْنَنَآ اَنْ نَّکْفُرَ بِاللّٰہِ وَنَجْعَلَ لَہٗٓ اَنْدَادًا ط وَاَسَرُّوا النَّدَامَۃَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ط وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْٓ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ط ھَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۳۳)

عوام لیڈروں کے جواب میں کہیں گے کہ یہ تمھاری رات دن کی سازشیں تھیں کہ ہم حق کی پیروی سے محروم رہے۔ تم نے رسول کی ہدایت سے برگشتہ کرنے کے لیے پروپیگنڈے کی مہم چلا رکھی تھی اور ہمیں تم یہ سمجھاتے اور سکھاتے تھے کہ ہم برابر کفر و شرک پر جمے رہیں ـــــ اس جواب سے یہ بات نکلی کہ ان کو اس امر کا تو اعتراف ہوگا کہ حق ان پر واضح تھا لیکن وہ اس وجہ سے اس کی پیروی نہ کر سکے کہ ان کے لیڈروں

کی رات دن کی سازشوں نے انھیں اس کی پیروی سے محروم رکھا۔

'وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ'۔ 'اَسَرُّوا النَّدَامَةَ' اسی طرح کا محاورہ ہے جس طرح 'ابطن العداوۃ' ہے۔ 'ندامت' ایک کیفیت قلبی و باطنی ہے اس وجہ سے اس کے لیے 'اسرّ' استعمال ہوا ہے۔ مقصود صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس سوال و جواب کے بعد جب وہ دیکھیں گے کہ سامنے عذاب کھڑا ہے تو وہ اپنی بدبختی پر سخت پشیمان ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا یہ عذر مسموع نہیں ہوگا کہ وہ اپنے لیڈروں کی سازشوں کے سبب سے ہدایت کی پیروی سے محروم رہے بلکہ ان کو لازماً عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کی پشیمانی کی وجہ یہ ہوگی کہ اس وقت ان کے سامنے یہ بات بالکل کھل کر آجائے گی کہ فی الحقیقت انھوں نے بالکل اپنے ضمیر کے خلاف اپنے لیڈروں کی پیروی کی۔ جو آدمی اپنے ضمیر کے خلاف کسی باطل کی پیروی کرتا ہے جب اس کا نتیجہ اس کے سامنے آتا ہے تو اس کو صرف نتیجہ کی تلخی ہی سے سابقہ نہیں پڑتا بلکہ اپنے ضمیر کی لعنت سے بھی اس کو دوچار ہونا پڑتا ہے اور یہ چیز اس کی مصیبت کو دوچند کر دیتی ہے۔ یہ مضمون احزاب کی آیات ۶۶-۶۸ میں گزر چکا ہے۔ مزید وضاحت مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

عمل اور جزا میں مشابہت

'وَجَعَلْنَا الْاَغْلٰلَ فِیْٓ اَعْنَاقِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا'۔ فرمایا کہ ہم ان کافروں کی گردنوں میں طوق ڈال دیں گے۔ یہ عمل اور جزا میں مطابقت کی طرف اشارہ ہے۔ جو لوگ اپنی عقل اور اپنے ضمیر کو بالکل معطل کر کے اپنی باگ دوسروں کے ہاتھ میں پکڑا دیں گے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو اس کی سزا یہ دے گا کہ ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے جائیں گے جن کو پکڑ کر دوزخ کے داروغے ان کو دوزخ میں گھسیٹیں گے۔

'هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ'۔ یعنی ان کی گردنوں میں یہ طوق جو ڈالے جائیں گے تو یہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں ہوگی بلکہ دنیا میں جو کچھ انھوں نے کیا اسی کی اصل حقیقت ان کے سامنے اس شکل میں آئے گی۔ انھوں نے دوسروں کی غلامی کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال کر اپنے رب کی نافرمانی کی جس کے نتیجہ میں ان کو دوزخ کے یہ اغلال اپنی گردنوں میں ڈالنے پڑیں گے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (۳۴)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دی گئی ہے کہ تمھارے زمانے کے امرا و اغنیاء جو کچھ تمھارے ساتھ کر رہے ہیں یہی کچھ ہر زمانے کے مترفین نے اپنے اپنے زمانوں کے رسولوں کے ساتھ کیا ہے۔ انھوں نے بھی نہایت رعونت کے ساتھ اپنے رسولوں کو یہ جواب دیا کہ جو پیغام تم دے کر بھیجے گئے ہو ہم اس سارے کے منکر ہیں۔ یعنی نہ تو تمھاری دعوتِ توحید و ایمان کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں اور نہ تمھاری اس دھونس ہی میں آنے والے ہیں کہ اگر ہم نے تمھاری بات نہ مانی تو ہم پر کوئی عذاب آجائے گا۔

'اُرْسِلْتُمْ بِهٖ' کے اسلوب میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ جس رسالت کے تم مدعی ہو یہ بھی محض تمہارا زعم ہے جس کی ہمارے نزدیک کوئی حقیقت نہیں ہے۔

وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ۙ وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (۳۵)

مترفین کا اصلی مغالطہ

یعنی رسولوں کے انذار کی تکذیب کے حق میں جو دلیل انھوں نے پیش کی وہ یہی تھی جو تمہارے زمانے کے مترفین پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے رسول اور اس کے ساتھیوں کو جواب دیا کہ تم ہمیں ڈراتے ہو کہ ہمارا عقیدہ و عمل باطل ہے اور ہم خدا کے عذاب کے سزاوار ہیں اور حال یہ ہے کہ ہم مال و اولاد میں تم سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اگر تمہاری بات سچی ہوتی تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ مال و اولاد میں تم ہم سے بڑھ چڑھ کر ہوتے۔ 'وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ' یعنی جب صورتِ حال علانیہ تمہاری تکذیب کر رہی ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ تم محض لاف زنی کر رہے ہو، ہم پر نہ اس دنیا میں کوئی عذاب آنے والا ہے اور نہ آخرت میں (اگر تمہارے زعم کے مطابق وہ ہوئی) ہمیں کسی عذاب کا کوئی اندیشہ ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۶)

مغالطہ کا ازالہ

فرمایا کہ ان کا یہ مغالطہ رفع کرنے کے لیے ان کو بتا دو کہ اس دنیا میں مال و اولاد کی زیادتی نہ تو خدا کے منظورِ نظر ہونے کی دلیل ہے اور نہ اس کی کمی خدا کی نظروں میں حقیر ہونے کی۔ بلکہ یہ کمی و زیادتی تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار اور اس کی حکمت پر منحصر ہے۔ وہ کسی کے رزق میں کشادگی دیتا ہے تو اس کے شکر کا امتحان کرتا ہے اور کسی کے رزق کو تنگ کرتا ہے تو اس کے صبر کو جانچتا ہے اور اصل کامیابی کا انحصار درحقیقت اس امتحان کے نتیجہ پر ہے جو آخرت میں سامنے آئے گا۔

'وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ' لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ وہ اس حماقت میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کو جو مال و جاہ حاصل ہے یہ ان کی قابلیت و استحقاق کا کرشمہ اور خدا کے ہاں ان کے مقرب و منظورِ نظر ہونے کی دلیل ہے اس طرح وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کو اپنے لیے عذاب بنا لیتے ہیں۔

وَمَاۗ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۗ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۡ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ جَزَاۗءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ (۳۷)

'زُلْفٰى' مصدر ہے جس سے مقصود فعل کی تاکید ہے یعنی 'تُقَرِّبُكُمْ قُرْبَةً'۔ مطلب یہ ہے کہ مال و اولاد ان چیزوں میں سے نہیں ہیں جو خدا کے ہاں ذرا بھی وجہِ قربت ہو سکیں۔ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ امتحان کے لیے دیتا ہے کہ ان کو پا کر بندہ اس کی ناشکری کرتا ہے یا ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرتا ہے اس وجہ سے خدا کے ہاں تقرب کا ذریعہ مال و اولاد نہیں بلکہ ایمان و عمل صالح ہے۔ اگر کسی نے ایمان و عمل صالح کی کمائی نہیں کی تو اس کے لیے مال و اولاد کی زیادتی صرف اس کے وبال میں

اضافہ کرے گی۔

'جزاء الضعف' کا مفہوم

'فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا' لفظ 'ضعف' عربی میں کسی شے کے مثل کے لیے بھی آتا ہے اور اس کے امثال کے لیے بھی، خواہ وہ امثال کتنے ہی غیر محدود ہوں۔ اس وجہ سے اس ٹکڑے کا مفہوم یہ ہوگا کہ البتہ وہ لوگ جو ایمان و عمل صالح کی روش اختیار کریں گے ان کے لیے ان کے اعمال کا مضاعف صلہ ہوگا۔ اس مضاعف صلہ کی وضاحت قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں ہوئی ہے۔ اس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ اس کو دُگنے اجر کے محدود مفہوم میں نہ لیجیے[1]

'وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ' یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اس دنیا میں تو مال و اولاد کے لیے ہر وقت خطرات ہیں اور کوئی بھی ان خطرات سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں کر سکتا لیکن جو لوگ مال و اولاد کو آخرت کی فلاح کا ذریعہ بناتے ہیں ان کو اس کا جو صلہ ملے گا وہ ابدی اور لازوال ہوگا۔ اس باب میں پھر ان کو کبھی کوئی تشویش لاحق نہیں ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ يَسْعَوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (۳۸)

یہ ان لوگوں کے انجام کا بیان ہے جنھوں نے مال و اولاد کی زیادتی کو اللہ کی آیات کو جھٹلانے اور رسول کو زچ کرنے کے لیے دلیل کے طور پر استعمال کیا۔ فرمایا کہ یہ لوگ پکڑ کر خدا کے عذاب میں لائے جائیں گے تاکہ اپنے کبر و غرور کی سزا بھگتیں۔ لفظ 'مُحْضَرُوْنَ' میں ان کی ذلت اور بے بسی کی جو تصویر ہے وہ ظاہر ہے۔

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ۭ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (۳۹)

رزق و فضل کا صحیح مصرف

اس آیت کی تمہید اوپر کی آیت ۳۶ کی تمہید بعینہٖ ایک ہی ہے لیکن دونوں جگہ مدّعا الگ الگ ہے۔ اوپر کی آیت میں یہ واضح فرمایا ہے کہ رزق کی کشادگی و تنگی تمام تر اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اس وجہ سے نہ اس کی کشادگی پر کسی کو اترانے کا حق ہے اور نہ اس کی تنگی سے کسی کو مایوس ہونا جائز ہے، بلکہ ہر شخص کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ یہ دونوں حالتیں اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت پیش آتی ہیں اور دونوں سے وہ اپنے بندوں کے شکر یا صبر کا امتحان کرتا ہے۔ اس آیت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ ان مترفین کو یہ بتا دو کہ اللہ کے بخشے ہوئے رزق و فضل پر اکڑنے کے بجائے اس کو

---

[1] صاحب اقرب الموارد نے اس لفظ کی تشریح یوں کی ہے:

وجائز فی کلام العرب ان یکون الضعف المثل الواحد وما زاد علیه من الامثال یقال لك ضعفه ای مثلاه وثلاثة امثاله لانه فی الاصل زیادة غیر محصورة۔

خدا کی خوشنودی کے کاموں میں صرف کریں کہ یہی شکر کا تقاضا ہے اور وہ اطمینان رکھیں کہ جو کچھ بھی وہ خدا کی راہ میں خرچ کریں گے وہ ضائع جانے والا نہیں ہے، بلکہ وہ چھوٹے سے چھوٹے انفاق کا بھی بھرپور صلہ دے گا۔ اور صلہ کے معاملے میں 'جَزَاۤءُ الضِّعۡفِ' کا اصول بیان ہو چکا ہے اور اس کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔ آیت میں 'وَمَاۤ اَنۡفَقۡتُمۡ' کے بعد 'فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ' کے الفاظ وضاحت قرینہ کی بنا پر حذف ہیں۔ 'اَخۡلَفَ اللّٰہُ عَلَیۡکَ' کے معنی ہوں گے 'ردّ علیک ما ذھب' (تمھاری گئی ہوئی چیز خدا نے تمھیں لوٹا دی)۔

'وَھُوَ خَیۡرُ الرّٰزِقِیۡنَ' یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے اطمینان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ بہترین رزق دینے والا ہے۔ آج وہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کے خرچ کیے ہوئے خزف ریزوں کے عوض میں کل وہ ان کو کیا کچھ بخش سکتا ہے اور کیا کچھ بخش دے گا۔ لفظ 'خیر' یہاں ترجیح و تفضیل کے مفہوم میں نہیں بلکہ مطلق بیانِ صفت کے لیے ہے۔ اس اسلوب کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۴۰ - ۴۵

آگے مترفین کو متنبہ کیا ہے کہ تم فرشتوں کو معبود بنا کر ان کی پرستش کر رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ آخرت کا مرحلہ پیش آیا تو وہ تم کو بچا لیں گے حالانکہ آخرت میں وہ تم سے اعلان برارت کریں گے اور خدا کے عذاب سے تم کو کوئی بچانے والا نہیں بنے گا۔ یہ اللہ نے تم پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے کہ تمھیں آگاہ کرنے کے لیے رسول بھیجا ہے لیکن تم بدبختی کے سبب سے اس کے کلام کو سحر قرار دے رہے ہو۔ بہتر ہے کہ ماضی کی قوموں کے انجام سے سبق لو۔ ان کو جو کچھ حاصل ہوا اس کا عُشرِ عشیر بھی تم حاصل نہیں کر پائے ہو لیکن جب وہ اللہ کی پکڑ میں آ گئے تو پھر کوئی بھی ان کو پناہ دینے والا نہ بن سکا — آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۰-۴۵

وَیَوۡمَ یَحۡشُرُہُمۡ جَمِیۡعًا ثُمَّ یَقُوۡلُ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اَہٰۤؤُلَآءِ اِیَّاکُمۡ کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ ﴿۴۰﴾ قَالُوۡا سُبۡحٰنَکَ اَنۡتَ وَلِیُّنَا مِنۡ دُوۡنِہِمۡ ۚ بَلۡ کَانُوۡا یَعۡبُدُوۡنَ الۡجِنَّ ۚ اَکۡثَرُہُمۡ بِہِمۡ مُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۱﴾ فَالۡیَوۡمَ لَا یَمۡلِکُ بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ نَّفۡعًا وَّلَا ضَرًّا ؕ وَنَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ذُوۡقُوۡا عَذَابَ النَّارِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ بِہَا تُکَذِّبُوۡنَ ﴿۴۲﴾ وَاِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالُوۡا مَا ہٰذَاۤ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیۡدُ اَنۡ یَّصُدَّکُمۡ عَمَّا کَانَ

يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۳﴾ وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ ؕ ﴿۴۴﴾ وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۙ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۴۵﴾

ع ۵ ۹ ۱۱

ترجمۂ آیات ۴۰ - ۴۵

اور اس دن کو یاد رکھو جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ لوگ تمھاری پرستش کرتے رہے ہیں! وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے۔ ان کے بالمقابل تو ہمارا کارساز ہے! بلکہ یہ جنوں کی پرستش کرتے رہے ہیں، ان کی اکثریت انہی پر ایمان رکھتی تھی۔ ۴۱

پس آج تم میں سے کوئی ایک دوسرے کو نہ تو کوئی نفع پہنچا سکے گا اور نہ نقصان۔ اور ہم ان ظالموں سے کہیں گے کہ اب اس دوزخ کے عذاب کا مزا چکھو جس کو جھٹلاتے رہے ہو! ۴۲

اور جب ان کو ہماری روشن آیات سنائی جاتی ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ یہ تو محض ایک شخص ہے جو چاہتا ہے کہ تم کو ان چیزوں سے روک دے جن کو تمھارے باپ دادا پوجتے آئے۔ اور انھوں نے کہا کہ یہ تو بس ایک من گھڑت جھوٹ ہے! اور ان کافروں نے حق کی بابت، جب کہ وہ ان کے پاس آگیا، کہا کہ یہ تو بس کھلا ہوا جادو ہے! اور ہم نے ان کو کتابیں نہیں دی تھیں جن کو وہ پڑھتے ہوں اور نہ ان کی طرف تم سے پہلے کوئی آگاہ کرنے والا بھیجا۔ ۴۴

اور ان سے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا۔ اور یہ تو اس کے عشر عشیر کو بھی نہ پہنچے جو ہم

نے ان کو دیا۔ تو انھوں نے میرے رسولوں کی تکذیب کی تو دیکھو، کیسی ہوئی ان پر میری پھٹکار! ۴۵

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ يَقُولُ لِلْمَلٰٓئِكَةِ أَهٰٓؤُلَآءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ (۴۰)

قیامت کے دن فرشتوں کی گواہی

'جَمِيعًا' کی تاکید اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ قیامت کے دن کفار و مشرکین بھی اکٹھے کیے جائیں گے اور ان کے خلاف گواہی دلوانے کے لیے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بھی اکٹھا کرے گا جن کی عبادت کے وہ مدعی رہے ہوں گے یا جن کی طرف انھوں نے اپنی بدعات منسوب کی ہوں گی۔ سورۂ مائدہ میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی شہادت کا ذکر گزر چکا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ان تمام بدعات سے اپنی براءت کا اعلان کریں گے جو ان کے اعدان کے مبتدع پیروؤں نے ایجاد کی ہوں گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھی اکٹھا کر کے ان سے سوال کرے گا کہ یہ مشرکین (اشارہ مشرکین عرب کی طرف ہے) مدعی ہیں کہ یہ تمھاری عبادت کرتے رہے ہیں تو کیا ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے؟ اس سوال کا مقصد ظاہر ہے کہ مشرکین پر اتمام حجت ہو گا کہ جن کو وہ شریک و شفیع سمجھ کر زندگی بھر پوجتے رہے ان کو نہ تو ان کی اس عبادت کی خبر ہے نہ انھوں نے اس کا ان کو حکم دیا اور نہ وہ ایک لمحہ کے لیے یہی گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں کہ کوئی ان کو پروردگارِ عالم کا شریک بنا کر ان کی عبادت کرے۔

قَالُوا سُبْحٰنَكَ أَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُونِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوا يَعْبُدُونَ الْجِنَّ ۖ أَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُونَ (۴۱)

فرشتے اس سوال کا فوراً یہ جواب دیں گے کہ 'سُبْحٰنَكَ'، تو اس سے پاک اور ارفع ہے کہ تیرا شریک و سہیم ہو!

فرشتوں کے جواب کے چند لازم پہلو

فرشتوں کے اس جواب سے ایک حقیقت تو یہ واضح ہوئی کہ شرک ایک ایسی گھناؤنی چیز ہے کہ اس کا ذکر سنتے ہی وہ اس سے اپنی نفرت کا اظہار کریں گے اور اللہ جل شانہٗ کو اس سے ارفع قرار دیں گے کہ کوئی اس کا شریک و سہیم ہو۔

دوسری یہ بات واضح ہوئی کہ وہ اپنے اوپر اس کو ایک سنگین تہمت خیال کریں گے کہ کچھ ظالموں نے ان کو شرک کی گندگی میں ملوث کرنے کی کوشش کی۔

تیسری یہ بات نکلی کہ جن احمقوں نے ایسا کیا ہے اس کی ذمہ داری تمام تر انھی پر ہے۔ فرشتے اس سے بری ہیں کہ وہ کسی کو اپنی عبادت کا حکم دیں۔

'اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ' یہ فرشتوں کا اپنے رب سے استغاثہ ہوگا کہ ان ظالموں کے مقابل میں، جنھوں نے ہمیں اس جرم میں ملوث کرنے کی کوشش کی، تو ہمارا یاور و ناصر اور مولیٰ و مرجع ہے ۔ ہم ان سے بری ہیں تو ہمیں ان کی تہمت سے بری فرما۔ 'مِنْ دُوْنِهِمْ' یہاں مقابل کے مفہوم میں ہے۔

مشرکین کی جنات پرستی

'بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ'۔ یعنی ان کا یہ زعم تو بالکل باطل ہے کہ یہ ہماری پرستش کرتے رہے ہیں البتہ یہ امر واقعی ہے کہ یہ لوگ جنوں کی پرستش کرتے رہے ہیں اس لیے کہ ان کی اکثریت انھی پر ایمان رکھنے والی تھی۔

فرشتوں کا یہ جواب بالکل حقیقت کے مطابق ہوگا۔ اس لیے کہ فرشتوں کے نام سے انھوں نے جو بت بنائے ـــــ مثلاً لات، منات اور عزّیٰ وغیرہ ـــــ یہ تو محض ان کے اپنے فرض کیے ہوئے نام تھے جن کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں تھا۔ البتہ اپنے کاہنوں کے توسط سے انھوں نے جنوں سے رابطہ قائم کیا تھا اور چونکہ ان کو وہ علم غیب کا ذریعہ سمجھتے تھے اس وجہ سے ان کے لیے چڑھاوے اور قربانیاں بھی پیش کرتے اور ان کی جے بھی پکارتے۔ 'اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ' یعنی یہ ان پر اس حیثیت سے ایمان رکھتے رہے ہیں کہ وہ غیب کی خبروں کے لانے والے اور بذاتِ خود نافع و ضارّ ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا يَمْلِكُ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ نَّفْعًا وَّلَا ضَرًّا ۭ وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ (۴۲)

فرشتوں کی گواہی کے بعد ان کے پجاریوں کا فیصلہ

یعنی فرشتوں کے اس جواب کے بعد ان کے پجاریوں سے کہہ دیا جائے گا کہ تمھارا سارا اعتماد جن فرشتوں پر تھا ان کی گواہی تم نے علیٰ رؤوس الاشہاد سُن لی۔ پس آج کے دن کوئی بھی ایک دوسرے کے کام آنے والا نہ بن سکے گا۔ نہ وہ تمھیں کوئی نفع یا ضرر پہنچا سکتے اور نہ تم ان کو۔

'وَنَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا ....'، یہاں 'اَلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا' سے مشرکین مراد ہیں جنھوں نے بے دلیل خدا کے شریک بنا کر 'ظلم عظیم'، کا ارتکاب کیا اور جب پیغمبر نے ان کو خدا کے عذاب سے ڈرایا تو انھوں نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اس کی تکذیب کی۔ فرمایا کہ اس آخری اتمامِ حجت کے بعد ہم ان سے کہیں گے کہ اب اس دوزخ کا مزا چکھو جس کو جھٹلاتے رہے ہو۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ۭ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۴۳)

مخالفین کی ہٹ دھرمی پر اظہارِ تعجب

یہ ان لوگوں کی ہٹ دھرمی اور مکابرت پر اظہار تعجب اور ان کی محرومی و بدبختی پر اظہار افسوس ہے کہ یہ آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب ان کو ہماری نہایت روشن، محکم اور عقل و دل کو منور کر دینے والی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ اپنے عوام کو ان کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکاتے ہیں کہ یہ شخص

تمھارے ان معبودوں سے تم کو برگشتہ کرنا چاہتا ہے جن کو تمھارے بزرگ اسلاف برابر پوجتے آئے۔
حقائق کے خلاف عوام کو مشتعل کرنے کے لیے اسلاف کا حوالہ ہمیشہ سے مفسدین کے ہاتھ میں ایک کارگر حربہ رہا ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ یہ واحد دلیل ہے جو ضلالت کے علمبردار لیڈروں نے اپنی ضلالتوں کے حق میں پیش کی ہے۔ 'مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ' کی تنکیر میں بھی ایک زہر چھپا ہوا ہے۔ یعنی وہ اپنے عوام کو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ شخص جو اپنے آپ کو ایک فرستادۂ الٰہی کی حیثیت سے تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے تم اس کے اس چکمے میں نہ آؤ، یہ محض ایک عام قسم کا آدمی ہے جس نے محض تمھارے دینِ آبائی سے تم کو منحرف کرنے کے لیے یہ روپ دھارا ہے کہ اس کو خدا نے تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے۔

'وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى' یہ قرآن کے خلاف ان کے پروپیگنڈے کا حوالہ ہے کہ وہ اپنے عوام کو یہ باور کراتے ہیں کہ اس قرآن کے متعلق یہ دعویٰ جو کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اتارا ہے، یہ دعویٰ بالکل جھوٹ ہے جو محض تمھیں مرعوب کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک خود تراشیدہ کتاب ہے جو بالکل جھوٹ موٹ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کی جا رہی ہے۔

'وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ لا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ' یہ ان لوگوں کی اس ژاژخائی پر اظہارِ حیرت ہے کہ یہ لوگ حق کی مخالفت میں اس وقت یہ سخن سازیاں کر رہے ہیں جب حق ان کے سامنے ظاہر ہو چکا ہے۔ اگر سورج افق سے غائب ہو اور کوئی ہٹ دھرم اس کے متعلق کوئی سوال اٹھائے تو یہ ہٹ دھرمی چنداں حیرت انگیز نہیں، لیکن جب سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو اور کوئی اس کو جادو قرار دے تو یہ محض خرد باختگی ہے۔

'لِلْحَقِّ' میں 'حق' سے مراد قرآن ہے اور 'ل' یہاں 'فی' کے مفہوم میں ہے۔ اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ اس کتاب میں اس کی مثالیں گزر چکی ہیں۔

'اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ' یہ ان کے قول کی تفصیل ہے کہ اس قرآن کو وہ جادو قرار دیتے ہیں۔ قرآن کو جادو قرار دینے کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ اس کی معجزانہ فصاحت و بلاغت اور تاثیر و تسخیر کے قائل تو اس کے کٹر سے کٹر مخالفین بھی تھے لیکن وہ اپنے عوام کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ یہ تاثیر و تسخیر محض اس کے پیش کرنے والے کی جادو بیانی کا کرشمہ ہے، اس کو خدا اور فرشتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

'وَمَآ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا وَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَّذِيْرٍ (۴۴)'

امیوں پر احسان اور ان کی
علم کی ناقدری

یہ ان مخالفین پر اظہارِ احسان اور ان کی اس ناقدری و محرومی پر اظہارِ افسوس ہے۔ فرمایا کہ یہ امی اور قرآن و کتاب سے ناآشنا لوگ رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ اللہ نے ان کو کوئی کتاب دی تھی جو

ان کے لیے تعلیم و تعلّم اور ارشاد و ہدایت کا ذریعہ بنتی اور نہ تم سے پہلے ان کے پاس کوئی نذیر آیا تھا جو ان کو اس غفلت کی نیند سے جگاتا اور آگے کے خطرات سے آگاہ کرتا۔ اس صورتِ حال کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس عظیم نعمت کی یہ دل و جان سے قدر کرتے، آگے بڑھ کر اس کو ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اس سے اپنی دنیا بھی سنوارتے اور آخرت کی بادشاہی بھی حاصل کرتے لیکن یہ اس کی مخالفت کر رہے ہیں اور اس طرح خدا کے اس قہر کو دعوت دے رہے ہیں جو سنتِ الٰہی کے مطابق اس قوم پر آکے رہتا ہے جو اس کے بھیجے ہوئے نذیر کو جھٹلا دیتی ہے۔

'کُتُب' کے بعد 'یَدْرُسُوْنَهَا' کی صفت سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اب تک ان کو اس طرح کے آسمانی صحیفے نہیں عطا ہوئے تھے جس طرح کے صحیفے بنی اسرائیل کو عطا ہوئے کہ یہ ان کو پڑھتے پڑھاتے۔ حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ذریعے سے ان کو جو تعلیم ملی تھی اس کی نوعیت روایت کی تھی جو امتدادِ زمانہ سے تقریباً فراموش بھی ہو چکی تھیں اور بدعات کے غلبہ نے ان کا حلیہ بھی بالکل بگاڑ کے رکھ دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ ان کو اپنی کتاب دے کر ان پر اپنی نعمت تمام کر دے لیکن اُن کا حال یہ ہے کہ یہ اس کو سحر اور افترا قرار دے رہے ہیں۔

وَكَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ فَكَذَّبُوا رُسُلِي فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ (۴۵)

خدا کے نذیروں کی تکذیب کا لازمی نتیجہ

یہ ان لوگوں کو تنبیہ ہے کہ خدا کے رسول اور اس کے نذیر کی تکذیب کا لازمی نتیجہ اس قوم کی تباہی ہے اور پوری تاریخ انسانی اس سنتِ الٰہی کی شاہد ہے۔

'وَمَا بَلَغُوا مِعْشَارَ مَا آتَيْنَاهُمْ' کلام کے بیچ میں ایک برمحل تنبیہ ہے کہ یہ ان قوموں کا حوالہ دیا جا رہا ہے جو کرّ و فر، شان و شوکت اور اسباب و وسائل کی فراوانی کے اعتبار سے اس مقام پر پہنچ چکی تھیں کہ قریش کے یہ متمردین ان کی گردِ پا کو بھی نہیں پہنچے۔ لیکن جب انھوں نے اللہ کے رسولوں کی تکذیب کی تو ان پر خدا کی پھٹکار جس طرح ہوئی اس کی تفصیلات قرآن میں بیان ہو چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو اپنے اسباب و وسائل کا غرّہ ہے تو یہ غرّہ بالکل بے بنیاد ہے۔ بڑی صولت و شوکت کی قومیں خدا کی ایک پھونک میں اڑ گئیں تو ان کی کیا حقیقت ہے۔ ان کو تو ان کا عُشر عشیر بھی حاصل نہیں ہوا۔ یہ تو اپنی تنگ ظرفی کے سبب سے بہت تھوڑے میں بہک گئے ہیں۔

۱۰- آگے کا مضمون - آیات ۴۶-۵۴

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں مخالفین کو نہایت دردمندی کے ساتھ نصیحت بھی ہے اور نہایت پُر زور وعید بھی کہ ابھی موقع ہے کہ سنبھل جاؤ، اگر یہ وقت نکل گیا تو پھر گیا وقت ہاتھ نہیں

آئے گا۔ اس وقت پچھتاؤ گے لیکن یہ پچھتانا بالکل بے سود ہو گا۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۶-۵۴

قُلْ إِنَّمَآ أَعِظُكُم بِوَٰحِدَةٍ ۖ أَن تَقُومُوا۟ لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَٰدَىٰ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا۟ ۚ مَا بِصَاحِبِكُم مِّن جِنَّةٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُم بَيْنَ يَدَىْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ﴿۴۶﴾ قُلْ مَا سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۖ إِنْ أَجْرِىَ إِلَّا عَلَى ٱللَّهِ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَىْءٍ شَهِيدٌ ﴿۴۷﴾ قُلْ إِنَّ رَبِّى يَقْذِفُ بِٱلْحَقِّ عَلَّٰمُ ٱلْغُيُوبِ ﴿۴۸﴾ قُلْ جَآءَ ٱلْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ ٱلْبَٰطِلُ وَمَا يُعِيدُ ﴿۴۹﴾ قُلْ إِن ضَلَلْتُ فَإِنَّمَآ أَضِلُّ عَلَىٰ نَفْسِى ۖ وَإِنِ ٱهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوحِىٓ إِلَىَّ رَبِّىٓ ۚ إِنَّهُۥ سَمِيعٌ قَرِيبٌ ﴿۵۰﴾ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ فَزِعُوا۟ فَلَا فَوْتَ وَأُخِذُوا۟ مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ ﴿۵۱﴾ وَقَالُوٓا۟ ءَامَنَّا بِهِۦ وَأَنَّىٰ لَهُمُ ٱلتَّنَاوُشُ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۵۲﴾ وَقَدْ كَفَرُوا۟ بِهِۦ مِن قَبْلُ ۖ وَيَقْذِفُونَ بِٱلْغَيْبِ مِن مَّكَانٍ بَعِيدٍ ﴿۵۳﴾ وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِم مِّن قَبْلُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا۟ فِى شَكٍّ مُّرِيبٍ ﴿۵۴﴾

ع ۶ ۱۲

ترجمہ آیات ۴۶-۵۴

ان سے کہو، میں تمھیں ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں، وہ یہ کہ تم اللہ کی خاطر دو دو اور ایک ایک کر کے اٹھو پھر غور کرو۔ تمھارے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے۔ وہ تو ایک شدید عذاب سے پہلے تم کو آگاہ کرنے والا ہے۔ کہو، میں نے تم سے کوئی اجر مانگا ہے تو تمھارے ہی لیے مانگا ہے۔ میرا اجر تو بس اللہ پر ہے اور وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ ۴۶-۴۷

میرا رب حق کو (باطل پر) مارے گا۔ وہ تمام بھیدوں کو خوب جاننے والا ہے۔

کہہ دو کہ حق آگیا اور باطل نہ آغاز کرتا ہے اور نہ اعادہ۔ ۴۸ - ۴۹

کہہ دو، اگر میں گمراہی پر ہوں تو میری گمراہی کا وبال مجھی پر ہے اور اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ اس وحی کی بدولت ہے جو میرا رب میری طرف بھیج رہا ہے۔ وہ سننے والا اور نہایت قریب ہے۔ ۵۰

اور اگر تم دیکھ پاتے جب ان پر گھبراہٹ طاری ہوگی پس وہ کہیں بھاگ نہ سکیں گے اور پاس ہی سے دھر لیے جائیں گے اور وہ کہیں گے ہم اس پر ایمان لائے۔ اور اتنی دور سے ان کے لیے اس کا پانا کہاں! اور اس سے پہلے انھوں نے اس کا انکار کیا اور دور سے اٹکل کے تیر تکے چلاتے رہے اور ان کے اور ان کی چاہتوں کے درمیان دیوار حائل ہو جائے گی جس طرح اس سے پہلے ان کے ہم مشربوں کے ساتھ معاملہ ہوا۔ بے شک وہ بھی الجھن میں ڈالنے والے شک میں پڑے رہے۔ ۵۱ - ۵۴

۱۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۫ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (۴۶)

ایک دل دوز نصیحت

پچھلے آیات ۔ ۸ میں گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی قوم کے مترفین کو عذابِ قیامت سے ڈراتے تو وہ آپ کی اس بات کو ایک قسم کے خبط پر محمول کرتے۔ کہتے کہ اس شخص کو ایک قسم کا مالیخولیا ہے جس کے سبب سے آگے پیچھے اس کو عذاب ہی عذاب نظر آتا ہے۔ اسی کا جواب دیتے ہوئے نہایت ناصحانہ انداز میں فرمایا کہ ان سے کہو کہ میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، خدارا اس پر عمل کرو۔ وہ یہ کہ اپنے ذہن کو ضد، تعصب اور غرور سے پاک کر کے، دو دو، ایک ایک کی صورت میں اٹھو، میری باتیں سنو اور معاملے پر سنجیدگی سے غور کرو۔ 'لِلّٰهِ' سے مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اب تک تو تمھاری روش تمام تر نفس اور شیطان کے تابع رہی ہے اس وجہ سے تم معاملے پر غیر جانبدار ہو کر غور نہ کر سکے لیکن آدمی پر سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے اور اللہ کو تم بھی مانتے ہو تو اس کی خاطر اپنے دوسرے

واعیات و محرکات سے آزاد ہو کر، اصل حقیقت پر غور کرنے کے لیے از سر نو اٹھو — اُٹھو، یعنی اس کا ارادہ کرو اور اس کے لیے کمر ہمت باندھو۔ تعصّبات کی اس فضا میں یہ بات ہوگی تو تمھارے دلوں پر شاق، لیکن اللہ کے لیے اس شاق چیز کو گوارا کرو۔ یہی راہ سعادت کی راہ ہے۔

'مَثْنٰی وَفُرَادٰی' کی قید سے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ بھیڑ کا ذہن حقائق کو سوچنے سمجھنے کا اہل نہیں ہوتا۔ اب تک تو تمھاری روش یہ رہی ہے کہ جہاں میری زبان سے کوئی بات نکلی تمھارے اشرار نے اس کے خلاف ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کی کہ کوئی میری بات سننے سمجھنے نہ پائے۔ یہ طریقہ چھوڑو اور اس کی جگہ یہ طریقہ اختیار کرو کہ دو دو اور ایک ایک کر کے میرے پاس آؤ، میری باتیں توجہ سے سنو، میرے دلائل پر غور کرو، اپنے شبہات پیش کر کے مجھ سے ان کے جواب معلوم کرو اور پھر غور کرو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں جنون میں کہہ رہا ہوں یا تمھارے سامنے وہ انجام رکھ رہا ہوں جس سے کل تمھیں لازماً دوچار ہونا ہے۔

'مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ': یعنی اس طرح سنجیدگی کے ساتھ غور کرو گے تو تم پر یہ حقیقت خود واضح ہو جائے گی کہ تمھارے ساتھی کو کوئی جنون نہیں ہے بلکہ خود تمھاری اپنی عقلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ تم اس کے خلاف جتھہ بندی کر کے اس کو زچ کرنے کے درپے ہو۔

لفظ 'صاحب' یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جس شخص کو تم خبطی اور دیوانہ قرار دے رہے ہو اس سے تمھیں کوئی نیا نیا رابطہ پیش نہیں آیا ہے بلکہ یہ تمھارے ہی اندر پیدا ہوا، تمھارے ہی سامنے پلا اور بڑھا اور تمھارے ہی آگے یہ اپنی اس عمر کو پہنچا۔ اس پورے زمانے میں تم نے دیکھا کہ یہ تمھارے ہر خیر میں شریک اور تمھارے ہر شر سے مجتنب رہا ہے۔ تم نے ہر آزمائش میں اس کو صادق اور امین پایا۔ اس کی سوجھ بوجھ اور اس کی عقل و بصیرت پر تم نے اعتماد کیا اور اس کو اپنے اندر سب سے بڑا عاقل و فرزانہ مانتے رہے لیکن آج اسی فرزانہ کو دیوانہ قرار دے رہے ہو! غور کرو، دیوانہ وہ ہے یا تم!

ایک بلیغ وقفہ

یہاں 'تَتَفَكَّرُوْا' کے بعد وقف ہے اور یہ وقف نہایت بلیغ ہے۔ گویا غور و فکر کی دعوت کے بعد لوگوں کو غور و فکر کے لیے تھوڑا سا وقت بھی دے دیا۔ اس کے بعد اس غور و فکر کا جو صحیح نتیجہ نکلنا چاہیے وہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ اس قسم کے وقف کی متعدد مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔

پیغمبر کی بے قراری کا اصلی وجہ

'اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ': یہ بات بھی یہاں نہایت برمحل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو تم دیکھتے ہو کہ اس کے دل و دماغ پر ایک ہی فکر، عذاب اور آخرت کی، ہر وقت سوار ہے۔ اٹھتے بیٹھتے ہر لمحہ وہ تم کو اسی سے ڈراتا اور اسی کے لیے تیاری کرنے کی نصیحت کرتا ہے۔ تمھاری تمام ناقدریوں، دل آزاریوں اور ستم رانیوں کے باوجود تمھارے پیچھے پھرتا ہے تو اس کی یہ بے قراری

بھی اس وجہ سے نہیں ہے کہ اس کو کوئی جنون لاحق ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ جو عذاب تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے وہ اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے لیکن تمھیں وہ نظر نہیں آرہا ہے۔ اس کی یہ ساری بے چینی و بے قراری تمھاری ہمدردی میں ہے لیکن تم اپنے اندھے پن کے سبب سے اس کی ان بے چینیوں اور بے قراریوں کو خبط و جنون پر محمول کرتے ہو۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ایک رسول کو اپنی قوم پر آنے والے عذاب کا نظر آنا کوئی مجاز نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ رسول اپنی قوم کے لیے رحمت کی گھٹا بن کر آتا ہے لیکن اس رحمت کی گھٹا کے اندر ہی اس کی قوم کے لیے صاعقۂ عذاب بھی پوشیدہ ہوتا ہے اگر قوم اس کی تکذیب کر دیتی ہے۔ یہی عذاب آخرت کے عذاب کا دیباچہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہر رسول نے اپنی قوم کو ان دونوں عذابوں سے ڈرایا ہے اور اس یقین کے ساتھ ڈرایا ہے کہ گویا وہ اپنی دونوں آنکھوں سے اس عذاب کو دیکھ رہا ہو۔ لیکن عقل کے اندھوں نے اس کے اس یقین کو جنون پر محمول کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر چڑھ کر واصباحا! کا جو نعرہ لگایا وہ اسی یقین کا مظاہرہ تھا لیکن قریش کے لیڈروں نے اس سے متنبہ ہونے کے بجائے اس کا مذاق اڑایا۔

قُلْ مَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَي اللّٰهِ ۚ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۴۷)

ایک ہی حقیقت دو مختلف اسلوبوں سے

یہ مضمون قرآن میں دو اسلوبوں سے آیا ہے اور دونوں کا مفاد ایک ہی ہے۔

ایک اسلوب یہ ہے کہ میں نے اپنی خدمت پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے کہ تم مجھ سے بدک رہے ہو، میرا اجر تو بس میرے رب ہی کے ذمہ ہے۔

دوسرا یہ کہ اگر میں نے تم سے کوئی بات چاہی ہے جس کو تم اجر سمجھتے اور بار محسوس کرتے ہو تو وہ اپنے لیے نہیں بلکہ تمھاری ہی دنیا و آخرت کی بہبود کے لیے چاہی ہے۔

پہلے اسلوب کی مثالیں بکثرت ہیں۔ ان کے حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں یہ مضمون اس دوسرے اسلوب میں بیان ہوا ہے جس کی بعض نظیریں ہم نقل کرتے ہیں۔ سورۂ فرقان میں ہے:

قُلْ مَآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ	کہہ دو کہ میں نے اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگا ہے،
شَاۗءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا (۵۷)	مگر یہ کہ جو چاہے اپنے رب کی راہ اختیار کرے۔

اگرچہ اس آیت کی تاویل پہلے اسلوب کے مفہوم میں بھی ہو سکتی ہے اور وہ بھی عربیت کے خلاف نہیں ہو گی لیکن اس کا یہ مطلب بھی بالکل واضح ہے کہ میں نے اپنی اس خدمت پر تم سے اپنے لیے کچھ نہیں چاہا ہے۔ اگر چاہا ہے تو تمھارے ہی لیے چاہا ہے کہ تم میں سے جو خدا کی راہ کا طالب ہو میں اس کو خدا کی صراطِ مستقیم دکھا دوں۔

اسی طرح سورۂ شوریٰ میں ہے:

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى (۲۳) — کہہ دو کہ میں اس پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا مگر یہ کہ قرابت مندوں کے معاملے میں حسنِ سلوک کی روش اختیار کرو۔

اگرچہ اس آیت کی تاویل بھی پہلے اسلوب کی روشنی میں ہو سکتی ہے، اس پر اس کے محل میں ہم بحث کریں گے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی بالکل واضح ہے کہ اگر تم میری دعوت انفاق و صلۂ رحم کو بار سمجھتے ہو تو یہ بھی میں اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے ہی لیے اور تمہارے رشتہ داروں و قرابت مندوں ہی کے لیے چاہتا ہوں۔

اسی اسلوب پر آیت زیر بحث میں فرمایا کہ اول تو میں نے اپنی اس دعوت و تعلیم پر تم سے کسی اجر کا مطالبہ کیا نہیں، میرا اجر میرے رب کے ذمہ ہے؛ لیکن اگر تم میرے کسی مطالبہ کو اپنے اوپر بار اور اس کو میرا اجر تصور کرتے ہو تو یہ تمہاری غلط فہمی و کج اندیشی ہے۔ میں نے تم سے جو کچھ بھی چاہا ہے اپنے لیے نہیں بلکہ تمہارے ہی لیے چاہا ہے۔ میں تمہیں خدا اور آخرت سے جو ڈراتا ہوں، نیکی کی تلقین کرتا ہوں، انفاق فی سبیل اللہ، اطعام فقراء و یتامیٰ اور غلاموں کو آزاد کرنے پر ابھارتا ہوں تو ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں میرا کوئی ذاتی مفاد ہو بلکہ ان کا فائدہ، انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں سے، تمہی کو حاصل ہوگا۔ تم ان باتوں پر عمل کر کے اپنی دنیا بھی سنوارو گے اور اپنی آخرت بھی بناؤ گے۔

یہ بات قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی فرمائی گئی ہے مخاطبوں کو ملامت اور ان سے اظہارِ بے نیازی کے سیاق ہی میں فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان ناقدروں سے کہہ دو کہ میں نے اپنی دعوت پر کوئی ٹکٹ یا چندہ تو نہیں لگا رکھا ہے کہ وہ تمہارے لیے میرے پاس آنے اور میری بات سننے میں مانع ہو رہا ہو، تم ہر وقت میرے پاس آ سکتے ہو اور بے جھجک آ سکتے ہو۔ میری مجلس میں کسی پر کوئی قدغن نہیں۔ تمہارے امیر و غریب سب کے لیے میرا دروازہ کھلا ہوا اور میرا سینہ کشادہ ہے۔ اور اگر نہیں آتے تو یاد رکھو کہ میرا کچھ نہیں بگاڑو گے، اپنا ہی بگاڑو گے۔ میں نے کوئی دکان نہیں کھولی ہے کہ تمہاری بے التفاتی سے میری دکان بیٹھ جائے گی۔ میں نے تو اپنے رب سے مفت پایا ہے، مفت بانٹ رہا ہوں۔

'وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ'۔ یعنی میرا اجر جس اللہ کے ذمہ ہے وہ ہر چیز پر حاضر و ناظر ہے۔ مجھے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ میری کوئی حقیر سے حقیر خدمت بھی اس سے پوشیدہ رہے گی۔ وہ میری سرگرمیاں بھی دیکھ رہا ہے اور تمہاری ناقدریاں بھی اس کی نگاہوں میں ہیں۔ میں پورا بھروسہ رکھتا ہوں کہ وہ مجھے میری خدمات کا بھرپور صلہ دے گا۔

قُلْ اِنَّ رَبِّىْ يَقْذِفُ بِالْحَقِّ ۚ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (۴۸)

'يَقْذِفُ بِالْحَقِّ' کے بعد 'عَلَى الْبَاطِلِ' کے الفاظ بربنائے قرینہ محذوف ہیں، جیسا کہ دوسرے مقام میں ایک تنبیہ:

فرمایا ہے "بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ" (الانبیاء: ۱۸) (ہم حق کو باطل پر ماریں گے پس وہ اس کا بھیجا نکال کے رکھ دے گا)۔

یعنی ان نادانوں کو بتا دو کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ یہ دنیا یوں ہی پیدا ہوئی، یوں ہی تمام ہو جائے گی بلکہ ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس دن اس کا خالق اس کے حق و باطل میں فیصلہ فرمائے گا اور حق کو باطل پر مارے گا جس سے باطل پاش پاش ہو کے رہ جائے گا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اصلاً تو یہ بات آخرت کی عدالتِ کبریٰ سے متعلق ہے لیکن یہی نتیجہ اس عدالتِ صغریٰ کا بھی برآمد ہوتا ہے جو ایک رسول کی بعثت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ ہم جگہ جگہ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جس قوم کی طرف رسول کی بعثت ہوئی اس قوم کے حق و باطل کا فیصلہ لازماً ہو گیا۔ چنانچہ فتحِ مکہ کے موقع پر حضورؐ نے اعلان فرمایا کہ "جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا" (حق آگیا اور باطل نابود ہوا، بے شک باطل نابود ہی ہونے والی چیز ہے)۔

"عَلَّامُ الْغُيُوبِ"۔ ہمارے نزدیک یہ مستقل جملہ ہے اور مبتدا یہاں محذوف ہے۔ یہ حق و باطل کے درمیان عدالت کی دلیل صفاتِ الٰہی سے پیش کی گئی ہے کہ اس کائنات کا رب تمام غیب کی باتوں کو جانتا ہے، کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہے، اس وجہ سے کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس کو کسی چیز کا فیصلہ کرنے میں کوئی زحمت پیش آئے گی۔ وہ ہر ایک کا پورا اعمال نامہ اس کے آگے رکھ دے گا جس میں اس کا ہر عمل درج ہوگا خواہ وہ کتنے ہی پوشیدہ گوشوں میں انجام دیا گیا ہو۔

قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ (۴۹)

جس طرح اوپر کی آیت میں "یَقْذِفُ بِالْحَقِّ" کے بعد "زَهَقَ الْبَاطِلُ" کے الفاظ حذف ہیں اسی طرح یہاں "جَاءَ الْحَقُّ" کے بعد "زَهَقَ الْبَاطِلُ" کے الفاظ حذف ہیں اور اس خلا کو "وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ" کے الفاظ نے بھر دیا ہے۔

باطل ایک بے ثبات چیز ہے

فرمایا کہ ان نادانوں کو بتا دو کہ اب حق قرآن کی شکل میں آگیا اور جب حق آگیا تو اس باطل کا نابود ہونا لازمی ہے جس کی وہ پرستش کرتے رہے ہیں۔ اب اگر وہ اس باطل کے ساتھ چمٹے رہے تو اس کے ساتھ وہ بھی پس جائیں گے۔

جن کا اس کائنات کے ابداء میں دخل نہیں ان کا اس کے اعادہ میں بھی کوئی دخل نہیں

"وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ"۔ یہ باطل کی بے ثباتی کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ اس کارخانۂ کائنات کا آغاز اس کے خالق نے حق کے ساتھ فرمایا ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ اس کی انتہا بھی حق پر ہو۔ جب باطل کا کوئی دخل اس کے ابداء میں نہیں ہے تو اس کے اعادہ میں اس کا دخل کس طرح ہو جائے گا! پس جو لوگ فرضی دیویوں دیوتاؤں کی سفارشوں پر تکیہ کیے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں یاد رکھیں کہ ان کے دیوتاؤں کے اختیار میں نہ کسی چیز کا ابداء ہے نہ اعادہ۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکینِ عرب اس کائنات

کے ابدا میں کسی کو شریک نہیں مانتے تھے لیکن وہ اس بات کے قائل تھے کہ اگر آخرت کا مرحلہ پیش آیا تو ان کی واپسی ان کے معبودوں کی طرف ہوگی جو اپنی سفارشوں سے ان کو وہاں بھی اعلیٰ مراتب دلائیں گے۔ قرآن نے ان کی اسی غلط فہمی کے ازالہ کے لیے جگہ جگہ ان کے اس مغالطہ پر گرفت کی ہے کہ جب تم اس کائنات کے ابداء میں کسی کو شریک نہیں مانتے تو اس کے اعادہ میں کیوں شریک مانتے ہو؟

سورۂ یونس میں یہی مضمون اس طرح بیان فرمایا ہے:

اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ۭ وَعْدَ	اسی کی طرف تم سب کی واپسی ہونی ہے۔ یہ اللہ
اللّٰهِ حَقًّا ۭ اِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ	کا شدنی وعدہ ہے۔ بے شک وہی خلق کا آغاز فرماتا
ثُمَّ يُعِيْدُهٗ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ	ہے پھر وہ اس کا اعادہ فرمائے گا تاکہ وہ ان لوگوں کو
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۭ	انصاف کے ساتھ بدلہ دے جو ایمان لائے اور جنھوں
(یونس: ۴)	نے نیک اعمال کیے۔

پھر یہی مضمون دوسرے اسلوب سے یوں بیان ہوا ہے:

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ	ان سے پوچھو، تمھارے شرکاء میں سے کوئی ہے
يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ۭ	جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا اعادہ کرے گا؟
فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝	کہہ دو، اللہ ہی خلق کا آغاز کرتا ہے پھر وہ اس کا
(یونس: ۳۴)	اعادہ کرے گا۔ تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو!

قُلْ اِنْ ضَلَلْتُ فَاِنَّمَآ اَضِلُّ عَلٰي نَفْسِيْ ۚ وَاِنِ اهْتَدَيْتُ فَبِمَا يُوْحِيْٓ اِلَيَّ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ (۵۰)

اب یہاں لوگوں کو تنبیہ فرمائی کہ ان سے کہہ دو کہ اگر میں گمراہ ہوں، جیسا کہ تم سمجھتے ہو تو اس گمراہی کا خمیازہ بہرحال مجھ ہی کو بھگتنا ہے، تم اس کے وبال سے محفوظ ہو اس لیے کہ تم اس میں میرا ساتھ نہیں دے رہے ہو۔ لیکن اس مسئلہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اس پر بھی اچھی طرح غور کر لو۔ وہ یہ کہ اگر میں ہدایت پر ہوں تو یہ ہدایت اس وحی کی بدولت مجھے حاصل ہوئی ہے جو میرا پروردگار مجھ پر نازل فرما رہا ہے۔ اس صورت میں میری تکذیب تمھارے لیے کوئی سہل چیز نہیں ہے بلکہ تم وحی الٰہی کے جھٹلانے والے ٹھہرتے ہو اور وحی الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام ہونا چاہیے اور ہوگا وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کو بہت دور تک سوچ لو!

وحی الٰہی کی تکذیب کا انجام

تفویض الی اللہ

'اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ' یہ تفویض الی اللہ کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تم سے زیادہ بحث و جدال بے سود ہے۔ میں یہ آخری بات کہہ کے تمھارا معاملہ اپنے رب کے حوالے کرتا ہوں۔ تم نہ تو میری بات سننے کے لیے تیار ہو، نہ قریب آنے کے روادار ہو لیکن میرا رب میری باتیں سننے والا بھی ہے اور قریب بھی ہے۔ تو اب تمھارے پیچھے سر کھپانے کے بجائے اسی سے عرض معروض کروں گا جو سنتا اور قبول فرماتا ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ فَزِعُوا فَلَا فَوْتَ وَأُخِذُوا مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ (۵۱)

فیصلہ کن گھڑی

یہاں جوابِ شرط محذوف ہے۔ اس کی مثال آیت ۳۱ میں گزر چکی ہے۔ اس طرح جوابِ شرط کا محذوف ہونا اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ جواب تعبیر و تصویر سے مافوق ہے۔ فرمایا کہ آج تو ان کے استکبار کا یہ حال ہے کہ پُٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دے رہے ہیں لیکن اگر کہیں تم ان کے اس وقت کو دیکھ پاتے جب کہ وہ خدا کی اس گرفت میں آجائیں گے جس کو آج جھٹلا رہے ہیں تب تم کو ان کی بے بسی کا کچھ اندازہ ہوتا کہ کس طرح یہ ناک رگڑتے اور حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔ فرمایا کہ جب یہ خدا کے عذاب کی پکڑ میں آئیں گے تو گھبرا کر بھاگنے اور بچنے کی کوشش کریں گے لیکن خدا کی گرفت سے کون بچ سکتا ہے جو یہ اس سے بھاگ سکیں گے۔ "وَأُخِذُوا مِن مَّكَانٍ قَرِيبٍ" یعنی یہ بھاگنا چاہیں گے لیکن پاس ہی سے دھر لیے جائیں گے۔ ان کے پاؤں کے نیچے یا ان کے سر کے اوپر سے اس طرح خدا کا عذاب ان کو اپنے نرغے میں کرے گا کہ کسی طرف بھی ان کو راہِ فرار سجھائی نہیں دے گی۔

وَقَالُوٓا ءَامَنَّا بِهِۦ وَأَنَّىٰ لَهُمُ ٱلتَّنَاوُشُ مِن مَّكَانٍۭ بَعِيدٍ (۵۲)

یعنی اس وقت ان کا سارا نشہ ہرن ہو جائے گا اور وہ پکار اٹھیں گے کہ اب ہم اس قرآن پر ایمان لائے۔ ضمیر کا مرجع یہاں قرآن ہے جس کا ذکر اوپر کی آیات میں گزر چکا ہے۔ قرآن کو پیش کرنے والے یعنی آنحضرت از خود اس میں شامل ہیں۔

بعد از وقت ایمان

"وَأَنَّىٰ لَهُمُ ٱلتَّنَاوُشُ مِن مَّكَانٍۭ بَعِيدٍ" یعنی ایمان کا محل تو یہ دنیا ہے اور وہ بھی عذابِ الٰہی کے ظہور سے پہلے تو جب عذابِ الٰہی ظاہر ہو جائے گا اس وقت تو یہ ایمان کی منزل سے اتنی دور نکل جائیں گے کہ وہاں سے ان کے لیے اس کے پا سکنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جائے گا۔ عذابِ الٰہی کی گرفت میں آجانے کے بعد تو فرعون جیسا سرکش بھی پکار اٹھا تھا کہ میں موسیٰ و ہارون کے رب پر ایمان لایا! لیکن اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب ملا کہ "آلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ" (اب ایمان لائے! حالانکہ جب ایمان لانے کا وقت تھا تو تم نے نافرمانی کی)۔

'تناوش' کے معنی پا لینے کے ہیں اور "أَنَّىٰ لَهُمُ" کا مفہوم یہ ہے کہ بھلا اس وقت اس کے پانے کا کیا امکان ہوگا!

دست کوتاہ است و خرما بر نخیل

وَقَدْ كَفَرُوا بِهِۦ مِن قَبْلُ ۖ وَيَقْذِفُونَ بِٱلْغَيْبِ مِن مَّكَانٍۭ بَعِيدٍ (۵۳)

'قذف بالحجارۃ' کے معنی ہیں پتھر پھینکا۔ 'قذف بالقول' تکلم بلا تدبر ولا تامل۔ یعنی بے سوچے سمجھے بات پھینک ماری۔ یہیں سے یہ 'رجماً بالغیب' یعنی اٹکل پچو بات کہنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عذاب دیکھنے کے بعد وہ ایمان کا اقرار کریں گے حالانکہ اس سے پہلے وہ دور سے

بیٹھے ہوئے اٹکل کے تیر تکے چلاتے رہے تھے کہ یہ کتاب من گھڑت ہے، اس کا پیش کرنے والا (العیاذ باللہ) بر خود غلط ہے، عذاب کی دھمکی محض دھونس ہے، قیامت کا ڈراوا محض خلل دماغ کا نتیجہ ہے اور اگر قیامت کا کوئی مرحلہ پیش آیا تو ہمارے شرکاء کے طفیل ہمارا تفوق وہاں بھی قائم رہے گا۔ الغرض عقل کو بالائے طاق رکھ کے قرآن اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تکذیب کے جنون میں جو کچھ زبان پر آیا بکتے رہے لیکن جب حقیقت سامنے آجائے گی تو اس کا اقرار کریں گے لیکن یہ اقرار بعد از وقت اور بالکل بے سود ہوگا۔

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِم مِّن قَبْلُ ۚ إِنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مُّرِيبٍ (۵۴)

امید کے تمام دروازے بند

یعنی جب فیصلہ کن عذاب نمودار ہو جائے گا تو ان کے اور ان کی تمام چاہتوں کے مابین دیوار حائل ہو جائے گی۔ وہ ایمان لانا چاہیں گے لیکن ان کا یہ چاہنا بے سود ہوگا۔ وہ مہلت کی درخواست کریں گے لیکن کوئی شنوائی نہیں ہوگی۔ وہ اپنے شریکوں کو پکاریں گے لیکن ان کی طرف سے بھی ان کی کوئی فریاد رسی نہیں ہوگی۔ غرض امید کے تمام دروازے ان پر بند ہو جائیں گے اور ایک ابدی مایوسی سے ان کو سابقہ پیش آئے گا۔

'كَمَا فُعِلَ بِأَشْيَاعِهِم' یعنی ان کو بھی اسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے گا جس سے ان کے پیشرو ہم مشربوں کو دوچار ہونا پڑا۔ یہ اشارہ عاد، ثمود، اہلِ مدین اور فرعون وغیرہ کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں تفصیل کے ساتھ قرآن میں سنائی جا چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس سے پہلے پیش نہ آچکی ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان تمام قوموں کو اسی انجام سے سابقہ پیش آیا جنھوں نے ان کی طرح اپنے رسولوں کے انذار کی تکذیب کی۔ اگر یہ ان کے حالات سے سبق نہیں لیتے تو لازماً انہی کے انجام سے دوچار ہوں گے۔

'إِنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مُّرِيبٍ' یعنی وہ بھی انہی کی طرح الجھن میں ڈالنے والے شک میں پڑے رہے یہاں تک کہ بالآخر فیصلہ کن گھڑی سر پر آہی گئی۔ 'شک مریب' کی نوعیت پر ھود ۶۲-۱۱۰ میں ہم گفتگو کر چکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے، ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد : ۳ر جنوری ۱۹۷۵ء

جمعہ۔ ۹ بجے دن

۳۵

فاطر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــــ سورۂ سبا ـــــــ کی توام سورہ ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اس کا بھی اصل مضمون توحید ہی ہے۔ اس کا آغاز خدا کی حمد کے اثبات اور فرشتوں کی الوہیت کے تصور کے ابطال سے ہوا ہے۔ پھر توحید ہی کے تحت رسالت و معاد سے متعلق وہ باتیں بیان ہوئی ہیں جو مقصد انذار کے پہلو سے ضروری اور سورہ کے مزاج اور اس کے زمانۂ نزول سے مناسبت رکھنے والی ہیں۔ پچھلی سورہ میں، یاد ہوگا، جنوں اور ملائکہ کی الوہیت کے تصور کا ابطال فرمایا ہے۔ اس سورہ میں ملائکہ کی الوہیت کے تصور کی تردید نسبۃً زیادہ واضح الفاظ میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکینِ عرب کے مزعومہ معبودوں میں سب سے زیادہ اہمیت فرشتوں ہی کو حاصل تھی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) شکر کا حقیقی سزاوار اللہ ہے۔ وہی آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ اسی نے فرشتوں کو بھی وجود بخشا ہے اور ان کو، اپنی حکمت کے مطابق، جن صلاحیتوں اور قوتوں سے چاہا ہے بہرہ مند کیا ہے۔ ان کو بذاتِ خود کوئی اختیار و اقتدار حاصل نہیں ہے۔ تمام رزق و فضل خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ بخشنا چاہے تو کوئی اس کی بخشش کو روک نہیں سکتا اور روکنا چاہے تو کوئی اس سے دلوا نہیں سکتا۔ پس عبادت کا اصلی حقدار وہی ہے۔ اس کے سوا دوسروں کی پوجا محض جہالت و حماقت ہے۔

(۴-۸) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ اگر تمہاری قوم کے لوگ تمہاری تکذیب کر رہے ہیں تو اپنی پیشرو قوموں کے نقشِ قدم کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے وہ دوچار ہوئیں۔ ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں کھبا دیے گئے ہیں اور یہ اللہ کے قانون کی زد میں آچکے ہیں تو ان کے غم میں اپنے کو گھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔

قریش کو انذار کہ پیغمبرؐ جس چیز سے تم کو ڈرا رہا ہے وہ ایک امر شدنی ہے تو اپنی موجودہ دنیوی کامیابیوں سے کسی دھوکے میں نہ رہو اور شیطان کے پھندوں میں نہ پھنسو، وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے تو اپنے دشمن کو دشمن ہی سمجھو۔ بڑا ہی نادان ہے وہ جو اپنے دشمن کو دوست بنا بیٹھے۔

(۹-۱۰) حشر و نشر کی ایک واضح دلیل کی طرف اشارہ اور یہ تنبیہ کہ جو حشر کے دن خدا کے ہاں تقرب کا طالب ہو وہ جھوٹے سہاروں پر زندگی نہ گزارے۔ اس دن فرضی دیویوں دیوتاؤں کے بل پر کسی کو تقرب حاصل نہیں ہوگا۔ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز کلمۂ طیبہ ـــــ کلمۂ توحید ـــــ ہے اور اس کلمۂ طیبہ کو بلندی عمل صالح سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کو آخرت کی عزت مطلوب ہو وہ ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرے۔ اس سے ہٹ کر جو راہیں نکالی گئی ہیں وہ سب فریب نفس کی راہیں ہیں اور ان کا انجام ابدی تباہی ہے۔

(۱۱-۱۸) مال و اولاد اور رزق و فضل خدا کا عطیہ ہیں۔ عمر کی زیادتی و کمی خدا کے اختیار میں ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی کسی دوسرے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کائنات کے اضداد میں جو توافق ہے وہ اس بات کی کھلی ہوئی شہادت ہے کہ اس میں ایک ہی خدائے قادر و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے۔ اس کے سوا جن کو معبود بنایا گیا ہے نہ ان کو کوئی اختیار حاصل ہے اور نہ وہ قیامت کے روز کسی کے کچھ کام آنے والے بنیں گے۔

لوگوں کو یہ تنبیہ کہ تمھیں اصل حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔ اگر تم نے اس کی قدر نہ کی تو اپنا ہی بگاڑو گے خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے۔ خدا تمھارا محتاج نہیں ہے بلکہ تمہی خدا کے محتاج ہو۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ تمھاری دعوت انہی لوگوں پر اثر انداز ہو سکتی ہے جن کے اندر زندگی کی کچھ رمق ہے۔ جو بالکل مردہ ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ ان کے لیے جو انجام مقدر ہو چکا ہے وہ اسی سے دوچار ہوں گے۔

(۱۹-۲۸) ایمان لانے اور نہ لانے والوں کی تفصیل اور اس کائنات میں جو اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اس کی حکمت کی طرف اشارہ کہ جس طرح اس میں اللہ نے نور و ظلمت کو پیدا کیا ہے اور ان دونوں کی خلقت حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اسی طرح ایمان و کفر کا یہ تصادم بھی خدا کی حکمت پر مبنی ہے۔ اس وجہ سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ سب ایمان سے بہرہ مند ہو جائیں گے۔ ایمان صرف وہی لائیں گے جن کے اندر علم و معرفت کی روشنی اور اس کی قدر ہے۔

(۲۹-۳۸) ان علمائے اہل کتاب کی تحسین و حوصلہ افزائی جو تمام بگاڑ اور فساد کے باوجود اللہ کی کتاب پر قائم ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ کہ جس طرح ان کو تورات پر قائم رہنے کی سعادت حاصل ہوئی اسی طرح قرآن پر بھی ایمان لانے کی ان کو سعادت حاصل ہوگی اس لیے کہ یہ انہی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے جو اس کی بابت تورات اور دوسرے صحیفوں میں وارد ہوئی ہیں۔ تورات کے بعد اس قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے امیوں پر عظیم احسان فرمایا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اس نے ان کو دنیا کی امامت بخشی ہے بشرطیکہ وہ اس کی قدر کریں۔ پھر فرمایا کہ اگرچہ ان میں ناقدرے اور ناشکرے بھی ہیں لیکن ساتھ ہی ان میں معقولیت پسند اور نیکی کی راہوں میں سبقت کرنے والے بھی ہیں۔ اس طرح کے لوگ اس پر ایمان لائیں گے رہے وہ لوگ جو اس نعمت کی ناقدری کریں گے تو وہ اس انجام سے دوچار ہوں گے جو اس طرح کے لوگوں کے لیے اللہ کے

ہاں متعذر ہے۔

(۳۹-۴۱) قریش کو تہدید و وعید کہ تم دنیا میں پہلی قوم نہیں ہو بلکہ پچھلی قوموں کے جانشین ہو اس وجہ سے خدا نے جس میزانِ عدل سے ان کو تولا کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس سے تم کو نہ تولے۔ خدا کے ہاں الگ الگ ترازو اور الگ الگ باٹ نہیں ہیں بلکہ سب کے لیے ایک ہی میزان ہے۔ تمھاری سرکشی کے باوجود خدا جو ڈھیل تمھیں دے رہا ہے اس کو اپنی کامیابی نہ سمجھو بلکہ یہ تمھارے خسارہ میں اضافہ ہے۔ خدا حلیم و غفور ہے اس وجہ سے تمھیں مہلت دیتے رہتا ہے لیکن جب وہ پکڑے گا تو تمھارے یہ فرضی دیوی دیوتا تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ آسمان و زمین خدا کے تھامے تھمے ہوئے ہیں تمھارے ان دیوتاؤں نے ان کو نہیں تھام رکھا ہے۔

(۴۲-۴۵) قریش کو یہ یاددہانی کہ رسول کی بعثت سے پہلے تو تم اس ولولہ کا اظہار کرتے تھے کہ اگر تمھارے اندر کسی رسول کی بعثت ہوئی تو تم دنیا کی سب سے زیادہ ہدایت یافتہ قوم بنو گے لیکن جب رسول آیا تو رات دن اس کے خلاف سازشوں میں سرگرم ہوا اور خدا کے اسی قہر کو دعوت دے رہے ہو جو رسولوں کی تکذیب کرنے والوں پر ہمیشہ نازل ہوا۔ یاد رکھو کہ اگر خدا کسی قوم کو فوراً پکڑنا چاہے تو کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا لیکن اس نے ہر قوم کے فیصلہ کے لیے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا ہے۔

مطالب کے اس تجزیہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اس سورہ کا اندرونی نظام اور سابق سورہ سے اس کا تعلق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اب اللہ کا نام لے کر ہم سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔ وبیدہ اللہ التوفیق وھو الھادی الی الصواب۔

سُورَةُ فَاطِرٍ (۳۵)

مَكِّيَّةٌ ______ اٰيَاتُهَا ۴۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ① مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ② يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ڮ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ③ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ④ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۪ وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ⑤ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ⑥ ۭ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ڛ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ⑦ ۧ اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْۗءُ

آيات ۱-۸

ع ۱ ۱۳

عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ﴿۸﴾

ترجمۂ آیات ۱-۸

شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے۔ آسمانوں اور زمین کا خالق، فرشتوں کو دو دو، تین تین اور چار چار پروں والے پیغام رساں بنانے والا۔ وہ خلق میں جو چاہے اضافہ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱

اللہ لوگوں کے لیے جس رحمت کا فتح باب کرے تو اس کو کوئی روکنے والا نہیں اور جس کو روک لے تو اس کے بعد کوئی اس کو کھولنے والا نہیں اور وہی حقیقی عزیز و حکیم ہے۔ ۲

اے لوگو! تمھارے اوپر اللہ کا جو انعام ہے اس کا دھیان کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق بہم پہنچاتا ہو! اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو تم کہاں اوندھے ہوئے جاتے ہو! ۳

اور اگر یہ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو کچھ غم نہ کرو، تم سے پہلے بھی کتنے رسولوں کی تکذیب کی گئی ہے اور اللہ ہی کے سامنے سارے امور پیش کیے جائیں گے۔ ۴

اے لوگو! اللہ کا وعدہ شدنی ہے تو تم کو یہ دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ اللہ کے باب میں تم کو فریب کار شیطان فریب میں رکھے۔ بے شک شیطان تمھارا دشمن ہے تو تم اس کو دشمن ہی سمجھو۔ وہ تو اپنی پارٹی کو صرف جہنم کا ایندھن بنانے کے لیے بلاتا ہے۔ جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے سخت عذاب ہے اور جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے ان کے لیے مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے۔ ۵-۷

کیا وہ جس کی نگاہوں میں اس کا بُرا عمل کُھبا دیا گیا ہے، پس وہ اس کو اچھا خیال کرنے لگا ہے (ایمان لانے والا بن سکتا ہے!) پس اللہ ہی جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے تو ان کے غم میں تم اپنے کو ہلکان نہ کرو، اللہ باخبر ہے ان کاموں سے جو وہ کر رہے ہیں۔ ۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱)

دین کی بنیاد توحید ہے اور توحید کی حقیقت اللہ ہی کی شکرگزاری ہے

یاد ہوگا، پچھلی سورہ کا آغاز بھی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ہی سے ہوا ہے۔ اس سے دونوں سورتوں کے مزاج کی مناسبت واضح ہوتی ہے۔ دین کی بنیاد توحید پر ہے اور توحید کی حقیقت اللہ ہی کی شکرگزاری ہے اس لیے کہ آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا اللہ ہی ہے اور بندوں کو جو ظاہری و باطنی نعمتیں بھی حاصل ہوئی ہیں سب اللہ ہی کا عطیہ ہیں۔

فرشتوں کی حیثیت قاصدوں کی ہے نہ کہ معبودوں کی

'جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ'۔ 'جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ' بدل ہے 'فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ' سے۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر اس کی اہمیت کے پہلو سے فرمایا کہ جو اللہ آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اسی نے فرشتوں کو بھی پیغام رسانی کے مقصد سے وجود بخشا ہے۔ فرشتوں کے خاص طور پر ذکر کی وجہ یہ ہے کہ عربوں کی میتھالوجی (MYTHOLOGY) میں سب سے زیادہ اہمیت فرشتوں ہی کو حاصل تھی۔ وہ ان کو خدا کی چہیتی بیٹیوں کا درجہ دیتے اور اسی حیثیت سے ان کی عبادت کرتے تھے۔ ان کا تصور یہ تھا کہ اگر یہ خوش رہیں تو ان کے واسطے سے سب کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ اس عقیدے نے ان کے ہاں خدا کے وجود کو بالکل معطل کر دیا تھا۔ وہ خدا کو رسمی طور پر مانتے تو تھے لیکن ان کی تمام شکرگزاری اور عبادت کے مرکز ان کے وہ اصنام ہی تھے جو انھوں نے اپنے زعم کے مطابق فرشتوں کے نام پر بنا رکھے تھے۔ یہاں ان کے اسی زعم باطل کی تردید کے لیے ارشاد ہوا کہ شکر کا سزاوار اللہ ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ اسی نے فرشتوں کو بھی پیغام بری کی ڈیوٹی پر مقرر فرمایا ہے یعنی یہ فرشتے نہ آسمان و زمین کی تخلیق میں کسی نوع سے شریک ہیں اور نہ الوہیت میں ان کا کوئی حصہ ہے بلکہ یہ صرف خدا کے پیغام رساں ہیں جن کے ذریعے سے خدا اپنے رسولوں کو اپنے احکام سے آگاہ کرتا ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ جن لوگوں نے ان قاصدوں کو مقصود کا اور نامہ بروں کو محبوب کا درجہ دے کر انہی کی پرستش شروع کر رکھی ہے انھوں نے نہ خدا کی قدر پہچانی، نہ ان قاصدوں کی اور نہ اپنی ہی۔

فرشتوں کے درمیان فرقِ مراتب

'اُولِیْٓ اَجْنِحَۃٍ' صفت ہے 'رُسُلًا' کی۔ 'اَجْنِحَۃ' جمع ہے 'جَنَاح' کی۔ 'جناح' آدمیوں کے بازوؤں کے لیے بھی آتا ہے اور پرندوں کے پروں کے لیے بھی جن سے وہ اڑتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ فرشتوں کے لیے استعمال ہوا ہے اس وجہ سے اس کی نوعیت متشابہات کی ہے یعنی ان کی اصل حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ مقصود اس سے یہاں ہم کو صرف اس حقیقت کا علم دینا ہے کہ سب فرشتے ایک ہی درجے کے نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی مصلحتوں کے تحت مختلف درجے کی قوتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ کسی کی قوتِ پرواز کم ہے کسی کی زیادہ۔ کچھ دو پروں کی قوت سے اڑتے ہیں، کچھ تین کی، کچھ چار کی۔

یہ پَر فرشتوں کے ہیں اس وجہ سے ان کی قوتِ پرواز کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور یہ چار تک کا ذکر بھی تحدید کے مفہوم میں نہیں ہے۔ مقصود یہاں صرف ان کے مراتب و منازل کے تفاوت کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ اس وجہ سے اگر اللہ تعالیٰ کے پاس ایسے فرشتے بھی ہوں جن کی قوتِ پرواز اس سے زیادہ ہو تو اس آیت سے اس کی نفی نہیں ہوتی۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں حضرت جبریلؑ کے پروں کی تعداد اس سے زیادہ مذکور ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوتِ پرواز اور رسائی تمام فرشتوں سے زیادہ ہے۔ مقصود یہاں صرف یہ واضح کرنا ہے کہ جن نادانوں نے فرشتوں کو الوہیت کے زمرے میں داخل کر رکھا ہے ان کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہِ بلند کا پتہ نہیں ہے۔ خدائی میں شریک ہونا تو درکنار اس کے قاصد اور سفیر ہونے میں بھی ان سب کا درجہ و مرتبہ ایک نہیں ہے بلکہ کسی کی رسائی کسی منزل تک ہے اور کسی کی پہنچ کسی مقام تک۔ اسی حقیقت کا اعتراف سورۂ صافات میں حضرت جبریل امینؑ کی زبان سے یوں منقول ہے۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ۝ (۱۶۴-۱۶۶)	اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک معین مقام ہے اور ہم ہر وقت صف بستہ رہنے والے ہیں اور ہم ہر وقت تسبیح کرتے رہنے والے ہیں۔

صفات اور صلاحیتوں میں کمی بیشی کرنا اللہ ہی کے اختیار میں ہے

'یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَا یَشَآءُ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ' یعنی اللہ تعالیٰ جن صلاحیتوں اور قوتوں کی مخلوق چاہے پیدا کر سکتا ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس نے فرشتوں کو اگر اپنی پیغام بری کے لیے پیدا کیا تو یہ بھی اس کی قدرت و حکمت کا کرشمہ ہے۔ اگر ان کے درجات میں تفاوت رکھا تو یہ بھی اسی کی قدرت کی ایک شان ہے کہ اگر وہ اپنی خلق یا اس کی صلاحیتوں میں کوئی مزید اضافہ کرنا چاہے تو اس پر بھی وہ قادر ہے۔ صفات اور صلاحیتوں میں کمی بیشی کرنا اللہ کے اختیار میں ہے۔ اگر کسی کی صفات اور

قوتوں میں اس نے افزونی عطا فرمائی ہے تو اس کے بھی معین حدود ہیں، اس کی بنا پر نہ کسی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ خدا کی خدائی میں شریک ہونے کا مدعی بن جائے نہ یہ جائز ہے کہ دوسرے اس کو خدائی میں شریک بنا دیں۔

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۲)

اس بات کی دلیل کہ کیوں اللہ ہی سزاوار شکر ہے

یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں خدا ہی شکر کا سزاوار ہے۔ فرمایا کہ اللہ تمھارے لیے جس فضل و رحمت کا بھی دروازہ کھولنا چاہے وہ اس کو کھول سکتا ہے، کوئی اس کے فضل و رحمت کو روک نہیں سکتا۔ اسی طرح اگر وہ کسی رحمت سے محروم کرنا چاہے تو کسی کی طاقت نہیں کہ وہ تمھیں اس سے بہرہ مند کر سکے۔ یہی مضمون سورۂ زمر میں یوں بیان ہوا ہے۔

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ (الزمر: ۳۸)

اللہ کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو کبھی تم نے ان پر غور کیا ہے۔ اگر اللہ مجھے کوئی ضرر پہنچانا چاہے تو کیا وہ اس کے دفع کرنے والے بن سکتے ہیں! یا اللہ مجھے کسی رحمت سے نوازنا چاہے تو کیا وہ اس کی رحمت کو روک سکتے ہیں!

مقصد یہ ہے کہ جب اصل حقیقت یہ ہے تو فرشتوں اور جنوں کو تم نافع و ضار سمجھ کر ان کی عبادت جو کرتے ہو یہ محض تمھاری حماقت ہے۔ نفع و ضرر تمام تر خدا ہی کے اختیار میں ہے اس وجہ سے شکر اور عبادت کا حق دار تنہا وہی ہے۔

آیت میں ایک ہی چیز (رحمت) کے لیے ضمیر پہلے مؤنث آئی، پھر اسی کے لیے مذکر آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک جگہ لفظ کا لحاظ ہے دوسری جگہ مفہوم کا۔ اس کی متعدد نظیریں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'مِنْۢ بَعْدِهٖ' یعنی مِنْۢ بَعْدِ اِمْسَاكِهٖ۔ آگے اسی سورہ میں فرمایا ہے 'وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ' (۴۱) (اگر وہ دونوں (آسمان و زمین) اپنی جگہ سے ٹل جائیں تو خدا کے بعد کوئی ان کو تھامنے والا نہیں بن سکتا)۔

'وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' یعنی اصل غالب و مقتدر وہی ہے۔ وہ کھولتا اور وہی روکتا ہے اور یہ کھولنا اور باندھنا تمام تر اس کی حکمت کے تقاضوں کے تحت ہوتا ہے اس لیے کہ وہ حکیم بھی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ؕ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۖ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ (۳)

اتمامِ حجت کے لیے ایک سوال

اوپر کی آیات میں جو مضمون اصولی طور پر بیان ہوا ہے اسی مضمون کو اتمامِ حجت کے انداز میں، لوگوں کو مخاطب کر کے، فرمایا کہ لوگو، اللہ کی جو نعمتیں تم کو حاصل ہیں ان میں سے ایک ایک کا دھیان کرو اور ان پر غور کرو۔ لفظ 'نعمت' یہاں جنس نعمت کے مفہوم میں ہے۔ غور کرنے کے لیے ان کے سامنے مسئلہ کو سوال کی صورت میں رکھا کہ یہ آسمان و زمین میں سے جو تمھیں روزی مل رہی ہے، آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین سے تمھاری معاش و معیشت کی گوناگوں چیزیں پیدا ہوتی ہیں، کیا تم کہہ سکتے ہو کہ خدا کے سوا کوئی اور خالق ہے جو تمھیں یہ چیزیں بخشتا ہے۔

سوال کا جواب

'لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ'۔ ان کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر خود اس کا جواب دیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ خود جواب دینے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اس سوال کا صحیح جواب اس کے سوا کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا، دوسری یہ کہ مشرکینِ عرب، جو یہاں مخاطب ہیں، اس سوال کا یہی جواب، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، دیتے بھی تھے۔ فرمایا کہ جب اصل حقیقت یہ ہے اور تم کو بھی اس سے انکار نہیں ہے تو پھر کہاں تمھاری عقل الٹ گئی ہے کہ دوسری چیزوں کو تم معبود بنائے بیٹھے ہو!

وَاِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِکَ ط وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۴)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر ایسے سرپھرے لوگ تمھاری تکذیب کر رہے ہیں تو یہ کوئی تعجب یا غم کی بات نہیں ہے، تم سے پہلے جو رسول آئے اس طرح کے لوگوں نے ان کی بھی تکذیب کی۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں تمھاری کسی تقصیر کو دخل نہیں ہے بلکہ تمام تر دخل اس میں ان مکذبین کی مخصوص ذہنیت کو ہے۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ یہ اپنی پیش رَو قوموں کی روش پر چل رہے ہیں تو اس روش کا جو انجام اُن کے سامنے آیا وہی اِن کے سامنے بھی آئے گا۔

'وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ'۔ سارے امور خدا کی طرف لوٹتے ہیں اور اسی کی طرف لوٹیں گے۔ یعنی خدا اس معاملہ میں غیر جانبدار یا غیر متعلق نہیں ہے بلکہ ہر چیز اس کے سامنے آ رہی ہے اور آئے گی اور آخری فیصلہ اسی کا ہوگا تو اسی کے بھروسہ پر اپنے کام میں لگے رہو اور ان کے معاملے کو اللہ پر چھوڑو۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جو لوگ اللہ کے سوا دوسروں کو مولیٰ و مرجع بنائے بیٹھے ہیں ایک دن اپنی اس طمعِ خام کا انجام خود دیکھ لیں گے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وقفہ وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ (۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے بعد مخالفین کو دھمکی دی کہ تم کو پچھلی قوموں کے انجام سے جو ڈرایا جا رہا ہے اس کو ہوائی بات نہ سمجھو۔ اللہ کی یہ وعید شدنی ہے۔ اس وقت تمھیں دنیا کی زندگی کی

جو رفاہیت حاصل ہے وہ تمھیں دھوکے میں نہ رکھے۔ تم اپنی موجودہ رفاہیت کو اپنے رویّہ کی صحت کی دلیل گمان کرتے ہو اور پیغمبرؐ کی وعید کا مذاق اڑاتے ہو کہ بھلا تم پر عذاب کیوں اور کدھر سے آجائے گا لیکن جب اللہ کے وعدے کے ظہور کا وقت آئے گا تو تم دیکھ لوگے کہ جس چیز سے تمھیں ڈرایا جا رہا تھا وہ بالکل تمھارے سامنے ہی موجود تھی۔

سب سے بڑے فتنہ سے آگاہی

وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ غَرُوْر، کے معنی فریب کار کے ہیں اور یہاں اس سے مراد شیطان ہے اس لیے کہ سب سے بڑا فریب کار شیطان ہی ہے۔ فرمایا کہ خدا کے باب میں فریب کار شیطان تمھیں دھوکے میں نہ رکھے۔ خدا بڑا رحیم و کریم بھی ہے اور بڑا ہی منتقم و قہار بھی۔ تمھارے تمام طغیان و فساد کے باوجود اس نے تمھیں جو ڈھیل دے رکھی ہے تو اس سے اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تم اس کی گرفت سے باہر ہو یا تمھارے مزعومہ شرکاء نے تم کو بچا رکھا ہے یا وہ تم کو اس کی پکڑ سے بچا لیں گے۔ اللہ کا نہ کوئی شریک ہے نہ کوئی اس کی پکڑ سے بچانے والا بن سکتا۔ شیطان نے تم کو اس فریبِ نفس میں اس لیے مبتلا کیا ہے کہ اس طرح وہ تم کو سیدھے جہنم میں لے جا اتارے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خدا کی صفات کے باب میں گمراہی دراصل تمام گمراہیوں کی جڑ ہے اس وجہ سے شیطان یہیں سے انسان پر گھات لگاتا ہے۔ اسی خطرے سے آیت وَمَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (الانفطار: ۶) میں آگاہ فرمایا گیا ہے۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۶)

یعنی شیطان تمھارا دشمن اور کھلا ہوا دشمن ہے تو اپنے دشمن کو دشمن ہی سمجھو اور اس کی چالوں سے بچ کے رہو۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ وہ تو تمھارا دشمن ہے لیکن تم نے اس کو اپنا مرشد سمجھ کر اپنی باگ اس کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے! اگر اپنی باگ اس کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے تو اس کا انجام سن لو کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ اس کی پارٹی میں شامل ہو جائیں وہ ان سب کو جہنم کے گھاٹ پر لے جا اتارے۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ڛ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ (۷)

وعدۂ شُدنی کی وضاحت

یہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدۂ شدنی کی وضاحت ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۵ میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے باب میں کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ یہ دنیا نیکی اور بدی، خیر اور شر میں کسی امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے گی جنھوں نے یہ گمان کر رکھا ہے ان کو شیطان نے خدا کی صفات کے باب میں سخت دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ ایک ایسا دن لازماً آنے والا ہے جس دن وہ لوگ عذاب شدید سے دوچار ہوں گے جنھوں نے کفر کیا ہوگا اور جن لوگوں نے ایمان و عمل صالح کی زندگی گزاری ہوگی وہ مغفرت اور اجر عظیم

کے حق دار ٹھہریں گے۔

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖؗ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ (۸)

جو لوگ خدا کے قانون کی زد میں آ چکے وہ ایمان نہیں لائیں گے

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس میں تمھاری کسی تقصیر کو دخل نہیں ہے بلکہ یہ قانونِ الٰہی کی زد میں آئے ہوئے لوگ ہیں تو ان کے غم میں اپنے کو ہلکان نہ کرو۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑو۔ یہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے تو جب وہ باخبر ہے تو ان کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے وہ مستحق ہوں گے۔

'اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا' کے بعد جواب بر بنائے قرینہ محذوف ہے۔ اگر اس حذف کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی۔ کیا وہ جس کی نگاہوں میں اس کی بدعملی کھبا دی گئی ہے اور وہ اپنی بدی کو نیکی سمجھنے لگا ہے، تم اس کو ہدایت دینے والے بن سکتے ہو؟ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا ہدایت پانا سنتِ الٰہی کے خلاف ہے تو ایسے لوگوں کی فکر میں اپنے کو گھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرنا چاہیے۔ سورۂ زمر کی آیت ۱۹ میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے۔

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ؕ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِى النَّارِ ۚ — کیا وہ جس پر عذاب کی بات پوری ہو چکی ہے! کیا تم اس کو بچانے والے بن سکو گے جو دوزخ میں پڑ چکا۔

اس ٹکڑے سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی برائی کے ارتکاب کی ایک حالت تو وہ ہے کہ آدمی اس کا ارتکاب کرتا ہے لیکن اس کے اندر اس کے برائی ہونے کا احساس زندہ رہتا ہے، دوسری حالت یہ ہے کہ اس کی برائی اس کی نگاہوں میں اس طرح کھبا دی جاتی ہے کہ وہ اسی کو ہنر، اسی کو فیشن، اسی کو ترقی کا زینہ اور اسی کو تہذیب و تعلیم کا مقتضیٰ سمجھنے لگتا ہے۔ پہلی حالت میں یہ توقع رہتی ہے کہ اس کو اگر تذکیر و تنبیہ کی جائے تو وہ سنبھل جائے گا لیکن دوسری حالت دل کے مسخ اور عقل کے ماؤف ہو جانے کی علامت ہے جس کو قرآن نے 'ختمِ قلوب' یا 'رین' سے تعبیر فرمایا ہے۔ جو اس بیماری میں مبتلا ہوا، وہ خدا کے قانون کی زد میں آ چکا۔ اس کو کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔

'فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ' یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے اور جس کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں۔ آگے اسی سورہ میں اس کی مزید وضاحت آ رہی ہے۔

'فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ' مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے غم میں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے خود عقلی و روحانی خودکشی کی ہے۔ اگر یہ ایمان نہیں لا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تمھاری دعوت میں کوئی کسر ہے بلکہ ان کے دلوں پر

بہر ہو چکی ہے تو ان کا غم کھانے کے بجائے ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ وہ ان کی ساری کارستانیاں دیکھ رہا ہے، ان کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے یہ سزاوار ہوں گے۔

'حَسَرٰتٍ' حال بھی ہو سکتا ہے اور مفعول لہٗ بھی۔ کلامِ عرب میں دونوں کی نظیریں ملتی ہیں۔ اور 'عَلَيْهِمْ' کا تعلق میرے نزدیک 'حَسَرٰتٍ' سے ہے جس طرح 'يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ' میں ہے۔ اس کا جمع کی صورت میں آنا فرطِ غم کے اظہار کے لیے ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۹۔۱۸

آگے اس وعدۂ شدنی کی، جس کا ذکر اوپر آیت ۵ میں ہوا ہے، بطور تمہید پہلے دلیل بیان فرمائی ہے، پھر بتایا ہے کہ جس کو خدا کا تقرب اور اس کی بارگاہ میں سرخ روئی مطلوب ہو وہ جھوٹے معبودوں کو تقرب کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کا صحیح طریقہ اختیار کرے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی ایمان اور عملِ صالح کی راہ پر چلے۔ ایمان خدا کی طرف صعود کرنے والی چیز ہے اور عملِ صالح اس کو سہارا دیتا اور رفعت بخشتا ہے۔ اس کے سوا خدا کے تقرب کی کوئی اور راہ نہیں ہے۔ جن لوگوں نے یہ راہ چھوڑ کر دوسری راہیں نکالی ہیں اور اصل راہ سے لوگوں کو ہٹانے کے لیے رات دن طرح طرح کی سازشوں میں سرگرم ہیں ان کی ساری سازشوں کے تاروپود ایک دن بکھر جائیں گے۔

پھر یہ واضح فرمایا کہ مال و اولاد میں بڑھوتری، عمر میں کمی بیشی اور اس طرح کی تمام باتیں اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں، فرشتوں یا جنوں یا دوسرے فرضی معبودوں کو ان میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کائنات کے اضداد میں جو توافق ہے وہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اس کے اندر صرف ایک ہی خدائے قادر و قیوم کا ارادہ کارفرما ہے۔ اس کے سوا کسی کو ذرہ برابر بھی کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

اس کے بعد لوگوں کو متنبہ فرمایا کہ یہ دعوت جو تمھیں دی جا رہی ہے تمھارے ہی نفع کے لیے دی جا رہی ہے۔ خدا کو تمھاری کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمھی خدا کے محتاج ہو۔ یہ دعوت قبول کرو گے تو اپنی دنیا و عاقبت سنوارو گے اور اگر نہ کرو گے تو اپنے ہی کو تباہ کرو گے۔ ساتھ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ کس مزاج کے لوگ اس دعوت کو قبول کریں گے اور کس طرح کے لوگ اس سے محروم رہیں گے ـــــ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۹-۱۸

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ⑨ مَنْ كَانَ

يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ۭ اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ
وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ ۭ وَالَّذِيْنَ يَمْكُرُوْنَ السَّيِّاٰتِ لَهُمْ عَذَابٌ
شَدِيْدٌ ۭ وَمَكْرُ اُولٰۗىِٕكَ هُوَ يَبُوْرُ ۝۱۰ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ
مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ۭ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ
اِلَّا بِعِلْمِهٖ ۭ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۭ
اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۱۱ وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ
سَاۗىِٕغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۭ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا
وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا
مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۲ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ
النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ڮ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ
ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ
مِنْ قِطْمِيْرٍ ۝۱۳ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَاۗءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا
اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۭ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۭ وَلَا يُنَبِّئُكَ
مِثْلُ خَبِيْرٍ ۝۱۴ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ
الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝۱۵ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝۱۶
وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ۝۱۷ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۭ وَ
اِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ
ذَا قُرْبٰى ۭ اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا

ع ۲ ۱۴

الصَّلٰوةَ ۭ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿١٨﴾

ترجمہ آیات ۹-۱۸

اور اللہ ہی ہے جو بھیجتا ہے ہواؤں کو پس وہ ابھارتی ہیں بادلوں کو پھر ہم ان کو ہانکتے ہیں کسی خشک زمین کی طرف پس ہم اس سے اس زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندگی بخش دیتے ہیں۔ اسی طرح لوگوں کا از سرِ نو زندہ ہو کر اٹھنا ہے۔ ۹

جو عزت کا طالب ہو تو یاد رکھے کہ عزت تمام تر اللہ ہی کے لیے ہے۔ اس کی طرف صعود کرتا ہے پاکیزہ کلمہ اور عملِ صالح اس کلمہ کو سہارا دیتا ہے۔ اور جو لوگ بری چالیں چل رہے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کی چال نابود ہو کے رہے گی۔ ۱۰

اور اللہ نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر پانی کی بوند سے اور پھر تم کو جوڑے جوڑے بنایا۔ اور کوئی عورت نہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے۔ کسی عمر والے کی عمر میں نہ زیادتی ہوتی نہ کمی مگر یہ ایک کتاب میں نوشتہ ہے۔ یہ سب اللہ کے لیے آسان ہے۔ ۱۱

اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں۔ ایک شیریں، پیاس بجھانے والا، پینے کے لیے خوش گوار ہے اور ایک کھاری کڑوا ہے۔ اور تم دونوں سے تازہ گوشت کھاتے ہو اور زینت کی چیز نکالتے ہو جس کو پہنتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کشتیوں کو اس میں پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم اس کے فضل کے طالب بنو اور تاکہ تم شکر گزار بنو۔ وہ داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور اس نے سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے۔ ہر ایک گردش کرتا ہے ایک معین وقت کے لیے۔ وہی اللہ تمھارا رب ہے، اسی کی بادشاہی ہے۔ رہے وہ جن کو اس کے سوا تم پکارتے ہو تو وہ ذرہ برابر کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتے۔

اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمھاری فریاد نہیں سنیں گے اور اگر سنیں گے بھی تو تمھاری فریاد رسی نہیں کریں گے اور قیامت کے دن تمھارے شرک کا انکار کریں گے۔ اور ایک باخبر کی طرح کوئی دوسرا تمھیں آگاہ نہیں کر سکتا! ۱۲-۱۴

اے لوگو! تمھی اللہ کے محتاج ہو، اللہ تو بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ اگر وہ چاہے تو تمھیں فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق لا کھڑی کرے اور یہ اللہ کے لیے ذرا مشکل نہیں۔ ۱۵-۱۷

اور کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی اور اگر کوئی بوجھل جان اپنے بوجھ کے اٹھانے میں کسی سے طالبِ مدد ہوگی تو اس میں ذرا بھی اس کا ہاتھ نہیں بٹایا جائے گا اگرچہ وہ قرابت مند ہی کیوں نہ ہو۔ تم تو بس انھی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈرتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور جو پاکی حاصل کرتا ہے وہ اپنے لیے حاصل کرتا ہے اور اللہ ہی کی طرف سب کی واپسی ہے۔ ۱۸

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاللّٰهُ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ (۹)

یہ دنیا اپنے وجود میں ایک تعلیم گاہ ہے۔

اوپر آیت ۵ میں جس وعدۂ شدنی کی یاد دہانی فرمائی ہے کائنات کے مشاہدات سے یہ اس کی دلیل پیش کی ہے کہ اس کو مستبعد نہ سمجھو۔ مرنے کے بعد لوگوں کو قبروں سے اٹھا کھڑا کرنا اللہ کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ تم اس دنیا میں برابر دیکھتے ہو کہ زمین بالکل خشک پڑی ہوتی ہے، اس میں سبزہ اور روئیدگی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہوتا کہ اللہ کسی طرف سے ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ وہ تمھارے دیکھتے دیکھتے بادلوں کو ابھارتی اور جمع کرتی ہیں۔ پھر ہم ان کو اس مُردہ زمین کی طرف ہانک کے لے جاتے اور اس کو سیراب کر دیتے ہیں جس سے اس کے ہر گوشے میں از سرِ نو زندگی نمودار ہو جاتی ہے۔ فرمایا کہ کَذٰلِكَ النُّشُوْرُ اسی طرح قیامت کے دن لوگوں کا از سرِ نو جی کر اٹھنا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ مرنے اور مرنے کے بعد زندہ ہونے کا

مشاہدہ تو تم کو اس دنیا میں اللہ برابر کرا رہا ہے تو تم قیامت کو ناممکن کیوں خیال کیے بیٹھے ہو! ـــــــ یہ حقیقت اس کتاب میں جگہ جگہ ہم واضح کرتے آ رہے ہیں کہ یہ دنیا اپنے وجود میں ان تمام حقائق کی تعلیم کے لیے ایک بہترین تعلیم گاہ ہے جن کی قرآن تعلیم دے رہا ہے۔ اگر انسان عقل و بصیرت سے کام لے تو قرآن کے ہر دعوے کی دلیل اس کو اپنے دہنے بائیں سے مل سکتی ہے۔

عربیت کا ایک اسلوب

اس آیت میں اسلوبِ کلام بھی قابلِ توجہ ہے۔ پہلے ماضی کا صیغہ 'اَرْسَلَ' استعمال ہوا ہے۔ پھر مضارع 'تُثِیْرُ' آ گیا۔ اس کے بعد 'سُقْنٰـہُ' اور 'اَحْیَیْنَا' متکلم کے صیغے آ گئے۔ اسلوب کا یہ تنوع اپنے اندر گوناگوں خوبیاں رکھتا ہے جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ ماضی تو صرف بیانِ واقعہ کے لیے آتا ہے۔ مضارع میں تصویرِ حال کا پہلو بھی ہوتا ہے اور متکلم کا صیغہ التفات و عنایاتِ خاص پر دلیل ہوتا ہے۔

مَنْ کَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّۃَ فَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ جَمِیْعًا ؕ اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ ؕ وَالَّذِیْنَ یَمْکُرُوْنَ السَّیِّاٰتِ لَھُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَمَکْرُ اُولٰٓئِکَ ھُوَ یَبُوْرُ (۱۰)

خدا کے تقرب کا واحد ذریعہ ایمان اور عمل صالح ہے

مطلب یہ ہے کہ قیامت تو بہرحال شدنی ہے اور ہر ایک کو اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ رہا یہ سوال کہ خدا کے ہاں کن کو عزت و سرخروئی حاصل ہو گی اور کن کو ذلت و نامرادی سے دوچار ہونا پڑے گا تو جن کو اس سوال کا صحیح جواب مطلوب ہے وہ یاد رکھیں کہ عزت تمام تر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اس وجہ سے جس کو بھی یہ حاصل ہو گی اسی کے تعلق اور اسی کی عزت بخشی سے حاصل ہو گی۔

'اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ'، یہ اس عزت کے حاصل کرنے کا طریقہ ارشاد ہوا کہ بندوں کی طرف سے اللہ کی طرف صعود کرنے والی چیز کلمۂ طیّب یعنی کلمۂ ایمان ہے۔ اس کے سوا دوسری کوئی چیز نہیں جو خدا سے توسل اور قربت کا ذریعہ بن سکے۔ اس کلمۂ ایمان کو جو چیز سہارا دیتی اور رفعت بخشتی ہے وہ عمل صالح ہے۔ عمل صالح کے بغیر کلمۂ ایمان مرجھا کے رہ جاتا ہے۔ گویا کلمۂ ایمان کی مثال انگور کی بیل کی ہوئی جو ہے تو بجائے خود نہایت ثمر بار لیکن اس کی شادابی و ثمر باری کا تمام تر انحصار اس امر پر ہے کہ اس کو کوئی سہارا ملے جس پر وہ چڑھے، پھیلے اور پھولے پھلے۔ یہ سہارا اس کو عملِ صالح سے حاصل ہوتا ہے۔ عمل صالح ہی اس کو پروان چڑھاتا اور مثمر و بار آور بناتا ہے۔ ورنہ جس طرح انگور کی بیل سہارے کے بغیر سکڑ کے رہ جاتی ہے اسی طرح ایمان بھی عمل صالح کے بدون مرجھا کے رہ جاتا ہے۔

حضرت ابنِ عباسؓ نے 'اَلْکَلِمُ الطَّیِّبُ'، سے کلمۂ ایمان ہی مراد لیا ہے اور یہاں اس کے پہلو بہ پہلو عمل صالح کا ذکر خود اس بات کی شہادت ہے کہ اس سے کلمۂ ایمان ہی مراد ہے۔ لفظ 'طَیِّب' اس کلمہ کی زرخیزی و ثمر باری کی طرف اشارہ کر رہا ہے اس لیے کہ فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے یہی کلمہ تمام علم و حکمت

کی جڑ ہے۔ جس نے اس کو پا لیا اس نے تمام علم و حکمت کے خزانے کی کلید پا لی اور یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ ایمان اور عمل صالح دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح ایمان کے بغیر عمل کی کوئی بنیاد نہیں اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے جان شے ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے سورۂ ابراہیم کی آیات ۲۴-۲۶ کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

یہ بات یہاں مشرکین پر یہ حقیقت واضح کرنے کے لیے فرمائی گئی ہے کہ تم اپنے معبود ملائکہ کو خدا کے ہاں عزت و سرفرازی کا واسطہ سمجھے بیٹھے ہو حالانکہ عزت صرف اللہ کے لیے ہے اور اللہ کا قرب حاصل کرنے کا واحد ذریعہ وہ ایمان ہے جس کے ساتھ عمل صالح کی تائید موجود ہو۔ قرآن میں مشرکین کی نسبت یہ بات جگہ جگہ نقل ہوئی ہے کہ وہ اپنے معبودوں کو خدا کے ہاں عزت و سرخروئی کا ذریعہ خیال کرتے تھے مثلاً

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (الزمر: ۳) — ہم ان کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا سے قریب تر کر دیں۔

دوسری جگہ ہے۔

وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لِيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا (مریم: ۸۱) — اور انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے معبود بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے عزت کا ذریعہ بن سکیں۔

ان کے اسی واہمہ پر یہاں ضرب لگائی ہے کہ اس جنت الحمقاء سے نکلو اور خدا کے ہاں عزت کے طالب ہو تو اس کے لیے ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرو۔

'وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ' یعنی جو لوگ اس حقیقت کا مواجہہ کرنے کے بجائے اپنے پندار کے تحفظ اور اللہ کے دین اور اس کے رسول کو زک پہنچانے کے لیے طرح طرح کی بری چالیں چل رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ اس طرح ان کو عزت نہیں حاصل ہوگی بلکہ وہ اپنے لیے ایک سخت عذاب کا سامان کر رہے ہیں۔

اس ٹکڑے میں 'سَيِّئَاتِ' کا نصب کچھ بیگانہ سا محسوس ہوتا ہے اس لیے کہ فعل 'مکر' اس طرح متعدی نہیں ہوتا۔ صاحب کشاف نے اس کی توجیہ یہ کی ہے کہ 'سَيِّئَاتِ' یہاں مصدر کی صفت ہے۔ یعنی 'یمکرون المکرات السیئات'۔ یہ توجیہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ آگے آیت ۴۳ میں اس کی نظیر موجود ہے۔

'وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يَبُورُ' یعنی جو لوگ اس فریب نفس میں خود بھی مبتلا اور دوسروں کو بھی مبتلا رکھنے کے لیے رات دن جوڑ توڑ میں سرگرم ہیں وہ یاد رکھیں کہ ایک دن ان کی یہ ساری سازشیں اور سرگرمیاں نابود ہو جائیں گی۔ یہاں مبتدا کے اعادے سے کلام میں یہ زور پیدا ہو گیا ہے کہ ان لوگوں کی ان ساری سازشوں سے کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ تباہی ان کی سازشوں ہی پر آئے گی اور وہ انہی کی خرابی کا باعث ہوں گی۔ آگے اس مضمون کو کھول دیا ہے۔ فرمایا ہے 'وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا

بِاَھْلِہٖ (اور بُری چالیں انہی کو تباہ کرتی ہیں جو بری چالیں چلتے ہیں) اس لیے کہ حق ایک متاعِ مشترک اور سب کی فلاح کا ذریعہ ہے۔ اگر کوئی اس کی مخالفت کرتا ہے تو خود اپنی ہی آنکھیں پھوڑتا اور اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارتا ہے۔

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ جَعَلَکُمْ اَزْوَاجًا ط وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہٖ ط وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖٓ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ ط اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ (۱۱)

مشرکین کے ایک واہمہ کی تردید

یعنی اولاد اور عمر میں جو کمی بیشی بھی ہوتی ہے وہ اللہ ہی کے علم اور اسی کے حکم سے ہوتی ہے۔ ان چیزوں میں بھی تمہارے ان دیویوں دیوتاؤں کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کے لیے بھی تمہیں خدا ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس کے سوا کسی دوسرے کا سہارا نہیں ڈھونڈنا چاہیے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مال و اولاد اور صحت و زندگی اور اس قبیل کی دوسری مطلوبات ہمیشہ شرک کے عوامل میں سے رہی ہیں۔ جن کے ہاں اولاد نہیں ہوتی، یا ہوتی ہے لیکن زندہ نہیں رہتی، یا صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں، اولادِ نرینہ نہیں پیدا ہوتی، اس طرح کے لوگ اگر وہمی ہوتے ہیں تو شیطان بڑی آسانی سے ان کا رُخ تھانوں، استھانوں، قبروں اور مزاروں کی طرف موڑ دیتا ہے۔ مشرکینِ عرب کے شرک میں بھی اس عامل کو بڑا دخل رہا ہے۔ وہ اپنے معبودوں کو آسمان و زمین کا خالق تو نہیں سمجھتے تھے لیکن رزق اور مال و اولاد وغیرہ کے معاملات میں ان کو ___ خاص طور پر فرشتوں کو ___ بہت دخیل سمجھتے تھے۔ اسی طرح بیماری اور موت وغیرہ کے معاملے میں وہ جنوں کو متصرف خیال کر کے ان کی پوجا کرتے۔ ہم سورۂ انعام کی تفسیر میں ذکر کر آئے ہیں کہ بعض جنوں کو وہ اتنا خطرناک سمجھتے تھے کہ ان کے لیے اپنی اولاد تک کی قربانی کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کسی بیٹے یا بیٹی کی قربانی دے کر ان کو راضی نہ رکھا جائے تو یہ ساری اولاد چٹ کر جاتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ کسی بیماری میں مبتلا ہوتے وہ بھی ان دیویوں دیوتاؤں کی طرف رجوع کرتے اور ان سے صحت اور طولِ عمر کی دعا کرتے۔ اس آیت میں انہی اوہام پر ضرب لگائی ہے۔

ایک مسلّم حقیقت کی یاددہانی

'وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ جَعَلَکُمْ اَزْوَاجًا' یہ ٹکڑا آگے کے مضمون کے لیے بطور تمہید ہے۔ اس میں اس مسلّم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ اللہ ہی ہے جس نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے ان کی نسل چلائی پھر تم کو جوڑے جوڑے بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ سارا گھر بنایا اور بسایا تو خدا نے اور یہ ایسی حقیقت ہے جس سے تمہیں بھی انکار نہیں ہے تو اس گھر کو بسا کر آخر خدا کو کیا مشکل پیش آئی کہ وہ اس کے رزق، اولاد اور عمر وغیرہ کے معاملات دوسروں کے سپرد کرتے پر مجبور ہو گیا؟ کیا جو تمہیں مٹی سے بنا سکتا ہے، پانی کی ایک بوند سے تمہاری نسل چلا سکتا ہے، تمہیں میاں بیوی کی صورت میں آباد کر سکتا ہے، وہ تمہارے رزق، تمہاری اولاد اور تمہاری عمر کے معاملات کو سرانجام دینے سے قاصر ہے کہ ان کے لیے تمہیں دوسرے آستانوں کا محتاج بنائے!

ایک غلط فہمی کا ازالہ

'وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ'۔ یہ اوپر والی تمہید کے لازمی نتیجہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس نے آدم علیہ السلام کا یہ کنبہ بسایا ہے وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کون عورت کب حاملہ ہوئی اور اس کے پیٹ میں لڑکا ہے یا لڑکی اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ کب اس کو جنے گی اور کس شکل میں جنے گی! ـــــ یہاں علم کا حوالہ خاص طور پر اس وجہ سے دیا کہ مشرکین عرب خدا کے خالق ہونے کے منکر نہیں تھے ان کو وہم تھا تو یہ تھا کہ اتنی وسیع و عریض دنیا کے ہر معاملے کی خبر خدا کو کس طرح ہو سکتی ہے اس وجہ سے بہت سے معاملات، جو رزق و عمر اور اولاد وغیرہ سے متعلق ہیں، اس نے اپنے شرکاء کے حوالے کر دیے ہیں۔ قرآن نے 'اِلَّا بِعِلْمِهٖ' کے لفظ سے ان کے اسی واہمہ پر ضرب لگائی ہے کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی اس دنیا میں ایسا نہیں ہوتا جو اس کے خالق کے دائرۂ علم سے باہر ہو۔

'وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ' لفظ 'مُعَمَّرٌ' یہاں طویل العمر کے مفہوم میں نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ہر وہ شخص ہے جس کو کوئی عمر ملتی ہے خواہ طویل یا قصیر۔ صاحب کشاف نے اس کا یہی مفہوم لیا ہے اور ہمارے نزدیک یہ صحیح ہے۔

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید وضاحت ہے کہ جس کو بھی کوئی عمر نصیب ہوتی ہے اور پھر اس عمر میں سے جو گھنٹے اور دن کم ہوتے ہیں وہ خدا کے حکم اور علم سے ہوتے ہیں۔ 'اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ' یہاں اوپر کے الفاظ 'اِلَّا بِعِلْمِهٖ' کی جگہ پر ہے اور اس سے اوپر والا مضمون مزید محکم و موثق ہو گیا ہے۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ خدا ان ساری باتوں کو جانتا ہے بلکہ ان میں سے ہر چیز ایک عظیم کتاب میں مندرج ہے۔ اس وہم میں نہ رہو کہ خدا کسی چیز کو بھول جائے گا۔

'اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ'۔ یہ اسی شبہ کا ازالہ ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ اہل عرب اس وہم میں مبتلا تھے کہ بھلا خدا تن تنہا ان تمام جزئیات امور کا احاطہ کس طرح کر سکتا ہے! اس وہم کے تحت انھوں نے خدا کی مدد کے لیے شرکاء و اعوان ایجاد کیے اور پھر ان کی عبادت میں اس طرح لگے کہ خدا ان کے ہاں ایک وجودِ معطل ہو کے رہ گیا ـــــ یہ ان کے اسی واہمہ کی تردید ہے کہ خدا کے لیے ان کاموں میں سے کوئی کام بھی مشکل نہیں ہے کہ وہ کسی شریک و مددگار کا محتاج ہو۔

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۭ وَمِنْ كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ؁ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۙ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ڮ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ (۱۲-۱۳)

کائنات کے اضداد سے شرک کی تردید

یہ ایک دوسرے پہلو سے شرک اور شرکاء کی تردید فرمائی گئی۔ اس کائنات میں اضداد کا جو تصادم ہے یہ بھی شرک کے نہایت اہم عوامل میں سے ہے۔ قرآن نے مختلف پہلوؤں سے اس کی تردید فرمائی ہے اور ہم

اس کی وضاحت کرتے آرہے ہیں۔ یہاں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا میں اضداد کا وجود اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کے اندر مختلف ارادے کارفرما ہیں اس لیے کہ اس کے اضداد میں ظاہری تضاد کے ساتھ ساتھ نہایت گہری سازگاری بھی پائی جاتی ہے جس سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ کوئی بالاتر اور ہمہ گیر و ہمہ جہت قوتِ قاہرہ ان تمام اضداد پر حاوی ہے جو ان کو اپنی حکمت کے تحت اس کائنات کی عمومی بہبود کے لیے استعمال کر رہی ہے۔

'وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ - الآية' یعنی دیکھو، دو سمندر ہیں اور دونوں اپنی ظاہری خصوصیات و صفات میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ایک کا پانی شیریں، پیاس بجھانے والا اور خوشگوار ہے، دوسرے کا کھاری، کڑوا۔ یہ دونوں آپس میں ٹکراتے ہیں لیکن یہ نہیں ہوتا کہ کھاری سمندر میٹھے سمندر پر غالب ہو کر اس کو کھاری بنا دے یا شیریں سمندر کھاری کے مزاج کو بدل دے بلکہ ایک بالاتر قوت نے ان دونوں کو ٹکرانے کے باوجود ان کے حدود کا پابند کر رکھا ہے۔ سورۂ رحمان میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ ، بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيَانِ (الرحمان ۱۹-۲۰) (اس نے چھوڑے دو دریا، دونوں باہم دگر ٹکراتے ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان ایک اوٹ ہوتی ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے)۔

پھر یہ دیکھو کہ کس طرح یہ اپنے تضاد و اختلاف کے باوجود اپنے سے بالاتر مقصد کی خدمت بجا لاتے ہیں کہ تم دونوں ہی سے اپنے لمبے لمبے بحری سفروں میں جہاں تازہ گوشت حاصل کرنا ناممکن ہوتا، ان سے تازہ گوشت حاصل کر لیتے ہو اور غذا کے ساتھ اپنی زینت کے لیے ان سے قیمتی موتی بھی نکالتے ہو۔ پھر تم دیکھتے ہو کہ یہ تمہارے لیے اس طرح مسخر ہیں کہ تمہارے جہازات ان کے سینے پر سے موجوں کو پھاڑتے ہوئے چلتے ہیں تاکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کر کے تم اللہ کے رزق و فضل کے طالب بنو اور اس کے شکر گزار رہو ـــــ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کے ظاہری تضاد میں گم ہو کے نہ رہ جاؤ بلکہ ان اضداد کے باہمی توافق پر بھی نگاہ ڈالو تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ایک ہی خدائے قادر و قیوم نے اس دنیا کو وجود بخشا ہے اور اسی نے اپنی قدرت و حکمت سے اس کے تمام اجزائے مختلفہ کو انسان کی خدمت میں لگا رکھا ہے تاکہ انسان اپنے پروردگار کا شکر گزار رہے۔

'يُولِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ الآية' ۔ یہ اسی حقیقت کی طرف ایک دوسری مثال سے توجہ دلائی ہے کہ یہی حال تمہارے سامنے روز آنے والی رات اور روز ظاہر ہونے والے دن کا بھی ہے۔ وہ بھی بظاہر ضدین کی نسبت رکھتے ہیں لیکن ان کے درمیان بالکل زوجین کا توافق پایا جاتا ہے۔ دونوں ہی اس دنیا کے بقا اور تمہاری راحت و معیشت کے لیے ضروری ہیں۔ یہی حال سورج اور چاند کا بھی ہے۔ نادانوں نے ان کو معبود بنا کر پوجا حالانکہ وہ اپنے وجود سے شہادت دیتے ہیں کہ خدا نے ان کو اپنی خلق کی خدمت کے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ چنانچہ دونوں اپنے معین نظامِ اوقات کے ساتھ برابر تمہاری خدمت میں سرگرم رہتے ہیں۔

'ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ'۔ یہ خلاصہ ہے اوپر کی ساری بحث کا کہ یہی اللہ جس کی یہ شانیں، قدرتیں اور حکمتیں دیکھتے ہو، تمہارا رب ہے اور اسی کے قبضۂ قدرت میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے۔

'وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ مَا یَمْلِکُوْنَ مِنْ قِطْمِیْرٍ'۔ 'قِطْمِیْر' اس باریک غلاف کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے اوپر ہوتا ہے۔

یہ وہی بات منفی اسلوب سے فرمائی کہ رہے وہ جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے اور پوجتے ہو تو وہ اس دنیا کے خلق و تدبیر میں ذرہ برابر بھی دخل نہیں رکھتے۔

اِنْ تَدْعُوْھُمْ لَا یَسْمَعُوْا دُعَآءَکُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَکُمْ ؕ وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکْفُرُوْنَ بِشِرْکِکُمْ ؕ وَلَا یُنَبِّئُکَ مِثْلُ خَبِیْرٍ (۱۴)

'اِسْتَجَابَ لَہٗ' کے معنی ہیں اس کا جواب دیا یا اس کی فریاد رسی کی۔

فرضی معبودوں کی بے بسی دنیا اور آخرت دونوں میں

یہ ان کے مزعومہ دیوتاؤں کی بے بسی اور بے حقیقتی واضح فرمائی ہے کہ اگر تم اپنی کسی مشکل میں ان کو مدد کے لیے پکارو گے تو اول تو وہ تمہاری فریاد سنیں گے نہیں اور سن بھی لیں تو وہ تمہاری کوئی فریاد رسی نہیں کریں گے۔ ان کی یہ بے بسی اس دنیا میں بھی واضح ہے اور آخرت میں یہ مزید ہو جائے گی۔ مشرکین جن چیزوں کو پوجتے تھے اول تو ان کا کوئی مسمّی موجود ہی نہیں تھا اس وجہ سے ان کے سننے یا فریاد رسی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر کچھ ایسی ہستیوں کو پوجتے تھے جن کا کوئی وجود ہے تو اول تو وہ آخرت میں اپنی بے خبری کا اظہار کریں گی کہ ہمیں علم نہیں کہ کچھ لوگ ہماری عبادت کرتے رہے ہیں۔ ثانیاً ان میں سے جو صالحین ہوں گے مثلاً ملائکہ اور انبیاء وہ تو صاف الفاظ میں اعلان براءت کریں گے۔ اور جو اشرار ہوں گے مثلاً جنات و شیاطین تو وہ ان فریاد کرنے والوں کو جواب دیں گے کہ یہ تمہاری بدبختی تھی کہ تم نے ہماری پرستش کی، اب اس کا انجام بھگتو۔ اب نہ تم ہمارے کچھ کام آ سکتے اور نہ ہم تمہاری کوئی فریاد رسی کر سکتے ہیں۔

'وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یَکْفُرُوْنَ بِشِرْکِکُمْ'۔ یعنی اس دنیا میں تو وہ تمہاری فریاد سے بے خبر اور تمہاری فریاد رسی سے بے بس ہیں اور قیامت کے دن وہ تمہارے شرک کا انکار کریں گے۔ چنانچہ فرشتوں کے انکار کی تفصیل سورۂ سبا میں بدیں الفاظ گزر چکی ہے۔

وَیَوْمَ یَحْشُرُھُمْ جَمِیْعًا ثُمَّ یَقُوْلُ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اَھٰٓؤُلَآءِ اِیَّاکُمْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَکَ اَنْتَ وَلِیُّنَا مِنْ دُوْنِھِمْ ۝ بَلْ کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ (سبا: ۴۰-۴۱)	اور اس دن کا دھیان کرو جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا کہ کیا یہ لوگ تمہاری پرستش کرتے رہے ہیں؟ وہ جواب دیں گے کہ تو پاک ہے! ان کے مقابل میں تو ہمارا کارساز ہے بلکہ یہ لوگ جنوں کی پوجا کرتے رہے ہیں۔

نہایت بلیغ تنبیہ

'وَلَا يُنَبِّئُكَ مِثْلُ خَبِيرٍ' یہ آخر میں تنبیہ اور نہایت ہی زوردار اور بلیغ تنبیہ ہے۔ 'خَبِيرٍ' کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان باتوں کو سن لو اور اچھی طرح سن لو، اس لیے کہ غیب کے پردوں میں کیا ہے اور کل کیا کچھ تمھارے سامنے آنے والا ہے اس کو ایک حقیقی باخبر ہی جانتا ہے۔ اس سے بڑھ کر تمھیں ان حقائق سے کوئی دوسرا باخبر نہیں کر سکتا۔ تمھاری بدقسمتی ہوگی اگر تم نے اس کی قدر نہ کی اور جھوٹی آرزوؤں میں پھنسے رہ گئے!

يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيدٍ ۝ وَمَا ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ (۱۵ - ۱۷)

یہ اسی تنبیہ پر اضافہ اور نہایت زوردار اضافہ ہے۔ خطاب بھی 'يَا أَيُّهَا النَّاسُ' کے الفاظ سے ہے کہ سب کان کھول کر سن لیں کہ تعلیم و تذکیر کا یہ سارا اہتمام جو کیا گیا ہے، اور خدا کا رسول لوگوں کو جگانے اور جھنجھوڑنے کے لیے اپنے رات دن جو ایک کیے ہوئے ہے تو اس لیے نہیں کہ لوگوں کے ایمان نہ لانے سے خدا کا کوئی کام اٹکا ہوا ہے، خدا تو بالکل بے نیاز اور اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے، البتہ تم لوگ خود خدا کے محتاج ہو، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ خدا کی بے نیازی کا تو یہ عالم ہے کہ وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اور تمھاری جگہ ایک دوسری نئی مخلوق لا بسائے۔ اگر وہ یہ کرنا چاہے تو یہ کام ذرا بھی اس کے لیے مشکل نہیں ہے۔ یہ محض تمھارے اوپر اس کی رحمت و عنایت ہے کہ تمھاری ان ناقدریوں اور ناشکریوں کے باوجود تمھیں مہلت دیے جا رہا ہے۔ بہتر ہے کہ اس مہلت سے فائدہ اٹھاؤ ورنہ یاد رکھو کہ نہ خدا کا کچھ بگاڑو گے نہ اس کے رسول کا بلکہ اپنے ہی کو تباہ کرو گے۔

'هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ' کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں کہ خدا اپنی ذات میں کامل ہے۔ اس کا یہ کمال اس کی ذات سے خارج کی کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔ ساتھ ہی وہ حمید یعنی تمام صفات حمد سے متصف بھی ہے۔ خلق کے ساتھ اس کا تعلق کسی احتیاج پر نہیں بلکہ تمام تر اس کی رحمت و عنایت پر مبنی ہے۔

من نہ کردم خلق تا سودے کنم
بلکہ کردم خلق تا جودے کنم

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۚ وَإِن تَدْعُ مُثْقَلَةٌ إِلَىٰ حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۗ إِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ ۚ وَمَن تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ (۱۸)

یہ اسی اوپر والے مضمون کی مزید وضاحت دوسرے پہلو سے ہے۔ فرمایا کہ اس دن کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔

وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى۔ 'مُثْقَلَۃٌ' سے پہلے موصوف محذوف ہے۔ یعنی 'نفس مثقلۃ' (اپنے بارِ گناہ کے نیچے دبی ہوئی جان)۔ اسی طرح 'الی حِمْلِھَا' میں 'حِمْل' سے پہلے مضاف محذوف ہے اور 'کان' کے بعد اس کا اسم 'المدعو' محذوف ہے۔ یہ تمام محذوفات اہلِ عربیت کے معروف قواعد کے مطابق ہیں۔

آنحضرت صلعم کو تسلی

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے گناہوں سے بوجھل جان کسی کو پکارے گی کہ ذرا وہ اس کے بوجھ کے اٹھانے میں اس کو سہارا دے دے تو کوئی اس کا ہاتھ بٹانے والا نہیں بنے گا اگرچہ جس کو وہ مدد کے لیے پکارے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ نیک تو اس لیے اس کا ہاتھ نہیں بٹائیں گے کہ جب وہ دنیا میں اس کے گناہوں میں اس کے ساتھی نہ بنے تو وہ آخرت میں اس کے ساتھی کیوں بنیں اور جو بد ہوں گے وہ خود اپنے بوجھ کے تلے دبے ہوں گے وہ کسی دوسرے کو کیا سہارا دے سکیں گے!

اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ تم ان حقائق سے لوگوں کو باخبر کر دو۔ اگر یہ متنبہ ہوتے ہیں تو فبہا۔ نہیں ہوتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ تمہارا انذار صرف انہیں لوگوں پر کارگر ہو سکتا ہے جو اپنی عقل اور سمع و بصر و فؤاد کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں اور غیب میں رہتے اپنے رب سے ڈریں اور نماز کا اہتمام کریں۔ یہ وہ لوگ جو سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتے ہیں تو ان کا علاج تمہارے پاس نہیں ہے۔ ان کا معاملہ ہمارے اوپر چھوڑ دو۔

'وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ' کا ذکر یہاں ایمان کے اولین ثمرہ اور خشیتِ ربِ بالغیب کی علامت کے طور پر ہوا ہے۔ جو شخص غیب میں خدا سے ڈرتا ہے وہ لازماً نماز کا اہتمام کرتا ہے۔ جو نماز سے بے پروا ہے وہ خدا سے بے پروا ہے اگرچہ وہ زبان سے ایمان کے کتنے ہی بلند بانگ دعوے کرے۔

'وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ' یہ نماز کے فائدے کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جو شخص گناہوں کے بوجھ سے سبکدوش اور پاکیزہ ہونا چاہتا ہو وہ جھوٹے سہاروں پر اعتماد کرنے کے بجائے نماز کا اہتمام کرے۔ یہ چیز اس کو گناہوں سے پاک کرے گی اور جس نے پاکیزگی حاصل کی وہ اپنا ہی بھلا کرے گا اس لیے کہ اللہ کسی کی عبادت و اطاعت کا محتاج نہیں ہے بلکہ بندے خود ہی اس کے محتاج ہیں اور سب کی واپسی بہرحال اسی کی طرف ہونی ہے۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۹-۲۸

آگے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ کس طرح کے لوگ ایمان لائیں گے اور کس قسم کے لوگ اس نعمت سے محروم رہیں گے۔ اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے اس کائنات کے اندر اضداد کے وجود کی طرف توجہ

ولائی کہ دیکھتے ہو کہ اس کے اندر روشنی بھی ہے اور تاریکی بھی، گرمی بھی ہے اور سردی بھی۔ اسی طرح زمین میں زرخیز قطعات بھی ہیں جو بارش کا چھینٹا پڑتے ہی لہلہا اٹھتے ہیں اور بنجر علاقے بھی ہیں جو ہزار بارش ہو لیکن ویران ہی پڑے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح اشخاص و افراد کے اندر بھی مختلف قسم کی صلاحیتیں رکھنے والے ہیں۔ جن کی صلاحیتیں زندہ ہیں وہ اس رحمت کی بارش سے، جو قرآن کی صورت میں نازل ہوئی ہے، فائدہ اٹھائیں گے اور جن کی صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہیں وہ اس کے فیض سے محروم رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح روشنی و تاریکی اور سردی و گرمی کو اس کائنات کی مجموعی مصلحت کے لیے پیدا کیا ہے اسی طرح اس کے اندر حق کے طالبوں کی طرح باطل کے پسند کرنے والوں کو بھی مہلت دی ہے اس لیے کہ حق و باطل کے اس تصادم ہی کے اندر اہل حق کے جوہر نکھرتے ہیں اور اہل باطل پر اللہ کی حجت تمام ہوتی ہے ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ﴿۱۹﴾ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ﴿۲۰﴾ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ ﴿۲۱﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَآءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴿۲۲﴾ اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِيْرٌ ﴿۲۳﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ؕ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ﴿۲۴﴾ وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۲۵﴾ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۲۶﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿۲۷﴾ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾

ترجمۂ آیات ۱۹-۲۸

نابینا اور بینا دونوں یکساں نہیں ہوں گے اور نہ تاریکی اور روشنی اور سایہ اور دھوپ یکساں ہیں اور نہ زندہ اور مردے یکساں ہوں گے۔ اللہ ہی جن کو چاہتا ہے سناتا ہے اور تم ان کو سنانے والے نہیں بن سکتے جو قبروں کے اندر ہیں۔ تم تو بس ایک نذیر ہو۔ ہم نے تم کو حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی ہے جس کے اندر ایک نذیر نہ آیا ہو۔ اور اگر یہ لوگ تم کو جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے جو لوگ ہوئے ہیں انھوں نے بھی جھٹلایا۔ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل، صحیفوں اور روشن کتاب کے ساتھ آئے تھے۔ پھر میں نے ان لوگوں کو پکڑا تو دیکھو کیسی ہوئی ان کے اوپر میری پھٹکار! ۱۹-۲۶

تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا پس ہم نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کر دیے۔ اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ مختلف رنگوں کی دھاریاں ہیں اور بھجنگ کالی بھی۔ اور انسانوں، جانوروں اور چارپایوں کے اندر بھی مختلف رنگ کے ہیں۔ اسی طرح اللہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈریں گے جو علم رکھنے والے ہیں۔ بے شک اللہ غالب اور بخشنے والا ہے۔ ۲۷-۲۸

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ (۱۹)

ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں خدا کا قانون

'اَعْمٰی' سے مراد یہاں عقل و دل کے اندھے ہیں اور 'بَصِیْر' سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی عقل و دل کی صلاحیتیں زندہ ہیں اور وہ ان سے کام لیتے ہیں۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تمھاری دعوت قبول کرنے کے معاملے میں ہر ایک کا حال یکساں نہیں ہوگا۔ جن لوگوں نے اپنی عقل کی آنکھیں پھوڑ لی ہیں اور جن کے دل بے نور ہو چکے ہیں وہ لوگ تمھاری دعوت قبول کرنے والے نہیں

بنیں گے خواہ تم کتنے ہی جتن کرو۔ تمہاری روشنی سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھائیں گے جن کے اندر بصیرت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ اس کی بخشی ہوئی فطری صلاحیتوں کو زندہ رکھتے اور ان کی قدر کرتے ہیں ان کی بصیرت و ہدایت میں وہ مزید اضافہ فرماتا ہے اور جو لوگ ان صلاحیتوں کی قدر نہیں کرتے ان کو مزید عطا ہونا تو درکنار ان سے وہ بھی سلب کر لی جاتی ہیں جو ان کو عطا ہوئی ہوتی ہیں۔ سورۂ نمل میں یہی مضمون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ه وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِى الْعُمْىِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ط اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا ه (النمل: ۸۰-۸۱)	تم مردوں کو اپنی بات نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو سنا سکتے جب کہ وہ پیٹھ پھیر کے بھاگے جا رہے ہوں۔ اور نہ تم اندھوں کو بھی ان کی ضلالت سے موڑ کر ہدایت پر نہیں لا سکتے۔ تم تو بس انھیں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان رکھنے والے ہوں۔

وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّوْرُ ه وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ (۲۰-۲۱)

برُدوں کے اعمال میں بھی اس کائنات کی مصلحت ہے

فرمایا کہ جس طرح اس دنیا میں تاریکی بھی ہے اور روشنی بھی، سایہ بھی ہے اور گرمی بھی، اور یہ دونوں یکساں نہیں ہو سکتے، اسی طرح یہ دونوں قسم کے لوگ جن کا ذکر اوپر ہوا یکساں نہیں ہو سکتے۔ تاہم جس طرح تاریکی اور روشنی، سایہ اور گرمی دونوں میں اس دنیا کی مصلحت مضمر ہے اسی طرح اس قسم کے لوگوں کے وجود میں بھی قدرت کی مصلحت ہے۔ اس مصلحت کا ذکر قرآن کے دوسرے مقامات میں ہوا ہے۔ وہاں واضح فرمایا ہے کہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسان کے اختیار کے امتحان کے لیے پیدا کی ہے اس وجہ سے اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ اس میں ایک خاص حد تک ان لوگوں کو بھی مہلت ملے جو اس کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کی قدر نہیں کرتے اور حق کی جگہ باطل ہی کے پرستار بن کے زندگی گزارتے ہیں۔

اس میں دوسرے 'لَا' کے اعادے کو بعض اہلِ ادب نے زائد مانا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ زائد نہیں بلکہ تاکید کے لیے ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں۔

وَمَا يَسْتَوِى الْاَحْيَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ ط اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ج وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِى الْقُبُوْرِ (۲۲)

یہ وہی مضمون دوسرے الفاظ اور دوسرے اسلوب میں بیان ہوا ہے۔ اس دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کی بیزاری سے بڑی پریشانی تھی۔ آپ کو اندیشہ تھا کہ مبادا اس میں آپ ہی کی کسی کوتاہی کو دخل ہو۔ آپ کی یہ پریشانی دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف اسلوبوں سے تسلی دی کہ تمہارا کام زندوں کو سنانا ہے، مردوں کو جگانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے۔ جن کی صلاحیتیں زندہ ہیں

وہ تمہاری بات سن رہے ہیں اور مان رہے ہیں۔ رہے وہ جو عقلی و روحانی اعتبار سے بالکل مردہ ہو چکے ہیں اگر تم چاہتے ہو کہ یہ بھی تمہاری بات سننے والے بن جائیں تو یہ ہونے سے رہا۔

'اِنَّ اللّٰہَ یُسْمِعُ مَنْ یَّشَآءُ'۔ 'اسماع' یہاں بات کو سننے اور ماننے کی توفیق دینے کے مفہوم میں ہے۔ یعنی یہ اللہ ہی ہے جو سچی بات سننے اور اس کو ماننے کی، جس کو چاہتا ہے، توفیق دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ہر چاہنا اس کی حکمت کے تحت ہے۔ اس معاملے میں اس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ اس کی بخشی ہوئی فطری صلاحیتوں کو زندہ رکھتے ہیں ان کو تو وہ مزید سننے سمجھنے اور ماننے کی توفیق بخشتا ہے اور جو لوگ اپنی فطری ہدایت کی قدر نہیں کرتے وہ اخلاقی اعتبار سے مردوں کے حکم میں ہیں ان کو زندہ کرنا خدا کے سوا کسی کے امکان میں نہیں۔

اِنْ اَنْتَ اِلَّا نَذِیْرٌ ہ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ؕ وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ (۲۳-۲۴)

رسول کی ذمہ داری

یہ تبلیغ و دعوت کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داری کی حد واضح فرما دی کہ تم بس لوگوں کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر دینے والے ہو۔ یہ ذمہ داری تمہارے اوپر نہیں ہے کہ لوگ تمہاری بات مان بھی لیں۔ تم کو خدا نے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ جن باتوں کی تم خبر دے رہے ہو ان میں سے ہر بات شدنی ہے۔ پس تمہارا کام یہ ہے کہ جو لوگ تمہاری باتوں پر کان دھریں ان کو ان کے مبارک انجام کی خوش خبری سنا دو۔ اور جو لوگ تمہاری باتوں سے منہ موڑیں ان کو ان کے انجام بد سے آگاہ کر دو۔ اس سے زیادہ تمہاری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اس وجہ سے تمہیں ان کے لیے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

'وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ' یعنی تم دنیا میں پہلے نذیر نہیں ہو، بلکہ ماضی میں جو قومیں گزری ہیں ان میں بھی اللہ نے اپنے نذیر بھیجے تو ان کی سرگزشت میں تمہارے لیے بھی سبق ہے اور تمہاری قوم کے لیے بھی درسِ عبرت ہے۔ تمہارے ساتھ اللہ وہی معاملہ کرے گا جو اس نے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا اور تمہاری قوم کے ساتھ بھی لازماً وہی معاملہ کرے گا جو پچھلی قوموں کے ساتھ اس نے کیا۔

وَاِنْ یُّکَذِّبُوْکَ فَقَدْ کَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ۚ جَآءَتْھُمْ رُسُلُھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْکِتٰبِ الْمُنِیْرِ ہ ثُمَّ اَخَذْتُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَکَیْفَ کَانَ نَکِیْرِ (۲۵-۲۶)

یہ اسی اجمال کی وضاحت ہے۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ تمہاری تکذیب کر رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں اسی طرح انھوں نے بھی اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی۔ یہ روایت پہلے سے چلی آ رہی ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ پہلی بار تمہاری ہی قوم نے تمہارے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ صورتِ حال پہلی بار پیش آئی ہوتی تب تو تمہارے لیے یہ وجہ تشویش ہو سکتی تھی کہ

مبادا اس میں تمھاری کسی کوتاہی کو دخل ہو لیکن جب ہر رسول کے ساتھ اس کی قوم نے یہی سلوک کیا ہے تو معلوم ہوا کہ رسولوں کے ساتھ ان کی قوموں کی روش ہمیشہ سے یہی رہی ہے۔

'جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ ... الاٰیۃ' یعنی یہ بات بھی نہیں تھی کہ اُن کے رسول خالی ہاتھ آئے ہوں، بلکہ وہ نہایت واضح دلائل و معجزات، صحیفوں اور روشن کتاب کے ساتھ آئے لیکن ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ان کو قائل کرنے والی نہ بن سکی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے مخالفوں سے بھی تم یہ توقع نہ رکھو کہ اگر ان کی طلب کے مطابق ان کو کوئی نشانی دکھا دی جائے تو یہ ایمان لانے والے بن جائیں گے۔ اس قسم کے لوگوں کے لیے ساری نشانیاں، سارے صحیفے اور تمام کتابیں بے سود ہیں۔

'بَیِّنٰت' اور 'زُبُر' تو عام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر رسول کو ان سے مسلح کر کے بھیجا۔ 'کتاب منیر' سے اشارہ تورات کی طرف ہے۔ قرآن مجید سے پہلے کتاب منیر کی حیثیت اسی کو حاصل رہی۔

مکذبین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ

'ثُمَّ اَخَذۡتُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا' قوموں نے جو روش اختیار کی وہ اوپر مذکور ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ جو معاملہ کیا یہ اس کا بیان ہے۔ فرمایا کہ جب انھوں نے رسولوں کی تکذیب کر دی تو ہم نے ان کو پکڑا اور جب پکڑا تو دیکھو کس طرح پکڑا اور کیسی عبرت انگیز سزا ان کو دی! مطلب یہ ہے کہ اگر تمھاری قوم بھی اپنی اسی روش پر جمی رہی تو اس کے ساتھ بھی ہم یہی معاملہ کریں گے۔ ہمارا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخۡتَلِفًا اَلۡوَانُهَا ؕ وَمِنَ الۡجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيۡضٌ وَّحُمۡرٌ مُّخۡتَلِفٌ اَلۡوَانُهَا وَغَرَابِيۡبُ سُوۡدٌ (۲۷)

آیات ۲۰-۲۲ کا مضمون ایک نئے اسلوب سے

وہی حقیقت جو آیات ۲۰-۲۲ میں سمجھائی گئی ہے اس کائنات کی دوسری مثالوں کی روشنی میں سمجھائی جا رہی ہے۔ گویا آیات ۲۲-۲۶ بیچ میں بطور التفات آگئی تھیں۔ ان کے ختم ہونے کے بعد کلام پھر اپنے اصل سلسلہ سے مربوط ہو گیا۔ فرمایا کہ دیکھتے نہیں کہ اللہ آسمان سے بارش نازل کرتا ہے تو اس سے ایک ہی قسم کی چیز نہیں اُگتی بلکہ طرح طرح کی مختلف النوع اور مختلف الالوان چیزیں اُگ پڑتی ہیں۔ اسی سے خوش نما، خوش رنگ اور خوش ذائقہ پھلوں والی چیزیں بھی اُگتی ہیں اور اسی سے ناقص زمینوں میں جھاڑ جھنکاڑ بھی اُگتے ہیں۔ یہی حال اس قرآنی بارش کا بھی ہے۔ اس سے بھی صالح طبیعتوں کی صلاحیتیں بھی ابھریں گی اور جن کے اندر کھوٹ اور فساد ہے وہ بھی ابھر کر سامنے آئے گا۔ اس لیے کہ شیطان اس کو ٹھنڈے پیٹوں نہیں برداشت کرے گا بلکہ وہ بھی اپنی ذریات کو اس کے مقابلے کے لیے ابھارے گا۔ لفظ 'الوان' عربی میں صرف رنگوں ہی کے مفہوم میں نہیں آتا بلکہ انواع و اقسام کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ آگے بھی اسی آیت میں یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

سورۂ اعراف میں بارش کے اثرات کے اس پہلو کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ	اور جو زمین زرخیز ہوتی ہے تو اس کے
نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ ۚ وَالَّذِي	رب کے حکم سے اس کی نباتات بھی اچھی اگتی ہیں
خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۔	اور جو ناقص ہوتی ہے تو اس کی نباتات بھی ناقص
(الاعراف : ۵۸)	ہی اگتی ہیں ۔

اس آیت کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں، اس مقام کی وضاحت کے لیے ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

'وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ'۔ 'جُدَدٌ' جمع ہے 'جُدَّة' کی۔ یہ لفظ اصلاً تو ہرنوں اور گدھوں کی پیٹھوں پر مختلف رنگوں کی جو دھاریاں ہوتی ہیں ان کے لیے آتا ہے لیکن یہاں یہ ان مختلف الالوان سلوں اور چٹانوں کے لیے آیا ہے جن کی دھاریاں یا قطاریں پہاڑوں کے اندر پائی جاتی ہیں۔

'غَرَابِيبُ' جمع ہے 'غربیب' کی۔ اس کے معنی ہیں کالا بھجنگ۔ یہ لفظ عام طور پر 'اسود' کی تاکید کے لیے آتا ہے۔ مثلاً کہیں گے 'اسود غربیب'۔ فلاں چیز کالی بھجنگ ہے۔ اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں یہ 'سود' سے پہلے کیوں آیا، تاکید کا مقدم آنا تو بلاغت کے خلاف ہے؟ اس سوال کے جواب مختلف اہلِ ادب نے مختلف دیے ہیں۔ بعض نے اس کو بدل کے مفہوم میں لیا ہے جو وضاحت کے طور پر آیا ہے۔ اگر یہ توجیہ مان لی جائے تو یہ اس پہلو سے صحیح ہے کہ جو بدل وضاحت کے طور پر آتا ہے وہ درحقیقت تاکید ہی کے لیے آتا ہے۔ اس صورت میں متکلم گویا اپنی بات سادہ الفاظ میں پھر مخاطب کے سامنے دُہرا دیتا ہے کہ اچھی طرح اس کے ذہن نشین ہو جائے۔ یہاں سیاہ قسم کے پتھروں کی طرف اس وضاحت کے ساتھ توجہ دلانے کی وجہ یہ ہے کہ مقصود یہ سمجھانا ہے کہ جس طرح پہاڑوں میں سیاہ پتھر ہوتے ہیں اسی طرح لوگوں کے اندر سیاہ قلب افراد ہوتے ہیں اور جس طرح سفید و سرخ اور سیاہ پتھروں کا الگ الگ مصرف ہے۔ اسی طرح سیاہ قلب افراد کا بھی ایک محل اور مصرف ہے جس کے لیے قدرت نے ان کو اس دُنیا میں مہلت دی ہے۔

غرابیب سے متعلق ایک سوال کا جواب

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ ۗ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ غَفُورٌ (۲۸)

فرمایا کہ جمادات کی طرح انسانوں، جانداروں اور چوپایوں میں بھی قدرت کی یہی گوناگونی و بوقلمونی نمایاں ہے۔ لفظ 'الوان' یہاں بھی صرف رنگوں کے مفہوم میں نہیں بلکہ انواع و اقسام کے وسیع مفہوم میں ہے، یعنی صورت، سیرت، صفات، مزاج، خصوصیات اور عادات و اطوار کے اعتبار سے ان میں بڑا فرق و اختلاف پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہر جانور سے دودھ کی توقع نہیں کی جا سکتی اسی طرح ہر آدمی سے خدا کی خشیت کی توقع بھی نہیں رکھنی چاہیے۔ اللہ کے بندوں میں سے اس

سے ڈرنے والے وہی بنیں گے جن کے اندر علم و معرفت کی روشنی ہوگی۔

لفظ 'عُلَمٰٓؤُا' یہاں اصطلاحی مفہوم میں نہیں بلکہ اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ اوپر آیت ۱۸ میں جس طرح فرمایا ہے 'اِنَّمَا تُنْذِرُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ' (تم تو بس انہی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں رہتے، اپنے رب سے ڈرنے والے بنیں) اسی طرح یہاں فرمایا ہے 'کَذٰلِکَ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا'۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو محض ظاہر پرست ہوتے ہیں، محسوسات سے آگے نہ ان کو کچھ نظر آتا اور نہ اس سے آگے وہ کچھ دیکھنے کی کوشش ہی کرتے؛ دوسرے وہ ہوتے ہیں جن کے اندر ظاہر سے باطن اور مجاز سے حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اور جو اپنے بطن و فرج کی مطلوبات سے زیادہ اہمیت اپنی عقل اور روح کے مطالبات کو دیتے ہیں۔ درحقیقت یہی لوگ ہیں جو انسانیت کے گلِ سرسبد اور علماء کے لقب کے اصلی مستحق ہیں اور یہی لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے بنتے ہیں اور اللہ کے رسولوں کی دعوت ان کو اپیل کرتی ہے۔

'اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ'، جس طرح اوپر والی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیے فرمائی گئی ہے اسی طرح 'عزیز' اور 'غفور' کی صفات کا حوالہ بھی آپ کی تسلی ہی کے لیے دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج جو لوگ تمہاری دعوت کو رد کر رہے ہیں خدا جب چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے لیکن وہ 'عزیز' ہونے کے ساتھ ساتھ 'غفور' بھی ہے اس وجہ سے جب تک اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے وہ اس طرح کے لوگوں کو مہلت دیتا ہے۔

صحیح علم کا منبع اللہ کی معرفت ہے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحیح علم کا منبع درحقیقت اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ جس کو خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوئی وہ علم سے بالکل محروم ہے اگرچہ وہ دنیا جہان کی کتابیں حفظ کر ڈالے۔ اسی طرح یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جس کو خدا کی معرفت حاصل ہے اس کے اندر لازماً خدا کی خشیت بھی ہوگی۔ اگر کوئی شخص خدا کی خشیت سے محروم ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کی معرفت سے بھی محروم ہے۔ یہی معرفت اور خشیت انسان کے تمام علوم و افکار میں حقیقی زندگی پیدا کرتی ہے جس سے علوم و فنون دنیا کے لیے موجب خیر و برکت بنتے ہیں۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو انسان کی ساری ذہانت شیطان کی مقصد برآری میں صرف ہوتی ہے اور وہ بالآخر تباہی کا موجب بنتی ہے۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو کہ مذکورہ بالا آیات سے تو یہ بات نکلتی ہے کہ جس طرح اس کارخانۂ کائنات میں اللہ تعالیٰ نے مختلف الانواع چیزیں پیدا کی ہیں اور ان سب کے پیدا کرنے میں اس کی حکمت و مصلحت ہے اسی طرح ان لوگوں کے وجود میں بھی حکمت و مصلحت ہے جو حق کے مخالف، خدا کی خشیت سے خالی اور باطل کے علم بردار ہیں۔ جب صورت واقعہ یہ ہے تو آخر یہ لوگ سزاوار ملامت اور مستحقِ عتاب و عذاب کس بنا پر ہیں؟ اگرچہ ہم اوپر کی سطروں میں اس شبہے کو صاف کرتے آتے ہیں

لیکن یہاں پھر اس کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے فطرت اللہ پر پیدا کیا ہے اس وجہ سے اس کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت کے داعیات کا ساتھ دے لیکن چونکہ وہ حیوانات و جمادات کی طرح مجبور نہیں بلکہ ذی اختیار ہے اس وجہ سے ان میں بہتیرے اپنی فطرت اور اپنے رب کے احکام کی خلاف ورزی بھی کرتے ہیں۔ اپنے اختیار کے اس سوءِ استعمال پر وہ مستحق سزا ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ان کو مہلت دیتا ہے تاکہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو جائے اور ان کی مخالفتِ حق اہلِ حق کے امتحان کا ذریعہ بن سکے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ایک پہلو سے ان کا وجود مطابق حکمت و مصلحت ہے اور قدرت اس حکمت و مصلحت ہی کی خاطر ان کو اس دنیا میں ایک خاص وقت تک کے لیے مہلت دیتی ہے لیکن دوسرے پہلو سے یہ مستحق سزا ہیں کہ انھوں نے اپنے سمع و بصر کی صلاحیتوں کی قدر نہیں کی اور نفس کی خواہشوں کی پیروی میں اپنے اختیار کو غلط استعمال کیا۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۲۹-۳۸

اوپر کے پیرے میں جو بات اصولی حیثیت سے بیان فرمائی ہے آگے کی آیات میں اسی کو واقعاتِ حالات پر منطبق کیا ہے یعنی یہ واضح فرمایا ہے کہ پچھلی امتوں کے وارثین میں سے کون لوگ ہیں جو علماء کے لقب کے مستحق ہیں اور وہ اس قرآن پر ایمان لانے والے بنیں گے اور اب جس قوم کو اللہ نے اپنی کتاب کی وراثت کے لیے منتخب کیا ہے اس کے اخیار یا اشرار اس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کریں گے۔ پھر ان دونوں کے نتائج اعمال کی وضاحت فرمائی ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۹-۳۸

إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَٰبَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَٰهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَٰرَةً لَّن تَبُورَ ﴿۲۹﴾ لِيُوَفِّيَهُمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدَهُم مِّن فَضْلِهِۦٓ ۚ إِنَّهُۥ غَفُورٌ شَكُورٌ ﴿۳۰﴾ وَالَّذِىٓ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِعِبَادِهِۦ لَخَبِيرٌۢ بَصِيرٌ ﴿۳۱﴾ ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَٰبَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۖ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِۦ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرَٰتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ ﴿۳۲﴾

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ لُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۨ ﴿۳۴﴾ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ كُلَّ كَفُوْرٍ ﴿۳۶﴾ وَهُمْ يَصْطَرِخُوْنَ فِيْهَا ۚ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاۗءَكُمُ النَّذِيْرُ ۭ فَذُوْقُوْا فَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ ﴿۳۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ عٰلِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۳۸﴾

ع ۱۶/۱۱

ترجمہ آیات ۲۹-۳۸

بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے، نماز کا اہتمام کرتے اور جو کچھ ہم نے ان کو رزق دیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایک ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جس کے لیے کبھی کساد بازاری نہیں۔ تاکہ اللہ ان کو ان کے اعمال کا اجر بھی دے اور ان کے لیے اپنے فضل میں سے زیادہ بھی کرے۔ بے شک وہ بخشنے والا اور قبول فرمانے والا ہے۔ اور ہم نے تمھاری طرف جو کتاب وحی کی ہے، یہی حق ہے، ان پیشین گوئیوں کی مصداق جو اس کے پہلے سے موجود ہیں۔ بے شک اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا، دیکھنے والا ہے۔ ۲۹-۳۱

پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا ان لوگوں کو جن کو اپنے بندوں میں سے منتخب کیا۔

پس ان میں سے کچھ تو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں، کچھ ان میں سے میانہ رو ہیں اور کچھ ان میں سے اللہ کی توفیق سے بھلائیوں میں سبقت کرنے والے ہیں یہی سب سے بڑا فضل ہے۔ ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے جن میں وہ داخل ہوں گے، ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور اس میں ان کا لباس ریشم ہوگا۔ اور وہ کہیں گے شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کیا۔ بے شک ہمارا رب بخشنے والا، قبول فرمانے والا ہے۔ جس نے ہمیں اپنے فضل سے اس اقامت کے گھر میں اتارا، اس میں نہ ہمیں کوئی کلفت پہنچے گی اور نہ کبھی تکان لاحق ہوگی۔ ۳۲-۳۵

اور جنھوں نے کفر کیا ان کے لیے جہنم کی آگ ہے۔ نہ ان کی قضا ہی آئے گی کہ مر جائیں اور نہ ان سے ان کا عذاب ہی کچھ ہلکا کیا جائے گا۔ ایسا ہی ہم بدلہ دیں گے ہر ناشکرے کو اور وہ اس میں واویلا کریں گے۔ اے ہمارے رب! ہم کو اس سے نکال، اب ہم نیک عمل کریں گے، ان اعمال سے مختلف جو ہم اب تک کرتے رہے ہیں ــــ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی کہ جو یاددہانی حاصل کرنا چاہے اس میں یاددہانی حاصل کر سکے! اور تمھارے پاس آگاہ کرنے والا بھی پہنچا! تو اب اس عذاب کو چکھو۔ ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں بنے گا۔ اللہ آسمانوں اور زمین کے غیب کو جاننے والا ہے۔ بے شک وہ سینوں کے بھیدوں سے بھی اچھی طرح باخبر ہے۔ ۳۶-۳۸

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً یَّرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ (۲۹)

علماء کی تفصیل

اوپر آیت ۲۸ میں جن لوگوں کو 'علماءؑ' کہا ہے اور جن کی تعریف میں فرمایا ہے کہ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈریں گے جو علم رکھنے والے ہیں) یہ انہی علماء کی تفصیل ہے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے، نماز کا اہتمام کرتے اور خدا کے بخشے ہوئے رزق و فضل میں سے فیاضی کے ساتھ سرًا و علانیۃً راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں، یہ لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں اور ان کا یہ انفاق ایک ایسی تجارت ہے جس کے لیے مستقبل میں کسی کساد بازاری کا اندیشہ نہیں بلکہ اس کی برکات میں برابر اضافہ پر اضافہ ہوتا رہے گا۔

یہ اشارہ اگرچہ ان تمام صالحین کی طرف ہو سکتا ہے جو ان صفات سے متصف تھے لیکن میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہاں علمائے اہل کتاب کی طرف اشارہ ہے جو قرآن پر ایمان لائے اور قرآن نے جگہ جگہ جن کی تعریف فرمائی ہے۔ میرے نزدیک اس کا قرینہ یہ ہے کہ ان کے ذکر کے بعد بنی اسماعیل کے اخیار اور اشرار کا ذکر آیت ۳۲ میں مستقلاً آ رہا ہے اور ان کا ذکر ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا (پھر ہم نے کتاب کا وارث بنایا اپنے بندوں میں سے ان لوگوں کو جن کو اس کے لیے منتخب کیا) کے الفاظ سے ہوا ہے۔ یہاں لفظ 'ثُمَّ' (پھر) اس بات کی دلیل ہے کہ اوپر جن لوگوں کا ذکر ہے اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن سے پہلے کی کتاب کے وارث بنائے گئے تھے اور وہ اللہ کی توفیق سے اس پر قائم رہے جس کی برکت سے ان کو قرآن کے نازل ہونے کے بعد اس پر بھی ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوئی۔

یہاں ان صالحین اہل کتاب کی تعریف میں تین باتوں کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ تلاوتِ کتاب اللہ، اقامتِ صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی تین چیزیں دین کی حقیقی محافظ اور خشیتِ الٰہی کی اصلی علامت ہیں اور قرآن میں نہایت تصریح کے ساتھ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ یہود نے اپنی کتاب فراموش کر دی تھی، نماز ضائع کر بیٹھے تھے اور ان پر بخالت و زرپرستی کی بیماری مسلط ہو گئی تھی اس وجہ سے وہ قرآن پر ایمان لانے کی سعادت سے محروم رہے۔ ان کے اندر سے صرف وہ لوگ قرآن پر ایمان لائے جو ان بیماریوں سے محفوظ رہے۔

'یَرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ' میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جنھوں نے اس دنیا کی زندگی کو مقصود بنا کر حرام و حلال کی کمائی سے اپنی تجوریاں بھریں اور ہر ایک نے راک فیلر بننے کی کوشش کی ان کا حشر تو ایک دن یہ ہونا ہے کہ ان کی ساری دولت خاک اور راکھ ہو کر اڑ جائے گی۔ البتہ جو لوگ اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کریں گے وہ اپنا سرمایہ ایک ایسے کاروبار میں لگا رہے ہیں جس میں کبھی کسی خسارے کا اندیشہ نہیں ہے۔

لِیُوَفِّیَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَیَزِیْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ (۳۰)

یہ ان کے انفاق کے محرک کی طرف اشارہ بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بھرپور صلہ کا وعدہ بھی کہ وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں نہ ریاء و نمائش کے لیے خرچ کرتے ہیں، نہ اس کا کوئی معاوضہ چاہتے اور نہ اس کا کوئی احسان جتاتے ہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں کہ وہ ان کو اس کا پورا پورا صلہ دے اور اپنے فضل سے اس پر مزید اضافہ فرمائے۔ چنانچہ ان کا رب ان کے ساتھ ان کی توقعات کے مطابق معاملہ کرے گا اس لیے کہ وہ کوتاہیوں اور غلطیوں کو معاف اور بندوں کے اعمال کی قدر فرمانے والا ہے۔ یہاں 'غَفُورٌ شَكُورٌ' کی صفات کا حوالہ بندوں کی امید افزائی کے لیے ہے کہ ان کی نیکیاں قبول کرنے کے معاملے میں اللہ تعالیٰ بڑی چشم پوشی سے کام لے گا اور ان کے چھوٹے چھوٹے عمل کو بھی قدر و عزت کے ساتھ قبول فرمائے گا۔

وَالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ (۳۱)

صالحین اہل کتاب کو دعوت ایمان

یہ صالحین اہل کتاب کو دعوتِ ایمان ہے کہ جو کتاب ہم نے تم پر وحی کی ہے یہی حق ہے! اس لیے تمام طالبینِ حق کو چاہیے کہ اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں اور حرزِ جاں بنائیں۔ 'هُوَ الْحَقُّ' میں حصر کا جو مضمون ہے وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے پہلے اللہ نے اہل کتاب کو جو کتاب دی اس کو انھوں نے اپنی تحریفات سے رطب و یابس کا مجموعہ بنا ڈالا اس وجہ سے وہ حق کی نعمت سے محروم ہو گئے تھے۔ اب اللہ نے اس کتاب کی صورت میں اس کو بالکل بے آمیز اور کامل شکل میں از سرِ نو اجاگر کیا ہے تاکہ یہ خلق کی ہدایت کا ذریعہ بنے۔

'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ' یہ اس کتاب کی حقانیت کی وہ دلیل ہے جو خاص طور پر اہل کتاب پر اتمامِ حجت کے لیے قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہوئی ہے کہ یہ کتاب ان پیشین گوئیوں کا مصداق ہے جو سابق صحیفوں میں اس کے باب میں پہلے سے وارد ہیں۔ ان پیشین گوئیوں کا حوالہ ان کے محل میں ہم تفصیل سے دے چکے ہیں۔

'اِنَّ اللّٰهَ بِعِبَادِهٖ لَخَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ' فرمایا کہ اللہ نے اس حق کی حفاظت کا یہ اہتمام اس لیے فرمایا کہ وہ اپنے بندوں کے حال کی خبر رکھنے والا اور ان کے بناؤ اور بگاڑ کو برابر دیکھتے رہنے والا ہے۔ چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ جس ہدایت سے اس نے ان کو نوازا تھا پاسبانوں کی خیانت سے وہ اس سے محروم ہو گئے تو اس کی حفاظت کا اس نے از سرِ نو انتظام فرمایا۔ اگر وہ یہ انتظام نہ فرماتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ اپنی خلق کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق ہے۔ حالانکہ وہ بے تعلق نہیں بلکہ ایک ایک چیز سے باخبر اور ہر جزئیہ پر نظر رکھنے والا ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ

وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ (۳۲)

خلق کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کا انتظام

یہ اس انتظام کا ذکر ہے جو اپنی ہدایت سے خلق کو بہرہ یاب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ 'اَلَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا' سے یہاں بنی اسماعیل یا بالفاظ دیگر 'امیین عرب' من حیث الجماعت مراد ہیں جن کے اندر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنا وہ آخری رسول بھیجنے کا وعدہ فرمایا تھا جس کے ذریعے سے خلق کو آخری اور کامل شریعت ملنے والی تھی۔ فرمایا کہ ہم نے اپنے بندوں میں سے ایک دوسرے گروہ کو چنا اور اس کو اپنی کتاب کا وارث بنایا۔ 'وارث بنایا' کے الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس سے پہلے جو لوگ کتاب الٰہی کے وارث بنائے گئے تھے (یعنی بنی اسرائیل) ان سے یہ امانت چھینی اور ایک دوسرے گروہ کو جس کو اس شرف کے لیے منتخب کیا، یعنی بنی اسماعیل کو، یہ امانت بخشی۔

امیوں کے اسی شرف کی طرف اشارہ سورۂ جمعہ کی آیت 'هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ الآیۃ' میں ہے اور قرآن نے جگہ جگہ ان کے اس شرف کا حوالہ دے کر ان کو ایمان کی دعوت دی ہے کہ وہ اس کی قدر کریں۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو دنیا کی امامت کی جس عزت کے لیے اللہ نے ان کا انتخاب فرمایا ہے وہ اس سے اپنے کو محروم کر لیں گے۔ امیوں کی اس عزت افزائی کا ذکر سورۂ نساء میں یوں آیا ہے۔

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ فَقَدْ اٰتَیْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَیْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِیْمًا ۝ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰی بِجَهَنَّمَ سَعِیْرًا ۝ (النساء: ۴: ۵۴-۵۵)

کیا (بنی اسرائیل) اس فضل کی بنا پر لوگوں پر (بنی اسماعیل پر) حسد کر رہے ہیں جو ہم نے ان پر (بنی اسماعیل پر) کیا؟ اگر وہ حسد کر رہے ہیں تو جتنا حسد کرنا چاہیں کر لیں، ہم نے تو آل ابراہیم (بنی اسماعیل) کو کتاب اور حکمت بھی عطا فرمائی اور ان کو ایک عظیم بادشاہی بھی بخشی تو ان میں سے (بنی اسماعیل میں سے) کچھ تو اس کتاب پر ایمان لائے اور ان میں سے کچھ اس سے اعراض کرنے والے بنے ہوئے ہیں اور دوزخ کی آگ ان کے لیے کافی ہے۔

اس آیت کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں آیت زیر بحث کو سمجھنے کے لیے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ جس طرح اس آیت میں بنی اسماعیل من حیث الجماعت مراد ہیں اور ان کو کتاب و حکمت اور ملک عظیم دیے جانے کا ذکر ہے اسی طرح آیت زیر بحث میں ان کی جس برگزیدگی کی طرف اشارہ ہے وہ من حیث الجماعت ان کو حاصل ہوئی۔ یہود کو ان کی اس برگزیدگی پر بڑا حسد تھا اور ان کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کا ایک بڑا محرک یہی تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ آپ کی نبوت اگر قائم ہو گئی تو اس

طرح وہ مذہبی پیشوائی جو اب تک ان کو حاصل رہی ہے ان کے حریفوں یعنی بنی اسماعیل کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ قرآن نے جگہ جگہ بنی اسرائیل کے اس کھوٹ سے عربوں کو آگاہ کیا ہے اور ان کو دعوت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جس شرف سے نوازا اور جس منصب عظیم کے لیے ان کا انتخاب فرمایا ہے اس کی قدر کریں، اس کی مخالفت کر کے اپنے دشمنوں کی مقصد برآری کا سامان نہ کریں۔ اسی طرح یہاں اس برگزیدگی کا حوالہ اس مقصد سے دیا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کی قدر کریں، اس سے محروم نہ رہیں۔

قرآن کے باب میں بنی اسمٰعیل کا رویہ من حیث الافراد۔ پہلا گروہ

'فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ۚ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ'۔ یہ من حیث الافراد ان کا وہ رویہ بیان ہوا ہے جو انھوں نے اللہ تعالیٰ کے اس انعام کے جواب میں اختیار کیا۔ فرمایا کہ ان میں تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں یعنی اپنا ایڑی چوٹی کا زور اس کی مخالفت میں صرف کر رہے ہیں۔ نہ خود اس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہیں نہ کسی دوسرے ہی کو قبول کرنے دینا چاہتے ہیں۔ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں اسی گروہ کا ذکر 'وَمِنْهُم مَّنْ صَدَّ عَنْهُ' کے الفاظ سے ہوا ہے یعنی خود بھی اس سے اعراض کیے ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ لفظ 'صدّ' رکنے اور روکنے دونوں معنوں میں آتا ہے۔ اسی گروہ کو یہاں 'ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی یہ اپنی اس مخالفت سے اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھا رہے ہیں کہ اپنے لیے خدا کے سب سے بڑے فضل سے محرومی اور جہنم کے عذاب کا سامان کر رہے ہیں ورنہ جہاں تک خدا کے دین کا تعلق ہے اس کو ان کی مخالفت سے کوئی گزند پہنچنے والا نہیں ہے۔ لفظ 'ظلم' سے قرآن مجید میں بالعموم شرک کو تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۂ صافات میں ہے۔ 'وَمِن ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ مُبِينٌ' (۱۱۳) (اور ان دونوں (ابراہیم و اسحاق) کی ذریت میں نیکوکار بھی ہیں اور اپنی جانوں پر کھلا ہوا ظلم ڈھانے والے بھی) مفسرین نے عام طور پر 'الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا' سے امت مسلمہ کو مراد لیا ہے اور پھر اس سے یہ نتیجہ بھی، معلوم نہیں، کس طرح نکال لیا ہے کہ یہ ظالمین بھی بخش دیے جائیں گے۔ ہم نے آیت کا صحیح موقع و محل معین کر دیا ہے اس وجہ سے اس خیال کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ہماری تائید میں حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد سے روایات بھی ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو تفسیر ابن کثیر یا تفسیر ابن جریر میں دیکھ لیجیے۔ ان بزرگ مفسرین نے 'ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ' سے ان لوگوں کو مراد لیا ہے جن کا ذکر سورۂ واقعہ میں 'اَصْحَابُ الْمَشْئَمَةِ' سے ہوا ہے۔

دوسرا گروہ

'وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ'۔ یہ دوسرے گروہ کا ذکر ہے۔ 'مقتصد' میانہ رو کو کہتے ہیں۔ یعنی یہ لوگ مخالفت تو نہیں کرتے ہیں لیکن آگے بڑھ کر اس دعوت حق کی حمایت کا حوصلہ بھی نہیں کر رہے ہیں۔ ان کا مخالفت نہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو اس دعوت کے حق ہونے کا احساس ہے لیکن

یہ احساس اتنا قوی نہیں ہے کہ وہ تمام پیش و عقب سے بالکل بے پروا ہو کر اس کی حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ قرآن نے ان کے لیے یہ لفظ استعمال کر کے فی الجملہ ان کے متعلق یہ امید دلائی ہے کہ یہ لوگ پہلے گروہ (ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ) کی طرح اس نعمت سے محروم رہنے والے نہیں ہیں بلکہ دیر سویر ان کا تردد رفع ہو جائے گا اور اللہ نے چاہا تو یہ اس دعوت کے پُرزور حامیوں میں بن جائیں گے۔

تیسرا گروہ

وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ: یہ تیسرے گروہ کا ذکر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اندر حق کا شعور اتنا قوی ہوتا ہے کہ ہر دعوتِ حق ان کو فوراً اپیل کرتی ہے اور ان کی قوتِ ارادی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ جب ان کو کوئی چیز اپیل کر لیتی ہے تو وہ اس کی خاطر راہ کے تمام عقبات ایک ہی جست میں پار کر جاتے ہیں اور اس کی حمایت یا مدافعت میں کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتے بلکہ تمام رکاوٹوں کا پوری دلیری سے مقابلہ کرتے ہوئے نیکی اور بھلائی کے ہر میدان میں گوئے سبقت لے جانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں۔ یہ اشارہ اسلام کے سابقون اولون کی طرف ہے جن کے سرخیل سیدنا ابوبکر صدیقؓ تھے۔

اس گروہ کی 'سبقت بالخیر' کے ساتھ 'بِاِذْنِ اللّٰهِ' کی قید اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اس رتبۂ بلند کی سرفرازی ہر ایک کا حصہ نہیں ہے بلکہ اللہ ہی جس کو چاہے یہ رتبہ بخشتا ہے۔ یہ اس سنتِ الٰہی کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں تقدم اور تاخر کے لیے مقرر کر رکھی ہے اور جس کی طرف اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ: یہ اس مرتبۂ بلند کا بیان ہے جو ان سابقون بالخیرات کو حاصل ہوگا۔ اور اس میں نہایت بلیغ انداز میں 'مقتصدین' کے لیے دعوت بھی ہے کہ ابھی موقع ہے کہ وہ بھی اس فضلِ کبیر میں حصہ دار بننے کے لیے قسمت آزمائی کر سکتے ہیں تو وہ تذبذب کو چھوڑیں اور ہمت کر کے آگے بڑھیں۔ یہاں ہم ان اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ سورۂ واقعہ کی تفسیر میں اس کے تمام اطراف زیرِ بحث آئیں گے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (۳۳)

آخرت کا صلہ

یہ آخرت میں ان جانبازوں کا صلہ بیان ہوا ہے کہ ان کے لیے اقامت کے باغ ہوں گے جن میں وہ داخل ہوں گے۔ یعنی ان باغوں میں ان کا داخل ہونا محض وقتی سیر و تفریح کے لیے نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ کے لیے ہوگا۔ 'يُحَلَّوْنَ' مجہول کا صیغہ تشریف و تکریم پر دلیل ہے۔ سونے کے کنگن، موتی اور ریشم وغیرہ کا ذکر تقریبِ فہم کے لیے ہے کہ جنت کی نعمتوں کا مخاطب کچھ تصور کر سکے۔ ان چیزوں کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ ان کا صحیح اندازہ اسی وقت ہوگا جب یہ آخرت میں سامنے آئیں گی۔

پہلے زمانہ میں سلاطین سونے کے کنگن اور موتی پہنتے تھے، اس وجہ سے جنت کے لباس کا تصور دینے کے لیے یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۖ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ ۝ الَّذِي أَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِن فَضْلِهِ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَلَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ (۳۴-۳۵)

اہل جنت کے احساسات اللہ تعالیٰ کے وعدوں کے ظہور کے بعد

یعنی اہل جنت جب اللہ تعالیٰ کے تمام وعدوں کی صداقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو بے ساختہ ان کی زبانوں پر کلمۂ شکر جاری ہو جائے گا کہ الحمدللہ ہم اپنے رب کے جن وعدوں کے لیے جیسے اور مرے وہ سب ہماری امیدوں سے کہیں بڑھ کر پورے ہوئے۔ اس نے ہمارے سارے غم دور کر دیے۔ اب نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا باقی رہا نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔ ہمارا رب غفور و شکور ہے۔ اس نے ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرمایا اور ہماری ایک ایک نیکی کو شرفِ قبول بخشا۔ اہل جنت کے اسی کلمۂ شکر کا ذکر دوسرے مقام میں یوں ہوا ہے۔ 'وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ' (یونس: ۱۰) (اور ان کا آخری کلمہ یہ ہوگا کہ شکر ہے اللہ رب العالمین کے لیے)۔

'دَارَ الْمُقَامَةِ' سے مراد ہمیشہ کی اقامت کا گھر ہے یعنی اس سے پہلے تو ہم دنیا میں ایک سرائے فانی میں تھے اور ہم نے اس کو ایک سرائے فانی ہی سمجھا۔ اب ہمارے رب نے ہم کو اپنے فضل و رحمت کے ایک ایسے گھر میں اتارا ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اس میں نہ ہمارے لیے کوئی محنت و مشقت ہے اور نہ کوئی تکان اور افسردگی۔ یہ امر واضح رہے کہ بہتر سے بہتر عیش بھی حاصل ہو تو آدمی اس کے اندر بھی افسردہ ہو جاتا ہے اگر اس کی خواہش کے مطابق اس میں تجدد و تنوع نہ ہوتا رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جنت ایسی بنائی ہے کہ اس میں ایسا بے خلل عیش اور متنوع عیش حاصل ہوگا کہ اہل جنت اس کے اندر اکتاہٹ نہیں محسوس کریں گے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ لَا يُقْضَىٰ عَلَيْهِمْ فَيَمُوتُوا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُم مِّنْ عَذَابِهَا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ ۝ وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيهَا رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ ۚ أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُم مَّا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَن تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ ۖ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِن نَّصِيرٍ (۳۶-۳۷)

کفار کے انجام کا بیان

یہ کفار کے انجام کا بیان ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ جہنم میں اتارے گا جہاں ان کا حال یہ ہوگا کہ نہ ان کو موت ہی آئے گی کہ مر کے اس عذاب سے رہائی پائیں، نہ ان کے عذاب میں تخفیف ہی کی جائے گی کہ ذرا دم لے لیں۔ 'مِنْ عَذَابِهَا' کے بعد 'فَيَسْتَرِيحُوا' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ بربنائے قرینہ محذوف ہے۔

'كَذَٰلِكَ نَجْزِي كُلَّ كَفُورٍ' یعنی یہ جو کچھ ہم سنا رہے ہیں، یہ صرف دوسروں ہی کی سرگزشت نہیں ہے بلکہ ہر ناشکرے نابکار کو ہم اسی طرح سزا دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ بھی اسی سزا کے مستحق

ٹھہریں گے جو آج ہماری کتاب اور ہمارے رسول کی تکذیب کر رہے ہیں۔ اس فقرے سے کلام بالکل مطابق حال ہو گیا ہے۔

وَهُمْ يَصْطَرِخُونَ فِيهَا الآية۔ وہ اسی جہنم میں پڑے فریاد کریں گے کہ اے رب، ہم کو یہاں سے ایک بار رہائی دے کہ ہم دنیا میں جا کر نیک عمل، اس سے بالکل مختلف، کریں جو ہم اب تک کرتے رہے ہیں۔

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيرُ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جواب ملے گا کہ کیا تمھیں اتنی مہلت نہیں ملی جس میں ایک یاد دہانی حاصل کرنے والا یاد دہانی حاصل کر سکے؟ علاوہ ازیں تمھارے پاس ایک آگاہ کر دینے والا رسول بھی آیا! تو اب کس بات کے لیے مہلت مانگتے ہو! اب تمھارا کوئی مددگار نہیں بن سکتا، اب تو جس عذاب کے اسباب تم نے فراہم کیے اس کا مزہ چکھو۔

اس آیت سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے عمر بھی کافی دی اور ان پر کسی منذر کے ذریعے سے حجت بھی تمام کر دی گئی ان کے ساتھ تو کسی قسم کی رعایت نہیں ہو گی لیکن جو لوگ سنِ و سال کی پختگی کو پہنچنے سے پہلے ہی مر گئے یا قتل ہو گئے ان کے ساتھ معاملہ نسبتہً ذرا نرم ہو گا۔

إِنَّ اللَّهَ عَالِمُ غَيْبِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۳۸)

اس سے دو باتیں واضح فرمائی گئی ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کے تمام بھیدوں کو جاننے والا ہے اس وجہ سے کوئی ان باتوں کو محض ڈراوا نہ سمجھے بلکہ یہ حقائق ہیں جو ایک دن سب کے سامنے ظاہر ہو کے رہیں گے۔

دوسری یہ کہ جو لوگ یہ فریاد کریں گے کہ اگر ان کو دوبارہ مہلت ملے تو وہ نیکی کریں گے، خدا ان کے جھوٹ کو بھی جانتا ہے ـــــ اس طرح کے لوگوں کو اگر پھر مہلت دی جائے تو وہ وہی کریں گے جو اب تک کرتے رہے ہیں۔

۸۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۳۹-۴۵

آگے کی آیات میں مشرکینِ عرب کو دھمکی ہے کہ تم اس ملک میں پہلی قوم نہیں ہو بلکہ پچھلی قوموں کے جانشین ہو تو ان کے حالات اور انجام سے سبق لو۔ اگر وہ قوت و شوکت میں تم سے بڑھ کر ہونے کے باوجود، رسولوں کی تکذیب کے جرم میں تباہ کر دی گئیں تو اسی جرم کا ارتکاب کر کے خدا کے قہر و غضب سے تم کس طرح بچ جاؤ گے؟ خدا کا قانون تو ہر قوم کے لیے ایک ہی ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یاد رکھو کہ آسمان و زمین تمھارے ان معبودوں کے تھامے نہیں تھمے ہوئے ہیں بلکہ خدا ہی کے تھامے تھمے ہیں۔ اگر خدا ان کو درہم برہم کر دے تو کوئی دوسرا ان کو نہیں سنبھال سکتا۔ تمھاری سرکشی کے باوجود اگر خدا نے تمھیں ڈھیل دے

دکھی ہے تو اس سے کسی غلط فہمی میں نہ رہو، خدا پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا لیکن جب پکڑتا ہے تو کوئی اس سے بھاگ نہیں سکتا۔

اسی ضمن میں یہ یاددہانی بھی کی گئی ہے کہ اس سے پہلے تو یہ قسمیں کھا کھا کے یہ وعدے کرتے تھے کہ اگر ان کے اندر کسی رسول کی بعثت ہوئی تو یہ دنیا کی سب سے زیادہ ہدایت یافتہ قوم بنیں گے لیکن جب رسول آیا تو محض استکبار کے سبب سے اس کی مخالفت اور رات دن اس کے خلاف سازشوں میں سرگرم ہیں حالانکہ حق کے خلاف جو سازشیں کی جاتی ہیں ان کے پھندوں میں وہی لوگ پھنستے ہیں جو سازشوں کے جال بُنتے ہیں۔

غور کیجیے تو اس پیرے میں، جس کو خاتمۂ سورہ کی حیثیت حاصل ہے، فواصل یعنی قوافی بدل گئے ہیں۔ قوافی کی یہ اچانک تبدیلی متکلم کے لب ولہجہ کی تبدیلی کی دلیل ہوتی ہے اور اس تبدیلی سے مقصود مخاطب کو ایک نئے پہلو سے متوجہ کرنا ہوتا ہے ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۹-۴۵

هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَٰٓئِفَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَمَن كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ ۖ وَلَا يَزِيدُ الْكَٰفِرِينَ كُفْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ إِلَّا مَقْتًا ۖ وَلَا يَزِيدُ الْكَٰفِرِينَ كُفْرُهُمْ إِلَّا خَسَارًا ﴿۳۹﴾ قُلْ أَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَٰوَٰتِ ۖ أَمْ ءَاتَيْنَٰهُمْ كِتَٰبًا فَهُمْ عَلَىٰ بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ إِن يَعِدُ الظَّٰلِمُونَ بَعْضُهُم بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا ﴿۴۰﴾ إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضَ أَن تَزُولَا ۚ وَلَئِن زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّن بَعْدِهِۦٓ ۚ إِنَّهُۥ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا ﴿۴۱﴾ وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَٰنِهِمْ لَئِن جَآءَهُمْ نَذِيرٌ لَّيَكُونُنَّ أَهْدَىٰ مِنْ إِحْدَى الْأُمَمِ ۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيرٌ مَّا زَادَهُمْ إِلَّا نُفُورًا ﴿۴۲﴾ اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِۦ ۚ فَهَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۚ فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۖ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ

اللّٰهِ تَحْوِيلًا ﴿٤٣﴾ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَكَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعْجِزَهٗ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا ﴿٤٤﴾ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ﴿٤٥﴾

ع ۵ / ۱۷

ترجمۂ آیات ۳۹-۴۵

وہی ہے جس نے تم کو زمین میں جانشین بنایا تو جو کفر کرے گا اس کے کفر کا وبال اسی پر آئے گا اور کافروں کے لیے ان کا کفر، ان کے رب کے نزدیک، اس کے غضب کی زیادتی ہی کا موجب ہوگا اور کافروں کے لیے ان کا کفران کے خسارے ہی میں اضافہ کرے گا۔ ۳۹

کہو، ذرا تم دیکھو تو اپنے ان شریکوں کو جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو! مجھے دکھاؤ، انھوں نے زمین میں سے کیا پیدا کیا ہے! کیا ان کی آسمانوں میں کوئی حصہ داری ہے؟ آیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے تو وہ اس کی کسی واضح دلیل پر ہیں! بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے محض پُر فریب وعدے کر رہے ہیں۔ ۴۰

اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ ٹل نہ جائیں۔ اور اگر وہ ٹل جائیں تو اس کے بعد کوئی اور ان کو تھامنے والا نہیں بن سکتا۔ بے شک وہ نہایت حلیم و غفور ہے۔ ۴۱

اور انھوں نے اللہ کی پکی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی نذیر آیا تو وہ ہر امت سے زیادہ ہدایت اختیار کرنے والے بنیں گے۔ پس جب ان کے پاس ایک نذیر آیا تو

اس چیز نے، زمین میں ان کے تکبر کے باعث، ان کی بیزاری اور ان کی بری چالوں ہی میں اضافہ کیا۔ اور بری چال تو اسی کو گھیرتی ہے جو بری چال چلتا ہے۔ پس یہ نہیں انتظار کر رہے ہیں مگر اسی سنتِ الٰہی کا جو اگلوں کے باب میں ظاہر ہوئی۔ تو تم سنتِ الٰہی میں نہ کوئی تبدیلی پاؤ گے اور نہ تم سنتِ الٰہی کو ٹلتے ہی ہوئے پاؤ گے۔ کیا انھوں نے زمین میں سفر نہیں کیا کہ دیکھتے کہ کیسا ہو چکا ہے انجام ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں حالانکہ وہ قوت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے۔ اور آسمانوں اور زمین کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ اللہ کے قابو سے باہر نکل سکے۔ وہ علم والا اور قدرت رکھنے والا ہے۔ ۴۲-۴۴

اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا لیکن وہ ان کو ایک معیّن مدت تک مہلت دیتا ہے۔ پس جب ان کی مدت پوری ہو جائے گی تو اللہ اپنے بندوں کو خود دیکھنے والا ہے۔ ۴۵

۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ ۭ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِلَّا مَقْتًا ۚ وَلَا يَزِيْدُ الْكٰفِرِيْنَ كُفْرُهُمْ اِلَّا خَسَارًا (۳۹)

خدا کا عدل ہر قوم کے لیے یکساں ہے

یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اس سرزمین میں آج جو اقتدار تم کو حاصل ہے یہ نہ تمہارا اپنا پیدا کردہ ہے اور نہ تم اس ملک میں پہلی بار برسرِ اقتدار آئے ہو بلکہ تم سے پہلے بھی قومیں گزر چکی ہیں جن کو خدا نے ان کے کفر و استکبار کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کی جگہ تم کو متمکن کیا تو اگر وہی روش تم نے اختیار کی تو اسی انجام سے دوچار ہونے کے لیے بھی تیار رہو جو ان کے سامنے آیا۔ خدا نے قوموں کے عزل و نصب کے لیے جو میزانِ عدل قائم کر رکھی ہے اس کا فیصلہ ہر قوم کے لیے بالکل بے لاگ ہے۔ جن قوموں کی سرگزشتیں تم کو سنائی گئی ہیں وہی تاریخ تم بھی دہراؤ گے اگر انہی کے نقشِ قدم پر چلو گے۔ یہ مضمون انعام آیت ۱۶۵ اور اعراف آیت ۱۰۰ کے تحت بھی تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔

'فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهُ' الآية' یعنی یہ بھی یاد رکھو کہ کسی کے کفر سے خدا کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ اس کا خمیازہ خود کفر کرنے والے ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔ خدا کسی کا محتاج نہیں ہے بلکہ لوگ ہی اس کے محتاج ہیں۔ اگر وہ کفر کریں گے تو اس سے خدا کا کچھ بگاڑنے کے بجائے اس کے غضب میں اضافہ کریں گے اور یہ چیز دنیا اور آخرت میں انہی کی تباہی کا موجب ہوگی۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا فَهُمْ عَلٰى بَيِّنَتٍ مِّنْهُ ۚ بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا (۴۰)

شرکاء کی بے حقیقتی

یہ ان کے شرکاء کی بے حقیقتی کی طرف توجہ دلائی کہ کیا ان کے بل پر خدا کی پکڑ سے نچنت بیٹھے ہو! ذرا ان کو دیکھو تو بھلا ان کی کیا حقیقت ہے! 'اَرَءَيْتُمْ' اس طرح کے مواقع میں اظہار تعجب اور تحقیر کے لیے آتا ہے۔ فرمایا کہ اگر زمین میں سے کوئی چیز انھوں نے پیدا کی ہو تو وہ مجھے دکھاؤ۔ یا آسمانوں میں ان کی کوئی حصہ داری ہو تو وہ مجھے بتاؤ۔

'اَمْ اٰتَيْنٰهُمْ كِتٰبًا' الآیۃ۔ اس ٹکڑے میں اسلوب کلام بدل کر حاضر کے بجائے غائب کا ہو گیا ہے جس سے تعجب اور اظہار بیزاری کے مضمون میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ فرمایا کہ جب آسمانوں اور زمین میں کسی نوعیت سے ان کی کوئی حصہ داری ثابت نہیں تو آخر کس دلیل کی بنا پر ان کو خدا کی خدائی میں انھوں نے شریک بنایا ہے؟ کیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے جس میں ہم نے تسلیم کیا ہو کہ فلاں اور فلاں ہماری خدائی میں شریک ہیں اور انھوں نے اس کی سند پر ان کو ہمارا شریک بنایا ہے!

لیڈروں کا فریب عوام کے ساتھ

'بَلْ اِنْ يَّعِدُ الظّٰلِمُوْنَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا' یعنی ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے۔ نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے نہ کوئی سند۔ بلکہ یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے لوگ بس یوں ہی بے دلیل و سند ایک دوسرے کو سبز باغ دکھا رہے ہیں کہ ان کے فلاں بت کے قبضہ میں یہ یہ اختیارات ہیں اور فلاں کی عبادت سے یہ برکات حاصل ہوتی ہیں۔ ان کی یہ ساری باتیں محض فریب ہیں جس میں ان کے لیڈر ان کو مبتلا کیے ہوئے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا (۴۱)

یعنی اگر یہ اس غلط فہمی میں ہیں کہ جس عذاب سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے اس سے ان کے مزعومہ دیوی دیوتا بچا لیں گے یا بچائے ہوئے ہیں تو انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ آسمانوں اور زمین کو ان کے محور و مدار پر خدا ہی ٹکائے ہوئے ہے۔ اگر وہ ذرا ان کی باگ ڈھیلی چھوڑ دے تو پھر کسی کی طاقت نہیں ہے کہ ان کو تھام سکے۔ پھر چشم زدن میں سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا۔ یعنی لوگوں کی سرکشی اور استکبار کے باوجود خدا لوگوں کو جو ڈھیل دیتا ہے تو اس وجہ سے دیتا ہے کہ وہ حلیم و غفور ہے۔ وہ قہر کرنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ لوگوں کے جرائم کے باوجود ان سے درگزر کرتا اور ان کو مہلت دیتا ہے۔ تاکہ جو شخص بھی اپنی اصلاح کرنی چاہے وہ کرلے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ لَّيَكُوْنُنَّ اَهْدٰى مِنْ اِحْدَى الْاُمَمِ ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ نَذِيْرٌ مَّا زَادَهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (۴۲)

اہل عرب کے اندر ایک رسول کی بعثت کی روایت

اہل عرب چونکہ امّی یعنی کتاب و شریعت سے ناآشنا تھے اس وجہ سے اہل کتاب بالخصوص یہود ان کو حقیر خیال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے علماء نے یہ فتویٰ دے رکھا تھا کہ ان امیوں کی امانت ہڑپ کر جانے اور ان سے سود لینے میں ان کے لیے کوئی قباحت نہیں ہے۔ آیت لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ کے تحت ہم ان خانہ زاد فتووں کا حوالہ دے چکے ہیں۔ مشرکین جب یہود کی اس طرح کی باتیں سنتے تو فطری طور پر ان کے اندر ایک قسم کا احساس کہتری پیدا ہوتا اور وہ ان کے جواب میں قسمیں کھا کے، بڑے طنطنہ کے ساتھ، یہ کہتے کہ اگر ہمارے اندر کسی رسول کی بعثت ہوتی تو ہم دوسری تمام قوموں سے زیادہ ہدایت یافتہ قوم بن کے دکھا دیں گے۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ سابق صحیفوں میں آخری رسول کی بعثت سے متعلق جو پیشین گوئیاں وارد ہیں ان میں، جیسا کہ تفسیر سورۂ اعراف میں ہم واضح کر چکے ہیں، نہایت صریح الفاظ میں یہ بات موجود ہے کہ اس رسول کی بعثت بنی اسماعیل (امّیوں) میں ہوگی۔ علمائے یہود اگرچہ یہ بات چھپاتے تھے لیکن ان کے اندر ایسے علماء بھی تھے، خاص طور پر نصاریٰ میں، جو امیوں کے اندر ایک رسول کی بعثت کے منتظر تھے۔ چنانچہ قرآن نے آیت وَاِذَا سَمِعُوْا الآیۃ (المائدۃ: ۸۳) میں اس کا نہایت شاندار الفاظ میں حوالہ دیا ہے۔ اس قسم کے علماء کے ذریعے سے بنی اسماعیل کے اندر بھی یہ روایت موجود تھی کہ ان کے اندر ایک رسول کی بعثت ہونے والی ہے اور وہ یہود کے مقابل میں اس کا اظہار بھی کرتے رہتے تھے کہ اگر ہمارے اندر کسی رسول کی بعثت ہوئی تو ہم تمہاری طرح کمزور اور بودے ثابت نہیں ہوں گے بلکہ ہدایت قبول کرنے کے معاملے میں سب پر بازی لے جائیں گے۔ ان کی اسی بات کی یاددہانی کرتے ہوئے قرآن نے ان کے حال پر اظہار افسوس کیا ہے کہ پہلے تو بہت بڑھ چڑھ کر آنے والے رسول کی حمایت و نصرت کے دعوے کرتے رہے لیکن جب وہ آیا تو ان کی ہدایت میں اضافہ ہونے کے بجائے ان کی نفرت و بیزاری میں اضافہ ہوا۔ ان کے اس رویے کا ذکر سورۂ صافات میں بھی ہوا ہے۔ فرمایا ہے۔

وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ۙ لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۙ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۙ فَكَفَرُوْا بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (الصّٰفّٰت: ۱۶۷-۱۷۰)	اور بے شک یہ لوگ کہتے رہے ہیں کہ اگر ہمارے پاس اگلوں کی کوئی یاد دہانی ہوتی تو ہم خدا کے مخصوص بندوں میں سے ہوتے تو انھوں نے اس کا انکار کر دیا تو وہ جلد جان لیں گے۔

اِسْتِكْبَارًا فِي الْاَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۭ وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ ۭ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ڬ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (۴۳)

استکبار کے باعث رسول کی تکذیب

یہ رسول سے ان کی بیزاری کا سبب بیان ہوا ہے کہ اس کا سبب صرف استکبار ہے۔ حق ان پر اچھی طرح واضح ہے لیکن ملک میں جو قیادت و سیادت ان کو حاصل ہے اس کو یہ کسی قیمت پر قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس وجہ سے اس صریح حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر انھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت تسلیم کر لی تو ان کی سیادت ختم ہو جائے گی۔

'وَمَكْرَ السَّيِّئِ' کا عطف 'نُفُوْرًا' پر ہے۔ یعنی جس رسول کی ہدایت کے علمبردار بننے کے مدعی تھے جب وہ آیا تو اس کے دشمن بن کے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کو زک پہنچانے کے لیے اس کے خلاف مکروہ سازشوں میں سرگرم ہو گئے۔ لفظ 'مکر' چونکہ اچھے معنوں میں بھی آتا ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ 'سیئ' کی قید لگا کر ان کے مکر کی نوعیت واضح فرما دی۔ پیچھے آیت ۱۰ میں بھی ان کی بری سازشوں اور اس کے انجام کا ذکر گزر چکا ہے۔

بری سازش کرنے والا خود اپنے کو تباہ کرتا ہے

'وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ'۔ حق کے خلاف جو شخص سازش کرتا ہے وہ درحقیقت خود اپنے خلاف سازش کرتا ہے۔ بظاہر تو وہ یہ جال دوسرے کے لیے بُنتا ہے لیکن اس جال میں سب سے پہلے وہ خود پھنستا ہے۔ صحیح راہ بتانے والے کی مخالفت کر کا خود اپنی راہ گم اور اپنی عاقبت برباد کرنا ہے۔ دوسروں کو اس سازش سے کوئی ضرر اللہ کے اذن کے بغیر وہ نہیں پہنچا سکتا لیکن اپنے کو وہ بہرحال ہلاکت کے حوالہ کر دیتا ہے۔

حق کے خلاف سازش کرنے والوں کے لیے سنتِ الٰہی

'فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ'۔ 'يَنْظُرُوْنَ'، یہاں انتظار کرنے کے معنی میں ہے اور 'سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ' کے اندر عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق کچھ الفاظ حذف ہیں۔ ان کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہو گی — 'فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ اللّٰهِ فِي الْاَوَّلِيْنَ'۔ یعنی اگر یہ لوگ اپنے تکبر اور حق بیزاری کے باعث اب مخالفت اور سازش ہی کے درپے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب یہ منتظر ہیں کہ ان سے پہلے جو قومیں گزری ہیں، اللہ کی جو سنت ان کے لیے ظاہر ہوئی وہ ان کے لیے بھی ظاہر ہو جائے اور جس طرح رسولوں کی تکذیب کے جرم میں وہ تباہ کر دی گئیں اسی طرح یہ بھی تباہ کر دیے جائیں۔

سنتِ الٰہی نہ بدلتی نہ ٹلتی ہے

'فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ڬ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا'۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت پُرزور الفاظ میں تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ اسی کے منتظر ہیں تو اطمینان رکھو کہ سنتِ الٰہی نہ بدلتی ہے، نہ ٹلتی ہے۔ 'نہ بدلنے' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہر قوم کے لیے بالکل یکساں اور بے لاگ ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ جو رویہ ایک قوم کے لیے باعثِ ہلاکت ہو چکا ہے وہی رویہ دوسری قوم اختیار کرے تو وہ اس انجام سے بچ جائے۔ 'نہ ٹلنے' کا مفہوم یہ ہے کہ جب اس کے ظہور کا وقت آ جائے گا تو وہ لازماً ظہور میں آ کے رہے گی۔ پھر اس کو ٹالنا یا اس کے رُخ کو بدلنا کسی کے بس میں بھی نہیں ہو گا۔

اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ وَ کَانُوۡۤا اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً ؕ وَ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعۡجِزَہٗ مِنۡ شَیۡءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ اِنَّہٗ کَانَ عَلِیۡمًا قَدِیۡرًا ﴿۴۴﴾

ملک کے آثار سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت

اللہ کی جو سنت پچھلی قوموں کے معاملے میں ظاہر ہوئی اور جس کے آثار خود ملکِ عرب میں موجود تھے یہ ان کی طرف توجہ دلائی کہ کیا ان لوگوں نے اپنے ملک کی سیاحت کبھی اس مقصد سے نہیں کی کہ اپنی ان پیشرو قوموں کے آثار و نشانات دیکھتے جو قوت و شوکت میں ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں لیکن رسولوں کی تکذیب کی پاداش میں ان کا انجام نہایت عبرت انگیز ہوا!۔

'اَوَلَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا' کے اسلوب سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس کی سیاحت تو انھوں نے بہت کی ہے۔ اپنے تجارتی سفروں میں برابر معذب قوموں کی بستیوں پر سے گزرتے رہے ہیں لیکن کبھی خاص اس مقصد سے انھوں نے ان کے آثار پر نظر نہیں ڈالی کہ وہ اس کیفرِ کردار کو کیوں پہنچیں، حالانکہ دیکھنے اور فائدہ اٹھانے کی اصل چیز یہی ہے۔ اب بھی موقع باقی ہے کہ اس نگاہ سے ان کے آثار دیکھیں اور ان کے انجام سے سبق حاصل کریں۔ قوت و شوکت میں قریش ان کے پاسنگ نہیں ہیں، لیکن خدا نے جب ان کو پکڑا تو وہ اس کی گرفت سے باہر نہ نکل سکیں۔ آسمانوں اور زمین میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو خدا کی گرفت سے باہر نکل سکے۔ خدا کا علم ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔ ساتھ ہی وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، کوئی کام اس کی قدرت سے باہر نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو اپنے علم اور اپنی قدرت دونوں میں کامل ہے کوئی اس سے بھاگ کے کہاں جا سکتا ہے؟

وَ لَوۡ یُؤَاخِذُ اللّٰہُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوۡا مَا تَرَکَ عَلٰی ظَہۡرِہَا مِنۡ دَآبَّۃٍ وَّ لٰکِنۡ یُّؤَخِّرُہُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُہُمۡ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِعِبَادِہٖ بَصِیۡرًا ﴿۴۵﴾

سنتِ الٰہی کا ایک اور پہلو

یہ اسی سنتِ الٰہی کے ایک دوسرے پہلو کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ان لوگوں کی پکڑ تو لازماً ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ مجرمین کو ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً نہیں پکڑا کرتا۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہے تو کوئی اس کا ہاتھ تو نہیں پکڑ سکتا، وہ چشم زدن میں روئے زمین سے ہر زندہ کو ختم کر دے، لیکن وہ حلیم و غفور ہے اس وجہ سے ایک معیّن مدت تک لوگوں کو مہلت دیتا ہے تاکہ جس کو توفیق ہو وہ توبہ اور اصلاح کر لے اور جو اپنی ضد ہی پر مرنا چاہے اس پر اللہ کی حجت پوری ہو جائے۔ جب ان کی معیّن مدتِ مہلت پوری ہو جائے گی تو پھر اللہ ان کو دیکھے گا کہ وہ کس پاداش کے مستحق ہیں۔

'بِمَا کَسَبُوۡا' کے بعد 'علی عجل' یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔ 'وَ لٰکِنۡ یُّؤَخِّرُہُمۡ' کے الفاظ سے اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔

بتوفیق ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

رحمان آباد
۴ / فروری ۱۹۷۵ء

تدبّرِ قرآن

۳۶

یٰسٓ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سورۂ یٰسٓ اور گروپ کی پچھلی دونوں سورتوں کے عمود میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ پچھلی سورتوں میں توحید، معاد اور رسالت کے جو مطالب زیر بحث آئے ہیں انہی پر اس میں بھی بحث ہوئی ہے۔ البتہ تفصیل و اجمال اور نہج استدلال کے اعتبار سے فرق ہے۔ پچھلی سورہ کے بعض مطالب اس میں تاریخی اور فطری دلائل سے اچھی طرح محکم و مدلّل کر دیے گئے ہیں۔ اس کا آغاز اثباتِ رسالت کے اسی مضمون سے ہوا ہے جس پر سابق سورہ تمام ہوئی ہے۔ اور فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی واضح طور پر نظر آئے گی کہ اس کی بنیاد بھی، پچھلی سورتوں کی طرح، تکبر اور اس کے مقتضیات ہی پر ہے۔ آگے ہم سورہ کے مطالب کا تجزیہ پیش کرتے ہیں جس سے اس کا عمود اور نظام ان شاء اللہ اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات اور آپ کو تسلی کہ یہ پُر حکمت قرآن خود اس بات کی سب سے بڑی شہادت ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دے رہے ہیں۔ یہ قرآن، خدائے عزیز و رحیم کی طرف سے، ان لوگوں پر ایک عظیم احسان ہے جو اب تک خدا کی تعلیم و ہدایت سے بالکل محروم ضلالت میں بھٹک رہے تھے۔ یہ محض ان کی بدقسمتی ہے کہ استکبار کے سبب سے یہ اس کو جھٹلا رہے ہیں۔ ان کی پچھلی روایات اور ان کی مستقبل کی آرزوئیں ان کے لیے حجاب بنی ہوئی ہیں اس وجہ سے نہ یہ ماضی سے کوئی سبق لے رہے ہیں اور نہ مستقبل کا کچھ دھیان کر رہے ہیں۔ آپ ایسے بے فکروں کے لیے زیادہ پریشان نہ ہوں۔ جو خدا سے ڈریں اور نصیحت کو سنیں ان کو مغفرت اور اجرِ عظیم کی بشارت دیجیے۔ جو نہیں سنتے ان کا معاملہ ہمارے حوالے کیجیے۔ ان کا اگلا پچھلا سب ہمارے رجسٹر میں درج ہے۔ ہم ان سے نمٹ لیں گے۔

(۱۳-۳۲) قریش کی عبرت کے لیے ایک بستی کی تمثال جس کے باشندوں کے انذار کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو

رسول بھیجے جب انھوں نے ان کی نہیں سنی تو اللہ نے ایک تیسرے بندے کو ان رسولوں کی تائید کے لیے اٹھایا۔ لیکن انھوں نے اس کی بھی کوئی پروا نہیں کی۔ ان کی تنبیہ کے لیے اس دوران میں جو نشانیاں ظاہر ہوئیں لوگوں نے ان کو ان رسولوں کی نحوست قرار دیا اور اس جرم میں ان کو سنگسار کر دینے کی دھمکی دی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے اپنے عذاب سے اس بستی کو ہلاک کر دیا۔

(۳۳ - ۴۴) اس کائنات میں خدا کی قدرت، حکمت، پروردگاری اور رحمت کی جو نشانیاں ہیں ان میں سے بعض کی طرف اشارہ اور اس امر کا بیان کہ یہ ساری نشانیاں اللہ تعالیٰ کے شکر کو واجب کرتی ہیں جس کا لازمی تقاضا توحید ہے اور ساتھ ہی یہ حشر و نشر اور جزاء و سزا کو مستلزم ہیں۔

(۴۵ - ۵۰) اس امر کا بیان کہ جب لوگوں کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا جاتا ہے اور اس سے بچنے کے لیے اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت دی جاتی ہے تو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جن کو خدا نے اپنے فضل سے محروم رکھا ہم اپنا مال ان پر کیوں خرچ کریں! انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ خدا کو جب عذاب لانا ہوگا تو اس کے لیے اسے کوئی تیاری نہیں کرنی پڑے گی بلکہ وہ چشم زدن میں آجائے گا جس کے بعد کسی کو لب ہلانے کی فرصت نصیب نہیں ہوگی۔

(۵۱ - ۶۵) قیامت کی تصویر اور اس دن ایمان لانے والوں اور اس کے جھٹلانے والوں کا جو حال ہوگا اس کی تفصیل۔

(۶۶ - ۶۸) عذاب کا مطالبہ کرنے والوں کو یہ تنبیہ کہ سمع و بصر کی جو صلاحیتیں خدا نے بخشی ہیں ان سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی عقل سے کام لو۔ اگر ان صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھایا تو خدا ان کو مسخ بھی کر سکتا ہے اور یہ کام خدا کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔

(۶۹ - ۸۳) خاتمۂ سورہ جس میں ابتدائے سورہ کے مضمون کو ایک نئے اسلوب سے لیا ہے۔ توحید اور قیامت کی بعض نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تمہارا کام زندوں کو جگانا ہے۔ جو لوگ اخلاقی اعتبار سے مردہ ہو چکے ہیں ان پر تمہارا کلام کارگر نہیں ہو سکتا۔

سُوْرَةُ يٰسٓ (۳۶)

مَكِّيَّةٌ —— اٰيَاتُهَا ۸۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۱۲

يٰسٓ ﴿١﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ﴿٢﴾ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٣﴾ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٤﴾ تَنْزِيْلَ الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ﴿٥﴾ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ﴿٦﴾ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٧﴾ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ﴿٨﴾ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿٩﴾ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠﴾ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ ﴿١١﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۣ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿١٢﴾

وقف غفران

ع ۱ ۱۲ ۱۸

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۲

یہ سورۂ یٰسٓ ہے۔ شاہد ہے پُرحکمت قرآن کہ تم رسولوں میں سے ہو، ایک نہایت سیدھی راہ پر، جس کو نہایت اہتمام سے اتارا ہے خدائے عزیز و رحیم نے کہ تم ان لوگوں کو آگاہ

کردو جن کے اگلوں کو آگاہ نہیں کیا گیا پس وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہتوں پر ہماری بات پوری ہو چکی ہے تو وہ ایمان لانے والے نہیں بنیں گے۔ ہم نے ان کی گردنوں میں طوق ڈال دیے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک ہیں پس ان کے سر اٹھے رہ گئے اور ہم نے ان کے آگے سے بھی ایک روک کھڑی کر دی ہے اور ان کے پیچھے سے بھی ایک روک کھڑی کر دی ہے۔ اس طرح ہم نے ان کو ڈھانک دیا ہے پس ان کو سجھائی نہیں دے رہا ہے۔ اور ان کے لیے یکساں ہے ، ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ ، وہ ایمان نہیں لانے کے۔ تم تو بس انہی کو ڈرا سکتے ہو جو نصیحت پر دھیان کریں اور غیب میں خدائے رحمان سے ڈریں۔ سو ایسے لوگوں کو مغفرت اور باعزت صلہ کی بشارت دو۔ بے شک ہم مُردوں کو زندہ کریں گے اور ہم نوٹ کر رہے ہیں جو کچھ انھوں نے آگے کے لیے بڑھایا اور جو کچھ پیچھے چھوڑا اور ہم نے ہر چیز ایک واضح کتاب میں محفوظ کر لی ہے۔ ۱۲-۱

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰسٓ (۱)

یہ حروف مقطّعات میں سے ہے جن پر ایک جامع بحث سورۂ بقرہ کی تفسیر کے شروع میں گزر چکی ہے۔ یہ اس سورہ کا قرآنی نام ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی 'یٰٓاَیُّھَا الْاِنْسَانُ' کے لیے ہیں لیکن یہ بات بالکل بے دلیل ہے۔

وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ ۝ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (۲-۳)

قرآن کے اعجاز میں اصل دخل اس کی حکمت کو ہے

'و' قسم کے مفہوم میں ہے اور قسم عربی میں ، جیسا کہ ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'الامعان فی اقسام القرآن' میں وضاحت فرمائی ہے ، شہادت کے لیے آتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پر حکمت قرآن جو تم لوگوں کو سنا رہے ہو ، خود اس بات کی شہادت کے لیے کافی ہے کہ تم رسولوں کے زمرے سے تعلق رکھنے والے ہو۔ رسول کے سوا کوئی دوسرا اس طرح کا حکیمانہ اور معجز کلام پیش کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے اعجاز میں اصلی دخل اس کی حکمت ، اس کے فلسفہ کو ہے۔ اس کی زبان کی بلاغت و جزالت

مزید برآں ہے۔

عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۴)

قرآن سے اعراض فطرت سے انحراف کا نتیجہ ہے

یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے اور اس کا بغیر حرف عطف کے آنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قرآن حکیم بیک وقت دونوں باتوں کا شاہد ہے۔ اس بات کا بھی کہ تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو اور اس بات کا بھی کہ تم بالکل سیدھی راہ پر ہو اور لوگوں کو سیدھی راہ پر چلنے کی دعوت دے رہے ہو۔ تنکیر یہاں تفخیم شان کے لیے ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ راہ عقل و فطرت اور خدا کی بتائی ہوئی نہایت سیدھی راہ ہے۔ جو لوگ یہ سیدھی راہ اختیار کرنے سے گریز کر رہے ہیں انھوں نے اپنی فطرت بگاڑ لی ہے اور اپنی عقل سے کام لینا چھوڑ دیا ہے اس وجہ سے انھیں سیدھی چیز ٹیڑھی نظر آ رہی ہے۔

تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ (۵)

قرآن انذار اور بشارت ہے

'تَنْزِیْلَ' فعل محذوف سے منصوب ہے۔ اس کے معنی کی وضاحت دوسرے مقام میں ہم کر چکے ہیں کہ یہ کسی چیز کو درجہ بدرجہ نہایت اہتمام کے ساتھ اتارنے کے لیے بھی آتا ہے۔ یہ قرآن کے ایک دوسرے پہلو کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس کو خدائے عزیز و رحیم نے نہایت اہتمام و تدریج کے ساتھ اتارا ہے کہ لوگ اس پر غور کریں، اس کو سمجھیں اور اس سے 'صراط مستقیم' کی رہنمائی حاصل کریں۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی دو صفتوں کا حوالہ ہے۔ ایک 'عزیز' دوسری 'رحیم'۔ ان میں ایک صفت انذار کے لیے ہے اور دوسری بشارت کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس کی تکذیب کریں گے وہ یاد رکھیں کہ یہ کسی سائل کی درخواست نہیں بلکہ ایک عزیز و مقتدر کا فرمان واجب الاذعان ہے جو سرکشی کرنے والوں کو لازماً سزا دے گا۔ ساتھ ہی وہ رحیم بھی ہے اور اپنی اس رحمت ہی کے لیے اس نے یہ کتاب اتاری ہے تو جو اللہ کے بندے اس قرآن کی قدر کریں گے ان کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے گا۔

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (۶)

بنی اسماعیل کو تنبیہ

یہ قرآن کے اتارنے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ نے اس کو اس اہتمام سے اس لیے اتارا ہے کہ جن کے اندر تم سے پہلے کسی رسول کی بعثت نہیں ہوئی تھی اور وہ غفلت میں پڑے ہوئے تھے ان کو تم زندگی کے انجام سے اچھی طرح آگاہ کر دو۔ یہ اشارہ بنی اسماعیل کی طرف ہے اور یہ اس عظیم احسان کا بیان ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئیوں کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان پر کیا۔ اس میں ان کے لیے ترغیب کے ساتھ یہ ترہیب بھی ہے کہ اگر انھوں نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو اپنے لیے سب سے بڑی سعادت کی جگہ سب سے بڑی شقاوت کا سامان کریں گے۔ یہی مضمون دوسرے مقامات میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ 'لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِیْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ' (القصص: ۴۶) (تاکہ تم ان لوگوں کو آگاہ کر دو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی نذیر نہیں آیا)۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓی اَکْثَرِہِمْ فَہُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۷)

سرکشوں سے اعراض کی ہدایت

'قول'، سے اشارہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کی طرف ہے جو اس نے ابلیس کے جواب میں اس وقت فرمایا تھا جب اس نے یہ دھمکی دی تھی کہ میں ذریت آدم کی اکثریت کو گمراہ کر کے چھوڑوں گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لَاَمْلَـَٔنَّ جَہَنَّمَ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (میں ایسے تمام جنوں اور انسانوں سے جو تیری پیروی کریں گے دوزخ کو بھر دوں گا) اسی قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمھارا فرض انذار کرنا ہے وہ کرتے رہو لیکن یہ توقع نہ رکھو کہ ان میں سے ہر شخص تمھاری دعوت قبول کرے گا بلکہ ان میں بہتیرے ایسے ہیں جن پر ہماری بات صادق آ چکی کہ وہ ابلیس کی پیروی کے جرم میں جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ اس طرح کے لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔ ان کے درپے اور ان کے لیے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِہِمْ اَغْلٰلًا فَہِیَ اِلَی الْاَذْقَانِ فَہُمْ مُّقْمَحُوْنَ (۸)

متکبرین کے استکبار کی تصویر

یہ ان ایمان نہ لانے والوں کے استکبار کی تصویر ہے کہ گویا ان کی گردنوں میں ایسے طوق پڑے ہوئے ہیں جو ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچتے ہیں جس کے سبب سے ان کے سر اس طرح اٹھے ہوئے رہ گئے ہیں کہ نہ وہ نیچے کی طرف جھک سکتے ہیں اور نہ اوپر ہی کی طرف اٹھ سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ زمین کی نشانیاں دیکھ سکتے اور نہ آسمان کے عجائب ہی پر نگاہ ڈال سکتے۔ ان کی اس حالت کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے کہ ہم نے ان کو ایسا بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم جگہ جگہ اشارہ کرتے آ رہے ہیں، یہ ہے کہ کسی فرد یا گروہ کی یہ حالت اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق ہوتی ہے۔ جو لوگ حق سے انحراف و اعراض کی یہ روش دیدہ و دانستہ اختیار کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے آنکھیں بند کر کے زندگی گزارتے ہیں ان کے اوپر اللہ ان کی خواہشیں اور ان کے اعمال اسی طرح مسلط کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پھر کوئی تعلیم و تذکیر ان پر اثرانداز نہیں ہوتی۔ اسی حقیقت کی طرف کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (المطففین: ۱۴) میں اشارہ فرمایا ہے۔

'مقمح' اصل میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کا سر پیچھے کی جانب اس طرح باندھ دیا گیا ہو کہ اس کی گردن ایک خاص حد سے نہ نیچے ہو سکے نہ اوپر۔ بالکل یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جس کے گلے میں آہنی طوق ڈال دیا جائے، وہ بھی اپنا سر نہ نیچے کر سکتا ہے نہ اوپر بلکہ ایک خاص زاویہ پر اس کی گردن تنی رہتی ہے۔ یہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، متکبرین کی تصویر ہے۔ اس طرح کے لوگ اپنے اوپر نیچے اور دہنے بائیں کی تمام نشانیوں سے بے خبر ہی رہتے ہیں۔ ان کو اپنی 'انا' کے سوا اور کسی چیز کی طرف کبھی توجہ نہیں ہوتی۔

وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْہِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِہِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰہُمْ فَہُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ (۹)

یہ اوپر والے مضمون ہی کی وضاحت ہے کہ اس طرح ہم نے ان کے آگے اور پیچھے دونوں طرف سے اوٹ کھڑی کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے جس کے سبب سے انھیں کچھ سجھائی نہیں

دے رہا ہے۔ ان کی اسی حالت پر سورۂ سبا میں اظہارِ تعجب فرمایا ہے: اَفَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۹) (کیا ان لوگوں نے ان کے آگے اور پیچھے جو آسمان و زمین ہیں ان پر نگاہ نہیں ڈالی؟) اس طرح کے متکبرین کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ یہ اپنی پچھلی روایات اور اپنے مستقبل کے مطامع کے غلام ہوتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ان کی راہ میں اس طرح روک بن جاتی ہیں کہ ان سے ہٹ کر وہ کوئی چیز دیکھنے کے قابل رہ ہی نہیں جاتے۔

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۱۰)

ظاہر ہے کہ اس طرح کے لوگ ایک سخت قسم کی عقلی و اخلاقی بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو ڈرانا یا نہ ڈرانا اصل مقصد کے لحاظ سے بالکل بے سود ہوتا ہے۔ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں بنتے۔ ان کو اگر انذار کیا جاتا ہے تو محض اتمامِ حجت کے لیے کہ قیامت کے دن یہ کوئی عذر نہ پیش کر سکیں۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں ختمِ قلوب پر جو بحث گزر چکی ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّاَجْرٍ كَرِيْمٍ (۱۱)

انذار ان پر کارگر ہو سکتا ہے جو عقل سے کام لیں

یعنی تمہاری تعلیم و تذکیر تو بس انہی کے اوپر کارگر ہو سکتی ہے جو تمہاری نصیحت سنیں، اس پر غور کریں اور اپنے دلوں کے دروازے اس کے لیے کھولیں نیز یہ کہ وہ اپنی عقل سے کام لیں، نرے محسوسات کے غلام بن کے زندگی نہ گزاریں کہ جب تک ان کو عذاب نہ دکھا دیا جائے اس وقت تک کوئی بات ماننے ہی کے لیے تیار نہ ہوں۔ ایمان معتبر وہ ہے جو سمع و بصر اور عقل و دل کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا کر لایا جاتا ہے نہ کہ حقائق کو آنکھوں سے دیکھ کر۔ فرمایا کہ جو لوگ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر ایمان لانا چاہتے ہیں ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ البتہ ان لوگوں کو مغفرت اور اجرِ کریم کی بشارت دو جو غیب میں رہتے خدائے رحمان سے ڈرتے ہیں۔

خدا کی خشیت اس کی رحمانیت کا تقاضا ہے

یہ حقیقت ہم جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں کہ خدا سے خشیت درحقیقت اس کی رحمانیت کا تقاضا ہے۔ وہ رحمان ہے اس وجہ سے لازم ہے کہ وہ نیکوں کو ان کی نیکی کا صلہ اور بدوں کو ان کی بدی کی سزا دے۔ اسی رحمانیت کے ظہور کے لیے اس نے جزا اور سزا کا دن مقرر کیا ہے جس میں اس کی کامل رحمت اور اس کے کامل عدل کا ظہور ہو گا۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ۚ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۱۲)

روزِ جزا کی یاددہانی

یہ اسی روزِ جزا کی یاددہانی ہے جو اس کی رحمانیت کا لازمی تقاضا ہے۔ فرمایا کہ ایک دن آئے گا کہ ہم تمام مُردوں کو زندہ کریں گے اور اس دنیا میں انھوں نے آگے کے لیے جو کچھ کیا اور پیچھے کے لیے جو کچھ چھوڑا ہے، ہم اس سارے کو قلم بند کر رہے ہیں۔ مقصود اس سے اس کے لازم کو واضح کرنا ہے کہ جب ہم سب کو

زندہ بھی کریں گے اور ہر ایک کے اعمال نوٹ بھی کر رہے ہیں تو لازماً ہر ایک کے ساتھ اس کے اعمال کے مطابق معاملہ بھی کریں گے۔ اس لازمی نتیجہ کی یہاں وضاحت نہیں کی۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ یہ بغیر ذکر کے بھی واضح ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ قیامت کے باب میں منکرین کا اصلی شبہ صرف دو پہلوؤں سے تھا۔ ایک اس پہلو سے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو مستبعد سمجھتے تھے۔ دوسرا اس پہلو سے کہ اتنی وسیع دنیا کے تمام اعمال و اقوال کون محفوظ رکھ سکتا ہے کہ وہ ایک دن اس سارے کا حساب کرنے بیٹھے؟ یہ دونوں شبہات یہاں صاف کر دیے جس کے بعد اس کا لازمی نتیجہ خود بخود سامنے آ گیا۔

'مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ' میں وہی مضمون بیان ہوا ہے جو دوسرے مقام میں 'يُنَبَّأُ الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۭ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اس دنیا میں انسان بہت سے کام اپنے تصور کے مطابق، آخرت کے لیے کرتا ہے اور بہت سے کام اپنی اس دنیا کی زندگی یا اپنے بعد والوں کے لیے کرتا ہے۔ فرمایا کہ ہم اس کے ان دونوں ہی طرح کے کاموں کو نوٹ کر رہے ہیں۔

'امام مبین' سے مراد

'وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ'۔ 'اِمَام' کے اصلی معنی رہنما، ہادی، لیڈر اور مرجع کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ اس کتاب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو سب کے لیے رہنما اور مرکز و مرجع کی حیثیت رکھتی ہو۔ چنانچہ ہود آیت ۱۷ اور احقاف آیت ۱۲ میں یہ لفظ تورات کے لیے آیا ہے۔ یہاں یہ اس مرکزی کتاب کے لیے استعمال ہوا ہے جس میں ہر شخص کے اعمال درج ہوں گے اور جس کے مطابق ہر شخص جزا یا سزا پائے گا۔ یہ اوپر والے ٹکڑے کی مزید وضاحت ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ لوگوں کے اعمال و اقوال کی تحریر میں ہم نے کسی غفلت و بے پروائی سے کام لیا ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ ہر چیز ایک نہایت واضح دفتر میں ہم نے درج کر رکھی ہے جو سب کے سامنے اس کا سارا کچا چٹھا پیش کر دے گا۔

۲۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۱۳-۳۲

ایک بستی کی مثال

آگے قریش کے سامنے رسولوں کی تکذیب کا انجام واضح کرنے کے لیے ایک بستی کی مثال پیش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بستی والوں کے انذار کے لیے اپنے دو رسول بھیجے لیکن انھوں نے ان کی تکذیب کر دی۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے ایک تیسرے منذر سے اپنے رسولوں کو کمک پہنچائی لیکن بستی والوں نے اس کی بھی کوئی پروا نہ کی۔ ان کی تنبیہ کے لیے جو نشانیاں ظاہر ہوئیں ان کو انھوں نے رسولوں کی نحوست پر محمول کیا اور ان کو سنگسار کر دینے کی دھمکی دی۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک فیصلہ کن عذاب بھیج کر ان کو بالکل پامال کر دیا۔

اس بستی سے کس بستی کی طرف اشارہ ہے؟

قرآن نے اس بستی کا نام نہیں لیا ہے اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے کون سی بستی مراد ہے، مفسرین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس سے مراد انطاکیہ ہے اور یہاں جن رسولوں کا ذکر ہے وہ اللہ کے رسول نہیں بلکہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بھیجے ہوئے سفیر تھے جن کو حضرتؑ نے اپنے شاگردوں میں سے انتخاب کر کے انطاکیہ والوں کے انذار کے لیے بھیجا تھا۔ میرے سامنے بروقت جو تفسیریں ہیں ان سب میں یہی روایت نقل ہوئی ہے۔ ابن کثیرؒ نے اس پر متعدد شبہات وارد کر کے اگرچہ اس کو مجروح کر دیا ہے لیکن اس کے سوا کوئی اور قول چونکہ ان کو نہیں ملا اس وجہ سے انھوں نے بھی اختیار اسی کو کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ قول متعدد وجوہ سے بے بنیاد ہے۔

۱- اس کے بے بنیاد ہونے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہاں ان رسولوں کا جس طرح ذکر ہوا ہے اور انھوں نے اپنے آپ کو جس حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے اس سے صاف واضح ہے کہ یہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بھیجے ہوئے رسول نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول تھے اور اسی حیثیت سے انھوں نے اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ مثلاً فرمایا ہے اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ۔ (یاد کرو جب کہ ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انھوں نے ان کو جھٹلا دیا تو ہم نے ایک تیسرے سے ان کو قوت پہنچائی تو انھوں نے لوگوں کے سامنے اعلان کیا کہ ہم تمھاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں) آگے اسی سلسلہ میں یہ بھی آتا ہے کہ جب لوگوں نے اس بنا پر ان کو جھٹلایا کہ وہ انھی کی طرح بشر ہیں تو انھوں نے قید قسم کے ساتھ کہا کہ رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ (ہمارا رب گواہ ہے کہ ہم تمھاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں)۔ اگر یہ لوگ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بھیجے ہوئے سفیر تھے تو ان کے بھیجنے کو اللہ تعالیٰ نے اس صراحت و تاکید کے ساتھ اپنی طرف کیوں منسوب فرمایا؟ اور اگر انھوں نے اپنے آپ کو اللہ کے رسول کے بجائے حضرت عیسٰیؑ کے سفیر کی حیثیت سے لوگوں کو دعوت دی ہوتی تو لوگ ان کی بشریت کی بنا پر ان کی تکذیب کیوں کرتے؟ رسولوں کے مکذبین نے ان کی بشریت کو تکذیب کا بہانہ تو اس بنیاد پر بنایا کہ وہ خدا کے رسول ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس پر لوگ یہ اعتراض اٹھاتے تھے کہ اگر خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کیا وہ ہمارے ہی جیسے انسانوں کو رسول بناتا، آخر اس نے اپنے فرشتوں یا کسی اور برتر مخلوق کو اس منصب کے لیے کیوں نہیں انتخاب کیا؟

۲- دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا اور اس کا نتیجہ اہل انطاکیہ کی تباہی کی شکل میں ظاہر ہوا تو یہ اتنا بڑا واقعہ تھا کہ انجیلوں اور بائبل ہسٹری میں اس کا ذکر ضرور ہوتا لیکن نہ تو انجیلوں میں اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ تاریخوں ہی میں اس کی طرف کوئی اشارہ ہے بلکہ تاریخوں میں اس کے برعکس یہ اشارہ ملتا ہے کہ اہل انطاکیہ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام پر ایمان

لانے میں سبقت کی۔

۳۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں اس واقعہ کا ذکر قریش کے سامنے ایک معروف واقعہ کی حیثیت سے ہوا ہے۔ چنانچہ یہاں قریہ پر الف لام عہد کا داخل ہے۔ 'اصحاب قریۃ' نہیں کہا ہے بلکہ 'اصحاب القریۃ' فرمایا ہے۔ اور موقع و محل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہاں کسی معروف واقعہ کا ذکر کیا جائے اس لیے کہ اس سے مقصود قریش کو انذار و تخویف ہے اور یہ مقصد صرف ایک مشہور واقعہ ہی سے حاصل ہو سکتا تھا نہ کہ ایک ایسے واقعہ سے جس سے وہ بالکل بے خبر ہوں۔

۴۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام بنی اسرائیل کے رسول تھے اس وجہ سے غیر قوموں کو نہ تو انھوں نے خود دعوت دی اور نہ ان کی طرف اپنے شاگردوں ہی کو بھیجا۔ بلکہ انھوں نے غیر قوموں کے پاس جانے سے اپنے شاگردوں کو روکا۔ ان کا ارشاد ہے کہ 'میں صرف اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں ہی کی تلاش کے لیے آیا ہوں۔' غیر قوموں کے بارے میں ان کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے کہ 'میرے پاس جو روٹی ہے وہ صرف بچوں ہی کے لیے ہے، کتوں کے آگے اس کو ڈالنا ٹھیک نہیں ہے۔' اس وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انطاکیہ میں انھوں نے اپنے شاگردوں کو کن کے پاس بھیجا؟ غیر قوموں کے پاس تو ظاہر ہے کہ وہ بھیج نہیں سکتے تھے۔ رہے بنی اسرائیل تو بشریت کی بنیاد پر تو انھوں نے حضرت عیسٰیؑ کی بھی تکذیب نہیں کی تو اس بنیاد پر وہ ان کے شاگردوں کی تکذیب کیوں کرتے؛ وہ جن نبیوں کے معتقد تھے ان کو وہ بشر مانتے تھے اس وجہ سے وہ یہ اعتراض نہیں اٹھا سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے خلاف ہر قسم کے فتنے اٹھائے لیکن یہ اعتراض نہیں اٹھایا کہ آپ بشر ہیں بلکہ قریش نے جب یہ اعتراض اٹھایا تو قرآن نے بنی اسرائیل ہی کو گواہ کی حیثیت سے پیش کیا کہ ان سے پوچھ لو کہ ہم نے جتنے نبی یا رسول بھیجے سب بشر ہی تھے۔

۵۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ آگے مذکور ہے کہ ان رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں ان کے اوپر ایسا فیصلہ کن عذاب آیا کہ وہ بالکل پامال ہو کے رہ گئے: اِنۡ کَانَتۡ اِلَّا صَیۡحَۃً وَّاحِدَۃً فَاِذَا ہُمۡ خٰمِدُوۡنَ (۲۹) (بس ہماری ایک ڈانٹ ہی تھی کہ وہ چشم زدن میں پامال ہو کے رہ گئے) اس قسم کے فیصلہ کن عذاب سے متعلق ہم سنتِ الٰہی کی وضاحت کر چکے ہیں کہ یہ صرف رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں، کامل اتمامِ حجت کے بعد ہی، آیا ہے۔ یہود کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تکذیب کے نتیجہ میں ان پر اس طرح کا کوئی عذاب نہیں آیا جس طرح کا عذاب سابق رسولوں کے مکذبین پر آیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس جرم میں ان پر قیامت تک کے لیے لعنت کر دی۔ لعنت کا عذاب تمام عذابوں سے زیادہ سخت ہے جس کے سبب سے وہ دنیا میں بھی ہمیشہ ذلیل و پامال رہیں گے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ذلت و رسوائی ہے۔ اس کی وضاحت سورۂ اعراف اور سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر میں ہم کر

چکے ہیں۔

اس قول کے ضعف کے یہ وجوہ بالکل واضح ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اور وجوہ بھی ہیں جو آگے آیات کی تفسیر کے ذیل میں سامنے آئیں گے۔ ہمارے نزدیک اس قریہ سے اشارہ مصر کی طرف ہے جہاں حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام اور تیسرے مردِ حق کی تکذیب کے نتیجہ میں فرعون اور اس کی قوم پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔ اس کے قرائن و دلائل کی تفصیل آیات کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۳-۳۲ (نیا مضمون)

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ ﴿۱۵﴾ قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸﴾ قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۰﴾ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْئَلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَمَالِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ ﴿۲۵﴾ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۶﴾ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ

مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ
مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ﴿۲۸﴾ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً
فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ ﴿۲۹﴾ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ (وقف غفران)
اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۰﴾ اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ
الْقُرُوْنِ اَنَّهُمْ اِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا
مُحْضَرُوْنَ ﴿۳۲﴾ ع ۲ ۲۰ ۱

ترجمہ آیات ۱۳-۳۲

اور ان کو بستی والوں کی مثال سناؤ، جب کہ ان کے پاس فرستادے آئے۔ جب کہ ہم نے ان کے پاس دو رسول بھیجے تو لوگوں نے ان کی تکذیب کردی تو ہم نے ایک تیسرے سے ان کی تائید کی تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ ہم تمھارے پاس بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ لوگوں نے جواب دیا کہ تم تو بس ہمارے ہی جیسے بشر ہو! اور خدائے رحمان نے کوئی چیز بھی نازل نہیں کی ہے، تم لوگ بالکل جھوٹ دعوی کرتے ہو۔ ۱۲-۱۵

انھوں نے کہا کہ ہمارا رب گواہ ہے کہ ہم تمھاری طرف رسول ہو کر آئے ہیں۔ اور ہماری ذمہ داری بس واضح طور پر پہنچا دینے کی ہے۔ لوگوں نے کہا، ہم تو تمھیں منحوس سمجھتے ہیں، اگر تم لوگ باز نہ رہے تو ہم تم کو سنگسار کر چھوڑیں گے اور تم کو ہمارے ہاتھوں بڑا دکھ پہنچے گا۔ رسولوں نے جواب دیا کہ تمھاری نحوست تمھارے ساتھ ہے۔ کیا اس چیز کو تم نے نحوست سمجھا کہ تمھیں یاد دہانی کی گئی! بلکہ تم خود حدود سے گزر جانے والے لوگ ہو۔ ۱۶-۱۹

اور شہر کے پرلے سرے سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا۔ اس نے کہا، اے میری قوم کے لوگو، رسولوں کی پیروی کرو۔ ان لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتے اور وہ

راہِ راست پر بھی ہیں۔ اور میں کیوں نہ بندگی کروں اس ذات کی جس نے مجھ کو پیدا کیا اور اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے! کیا میں اس کے سوا دوسروں کو معبود بناؤں! اگر خدائے رحمان مجھے کوئی تکلیف پہنچانی چاہے تو نہ ان کی سفارش میرے کچھ کام آئے گی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکیں گے۔ بے شک میں اس وقت ایک کھلی ہوئی گمراہی میں ہوں گا۔ میں تمھارے رب پر ایمان لایا تو میری بات سنو —— ارشاد ہوا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اس نے کہا کاش! میری قوم جانتی کہ میرے رب نے مجھے بخش دیا اور مجھے عزت پانے والوں میں سے بنایا! ۲۰-۲۷

اور اس کے بعد اس کی قوم پر ہم نے آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری اور نہ ہم اتارنے والے ہی تھے۔ بس ایک ڈانٹ تھی کہ دفعتہً وہ پامال ہو کے رہ گئے۔ افسوس ہے بندوں کے حال پر! جو رسول بھی ان کے پاس آئے وہ ان کا مذاق ہی اڑاتے رہے۔ کیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ کتنی قومیں ان سے پہلے ہوئی ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا، اب وہ ان کے پاس واپس آنے والی نہیں۔ بے شک وہ سب ہمارے ہی حضور میں حاضر کیے جائیں گے۔ ۲۸-۳۲

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ (۱۳)

قریش کی عبرت کے لیے مصر کی مثال

'لَهُمْ' میں ضمیر کا مرجع قریش ہیں اور 'اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ' میں 'قَرْيَة' پر الف لام اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ بستی مخاطب کے لیے ایک معہود و معلوم بستی تھی۔ آگے کے اشارات دلیل ہیں کہ اس سے مراد مصر ہے جس کی سرگزشت، مختلف اسلوبوں سے، قرآن میں، قریش کی عبرت پذیری کے لیے بیان ہوئی ہے اور جس کے حالات سے وہ واقف تھے 'اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ' سے اس بات کی طرف اشارہ ہے

کہ یہاں مقصود مخاطب کو اس وقت کے حالات کی طرف توجہ دلانا ہے جب ان کی طرف رسولوں کی بعثت ہوئی ہے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کو اس بستی کی سرگزشت کی طرف توجہ دلاؤ کہ جو انجام اس بستی والوں کا ہوا وہی حال ان کا بھی ہوگا اگر انھوں نے انہی کی روش اختیار کی۔

ایک تیسرے بندے سے رسولوں کی تائید

اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ (۱۴)

یہ 'اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ' کے اجمال کی وضاحت ہو رہی ہے کہ پہلے ہم نے ان کی طرف دو رسول بھیجے تو انھوں نے ان کو جھٹلا دیا۔ پھر ہم نے ایک تیسرے بندے سے ان دونوں رسولوں کو کمک پہنچائی اور انھوں نے ان کو دعوت دی کہ ہم تمھارے پاس خدا کے بھیجے ہوئے آئے ہیں تو تم لوگ ہماری بات سنو اور مانو۔

'اِثْنَيْنِ' سے مراد تو ظاہر ہے کہ حضرت موسٰی و حضرت ہارون علیہما السلام ہیں۔ رسولوں کی تاریخ میں یہی ایک مثال ملتی ہے کہ کسی قوم کی طرف بیک وقت دو رسول اللہ تعالیٰ نے بھیجے۔ اس اہتمام خاص کے وجوہ کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ جب فرعونیوں نے ان کی تکذیب کر دی تو اللہ تعالیٰ نے ایک تیسرے بندے کو ان رسولوں کی تائید کے لیے اٹھایا۔

تیسرے سے کون مراد ہے؟

اس تیسرے سے کون مراد ہے؟ میرے نزدیک اس سے وہ مومنِ آلِ فرعون مراد ہے جس کی جانبازیوں کا ذکر حضرت موسٰی علیہ السلام کی سرگزشت کے ذیل میں یہاں بھی آگے ہوا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات، بالخصوص سورۂ مومن، میں بھی ہوا ہے۔ حضرت موسٰی علیہ السلام کی تائید و حمایت میں اس مردِ حق نے جو کچھ کیا ہے اور جس بے خوفی و جانبازی کے ساتھ کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت حضرت موسٰی علیہ السلام کی امت میں وہی تھی جو اس امت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ہے۔ یہ اگرچہ اصطلاحی مفہوم میں رسول نہیں تھے لیکن جہاں تک رسولوں کی تائید و حمایت کا تعلق ہے اس کے لیے انھوں نے جان لڑا دی۔ چنانچہ الفاظِ قرآن سے خود یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا ذکر یہاں ایک رسول کی حیثیت سے نہیں بلکہ رسولوں کے ایک خاص مددگار کی حیثیت سے ہوا ہے۔

آگے آیت ۲۰ میں ان کا تفصیل کے ساتھ تعارف بھی قرآن نے کرایا ہے اور ان کی وہ آخری یادگار تقریر بھی آ رہی ہے جو حضرت موسٰی علیہ السلام کی تائید میں انھوں نے کی ہے۔

اس تقریر اور تعارف پر غور کیجیے تو اس سے میرے قیاس کی تائید ہوگی۔

مثلاً یہاں ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے 'وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى' (اور شہر کے دور کے حصہ سے ایک شخص بھاگا ہوا آیا) بعینہٖ انہی الفاظ میں ان کا تعارف سورۂ قصص آیت ۲۰ میں ہوا ہے۔ 'وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ' (اور ایک شخص شہر کے پرلے سرے سے بھاگا

ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ اے موسیٰ! اعیانِ حکومت تمہارے قتل کے مشورے کر رہے ہیں تو تم یہاں سے نکل جاؤ، میں تمہارے خیر خواہوں میں سے ہوں)۔ یہ اس موقع کا ذکر ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں ایک مصری کے قتل کا واقعہ صادر ہو گیا تھا اور فرعون کے آدمی ان کے قتل کے مشورے کر رہے تھے۔ اس وقت اسی مردِ حق نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دشمنوں کی سازش سے آگاہ کیا اور ان کو کہیں نکل جانے کا مشورہ دیا۔ جس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مدین کو ہجرت فرمائی۔

ان کی جس تائید و حمایت کا یہاں حوالہ ہے اس کی ایک مثال تو یہیں آگے آ رہی ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے ان کے متعدد کارناموں کا حوالہ دیا ہے۔ سورۂ مومن کی آیت ۲۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرعون کے خاص شاہی خاندان کے ایک فرد تھے لیکن نہایت حق پرست تھے۔ ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کی بعثت سے پہلے بھی نہایت ہمدردی تھی چنانچہ اوپر سورۂ قصص کا جو حوالہ نقل ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انھیں پتہ چلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جان کو خطرہ ہے تو وہ چین سے بیٹھے نہیں رہے۔ بلکہ دوڑے بھاگے ہوئے حضرت موسیٰؑ کے پاس پہنچے اور ان کو خطرے سے آگاہ کیا ـــ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعوائے نبوت کے بعد جب فرعون اور اس کے اعیان نے حضرت موسیٰؑ کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو اس مردِ حق نے بھرے دربار میں جو تقریر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید میں کی وہ قرآن نے سورۂ مومن میں نقل کی ہے۔ ہم یہ تقریر اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ اس کو پڑھیے تو کچھ اندازہ ہوگا کہ ان کا مرتبہ و مقام کیا تھا اور ان کی اس تائید و حمایت (تعزیز) کی نوعیت کیا تھی جس کا قرآن نے یہاں حوالہ دیا ہے۔ سورۂ مومن کی آیات ۲۶ - ۴۵ سامنے رکھ لیجیے۔

"فرعون نے درباریوں سے کہا کہ تم لوگ مجھے موسیٰ کو قتل کر لینے دو، اگر وہ سچا ہے تو اپنی مدد کے لیے اپنے رب کو بلائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمھارا دین بدل دے گا یا ملک میں فساد برپا کر کے رہے گا۔ موسیٰ نے کہا میں ہر متکبر سے، جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمھارے رب کی پناہ مانگتا ہوں۔

اور ایک مردِ مومن، جو فرعون کے خاندان میں سے تھا اور اب تک اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، بولا کہ کیا تم لوگ ایک شخص کو محض اس گناہ میں قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے درآنحالیکہ وہ تمھارے پاس تمھارے رب کی جانب سے نہایت واضح نشانیاں لے کر آیا ہے! اگر وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے تو اس کا وبال اسی پر آئے گا اور اگر وہ سچا ہے تو یاد رکھو کہ جس چیز سے وہ تم کو ڈرا رہا ہے اس کا کوئی حصہ تم کو پہنچ کے رہے گا۔ اللہ کبھی حد سے تجاوز کرنے والے اور جھوٹے کو بامراد نہیں کرتا۔ اے میری قوم کے لوگو! آج تم کو اس ملک میں اقتدار حاصل ہے لیکن کل اگر خدا کا عذاب ہم پر آ دھمکا تو خدا کے قہر سے ہم کو کون بچائے گا؟

فرعون نے کہا، میں تمھیں وہی رائے دے رہا ہوں جو میری سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے اور یاد رکھو کہ میں بالکل ٹھیک راہ کی طرف تمھاری رہنمائی کر رہا ہوں۔

مردِ مومن نے کہا، اے میری قوم کے لوگو! میں تم پر اسی طرح کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں جس طرح کا عذاب پچھلی قوموں ـــــ نوح، عاد، ثمود کی قوموں اور ان کے بعد والوں ـــــ پر آیا۔ اللہ بندوں کے لیے ظلم کو پسند نہیں کرتا۔

اے میری قوم کے لوگو، میں تم پر ایک بڑی ہلچل کے دن کا اندیشہ رکھتا ہوں جس دن تم پیٹھ پیچھے بھاگو گے۔ اور کوئی تم کو خدا کے غضب سے بچانے والا نہیں ہوگا۔ یاد رکھو کہ جس کو خدا گمراہ کر دے اس کو کوئی دوسرا راہ دکھانے والا نہیں بن سکتا۔ اس سے پہلے تمھارے پاس یوسف کھلی نشانیوں کے ساتھ آئے لیکن تم ان کی دعوت کی طرف سے برابر شک ہی میں رہے۔ یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہوگئی تو تم یہ سمجھ بیٹھے کہ اللہ اب کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔ اللہ حدود سے تجاوز کرنے والوں اور شکیوں کو اسی طرح گمراہی میں ڈال دیتا ہے۔ یعنی ان لوگوں کو جو بغیر کسی دلیل کے اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑتے ہیں، ایسے لوگ اللہ اور اہلِ ایمان کے نزدیک زیادہ مبغوض ہیں۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح ہر متکبر و جبّار کے دل پر مہر کر دیا کرتا ہے۔

فرعون نے ہامان کو مخاطب کر کے کہا، اے ہامان! میرے لیے ایک محل بنواؤ تاکہ میں آسمانوں کے اطراف میں جھانک کر دیکھوں کہ موسیٰ کا رب کہاں ہے! میں تو اس کو بالکل جھوٹا سمجھتا ہوں ....

مردِ مومن نے کہا، اے میری قوم کے لوگو، میری پیروی کرو، میں تمھیں سیدھی راہ دکھا رہا ہوں۔ اے میری قوم کے لوگو! یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ ہے، اصلی ٹھکانا تو آخرت ہے۔ جو کسی برائی کا ارتکاب کرے گا تو وہ اسی کے مطابق بدلہ پائے گا ـــــ اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، تو یہی لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر بے حساب فضل ہوگا۔

اے میری قوم کے لوگو! کیا بات ہے کہ میں تو تمھیں نجات کی طرف بلا رہا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی طرف بلا رہے ہو! تم مجھے دعوت دے رہے ہو کہ میں اللہ کا انکار کروں اور ایسی چیزوں کو اس کا شریک ٹھہراؤں جن کے باب میں مجھے کوئی علم نہیں اور میں تمھیں خدائے عزیز و غفار کی طرف دعوت دے رہا ہوں ـــــ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ تم جن کی طرف مجھے دعوت دے رہے ہو ان کی دہائی نہ دنیا میں کچھ نافع نہ آخرت میں۔ ہمارا لوٹنا اللہ کی طرف ہوگا اور حدود سے تجاوز کرنے والے جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کو بہت جلد تم یاد کرو گے۔ میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔

بے شک اللہ اپنے بندوں کا نگرانِ حال ہے۔ تو اللہ نے اس کو لوگوں کی بری سازشوں سے محفوظ رکھا اور آلِ فرعون کو بُرے عذاب نے گھیر لیا۔"

تین کا تیسرا

اس مردِ بزرگ کی یہ پوری تقریر پڑھیے۔ یہ تقریر انھوں نے مصر کے دار الامراء (HOUSE OF LORDS) میں اعیانِ حکومت کے سامنے اس وقت کی ہے جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ کے قتل کی تجویز پیش کی ہے اور اعیانِ حکومت کو اپنی تجویز سے متفق کرنا چاہا ہے۔ اس وقت تک انھوں نے اپنا ایمان پوشیدہ رکھا تھا لیکن جب یہ فیصلہ کن وقت آگیا تو انھوں نے پردہ اٹھا دیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تائید اور حق کی حمایت میں، فرعون اور قوم کے تمام اعیان و اکابر کے سامنے، انھوں نے جو کچھ کہا ہے، جن دلائل کے ساتھ کہا ہے اور جس جرأت و بے خوفی کے ساتھ کہا ہے، اس کی مثال انبیاء اور صدیقین کی تاریخ کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی۔ پھر یہ بات بھی یاد رکھیے کہ یہ کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ خاندانِ شاہی کے ایک رکنِ رکین تھے اس وجہ سے ان کی اس نصیحت کو اعیانِ حکومت کسی اسرائیلی عصبیت پر محمول نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ پر تو انھوں نے یہ الزام لگایا کہ یہ اسرائیلیوں کو بغاوت پر ابھارنا چاہتے ہیں لیکن یہ صدائے حق جو اہی کے اندر کے ایک مردِ بزرگ کی طرف سے اٹھی، اس کے خلاف وہ اپنے عوام کے اندر کیا بدگمانی پھیلا سکتے تھے! ــــ اس مردِ جلیل کا یہی وہ شاندار اور زندۂ جاوید کارنامہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے 'فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ' کے الفاظ سے ذکر فرمایا۔ یہ اس معنی میں تو رسول نہیں تھے جس معنی میں حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ رسول تھے لیکن ان کے سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ جاں نثار اور سب سے بڑے وفادار و راستباز ساتھی ضرور تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو تین کے تیسرے کا درجہ دیا۔

قَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ' یہ جمع کے صیغہ سے ان سب کا یہ کہنا کہ 'اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ' اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ یہ تینوں حضرات ایک ہی درجہ کے رسول تھے بلکہ یہ بات علیٰ سبیل التغلیب ارشاد ہوئی ہے۔ ایک سفارت کے تمام ارکان ایک ہی درجہ و منصب کے نہیں ہوتے لیکن اصل ذمہ داری میں چونکہ سب شریک ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کو اس طرح اپنے کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا حق ہوتا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اصل رسول کی حیثیت تو صرف حضرت موسیٰؑ کو حاصل تھی، حضرت ہارونؑ بھی اصل رسول نہیں بلکہ حضرت موسیٰؑ کے وزیر تھے۔ اسی طرح اس مردِ ثالث کی حیثیت رسول کی نہیں بلکہ ان رسولوں کے سب سے بڑے جاں نثار و مددگار کی تھی لیکن انھوں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی اور اپنی قوم کو غلط کار لیڈروں کی پیروی سے روک کر حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ اور اپنی پیروی کی دعوت دے رہے تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی زمرے میں شمار فرمایا۔

قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَيْءٍ ۙ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا

تُكَذِّبُوْنَ (۱۵)

فرعونیوں کا پامال اعتراض

یہ وہی اعتراض ہے جو ہر رسول کے مکذبین نے اپنے اپنے رسولوں کے خلاف اٹھایا ہے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے انسان ہو تو تم خدا کے رسول کیسے ہوئے! اگر خدا کو کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کسی برتر مخلوق کو رسول بناتا نہ کہ ہمارے ہی جیسے انسانوں کو۔ یہ اعتراض قرآن میں رسولوں کے مکذبین کی زبان سے بار بار نقل ہوا ہے۔ فرعون اور اس کے اعیان کو بھی حضرت موسیٰؑ پر یہ اعتراض تھا اور یہی اعتراض قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھی اٹھایا تھا۔

'وَمَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ' الاٰیۃ۔ یعنی تمہارا یہ دعویٰ کہ خدا نے تم پر کوئی کتاب یا وحی نازل کی ہے، بالکل جھوٹ ہے۔ خدا نے کوئی چیز بھی نازل نہیں کی ہے۔

قَالُوْا رَبُّنَا یَعْلَمُ اِنَّآ اِلَیْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ۝ وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (۱۶-۱۷)

اعتراض کا جواب اور تنبیہ

'رَبُّنَا یَعْلَمُ' قسم کے مفہوم میں آتا ہے۔ اس کی وضاحت ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ ان کی تکذیب کے جواب میں انھوں نے قسم کے ساتھ فرمایا کہ ہم تمہارے پاس خدا کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ جس طرح آیت ۱۴ میں 'مُرْسَلُوْنَ' علی سبیل التغلیب آیا ہے اسی اسلوب پر یہاں بھی جمع آیا ہے۔

'وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ'۔ یہ ان کی طرف سے لوگوں کو تنبیہ ہے کہ اگر تم ہم کو جھٹلاتے ہو تو جھٹلاؤ۔ ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ذمہ داری ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم تم کو خدا کی بات نہایت واضح طور پر پہنچا دیں۔ تمہارے دلوں میں ایمان اتار دینا ہماری ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو اس کا انجام خود بھگتو گے۔ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

قَالُوْٓا اِنَّا تَطَیَّرْنَا بِكُمْ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَیَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۱۸)

لفظ 'تطیر' کی تحقیق اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بری فال لینے اور کسی کو منحوس سمجھنے کے مفہوم میں ہے۔

فرعونیوں کی طرف سے حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں پر نحوست کا الزام

یعنی ان رسولوں کی دعوت کے زمانے میں اہل مصر پر جو آفتیں، ان کی تنبیہ کے لیے نازل ہوئیں ان سے عبرت حاصل کرنے کے بجائے انھوں نے ان کو حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیا اور کہا کہ یہ آفتیں ہمارے اعمال کے سبب سے ہم پر نہیں آ رہی ہیں، جیسا کہ موسیٰؑ اور ان کے ساتھی دعویٰ کر رہے ہیں، بلکہ یہ ان کی اس گمراہ کن دعوت کے نتیجہ میں پیش آ رہی ہیں جس سے ہمارے دیوتا ناراض ہیں۔ ساتھ ہی ان کو دھمکی بھی دی کہ اگر تم لوگ اس بدعقیدگی کی اشاعت سے باز نہ آئے تو ہم اپنے دیوتاؤں کی حرمت کی حفاظت کے لیے تم کو سنگسار کر دیں گے اور اس کے علاوہ بھی بہت سے دکھ تم کو ہمارے ہاتھوں جھیلنے پڑیں گے۔ یہ مضمون سورۂ اعراف میں بھی گزر چکا ہے۔ فرمایا ہے: 'وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ۝ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ

قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ (۱۳۰-۱۳۱)

(اور ہم نے قوم فرعون کو قحط اور پھلوں کی کمی میں مبتلا کیا۔ وہ نصیحت حاصل کریں تو جب ان کے حالات اچھے ہوتے کہتے کہ یہ تو ہمارا حق ہی ہے اور اگر ان کو کوئی آفت پہنچتی تو اس کو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے)۔

قَالُوْا طٰٓئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ۭ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ (۱۹)

نحوست آدمی کے اپنے اعمال کے اندر ہوتی ہے

لفظ 'طائر' کی تحقیق بھی اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے معنی نحوست کے ہیں۔ یہ ان رسولوں کا جواب ہے کہ تم اپنی بدبختی کے اسباب دوسروں کے اندر ڈھونڈتے ہو حالانکہ تمھاری نحوست خود تمھارے ساتھ ہے۔ یہ جو کچھ پیش آ رہا ہے تمھارے اپنے ہی عقائد و اعمال کا نتیجہ ہے اس وجہ سے دوسروں کو ملزم ٹھہرانے کے بجائے اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھو اور اپنے اعمال و عقائد کا جائزہ لو۔

'اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ' یعنی تم ہمیں جو منحوس ٹھہرا رہے ہو تو کیا اس گناہ میں کہ ہماری طرف سے تم کو یاددہانی کی گئی اور نیک و بد سے آگاہ کیا گیا ہے!

'بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ' یعنی یہ تمھاری سرکشی و بدبختی کی انتہا ہے کہ خدا کے حدود کو توڑ کر اپنے لیے خطرات کو دعوت دیتے ہو پھر خدا کے جو بندے تمھیں ان خطرات سے آگاہ کرتے ہیں ان کے شکرگزار ہونے کے بجائے اُلٹے انھی کو ان خطرات کا سبب قرار دیتے ہو۔

وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى قَالَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِيْنَ ۙ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ (۲۰-۲۱)

تیسرے منذر کی طرف سے تائیدِ حق

اوپر آیت ۱۴ میں جس تیسرے مُنذر کی طرف اشارہ ہے یہ اس کی تائیدِ حق کی تفصیل ہے۔ اوپر سورۂ اعراف کی آیت کے حوالہ سے ہم بیان کر چکے ہیں کہ 'رَجُلٌ' سے مراد وہی مومنِ آلِ فرعون ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ سورۂ مومن میں ہوا ہے اور جس کی تقریر کا حوالہ ہم اوپر دے چکے ہیں — اس کا واضح قرینہ یہ ہے کہ جن الفاظ میں ان کا تعارف یہاں کرایا گیا ہے بعینہٖ انھی الفاظ میں سورۂ اعراف میں بھی کرایا گیا ہے۔

'جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى' سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ ان کی ہمدردی محض نفظی نہیں بلکہ عملی تھی۔ اپنے خس خانوں میں بیٹھے بیٹھے تو بہت سے لوگ کسی متقصدِ حق اور مردِ حق کی تعریف و تحسین کر دیتے ہیں لیکن ایسے افراد، بالخصوص امرا و اغنیاء کے طبقہ میں بہت کم نکلتے ہیں جو عملاً اس حق کے لیے سرگرمی دکھائیں۔ لیکن اس مردِ حق کا حال اس سے مختلف تھا۔ ان کا مکان شہر کے ایک بعید کنارے پر تھا، جیسا کہ لفظ 'اقصیٰ' سے واضح ہوتا ہے، لیکن جب کبھی انھوں نے یہ محسوس فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ کو کوئی خطرہ درپیش ہے تو وہ بھاگ کر، جیسا کہ لفظ 'یسعیٰ' سے واضح ہوتا ہے، وہاں پہنچے ہیں اور اپنے تمام خاندانی

مفادات بلکہ اپنی جان تک خطرے میں ڈال کر ان کے لیے سپر بن گئے ہیں۔ اسی طرح کے ایک موقع کا حوالہ قرآن نے یہاں دیا ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہ وہی موقع ہے جب انھوں نے فرعون کے سامنے وہ تقریر فرمائی ہے جو پیچھے ہم نقل کر آئے ہیں۔ آگے کی آیات سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

مردِ مومن کی تقریر کا اجمالی حوالہ

'قَالَ یٰقَوۡمِ اتَّبِعُوا الۡمُرۡسَلِیۡنَ' یہ اس تقریر کا اجمالی حوالہ ہے جو انھوں نے فرعون اور اس کے اعیان کے سامنے کی ہے۔ 'اِتَّبِعُوا الۡمُرۡسَلِیۡنَ' میں 'مُرۡسَلِیۡنَ' سے ان کا اشارہ زمرۂ مرسلین کی طرف ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اپنے کو بھی اصطلاحی مفہوم میں ایک رسول سمجھتے رہے ہوں۔ ان کے اس ارشاد میں اصلی زور اس بات پر ہے کہ قوم کے لوگوں کو فرعون، ہامان، قارون اور اس قسم کے مفسد لیڈروں کے پیچھے چلنے کے بجائے ان لوگوں کے پیچھے چلنا چاہیے جن کو خدا نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے بھیجا ہے یا جو لوگ ان کا ساتھ دے رہے اور ان کی پیروی کر رہے ہیں۔

رسولوں کے حق میں دو واضح دلیلیں

'اتَّبِعُوۡا مَنۡ لَّا یَسۡـَٔلُکُمۡ الآیۃ' یہ رسولوں کی پیروی کے حق میں دو دلیلیں ہیں۔ ایک یہ کہ ان رسولوں کا اس دعوت کے ساتھ کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے بلکہ وہ ہر غرض سے بالاتر ہو کر محض خلق کی ہدایت کے لیے یہ سارے دکھ جھیل رہے ہیں۔ برعکس اس کے دوسرے لیڈر جو اس دعوتِ حق کی مخالفت کر رہے ہیں وہ محض اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔

دوسری دلیل انھوں نے یہ دی کہ 'وَّہُمۡ مُّہۡتَدُوۡنَ'۔ یہ رسول بے غرض ہونے کے ساتھ ساتھ ہدایت پر بھی ہیں۔ اس دلیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ بے غرضی ایک شخص کی نیک نیتی کی شہادت تو ضرور ہے لیکن مجرد نیک نیتی اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ حق پر بھی ہے۔ اس وجہ سے کسی شخص کی نیک نیتی اور بے غرضی کے ساتھ ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس کی بات عقل و منطق کے معیار پر بھی پوری اترتی ہے یا نہیں۔ اگر وہ بے غرض بھی ہے اور اس کی دعوت عقل و منطق کی رُو سے بھی صحیح ہے تو اس کی پیروی نہ کرنا بدبختی ہے۔

وَمَا لِیَ لَاۤ اَعۡبُدُ الَّذِیۡ فَطَرَنِیۡ وَاِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۲﴾ ءَاَتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِہَۃً اِنۡ یُّرِدۡنِ الرَّحۡمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغۡنِ عَنِّیۡ شَفَاعَتُہُمۡ شَیۡئًا وَّ لَا یُنۡقِذُوۡنِ ﴿۲۳﴾ اِنِّیۡۤ اِذًا لَّفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۲۴﴾ اِنِّیۡۤ اٰمَنۡتُ بِرَبِّکُمۡ فَاسۡمَعُوۡنِ ﴿۲۵﴾ (۲۲ - ۲۵)

قوم کے لیڈروں کی ملامت کا جواب

اندازِ کلام دلیل ہے کہ یہ بات انھوں نے قوم کے لیڈروں کی ملامت کے جواب میں فرمائی ہے۔ جب انھوں نے کھلم کھلا لوگوں کو رسولوں کی پیروی کی دعوت دی ہو گی تو ظاہر ہے کہ مفاد پرست لیڈروں نے ان کو قوم اور دینِ آبائی کا دشمن ٹھہرایا ہو گا۔ ان کے جواب میں انھوں نے فرمایا کہ آخر اس کی بندگی میں کیوں نہ کروں جس نے مجھے وجود بخشا اور جس کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے۔ 'وَاِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ' میں خطاب کا صیغہ تنبیہ کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج جس رب کی بندگی سے تم لوگ اس شدّ و مد کے ساتھ مجھے روک

رب ہے جو ایک دن پیشی سب کی اسی کے حضور میں ہونی ہے اور تمھیں اس کے آگے جواب دہی کرنی ہے۔

ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً الآیۃ: یعنی یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں تمھارے کہنے سے ایسی چیزوں کو معبود بناؤں جن کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ اگر خدا مجھے کوئی دکھ پہنچانا چاہے تو نہ ان کی سفارش میرے لیے کچھ نافع ہو سکتی ہے اور نہ وہ بذاتِ خود ہی یہ حیثیت رکھتے کہ مجھے اس دکھ سے نجات دے سکیں!

اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: یعنی اگر میں ایسا کروں تو یہ ایسی کھلی ہوئی گمراہی ہوگی جس کے لیے میرے پاس کوئی عذر نہ ہوگا۔

اِنِّيْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ: یہ قوم کو فیصلہ کن اور دندان شکن جواب ہے کہ تم لوگ اچھی طرح کان کھول کر میری یہ بات سن لو کہ میں تمھارے رب پر ایمان لایا۔ مطلب یہ ہے کہ اب مجھے اس راہ سے ہٹانے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع کرنے کے بجائے بہتر ہے کہ تم خود بھی یہی راہ اختیار کرو جو میں نے اختیار کی ہے اور اسی رب پر ایمان لاؤ جس پر میں ایمان لایا ہوں اس لیے کہ فی الحقیقت وہی تمھارا بھی رب ہے۔ اگر تم اس سے مجھے برگشتہ کرنے کی کوشش کروگے تو اپنے رب ہی سے برگشتہ کرنے کی کوشش کروگے۔

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۭ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۙ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ (۲۶ - ۲۷)

دشمنوں کے شر سے حفاظت کی بشارت

مذکورہ اعلان کے بعد ظاہر ہے کہ ان کی پوری قوم ان کی دشمن بن کر ان کے خلاف سازشوں میں لگ گئی ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو سازشوں کے شر سے محفوظ رکھا اور حمایتِ حق کی راہ میں انھوں نے یہ بازی جو کھیلی اس کے صلہ میں ان کو جنت کی بشارت دی گئی جس پر انھوں نے اس تمنّا کا اظہار فرمایا کہ کاش میری قوم بھی اس بات کی قدر و قیمت جانتی جس کے صلہ میں مجھے یہ مغفرت اور سرفرازی حاصل ہوئی۔

یہاں اس بات کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ یہ بشارت ان کو کس موقع پر دی گئی ہے۔

کلام کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے تین امکان سامنے آتے ہیں۔

ایک یہ کہ ان کے اس اعلان کے بعد قوم کے اشرار نے ان کو شہید کر دیا اور اس وقت ان کو یہ بشارت دی گئی ہو۔

دوسرا یہ کہ اس کے بعد انھوں نے قوم کے رویہ سے مایوس ہو کر ہجرت فرمائی ہو اور اس وقت ان کو یہ بشارت ملی ہو۔

تیسرا یہ کہ اس کے بعد چونکہ ان کا مشن پورا ہو چکا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس بشارت کے ساتھ ان کو وفات دی ہو۔

ان میں سے پہلا امکان کلام کے سیاق و سباق کی روشنی میں اگرچہ زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے لیکن سورۂ مومن کے حوالے سے اوپر ہم نے ان کی جو تقریر نقل کی ہے اس کے آخر میں یہ تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے ان کو قوم کی سازشوں کے شر سے محفوظ رکھا۔ ان کے وداعی کلمات کے بعد ان کی حفاظت کا ذکر یوں ہوا ہے:

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ۭ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ○ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْۗءُ الْعَذَابِ ○

(المؤمن: ۴۴ - ۴۵)

(اے میری قوم کے لوگو!) میں جو کچھ تم سے کہہ رہا ہوں اس کو تم عنقریب یاد کرو گے۔ میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات کو دیکھنے والا ہے۔ پس اللہ نے اس کو ان سازشوں کی آفات سے محفوظ رکھا جو لوگوں نے اس کے خلاف کیں اور آلِ فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔

اس آیت کی روشنی میں یہ امکان تو خارج از بحث ہو جاتا ہے کہ ان کو قتل کیا گیا ہو البتہ مذکورہ بالا دو امکان باقی رہ جاتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دو میں سے کون سی صورت پیش آئی۔ اس کا صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ بس اتنی بات یقینی ہے کہ حق کی حمایت میں جو جاں بازی انھوں نے دکھائی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا انعام ان کو یہ ملا کہ اسی دنیا میں 'مبشر بالجنۃ' قرار پائے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰي قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ○ اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ (۲۸ - ۲۹)

'مِنْۢ بَعْدِهٖ' میں مذکورہ بالا دو باتوں کا امکان ہے۔ ان کی موت کے بعد یا ان کی ہجرت کے بعد۔

رسولوں کے مکذبین کے لیے سنتِ الٰہی

یہ اس سنتِ الٰہی کا حوالہ ہے جس سے مکذبین کو لازماً سابقہ پیش آتا ہے جب کہ رسول اور اس کے ساتھی قوم کو چھوڑ کر ہجرت کر جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اس کے بعد ہمیں اس کی قوم کو پامال کرنے کے لیے آسمان سے کوئی فوج نہیں اتارنی پڑی بلکہ ہماری ایک ہی ڈانٹ میں وہ پامال ہو کے رہ گئے۔ لفظ 'صیحۃ' عذاب کی تعبیر ہے۔ 'وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ' سے مقصود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کے لیے آسمان سے کوئی فوج نہ اتارنے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کے کاموں کے لیے ہم اپنی فوجیں نہیں اتارا کرتے، بس ہماری ایک ڈانٹ ہی کافی ہو جاتی ہے۔

یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہے کہ ہرچند یہ عذاب اصلاً حضرت موسیٰؑ و حضرت ہارونؑ کی تکذیب کے نتیجہ میں آیا لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کو اس بندۂ مومن کی تکذیب کے نتیجہ کی حیثیت سے ذکر فرمایا ہے۔ اس سے رسول کے ساتھیوں کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ان کا یہ درجہ ہوتا ہے کہ ان کی تکذیب رسول کی تکذیب کے ہم معنی بن جاتی ہے اور اس کا وہی انجام ہوتا ہے جو رسول کی تکذیب کا ہوتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ حضرت موسیٰؑ کے مکذبین ——— فرعون اور اس کی قوم ——— پر جو عذاب آیا اس کی شکل تو یہ ہوئی کہ فرعون اپنی تمام فوج سمیت دریا میں غرق کر دیا گیا لیکن یہاں جس عذاب کا ذکر ہے اس میں غرق کے واقعہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے بلکہ الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر بھی کوئی اسی طرح کا عذاب آیا جس طرح کا عذاب عاد و ثمود اور دوسری پچھلی قوموں پر آیا جس کا اندیشہ اس مردِ مومن نے اپنی اس تقریر میں ظاہر کیا تھا جو سورۂ مومن کے حوالے سے اوپر نقل ہوئی ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ فرعون اور اس کی قوم پر دونوں قسم کے عذاب آئے ——— ایک طرف، تو اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی فوجوں کو ایک سائیکلونی طوفان کے ذریعے سے سمندر میں غرق کر دیا، دوسری طرف، رعد و برق اور زلزلہ کے عذاب نے مصر کی تمام تعمیرات اور اس کے سارے باغ و چمن تاراج کر دیے۔ اس دوسرے عذاب کا ذکر تورات میں نہیں ہے لیکن قرآن میں اس کا ذکر نہایت واضح الفاظ میں ہے ——— مثلاً فرمایا ہے:

وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ	اور ہم نے تاراج کر دیے وہ سب کچھ جو فرعون اور
فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا	اس کی قوم کے لوگ بناتے رہے تھے اور ان کے انگور
يَعْرِشُونَ (الاعراف: ۷: ۱۳۷)	کے وہ باغ بھی جن کو وہ ٹٹیوں پر چڑھاتے تھے۔

یہی بات سنتِ الٰہی کے مطابق بھی ہے۔ رسول کی تکذیب کے نتیجہ میں جو عذاب کسی قوم پر آیا ہے اس نے قوم کے قومی وجود کی جڑ کاٹ دی ہے۔ یہ بات مجرد فرعون اور اس کی فوجوں کے غرق ہونے سے نہیں پوری ہو سکتی تھی۔ یہ اسی طرح کے کسی عذاب سے پوری ہو سکتی تھی جس کی طرف سورۂ اعراف کی مذکورہ بالا آیت اشارہ کر رہی ہے۔ اسی کا ذکر یہاں آیت زیرِ بحث میں ہے۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ ۚ مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (۳۰)

مکذبینِ رسول کی بدبختی پر اظہارِ افسوس

یہ مکذبینِ رسول کی بدبختی پر اظہارِ افسوس ہے کہ ہمیشہ سے لوگوں کا حال یہی رہا ہے کہ جب اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے کوئی رسول بھیجا تو لوگوں نے ان کا مذاق اڑایا ہے اور پھر اس کے انجام بد سے دوچار ہوئے ہیں۔ چنانچہ جو روش فرعون اور اس کی قوم نے اپنے رسولوں کے ساتھ اختیار کی آج وہی روش قریش نے اپنے رسول اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ اختیار کی ہے اور لازماً یہ بھی اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے ان کے پیشرو دوچار ہوئے۔ رسول، خدا کی سب سے بڑی رحمت بن کر آتا ہے لیکن اس کو مذاق بنے تو پھر اس سے بڑی نقمت بھی کوئی نہیں ہے۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ وَإِن كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ مُّحْضَرُونَ (۳۱-۳۲)

یہ قریش کو رسولوں کے ساتھ استہزا کا انجام دکھانے کے لیے ماضی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کھیل جو وہ کھیل رہے ہیں یہ ایک نہایت خطرناک کھیل ہے۔ یہ کھیل کھیلنے والی قومیں اس دنیا سے اس طرح مٹی ہیں کہ اب وہ کبھی واپس آنے والی نہیں ہیں۔ بلکہ اب ان سب کی حاضری ہمارے ہی سامنے ہونی ہے اور ہم ہی ان کا حساب کریں گے۔

'لَمَّا' کا خاص استعمال

وَإِنْ كُلٌّ لَّمَّا' میں 'لَمَّا' اسی طرح کا ہے جس طرح سورۂ طارق میں ہے 'إِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ' (بے شک ہر جان پر ایک نگران مامور ہے)۔ یہ 'إِنْ' مخففہ ہے اور 'ل' اس کا قرینہ ہے چونکہ جملہ میں کچھ صوتی خلا رہ جاتا ہے اس وجہ سے اس کو بھرنے کے لیے اس کو 'لَمَّا' کر دیتے ہیں۔ معنی پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔

۴۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۳۳-۵۰

آگے آفاق کی نشانیوں سے رسول کی دعوت اور اس کے انذار کی تائید کی ہے اور ان لوگوں کو تنبیہ فرمائی ہے جو کائنات کی ان تمام نشانیوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے کسی نئی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ گویا اوپر کی تاریخی شہادت کے بعد کلام از سر نو تمہید سے متصل ہو گیا ہے جس میں یہ بات فرمائی گئی تھی کہ ان کی اصلی بیماری یہ ہے کہ استکبار ان کو اوپر یا نیچے کی کسی نشانی کی طرف متوجہ نہیں ہونے دے رہا ہے ورنہ ان کے آگے اور پیچھے نشانیوں کی کمی نہیں ہے۔ ان کے اس رویہ اور اس کے انجام کی مثال قوم فرعون سے دینے کے بعد پھر ان کو آسمان و زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۳۳-۵۰

وَآيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ ۖ أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُونَ ﴿٣٣﴾ وَجَعَلْنَا فِيهَا جَنَّاتٍ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ وَفَجَّرْنَا فِيهَا مِنَ الْعُيُونِ ﴿٣٤﴾ لِيَأْكُلُوا مِن ثَمَرِهِ وَمَا عَمِلَتْهُ أَيْدِيهِمْ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ ﴿٣٥﴾ سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٦﴾ وَآيَةٌ لَّهُمُ اللَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَإِذَا هُم مُّظْلِمُونَ ﴿٣٧﴾ وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿٣٨﴾ وَالْقَمَرَ

قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ﴿٣٩﴾ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ
لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ
يَّسْبَحُوْنَ ﴿٤٠﴾ وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ
الْمَشْحُوْنِ ﴿٤١﴾ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَاِنْ نَّشَاْ
نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ ﴿٤٣﴾ اِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا
وَمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿٤٤﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّقُوْا مَا بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ
وَمَا خَلْفَكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿٤٥﴾ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ
رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٦﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا
رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاۗءُ
اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ڰ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٤٧﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا
الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٤٨﴾ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً
تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ﴿٤٩﴾ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى
اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿٥٠﴾

ترجمہ آیات ۳۳-۵۰

اور ایک بہت بڑی نشانی ان کے لیے مردہ زمین ہے۔ اس کو ہم نے زندہ کیا اور
اس سے غلے اُگائے پس اس میں سے وہ کھاتے ہیں۔ اور اس میں ہم نے کھجوروں اور
انگوروں کے باغ لگائے اور اس میں چشمے جاری کر دیے کہ وہ اس کے پھل کھائیں، اور
یہ ان کے ہاتھوں کی کارگزاری نہیں ہے تو کیا وہ شکر نہیں کرتے! ۳۳-۳۵

پاک ہے وہ ذات جس نے تمام قسمیں پیدا کیں ان چیزوں میں سے بھی جن کو زمین اگاتی

ہے اور خود ان کے اندر سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو وہ نہیں جانتے ۔ ۳۶

اور ان کے لیے ایک بہت بڑی نشانی رات ہے ۔ ہم اس سے دن کو کھینچ لیتے ہیں پس وہ دفعتًہ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں اور سورج اپنے ایک معین مدار پر گردش کرتا ہے ۔ یہ خدائے عزیز و علیم کی منصوبہ بندی ہے ! اور چاند کے لیے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی ہیں یہاں تک کہ وہ کھجور کی پرانی ٹہنی کے مانند ہو کے رہ جاتا ہے ۔ نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت کر سکتی ۔ ہر ایک اپنے خاص دائرے میں گردش کرتا ہے ۔ ۳۷ - ۴۰

اور ان کے لیے ایک بہت بڑی نشانی یہ ہے کہ ہم نے ان کی نسل کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور ان کے لیے اسی کے مانند (خشکی میں بھی) چیزیں پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں ۔ اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں پھر نہ ان کا کوئی فریادرس ہوگا اور نہ ان کو نجات مل سکے گی ۔ بس یہ ہماری رحمت اور ایک وقتِ معین تک ان کو بہرہ مند کرنا ہے ۔ ۴۱ - ۴۴

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز سے ڈرو جو تمہارے آگے اور پیچھے ہے کہ تم پر رحم کیا جائے (تو وہ اعراض کرتے ہیں) اور ان کے رب کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے پاس آتی ہے وہ اس سے اعراض ہی کرنے والے بنے رہتے ہیں ۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ تم کو رزق بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو تو جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ کیا ہم ان لوگوں کو کھلائیں جن کو خدا چاہتا تو کھلاتا ! یہ تو تم لوگ ایک صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہو ! ۴۵ - ۴۷

اور وہ پوچھتے ہیں کہ یہ دھمکی کب پوری ہوگی اگر تم لوگ سچے ہو! یہ لوگ بس ایک ڈانٹ ہی کے منتظر ہیں جو ان کو آپکڑے گی اور وہ جھگڑتے ہی رہ جائیں گے! پس نہ تو وہ کوئی وصیت کر پائیں گے اور نہ اپنے لوگوں کے پاس لوٹ ہی سکیں گے۔

---

۴۸ - ۵۰

۵ - الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَۃُ ۚ اَحْیَیْنٰھَا وَاَخْرَجْنَا مِنْھَا حَبًّا فَمِنْہُ یَاْکُلُوْنَ ہ وَجَعَلْنَا فِیْھَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِیْھَا مِنَ الْعُیُوْنِ ہ لِیَاْکُلُوْا مِنْ ثَمَرِہٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْہُ اَیْدِیْھِمْ ۭ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ (۳۳-۳۵)

دلیلِ ربوبیت سے خدا کی شکرگزاری اور اس کی عبادت کا مطالبہ

یہ سب سے پہلے زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ مردہ زمین کی از سر نو زندگی سے قیامت، توحید اور آسمانی ہدایت کے نزول پر جن گوناگوں پہلوؤں سے استشہاد کیا ہے اس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے۔ یہاں ربوبیت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے اور پھر خدا کی شکرگزاری کے حق کا مطالبہ کیا ہے جو بندوں پر لازماً عائد ہوتا ہے۔ اس شکر کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندے تنہا اپنے رب ہی کی بندگی کریں اس لیے کہ ان نعمتوں میں سے کوئی نعمت بھی نہ تو انسان کی اپنی سعی و تدبیر سے وجود میں آئی ہے اور نہ کوئی دوسرا ان کو وجود میں لانے والا بنا ہے۔

'وَاٰیَۃٌ لَّھُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَۃُ' لفظ 'اٰیَۃٌ' کی تنکیر تفخیم شان پر دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو اگر کسی نشانی کی طلب ہے تو اس کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے لیے ایک سب سے بڑی نشانی ان کے پاؤں کے نیچے بچھی ہوئی یہ زمین ہی ہے۔ یہ بالکل مردہ ہوتی ہے، ہم اپنی بارش بھیج کر اس کو زندہ کرتے اور پھر اس سے غلے پیدا کرتے ہیں اور ان غلوں ہی پر ان کی معاش کا انحصار ہے۔ پھر یہ غور کریں تو ان کو معلوم ہوگا کہ ہم نے ان کی معاش کے لیے صرف غلے ہی کا انتظام نہیں کیا ہے بلکہ ہم نے اس میں ان کے لیے کھجوروں اور انگوروں اور دوسرے پھلوں کے باغ بھی اگائے ہیں اور ان باغوں کو شاداب رکھنے کے لیے چشمے بھی جاری کر دیے ہیں۔

'لِیَاْکُلُوْا مِنْ ثَمَرِہٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْہُ اَیْدِیْھِمْ ۭ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ' یہ اس تمام اہتمام ربوبیت کا حق بیان فرمایا ہے کہ یہ سارا اہتمام ہم نے اس لیے کیا کہ بندے ہماری نعمتوں سے بہرہ مند ہوں اور اس امر پر دھیان کریں کہ یہ ان کے ہاتھوں کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ ایک رب رحیم و کریم و منعم کی بخشش ہے

جس نے ان کو بغیر کسی استحقاق کے ان نعمتوں سے بہرہ مند کیا ہے کہ وہ اس کے شکرگزار و فرمانبردار بنیں۔ لیکن ان کی ناسپاسی کا یہ حال ہے کہ یہ تمام نعمتوں سے فائدہ تو اٹھا رہے ہیں لیکن جب ان کو خدا کی شکرگزاری کی دعوت دی جاتی ہے تو اکڑتے اور نشانیوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔

زبان کا ایک نامعلوم اسلوب

'مِنْ ثَمَرِہٖ' کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں اہلِ تاویل کا اختلاف ہے۔ اکثر لوگوں نے اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کو مانا ہے۔ (یعنی لوگ اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے پھل کھائیں اور اس کے شکرگزار رہیں) اس تاویل میں مجھے تکلف محسوس ہوتا ہے۔ اوپر سے اسلوب کلام متکلم کا چلا آرہا ہے اس وجہ سے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے یہاں 'مِنْ ثَمَرِہٖ' کے بجائے 'مِنْ ثَمَارِنَا' یا اس کے ہم مطلب کوئی اور اسلوب ہوتا اگرچہ یہ بھی کچھ موزوں نہ ہوتا۔ میرے نزدیک اس ضمیر کا مرجع 'ارض' ہی ہے جس کا ذکر اوپر سے چلا آرہا ہے لیکن اس کے لیے یہاں ضمیر مذکر اس اسلوب پر آئی ہے جس کو اہلِ ادب 'علی سبیل التاویل' سے تعبیر کرتے ہیں۔ عربی زبان میں یہ قاعدہ ہے کہ بعض مرتبہ ضمیر لفظ کے ظاہر کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس کے مفہوم کے اعتبار سے آتی ہے۔ اس کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ یہاں 'ارض' کے لیے مذکر ضمیر استعمال کر کے یہ اشارہ فرما دیا کہ اس سے 'بلد طیب' مراد ہے۔ اس لیے کہ بارش ہونے کو تو ہر خشک و تر اور ہر بنجر اور زرخیز زمین پر ہوتی ہے لیکن بارآور وہی زمین ہوتی ہے جو زرخیز ہوتی ہے۔ یہ مضمون سورۂ اعراف میں اس طرح بیان ہوا ہے۔ 'وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذْنِ رَبِّہٖ ۚ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا' (اعراف: ۵۸) (اور جو زمین زرخیز ہوتی ہے اس کی نباتات تو اس کے رب کے حکم سے خوب اگتی ہیں اور جو زمین ناقص ہوتی ہے اس سے ناقص ہی چیز اگتی ہے)۔

'وَمَا عَمِلَتْہُ اَیْدِیْھِمْ ؕ' یہ جملہ معترضہ کے محل میں ہے اور یہ ایک نہایت اہم یاددہانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان پھلوں کو کھائیں اور یہ یاد رکھیں کہ ان کو وجود میں لانے والے وہ نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی حقیقت کا تذکر ہی آدمی کے اندر شکر کا جذبہ ابھارتا ہے اور یہی شکر تمام دین کی بنیاد ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں وہ اللہ کی نعمتوں کو اپنے استحقاق اور اپنی قابلیت و صلاحیت کا کرشمہ سمجھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خدا کے شکرگزار بندے بننے کے بجائے استکبار میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ استکبار اپنی فطرت کے اعتبار سے شرک اور تمام فساد فی الارض کا پیش خیمہ ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّھَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِھِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۶)

توحید پر استدلال

لفظ 'ازواج' انواع و اقسام کے معنی میں بھی آتا ہے اور جوڑے جوڑے کے مفہوم میں بھی۔ یہاں یہ دونوں ہی معنوں کا جامع ہے۔ زمین سے جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں ان کو دیکھیے تو ان کے اندر گوناگونی اور تنوع بھی ہے اور ہر چیز جوڑے جوڑے کی شکل میں بھی نظر آتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کو دیکھیے تو ان کی شکلوں، رنگوں، قامتوں اور زبانوں میں عظیم فرق نظر آئے گا اور ساتھ ہی ان کے اندر جوڑے جوڑے

ہونے کا وصف بھی پایا جاتا ہے۔ یہی حال اس عالم کے اس حصہ کا ہے جو ہمارے علم کی رسائی سے باہر ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھ کر غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی آپ پر واضح ہوگی کہ اس کے تنوع کے اندر مقصد کی ہم آہنگی اور اس کے تضاد کے اندر توافق کی سازگاری پائی جاتی ہے۔ یہ چیز اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کائنات پر ایک ہی خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا ارادہ کارفرما ہے۔ کوئی دوسرا اس میں دخیل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہے اور اس کی اس پاکی کی شہادت اس کائنات کی ہر چیز دے رہی ہے۔

آخرت کی دلیل

نیز یہ بات بھی واضح ہوئی کہ جب ہر چیز جوڑا جوڑا ہے اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے تو لازم ہے اس دنیا کا بھی کوئی جوڑا ہو ورنہ یہ بالکل بے مقصد و بے غایت ہو کے رہ جاتی ہے اور یہ بات ایک حکیم خالق کی شان سے بعید ہے کہ وہ کوئی عبث اور بے مقصد کام کرے۔ چنانچہ اس دنیا کے اس خلا کو بھرنے کے لیے اس نے آخرت بنائی ہے۔

آیت کا مدعا یہ ہوا کہ یہ کائنات اپنے وجود سے توحید اور آخرت کی شہادت دے رہی ہے اور اس کا خالق اس بات سے پاک ہے کہ اس کا کوئی شریک ہو یا اس نے یہ دنیا بالکل بے مقصد بنائی ہو۔ لفظ سُبْحٰنَ تنزیہہ کے لیے آتا ہے۔ یہاں اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ (۳۷)

شب اور روز کی نشانی

فرمایا کہ اگر یہ لوگ غور کریں تو ان کے لیے رات بھی خدا کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور توحید کی ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ ہم اس کے اوپر ایک نور کی چادر اوڑھا دیتے ہیں تو ان کے لیے روشن دن نمودار ہو جاتا ہے جس میں وہ اپنے کام کاج انجام دیتے ہیں۔ پھر ہم اپنی یہ نورانی چادر اس سے کھینچ لیتے ہیں تو وہ تاریکی میں ہو جاتے ہیں جس میں وہ آرام کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنی یہ نورانی چادر نہ اوڑھائیں تو ہمیشہ تاریکی ہی میں رہیں اور اگر اس چادر کو نہ کھینچیں تو ان کو کبھی شب کا سکون نہ میسر ہو۔ روز و شب کا یہ ایاب و ذہاب اور خلق کے مفاد کے لیے ان کی یہ سازگاری اس بات کی صاف دلیل ہے کہ یہ دنیا اضداد کی کوئی رزم گاہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک خالق کی بنائی ہوئی دنیا ہے جو اس کے تمام اضداد کو اس کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (۳۸)

سورج کی نشانی

یہ دن کے اندر ظاہر ہونے والی سب سے بڑی نشانی کی طرف توجہ دلائی کہ اس سورج کو دیکھیں کہ یہ پوری پابندی کے ساتھ اپنے ایک معین محور و مدار پر گردش کرتا ہے۔ مجال نہیں کہ اپنے محور و مدار سے ذرا ہٹ سکے یا اس کی پابندیٔ اوقات میں منٹ یا سیکنڈ کا بھی فرق پیدا ہو سکے۔ کیا یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے آپ سے آپ ہو رہا ہے، اس کے پیچھے کوئی مدبر

اور کارفرما طاقت نہیں ہے؟ یا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے ایک قاہر، مقتدر اور علیم و حکیم ہستی ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی باگ ہے اور وہ اپنے بنائے ہوئے نقشہ اور اپنے قرار دادہ منصوبہ کے مطابق ہر چیز کو استعمال کر رہی ہے؟ اس کا صحیح جواب، عقل و فطرت کے مطابق، صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ یعنی یہ دنیا نہ تو اتفاق سے وجود میں آئی ہوئی کوئی چیز ہے اور نہ یہ آپ سے آپ چل رہی ہے بلکہ یہ ایک ایسی ہستی کی پلاننگ کا کرشمہ ہے جو ہر چیز پر قادر و غالب اور ہر چیز کا علم رکھنے والی ہے۔

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُونِ الْقَدِيمِ (۳۹)

چاند کی نشانی

فرمایا کہ یہی حال اس دنیا کی دوسری سب سے بڑی نشانی ——— چاند ——— کا ہے۔ وہ بھی نہ خود کار ہے، نہ خود مختار بلکہ ہم نے اس کے لیے منزلیں ٹھہرا رکھی ہیں جو ہر ماہ اس کو طے کرنی پڑتی ہیں یہاں تک کہ یہ منزلیں طے کرتے کرتے وہ بالآخر کھجور کی پرانی ٹہنی کے مانند ہو کے رہ جاتا ہے۔

عُرْجُوْنٌ، کھجور کی اس ٹہنی کو کہتے ہیں جس میں خوشے لگتے ہیں۔ یہ ٹہنیاں خشک ہونے کے بعد خمدار ہو کر بالکل وہ شکل اختیار کر لیتی ہیں جو شکل آخری اور ابتدائی تاریخوں میں چاند کی ہوتی ہے۔ یہ تشبیہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ جس چاند کو نادان لوگ پوجتے ہیں اس غریب کی بے بسی کا یہ حال ہے کہ ہر ماہ اس کو مختلف منازلِ فلکی طے کرنی پڑتی ہیں جس سے وہ سوکھ کے کانٹا اور اس طرح خمیدہ کمر ہو کے رہ جاتا ہے جس طرح کھجور کی سوکھی ٹہنی۔

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۴۰)

ساری کائنات ایک ہی خدا کے ہاتھ میں ہے

یعنی اس کائنات کا سارا نظام اس کے خالق نے اس طرح اپنے قابو میں کر رکھا ہے کہ نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ اپنے مدار سے نکل کر چاند کے مدار میں جا گھسے اور اس کو پکڑ لے اور نہ رات کی مجال ہے کہ ایک سیکنڈ کے لیے بھی دن پر سبقت کر جائے بلکہ ان میں سے ہر ایک کو اپنے اپنے دائرے میں گردش کرنی پڑتی ہے ——— یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز کی باگ ایک ہی خدائے قدیر و علیم کے ہاتھ میں ہے اور وہی تنہا ہر چیز کا مالک و مختار ہے۔ اگر اس کے سوا کسی اور کا بھی اس میں کوئی دخل ہوتا تو یہ دنیا اپنے اضداد کے تصادم میں تباہ ہو جاتی۔ خاص طور پر یہ حقیقت تو بالکل نمایاں ہے کہ جو چیزیں جتنی ہی زیادہ نمایاں ہیں اور جن کے نمایاں ہونے ہی کی بنا پر قوموں نے ان کو معبود مان کر ان کی پرستش کی وہ اپنے وجود ہی سے یہ اعلان کر رہی ہیں کہ وہ سب سے زیادہ مسخر و محکوم ہیں، مجال نہیں ہے کہ وہ اپنے دائرۂ کار سے ایک انچ بھی اِدھر یا اُدھر سرک سکیں۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۙ وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا

یُرۡکَبُوۡنَ ۔ وَ اِنۡ نَّشَاۡ نُغۡرِقۡہُمۡ فَلَا صَرِیۡخَ لَہُمۡ وَلَا ہُمۡ یُنۡقَذُوۡنَ ۙ۔ اِلَّا رَحۡمَۃً مِّنَّا وَ مَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍ (۴۱-۴۴)

کشتی کا نشانی

'ذُرِّیَّتَہُمۡ' میں 'ھُمۡ' سے مراد مخاطب بحیثیت انسان ہیں اور 'ذُرِّیَّۃ' نسل کے مفہوم میں ہے۔ 'مَشۡحُوۡن' بھری ہوئی کشتی کو کہتے ہیں۔ فرمایا کہ اگر ان کو مزید نشانی کی طلب ہو تو وہ اس بات کو دیکھیں کہ ہم نے نسل انسانی کے بحری سفر کے لیے یہ اہتمام کیا ہے کہ ان کی کشتیاں سمندر کے سینہ پر سے ہزاروں ٹن سامان لے کر چلتی ہیں اور نہیں ڈوبتیں۔

خشکی کے سفینے

'وَخَلَقۡنَا لَہُمۡ الاٰیۃ' فرمایا کہ جس طرح سمندر کے سفر کے لیے ہم نے کشتی بنائی ہے اسی طرح کی چیزیں ہم نے خشکی کے سفر کے لیے بھی بنائی ہیں مثلاً گھوڑے اور اونٹ وغیرہ۔ خاص طور پر اونٹ کو عرب میں سفینۂ صحرا کی حیثیت حاصل تھی۔ اسی حکم میں وہ سواریاں بھی داخل ہیں جو اب سائنس کی مدد سے ایجاد ہوئی ہیں یعنی موٹریں، لاریاں، بسیں، ہوائی جہاز وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں جن قوانین کے تحت کام کرتی ہیں وہ خدا ہی کے بنائے اور اسی کے سکھائے ہوئے ہیں۔ انسان انہی قوانین سے کام لے کر مختلف چیزیں ایجاد کرتا اور ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف منسوب فرمایا اس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔

ہر چیز اللہ کے فضل کا کرشمہ ہے

'وَاِنۡ نَّشَاۡ نُغۡرِقۡہُمۡ فَلَا صَرِیۡخَ لَہُمۡ الاٰیۃ'۔ 'صَرِیۡخ' فریاد اور فریاد رسی کے معنی میں بھی آتا ہے اور فریاد کرنے اور فریاد رسی کرنے والے کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ تمام معانی کے اعتبار سے موزوں ہے۔ فرمایا کہ یہ ہماری رحمت ہے کہ ان کی لدی پھندی کشتیاں سمندر کے سینہ پر دوڑتی ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو ان کو کشتی سمیت غرق کر دیں پھر نہ وہ کوئی فریاد کر سکیں اور نہ کوئی ان کی فریاد رسی کر سکے اور نہ وہ اس ورطۂ ہلاکت سے کسی طرح نجات پا سکیں۔

'اِلَّا رَحۡمَۃً مِّنَّا وَمَتَاعًا اِلٰی حِیۡنٍ'۔ فرمایا کہ انسان کو یہ جو کچھ بھی حاصل ہے نہ اس کے اب وجد کی میراث ہے اور نہ اس کی اپنی قوت و قابلیت کا کرشمہ بلکہ یہ محض خدا کا فضل اور اس کی رحمت ہے جس سے ایک وقتِ خاص تک کے لیے اس نے اس کو بہرہ مند کیا ہے۔ بالآخر وہ وقت آنے والا ہے جب اللہ تعالیٰ ان تمام نعمتوں سے متعلق پرسش کرے گا کہ ان کا شکر اور حق ادا کیا گیا یا نہیں!

وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمُ اتَّقُوۡا مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡکُمۡ وَمَا خَلۡفَکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ (۴۵)

ناشکروں کو تنبیہ!

یعنی جب ان کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ تمہارے آگے اور پیچھے جو آسمان و زمین ہیں ان سے ڈرو کہ زمین تمہارے سمیت دھنسا نہ دی جائے اور آسمان سے تم پر ٹکڑے نہ گرا دیے جائیں تو وہ متنبہ ہونے کے بجائے اعراض کرتے اور عذاب کی نشانی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ 'اِذَا' کا جواب یہاں بر بنائے وضاحت قرینہ محذوف ہے اور 'مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡکُمۡ وَمَا خَلۡفَکُمۡ' کے بعد 'مِنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ' کے الفاظ محذوف ہیں۔ سورہ

سبا میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے۔ 'اَفَلَمْ يَرَوْا إِلٰى مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنْ نَّشَاْ نَخْسِفْ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ نُسْقِطْ عَلَيْهِمْ كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ' (۹) (کیا وہ اپنے آگے اور پیچھے کے آسمان اور زمین پر غور نہیں کرتے! اگر ہم چاہیں تو ان کے سمیت زمین کو دھنسا دیں یا ان کے اوپر آسمان سے ٹکڑے گرا دیں)۔

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ (۴۶)

یعنی یہ اعراض و انکار اس طرح ان پر مستولی ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو آیت بھی ان کی تعلیم و تذکیر کے لیے آتی ہے وہ بالکل بے سود ہو کے رہ گئی ہے، کوئی چیز بھی ان کے اوپر کارگر نہیں ہوتی۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ ڰ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۴۷)

ایک جاہلی فلسفہ

اوپر والی آیت میں ان کی جس بے حسی اور سنگدلی کی طرف اشارہ ہے یہ اس کی ایک مثال بیان ہوئی ہے کہ جب ان کو شکر کی دعوت دی جاتی ہے، جیسا کہ اوپر آیت ۳۵ میں ہے۔ 'لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ' تو بہ رعونت کے ساتھ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ چنانچہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو رزق و فضل تم کو بخشا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ان غریبوں کی مدد کرو جو مدد کے محتاج ہیں تو وہ مسلمانوں کو یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ تمھاری صریح گمراہی ہے کہ جن کو اللہ نے محروم رکھنا چاہا ہے ان کو تم کھلانا چاہتے ہو۔ اگر اللہ ان کو بھی ہماری طرح کھلانا پہنانا چاہتا تو آخر اس کے پاس کس چیز کی کمی تھی لیکن جب اس نے ایسا نہیں کیا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس نے ان کے لیے یہی چاہا ہے اور جب اس نے ان کے لیے یہی چاہا ہے تو ہم ان کے اوپر کوئی احسان کر کے خدا کو خوش نہیں کریں گے بلکہ اس کی ناراضگی مول لیں گے! ـــــ اس فلسفۂ جاہلی کا حوالہ دے کر اس پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس لیے کہ اس کی قساوت و سفاہت اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ مقصود بس یہ دکھانا ہے کہ جب دل بگڑتے ہیں اور عقل الٹتی ہے تو آدمی کا حال یہ ہو جاتا ہے!

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَاْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ ۝ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ (۴۸-۵۰)

یعنی اللہ کی جو آیتیں ان کو سنائی جاتی ہیں ان پر تو وہ کوئی دھیان نہیں کرتے، بس یہ مطالبہ ان کی طرف سے پیہم ہے کہ جس عذاب سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے وہ ان کو دکھا دیا جائے۔ اس کے بغیر وہ اس کی خبر دینے والوں کو سچا ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

'مَا يَنْظُرُوْنَ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً الاٰية'۔ لفظ 'صَيْحَةً' آیت ۲۹ میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ اس

طنطنہ کے ساتھ وہ اس عذاب کا جو مطالبہ کر رہے ہیں تو کس برتے پر کر رہے ہیں! خدا کو اس کے لیے کوئی سر و سامان نہیں کرنا ہے۔ اس کی تو بس ایک ڈانٹ ہی ان کے لیے کافی ہوگی۔ وہ ان بحثوں ہی میں پڑے ہوں گے کہ وہ ان کو دبوچ لے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ نہیں آ رہا ہے تو اس کے نہ آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کی تیاری نہیں ہو پائی ہے۔ اس کی تیاری میں کوئی کسر نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے سبب سے لوگوں کو مہلت دے رہا ہے۔

'فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً الآية' یعنی خدا کی وہ ایک ہی ڈانٹ ایسی ہوگی کہ جو جہاں ہے وہ وہیں دبوچ لیا جائے گا۔ اس کو اتنی فرصت بھی نصیب نہیں ہوگی کہ کسی کو کوئی وصیت کر سکے یا اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ سکے۔

۶۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۵۱-۶۸

آگے واضح فرمایا ہے کہ جس طرح اس دنیا میں کوئی عذاب لانے کے لیے ہماری ایک ہی ڈانٹ کافی ہے اسی طرح جب ہم قیامت لانی چاہیں گے تو اس کے لیے بھی ہمیں کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا ہوگا بلکہ ایک ہی نفخ صور میں سب اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اس کے بعد روزِ قیامت کی تصویر ہے کہ اہلِ ایمان اس دن اپنی دلچسپیوں میں مگن ہوں گے اور کفار اپنے نتائجِ اعمال سے دوچار ہوں گے۔ اس دن کسی کو زبان سے کچھ بولنے کی اجازت نہیں ہوگی بلکہ ہر شخص کے ہاتھ پاؤں خود اس کے خلاف گواہی دیں گے۔

پھر دھمکی دی ہے کہ یہ لوگ اس ڈھٹائی کے ساتھ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں تو یاد رکھیں کہ یہ ہمارے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ہم چاہیں تو ان کو ان کی جگہ ہی پر اس طرح مسخ کر دیں کہ یہ تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے چشم زدن میں بالکل محروم ہو کے رہ جائیں۔ اس کے آثار وہ اس دنیا میں دیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے پاس آنکھیں ہوں۔ اگر ہم نے ان کو مسخ نہیں کیا تو اس وجہ سے نہیں کہ یہ کام ہمارے لیے مشکل ہے بلکہ یہ ہماری رحمت ہے کہ ہم لوگوں کو ان کی سرکشی کے باوجود مہلت دیتے ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے:

آیات ۵۱-۶۸

وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَإِذَا هُم مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنسِلُونَ ﴿٥١﴾ قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا ۜ هَٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُونَ ﴿٥٢﴾ إِن كَانَتْ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُمْ

جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ ﴿٥٣﴾ فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا
تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٥٤﴾ اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ
شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ﴿٥٥﴾ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ
مُتَّكِـُٔوْنَ ﴿٥٦﴾ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ﴿٥٧﴾ سَلٰمٌ
قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ﴿٥٨﴾ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٥٩﴾
اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ
وقف غفران عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٦٠﴾ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٦١﴾
وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٢﴾
هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿٦٣﴾ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ
تَكْفُرُوْنَ ﴿٦٤﴾ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ
وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا
عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ ﴿٦٦﴾ وَلَوْ نَشَآءُ
لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ ﴿٦٧﴾ ع ٤ ٣
وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ ﴿٦٨﴾

ترجمۂ آیات ٥١-٦٨

اور صُور پھونکا جائے گا تو وہ دفعتہً قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے
وہ کہیں گے، ہائے ہماری بدبختی! ہم کو ہماری قبر سے کس نے اٹھا کھڑا کیا! —— یہ تو وہی
چیز ہے جس کا خدائے رحمان نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں کی بات سچی نکلی! بس وہ ایک ڈانٹ
ہوگی، بس وہ دفعتہً سب کے سب ہمارے حضور حاضر کردیے جائیں گے۔ ٥١-٥٣

پس آج کے دن کسی جان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ اور تم کو بس وہی بدلے میں ملے گا جو تم کرتے رہے ہو۔ بے شک اہلِ جنت آج اپنی دلچسپیوں میں مگن ہوں گے۔ وہ اور ان کی بیویاں، سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے بیٹھیں گے۔ اور اس میں ان کے لیے میوے ہوں گے اور ان کے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو وہ مانگیں گے۔ ان کو سلام کہلایا جائے گا پروردگارِ رحیم کی طرف سے! ۵۴-۵۸

اور اے مجرمو! آج الگ ہو جاؤ۔ اور اے آدم کے بیٹو! کیا میں نے تمھیں یہ ہدایت نہیں کر دی تھی کہ شیطان کی بندگی نہ کیجیو، بے شک وہ تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری ہی بندگی کیجیو۔ یہی سیدھی راہ ہے۔ اور اس نے تم میں سے ایک خلقِ کثیر کو گمراہ کر لیا، تو کیا تم سمجھتے نہیں تھے! یہ ہے وہ جہنم جس سے تم کو ڈرایا جاتا رہا ہے۔ اب اپنے کفر کی پاداش میں اس میں داخل ہو جاؤ۔ ۵۹-۶۴

آج ہم ان کے مونہوں پر مہر کر دیں گے اور ان کے ہاتھ ہم کو بتائیں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔ ۶۵

اور اگر ہم چاہتے تو ان کی آنکھیں مٹا دیتے پھر وہ راستہ کی طرف بڑھتے تو کس طرح دیکھ پاتے! اور اگر ہم چاہتے تو ان کی جگہ ہی پر ان کو مسخ کر دیتے تو نہ وہ آگے بڑھ سکتے اور نہ پیچھے لوٹ سکتے۔ اور جس کو ہم زیادہ عمر دیتے ہیں ہم اس کو اس کی خلقت میں پیچھے لوٹا دیتے ہیں تو کیا وہ سمجھتے نہیں؟ ۶۶-۶۸

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ (۵۱)

تاخیر عذاب کی حکمت

اوپر کی آیات ۴۸ - ۴۹ میں یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ رسول کی تکذیب کی صورت میں جس عذاب کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے اگر وہ ٹل رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے لیے کوئی خاص تیاری کرنی ہے جو ابھی نہیں ہو پائی ہے۔ وہ عذاب بھیجنا چاہے تو اس کے لیے بس اس کی ایک ہی ڈانٹ کافی ہے۔ اب یہ فرمایا کہ یہی حال قیامت کا بھی ہے۔ اس کے لانے کے لیے بھی خدا کو کوئی خاص اہتمام و انتظام نہیں کرنا پڑے گا، بلکہ جوں ہی صور پھونکا جائے گا لوگ بھاگتے ہوئے اپنے رب کی طرف چل پڑیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ رسول کو زچ کرنے کے لیے عذاب یا قیامت کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ ان کاموں میں سے کوئی کام بھی اللہ کے لیے ذرا مشکل نہیں ہے۔ یہ تو چشم زدن میں ہو جانے والے کام ہیں۔ اگر اس کے باوجود نہیں ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر توبہ اور اصلاح کر لیں۔

قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (۵۲)

مذاق اڑانے والوں کا حال قیام قیامت کے وقت

یعنی یہ مذاق اڑانے والے لوگ اس وقت گھبراہٹ اور سراسیمگی میں اپنے سر پیٹیں گے اور کہیں گے کہ کس نے ہم کو ہماری قبروں سے اٹھا کھڑا کیا! یہ سوال تحقیق کے لیے نہیں بلکہ اپنی بدبختی کے اظہار کے لیے وہ کریں گے کہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد اٹھنا نہیں ہو گا لیکن یہ تو واقعہ ثابت ہوا!

'هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ' یہ ان کے قول کا حصہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تو وہی بات ہوئی جس کی خدائے رحمان کی طرف سے ہم کو آگاہی دی گئی تھی، رسولوں کی بات بالکل سچی نکلی۔ اور اس کا بھی امکان ہے کہ یہ بات فرشتوں کی زبانی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وقت ان کی تذلیل کے لیے فرمائی جائے کہ اب اپنی بدبختی پر سر پیٹو، یہ وہی چیز تمھارے سامنے آئی ہے جس سے خدائے رحمان نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے تم کو آگاہ کر دیا تھا لیکن تم نے ان کی کوئی پروا نہیں کی۔ میرا رجحان اس دوسری بات کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے نظائر سے واضح تائید اسی کی نکلتی ہے۔ سورۂ صافات میں ہے۔

فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا	بس وہ ایک ڈانٹ ہی ہو گی کہ دفعتہً وہ
هُمْ یَنْظُرُوْنَ ۝ وَقَالُوْا یٰوَیْلَنَا هٰذَا	اٹھ کے تاکنے لگیں گے اور کہیں گے۔ ہائے ہماری
یَوْمُ الدِّیْنِ ۝ هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِیْ	بدبختی! یہ تو جزا و سزا کا دن آگیا ــــ یہ وہی فیصلہ
كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ (۱۹-۲۱)	کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے تھے۔

اس میں آخری فقرہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بالکل بروقت ان کی تفضیح کے لیے کہلایا جائے گا۔

اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَیْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ جَمِیْعٌ لَّدَیْنَا مُحْضَرُوْنَ (۵۳)

یہ سب کچھ بالکل چشم زدن میں، محض ہماری ایک ڈانٹ سے ہو جائے گا۔ اس کے لیے نہ ہمیں دمدمے

بنانے پڑیں گے، نہ توپیں نصب کرنی پڑیں گی۔ جس طرح ہم اپنے کلمۂ کُن سے جو چیز چاہیں وجود میں لا سکتے ہیں اسی طرح اپنی ایک ڈانٹ سے جو قیامت برپا کرنی چاہیں برپا کر سکتے ہیں۔ 'جمیع' تاکید کے لیے ہے مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ پھر کوئی ہم سے بچ کے نکل سکے گا۔ اس کے بعد ان کے سب، چھوٹے اور بڑے، امیر اور مامور، عابد اور معبود پکڑ کر ہمارے حضور حاضر کر دیے جائیں گے۔ 'مُحْضَرُوْنَ' ان کی ذلت کی تصویر کے لیے ہے کہ وہ اس طرح ہمارے سامنے حاضر کیے جائیں گے جس طرح مجرم عدالت کے سامنے حاضر کیے جاتے ہیں۔

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۵۴)

ہر ایک کے سامنے اس کا اپنا ہی عمل آئے گا

اس آیت میں تصویرِ حال کا اسلوب ہے۔ گویا وہ دن سامنے ہے اور مخاطب سے یہ بات کہی جا رہی ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔

فرمایا کہ آج عدلِ کامل کے ظہور کا دن ہے۔ آج کسی جان پر ذرہ برابر ظلم نہیں ہوگا۔ 'وَلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ' یہ اسی عدلِ کامل کا بیان ہے کہ آج جس اصول پر لوگوں کے ساتھ معاملہ ہوگا وہ یہ ہے کہ جس نے جو کچھ کیا ہوگا وہی وہ بدلے میں پائے گا۔ ظاہر ہے کہ جب اپنی ہی کمائی سامنے آنے والی ہے تو اس میں کسی ظلم و ناانصافی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِيْ شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ ۝ هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِــُٔوْنَ ۝ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ۝ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (۵۵-۵۸)

اہلِ جنت کی تصویر

اس دن اہلِ جنت کا جو حال ہوگا یہ اس کی تصویر ہے۔ فرمایا کہ اس دن اہلِ جنت اپنی خاص دلچسپی میں مگن ہوں گے۔ 'شُغُل' کی تنکیر تفخیمِ شان کے لیے ہے۔

'هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ الاٰية' یہ ان کی بیویوں کا ذکر آیا ہے کہ وہ بھی ان کی دلچسپیوں میں شریک ہوں گی۔ ان کا ذکر خاص اہتمام سے اس لیے ضروری ہوا کہ آدمی کی کوئی دلچسپی اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک اس کے اہل و عیال بھی اس میں شریک نہ ہوں۔ 'عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِــُٔوْنَ' یہ سب سے اعلیٰ نشست کی تصویر ہے۔ اس زمانے میں بادشاہ اور ملکہ مزین تختوں ہی پر ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے۔ اہلِ جنت اپنی ابدی بادشاہی میں اسی طرح بیٹھیں گے۔

'لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ الاٰية' اس میں ان کے آگے پھل پیش کیے جائیں گے اور مزید جو کچھ وہ طلب کریں گے 'مَا يَدَّعُوْنَ' یعنی 'مَا يَشْتَهُوْنَ' جو کچھ وہ چاہیں گے وہ سب ان کے لیے حاضر ہوگا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اس دنیا میں کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی نہ اب تک یہ درجہ حاصل ہو سکا ہے اور نہ آئندہ کبھی حاصل ہو سکے گا کہ وہ جو کچھ چاہے اس کے لیے وہ فوراً حاضر کر دیا جائے۔ لیکن اہلِ جنت کو جنت میں یہ درجہ حاصل ہوگا اور ہمیشہ حاصل ہوگا۔

سب سے بڑی سرفرازی

'سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ'۔ یہ اس سب سے بڑی سرفرازی کا ذکر ہے جو اہلِ جنت کو جنت میں حاصل ہوگی کہ ربِ رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہلایا جائے گا۔ میرے نزدیک جملہ کی تالیف یوں ہے۔ 'تَحِیَّتُهُمْ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ' مبتدا یہاں حذف کر دیا گیا ہے تاکہ مخاطب کی ساری توجہ خبر پر مرکوز ہو جائے۔ سورۂ احزاب میں ارشاد فرمایا ہے۔ 'تَحِیَّتُهُمْ یَوْمَ یَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ' (۴۴) (اور ان کا خیر مقدم جس دن وہ اس سے ملیں گے سلام سے ہوگا) احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے جنت کے تمام دروازوں سے داخل ہوں گے اور اہلِ جنت کو اللہ تعالیٰ کا سلام پہنچائیں گے ـــــ کون اندازہ کر سکتا ہے اہلِ جنت کی اس سرفرازی کا کہ ان کو ربِ رحیم و کریم کی طرف سے سلام و پیغام موصول ہوں گے!!

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست!

وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ ○ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ○ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِیْ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ○ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِیْرًا ۚ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ (۵۹-۶۲)

مجرموں کا حشر

اہلِ جنت کا حال بیان کرنے کے بعد اب یہ مجرموں کا حشر بیان ہو رہا ہے۔ ان کو حکم ہوگا کہ اے مجرمو! دنیا میں تو تم میرے باایمان بندوں کے ساتھ رلے ملے رہے اس لیے کہ دنیا دار الامتحان تھی لیکن اب جزائے اعمال کا دن آگیا۔ اس وجہ سے اب تم میرے باایمان بندوں سے الگ ہو جاؤ اور اپنے اعمال کی سزا بھگتو۔ اب تمہاری دنیا الگ اور ان کی دنیا الگ ہے۔

'اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَیْكُمْ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ الاٰیۃ'۔ 'عَهِدَ' کا صلہ جب 'اِلٰی' کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی ضامن اور ذمہ دار بنانے کے ہوتے ہیں۔ مثلاً 'وَعَهِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ' (البقرۃ: ۱۲۵) (اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل کو اس بات کا ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھنا) یہ مجرموں کو اس وقت بطور ملامت یاد دہانی کی جائے گی کہ آدم کے بیٹو! کیا میں نے تم کو اس عہد کا پابند نہیں کیا تھا کہ شیطان کی بندگی نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے بلکہ صرف میری ہی بندگی کرنا۔ یہ نہایت سیدھی راہ ہے جس پر چلنے والے مجھ تک پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن تم ایسے بدقسمت نکلے کہ اس نے تمہارے اندر سے ایک خلقِ کثیر کو گمراہ کر ڈالا، کیا تم اتنی عقل و تمیز نہیں رکھتے تھے کہ اپنے دوست اور دشمن میں امتیاز کر سکتے اور اس بات کو یاد رکھتے کہ اس نے اپنے فریب سے تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو جنت سے نکلوایا اور اولادِ آدم کے ساتھ اس کی دشمنی قیامت تک کے لیے ہے۔

شیطان کی دشمنی، شیطان کے چیلنج، اولادِ آدم کو اللہ تعالیٰ کی یاد دہانی اور اس سلسلہ کے دوسرے امور جن کی طرف یہاں اشارہ ہے پچھلی سورتوں، خاص طور پر بقرہ اور اعراف میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکے ہیں۔ ان اجمالات کو ان کی روشنی میں سمجھیے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ اِصْلَوْهَا الْیَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (۶۳-۶۴)

یعنی اگر تم نے میرے عہد اور میری تنبیہ کو یاد نہیں رکھا تو اس کا انجام اب اس جہنم کی صورت میں تمہارے سامنے ہے۔ اس سے میرے رسول اور میرے نیک بندے تم کو ڈراتے رہے لیکن تم برابر ان کی باتوں کا انکار کرتے رہے۔ اب اس میں داخل ہو، یہی تمہارا ٹھکانا ہے۔

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤی اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَاۤ اَیْدِیْهِمْ وَ تَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ (۶۵)

ہاتھ پاؤں کی گواہی

اوپر کی آیات میں اسلوبِ کلام خطاب کا تھا، اس آیت میں غائب کا ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اوپر کی آیات میں زجر و ملامت ہے جس کے لیے موزوں اسلوب خطاب ہی کا ہے اور اس آیت میں ان کی بے بسی کی تصویر ہے جس کے لیے غائب کا اسلوب زیادہ موزوں ہے۔ فرمایا کہ آج کے دن ہم ان کے مونہوں پر مہر کر دیں گے اور ان کے ہاتھ اور پاؤں کو ناطق بنا دیں گے جو ان کی ساری کارستانیوں کی سرگزشت ہم کو سنا دیں گے۔ مونہوں پر مہر کر دینے کی وجہ یہ ہوگی کہ زبان جھوٹ بھی بول سکتی ہے اور عذر بھی تراش سکتی ہے لیکن ہاتھ پاؤں وہی بیان کریں گے جو انھوں نے کیا ہوگا۔ اس طرح انسان پر خود اس کے اعضاء و جوارح حجت قائم کر دیں گے اور یہ حجت تمام حجتوں پر بھاری ہوگی ــــ یہ مضمون سورۂ رحمان میں بھی ہے ــــ فَیَوْمَىٕذٍ لَّا یُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّ لَا جَآنٌّ ۝ .... یُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِیْمٰهُمْ فَیُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِیْ وَ الْاَقْدَامِ ۝ (الرحمٰن : ۳۹، ۴۱)

(پس اس دن کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بابت پرسش کی نوبت نہیں آئے گی ..... مجرم اپنی پیشانیوں سے پہچان لیے جائیں گے پس ان کی چوٹیاں اور ان کی ٹانگیں پکڑ کے جہنم میں پھینک دیا جائے گا)۔

وَ لَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰۤی اَعْیُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰی یُبْصِرُوْنَ (۶۶)

تنبیہ و تہدید

یعنی جب ان کا حال یہ ہے کہ اپنی ان صلاحیتوں سے جو اللہ نے ان کو بخشی ہیں کوئی کام ہی نہیں لے رہے ہیں تو یہ مستحق ہیں کہ ہم ان سے ان کو محروم کر دیں اور یہ کام ہمارے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ہم چاہتے تو ان کی آنکھیں مٹا دیتے، پھر یہ راستہ کی تلاش میں بھٹکتے پھرتے لیکن ان کو راہ نہ ملتی۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا تو یہ ہماری رحمت ہے اور اب بھی ان کے لیے موقع ہے کہ یہ ہماری اس رحمت سے فائدہ اٹھائیں اور آنکھیں بند کر کے زندگی نہ گزاریں ــــ 'لَوْ' شرط فی الماضی کے لیے آتا ہے اور ہمارے نزدیک یہاں مضارع سے پہلے فعل ناقص محذوف ہے۔ یعنی 'وَلَوْ كُنَّا نَشَآءُ'۔

وَ لَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰی مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِیًّا وَّ لَا یَرْجِعُوْنَ (۶۷)

اسی طرح اگر ہم چاہتے تو ان کو ان کی جگہ ہی پر مسخ کر کے رکھ دیتے تو پھر نہ وہ آگے ہی کو بڑھ سکتے اور نہ پیچھے ہی کو پلٹ سکتے لیکن یہ ہماری عنایت ہے کہ ہم نے ایسا نہیں کیا بلکہ ان کو مہلت دیے ہوئے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو سنبھل جائیں اور خدا کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کا حق پہچانیں، ان کی قدر کریں اور اپنے رب

کے شکرگزار بندے بنیں۔

وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ؕ أَفَلَا يَعْقِلُونَ (٦٨)

انسانی زندگی کے احوال سے اوپر کے دعوے کی دلیل

اوپر جو دھمکی دی گئی ہے یہ انسانی زندگی کے احوال و مشاہدات سے اس کی دلیل دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے لوگوں کی قوتوں اور صلاحیتوں کو مسخ کر دینا ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ انسان جب وجود میں آتا ہے تو وہ ایک مضغۂ گوشت ہوتا ہے پھر اللہ تعالیٰ درجہ بدرجہ اس کو قوت و توانائی بخشتا ہے یہاں تک کہ وہ جوانی کی تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے بھرپور ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے اوپر بڑھاپا طاری ہونا شروع ہوتا ہے اور درجہ بدرجہ وہ اسی ضعف و ناتوانی کی حالت کی طرف لوٹ جاتا ہے جس میں وہ اپنی ولادت کے وقت مبتلا تھا ـــــ قرآن نے اس حالت کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔ "اللَّهُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِن بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَشَيْبَةً" (الروم: ۵۴) (اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ناتوانی سے، پھر ناتوانی کے بعد اس نے توانائی بخشی پھر توانائی کے بعد ضعف اور بڑھاپا طاری کر دیا) یہ عام حالت کی تصویر ہے۔ ہر شخص جو جوانی اور پیری کے مراحل سے گزرتا ہے اس کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ قوتوں اور صلاحیتوں کی ناتوانی کا اس سے کہیں زیادہ تجربہ ان لوگوں کو ہوتا ہے جن کو ارذل عمر کے مرحلے سے سابقہ پڑتا ہے۔ قرآن نے ان کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔ "وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا" (النحل: ۷۰) (اور تم میں بعض وہ بھی ہوتے ہیں جو ارذل عمر کو پہنچا دیے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہیں جانتے)۔

آیت زیر بحث میں اسی صورتِ حال کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس دنیا میں تم دیکھتے ہو کہ جس کی عمر ہم زیادہ کرتے ہیں درجہ بدرجہ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں میں ہم اس کو پیچھے کی طرف لوٹا دیتے ہیں۔ یعنی جس ناتوانی کے دور سے وہ زندگی کا آغاز کرتا ہے اسی ناتوانی کی طرف پھر وہ واپس لوٹا دیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام قوتیں اور صلاحیتیں خدا ہی کی بخشی ہوئی ہیں وہ جب چاہے ان کو واپس لے سکتا ہے اور اس طرح واپس لے سکتا ہے کہ کسی کو اپنے دہنے بائیں کا بھی کچھ ہوش باقی نہ رہے تو حیف ہے ان لوگوں پر جو اللہ کی ان نعمتوں کی قدر نہ کریں اور ان کو پا کر خدا کے شکرگزار ہونے کے بجائے استکبار میں مبتلا ہو جائیں۔

"تنکیس" اور "نکس" کو عام اہلِ لغت بالکل ہم معنی قرار دیتے ہیں۔ یعنی کسی شے کو پیچھے کی طرف لوٹا دینا۔ لیکن میرے نزدیک تنکیس میں تدریج کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے یعنی درجہ بدرجہ کسی چیز کو پیچھے کی طرف لوٹانا۔ قرآن میں یہ دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں اور دونوں جگہ یہ فرق ملحوظ ہے۔ لفظ 'خلق' یہاں 'خلقت' کے مفہوم میں ہے اور اس معنی میں یہ قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔

۸۔ آگے کا مضمون ۔ آیات ۶۹-۸۳

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ خاتمہ میں تمہید کے مضمون کو، ایک نئے اسلوب سے پھر لے لیا ہے:

یاد ہوگا، سورہ کا آغاز قرآن حکیم کی قسم سے ہوا ہے اور اس حکیمانہ کتاب کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی دلیل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اس کتاب کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے امیوں پر عظیم احسان فرمایا ہے لیکن اس پر ایمان وہی لائیں گے جن کے اندر زندگی کی رمق ہوگی۔ اس تمہید کے بعد کلام کا رخ قرآن کے دعاوی کے اثبات کی طرف مڑ گیا ہے۔ یہاں بھی غور کیجیے تو وہی بات ایک نئے اسلوب سے آئی ہے۔ پہلے ان مخالفین کی تردید ہے جو قرآن کو شاعری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر قرار دیتے تھے۔ پھر یہ واضح فرمایا ہے کہ کن لوگوں پر یہ کلام اثر انداز ہوگا اور کون لوگ اس سے محروم رہیں گے۔ اس کے بعد ربوبیت کی بعض واضح آیات کی طرف اشارہ کر کے اس دعوتِ تشکر کا اعادہ کیا ہے جس پر اس سورہ کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد کلام کا رخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کی طرف مڑ گیا ہے کہ لوگ تمہاری مخالفت میں جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا غم نہ کرو، جو لوگ اللہ پر بھی پھبتیاں چست کرنے سے باز نہیں آتے وہ اگر تمہارا مذاق اڑائیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۹-۸۳

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ
مُّبِيْنٌ ﴿۶۹﴾ لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۷۰﴾ اَوَلَمْ
يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾
وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ
وَمَشَارِبُ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ
يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ ۙ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ ﴿۷۵﴾
فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ ۘ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَمْ

وقف لازم

يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷۷﴾ وَ
ضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ﴿۷۸﴾
قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾
الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ

تُوْقِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓي اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۭ بَلٰي ۤ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَـيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

وقف غفران

ع ۵ ۱۶ ۴

ترجمہ آیات ۶۹ - ۸۳

اور ہم نے اس کو شعر کی تعلیم نہیں دی ہے اور یہ اس کے شایانِ شان بھی نہیں۔ یہ تو بس یاددہانی اور نہایت واضح قرآن ہے تاکہ وہ ان لوگوں کو آگاہ کردے جن کے اندر زندگی ہے اور کافروں پر حجت تمام ہو جائے۔ ۶۹ - ۷۰

کیا انھوں نے غور نہیں کیا کہ ہم نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے چوپائے پیدا کیے، پس وہ ان کے مالک ہیں! اور ہم نے ان کو ان کا مطیع بنا دیا، پس ان میں سے بعض پر وہ سوار ہوتے ہیں اور بعض سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں اور ان میں ان کے لیے دوسری منفعتیں اور پینے کی چیزیں بھی ہیں۔ تو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔ ۷۱ - ۷۳

اور انھوں نے اس توقع پر اللہ کے سوا دوسرے معبود بنائے ہیں کہ ان کی مدد کی جائے گی، وہ ان کی مدد نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ وہ ان کی حاضر کی ہوئی فوج بنیں گے۔ تو ان کی بات تم کو مبتلائے غم نہ کرے، ہم جانتے ہیں جو کچھ وہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں۔ ۷۴ - ۷۶

کیا انسان نے غور نہیں کیا کہ ہم نے اس کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا تو وہ ایک کھلا ہوا حریف بن کر اٹھ کھڑا ہوا! اور اس نے ہم پر ایک پھبتی چست کی اور اپنی پیدائش کو بھول گیا! کہتا ہے کہ بھلا ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے جب کہ وہ بوسیدہ ہو جائیں گی! کہہ دو ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ اور وہ ہر مخلوق سے اچھی طرح باخبر ہے۔

وہی ہے جس نے تمھارے لیے سرسبز درخت سے آگ پیدا کر دی پس تم اس سے آگ جلا لیتے ہو۔ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا وہ ان کی جیسی مخلوق پیدا کرنے پر قادر نہیں! ہاں وہ قادر ہے اور وہی اصل پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے۔ اس کا معاملہ تو بس یوں ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ پس پاک ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ ۷۷-۸۳

۹۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (۶۹)

شعر و شاعری نبوت کے شایان شان نہیں ہے

ضمیر مفعول کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ ان لوگوں کے خیال کی تردید ہے جو قرآن کو شاعری اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک شاعر قرار دیتے تھے۔ فرمایا کہ نہ ہم نے اپنے رسول کو شعر کی تعلیم دی، نہ یہ چیز اس کے شایان شان ہی ہے۔ یہ ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو قرآن کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کو محض اس کے پیش کرنے والے کی شاعرانہ جادو بیانی کا کرشمہ قرار دیتے تھے تاکہ ان کے عوام پر یہ اثر نہ پڑنے پائے کہ وہ اس کی تاثیر و تسخیر سے مرعوب ہو کر اس کو آسمانی کتاب مان لیں۔ عوام کو قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے برگشتہ کرنے کے لیے وہ کہتے تھے کہ قرآن ہے تو بے شک ایک نہایت فصیح و بلیغ کلام لیکن اس کی یہ فصاحت و بلاغت اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ کوئی آسمانی وحی ہے، جیسا کہ اس کا پیش کرنے والا دعویٰ کرتا ہے، بلکہ جس طرح ہمارے اونچے درجے کے شاعروں کے کلام میں تاثیر و تسخیر ہے اسی طرح اس شخص کے کلام میں بھی تاثیر و تسخیر ہے۔ اس وجہ سے اس شخص کو زیادہ سے زیادہ ایک اونچے درجے کا شاعر سمجھنا چاہیے نہ کہ ایک نبی اور رسول اور اس قرآن کو ایک شاعرانہ کلام ہی کا رتبہ دینا چاہیے نہ کہ وحی و الہام کا۔ قرآن نے ان کے اس خیال کی مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ تردید کی ہے۔ خاص طور پر سورۂ شعراء میں اس فرق کو نہایت تفصیل سے نمایاں فرمایا ہے جو ایک نبی اور ایک شاعر کے درمیان ایک عامی کو بھی نظر آ سکتا ہے۔ تفصیل کے طالب اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

'وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ' سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شاعری نبوت کی شان سے ایک فروتر چیز ہے۔ اس کے فروتر ہونے کے دو پہلو ہیں۔

ایک پہلو تو یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی روایات و خصوصیات اور شاعروں کی

روایات و خصوصیات میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ سورہ شعرآء میں شاعروں کی تین خصوصیات بیان ہوئی ہیں اور یہ تینوں ہی شانِ نبوت کے منافی ہیں۔

ان کی ایک خصوصیت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کے غازی نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس نبی اپنی ہر بات پر سب سے اوّل اور سب سے بڑا عمل کرنے والا خود ہوتا ہے۔

دوسری خصوصیت ان کی یہ مذکور ہوئی ہے کہ ان کا کلام متضاد افکار کا مجموعہ ہوتا ہے۔ وہ ہر وادی میں ہرزہ گردی کرتے اور ایک ہی سانس میں کفر و اسلام دونوں کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے بالکل برعکس نبی کی ہر بات اپنی اصل اور فرع دونوں میں بالکل متحد و مربوط اور باہم دگر وابستہ و پیوستہ ہوتی ہے۔

ان کی تیسری خصوصیت یہ بیان ہوئی ہے کہ ان کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں۔ برعکس اس کے انبیائے کرام کے پیرو ہمیشہ سوسائٹی کے اخیار رہوئے ہیں۔

اگرچہ اس کلیہ میں بعض استثنا بھی ہیں جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے لیکن بہت کم۔ عام حالت یہی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو شعر و شاعری کی چھوت سے محفوظ رکھا۔

انبیاء کی شان سے اس کے فروتر ہونے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ شاعری کا تعلق تمام تر جذبات سے ہے۔ یہ جذبات ہی سے پیدا ہوتی ہے اور جذبات ہی پر عمل کرتی ہے۔ یہ اچھے جذبات ابھارتی ہے اگر اس کے اندر اچھے جذبات ظاہر کیے گئے ہوں اور برے جذبات بھی برانگیختہ کرتی ہے اگر اس کو برے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے۔ اس دائرہ سے باہر اس کا وجود بالکل بے کار ہے۔ حضرات انبیائے کرام جس مشن پر مامور ہوتے ہیں اس کا تعلق صرف جذبات سے نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر پہلو سے ہوتا ہے اس وجہ سے ان کی اصل اپیل جذبات کے بجائے انسان کی عقل سے ہوتی ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کرتی ہے۔ انھیں لوگوں کو صرف ابھارنا ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کی تربیت بھی کرنی ہوتی ہے، ان کی غلطیوں کو درست کرنا ہوتا ہے، ان کو انفرادی و اجتماعی زندگی کے آداب و اصول سکھانے ہوتے ہیں، ان کو حکومت و ریاست کے قوانین و ضوابط بتانے ہوتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھیے کہ انھیں دنیا اور آخرت دونوں کی حسنات سے لوگوں کو بہرہ مند کرنا ہوتا ہے۔ یہ سارے کام ظاہر ہے کہ شاعری کے بس سے باہر ہیں۔ ان کاموں کے لیے ضرورت کسی شاعر کے دیوان یا مجموعۂ کلام کی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کتاب مبین کی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو شاعر نہیں بلکہ اپنی کتاب مبین کا حامل بنایا۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب شاعری حضرات انبیائے کرام کی شان اور ان کے مقصد سے ایک فروتر چیز ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو زبور شعر کی شکل میں کیوں عطا فرمائی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس اصل رہنما کتاب زبور نہیں بلکہ تورات تھی۔ زبور کی حیثیت محض تورات کے ایک ضمیمہ کی سمجھیے جس میں حضرت داؤد علیہ السلام کی کچھ دعائیں، مناجاتیں، ان کے مواعظ اور

ان کی پُرحکمت نصیحتیں ہیں۔ تورات کے ساتھ مل کر تو یہ ایک نہایت بابرکت خزانۂ حکمت ہے لیکن تورات کے بغیر یہ اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہے جس کے لیے حضرات انبیا کی بعثت ہوئی۔

قرآن کے ذکر ہونے کے مختلف پہلو

'اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ' یعنی یہ قرآن شعر و شاعری نہیں بلکہ ایک عظیم یاددہانی اور ایک واضح صحیفۂ ہدایت ہے تاکہ یہ خلق کی اصلاح اور لوگوں کی رہنمائی کا ذریعہ بنے۔ قرآن کے 'ذکر' ہونے کا مفہوم اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں۔ یہ ان تمام حقائق کی بھی یاددہانی کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے اندر ودیعت فرمائے ہیں، اس پوری تاریخ ہدایت کی بھی یاددہانی کرتا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پھیلی ہوئی ہے اور ان تمام نتائج و عواقب کی بھی یاددہانی کرتا ہے جو دنیا اور آخرت دونوں میں لازماً پیش آ کے رہیں گے اگر اللہ کے رسول کی تکذیب کی گئی۔

'قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ' یعنی ایک جامع صحیفۂ ہدایت جو زندگی کے ہر پہلو کے لیے اپنے اندر نہایت واضح، ٹھوس، محکم اور مدلل رہنمائی رکھتا ہے اور ہر حقیقت کو اس طرح کھول کر بیان کرتا ہے کہ کسی انصاف پسند کے لیے کسی شبہے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ایسی مدلل، مبرہن اور منضبط کتاب کو شعر و شاعری سے کیا تعلق! دنیا کی پوری تاریخ میں کس شاعر نے اس طرح کی کتاب پیش کی ہے!

لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۷۰)

قرآن کے اتارے جانے کا مقصد

'يُنْذِرَ' کا فاعل نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ اس قرآنِ مبیں کے اتارے جانے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر یہ قرآن اس لیے اتارا ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ ان لوگوں کو انذار کرے جن کے اندر حیاتِ عقلی و روحانی کی رمق باقی ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں وہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے البتہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر حجت پوری ہو جائے گی اور وہ خدا کے ہاں یہ عذر نہیں کر سکیں گے کہ ان کے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا ورنہ وہ ہدایت اختیار کرنے والے بنتے۔

فعل 'انذار' یہاں اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے اور 'حیّ' سے دل کے زندہ مراد ہیں۔ ایک منذر انذار کرتا تو سب کو ہے لیکن اس کا انذار کارگر صرف انہی لوگوں پر ہوتا ہے جن کی فطرت زندہ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بات پر دھیان وہی کرتے ہیں، جیسا کہ فرمایا ہے۔ 'اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ (یٰسٓ: ۱۱)' (تم انہی کو ڈرا سکتے ہو جو نصیحت پر دھیان کریں) چونکہ حقیقت کے اعتبار سے زندہ وہی لوگ ہوتے ہیں اس وجہ سے قرآن نے انہی کو زندہ کہا ہے۔ جو اس وصف سے محروم ہیں وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی نسبت فرمایا ہے 'وَمَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ' (فاطر: ۲۲) اس اسلوبِ بیان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی بھی ہے کہ تمھارا کام زندوں کو جگانا ہے، مردوں کو جگانا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے قرآن میں بار بار بیان ہوا ہے۔

'القول' سے مراد وہ قول ہے جو اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے چیلنج کے جواب میں فرمایا تھا کہ میں بنی آدم

کی ہدایت کے لیے اپنی کتاب اور اپنی ہدایت نازل کروں گا۔ پھر جو اس کے بعد بھی تیری پیروی کریں گے تو میں ان سب کو تیرے سمیت جہنم میں بھر دوں گا۔

اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَہُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ اَنۡعَامًا فَہُمۡ لَہَا مٰلِکُوۡنَ ۔ وَذَلَّلۡنٰہَا لَہُمۡ فَمِنۡہَا رَکُوۡبُہُمۡ وَمِنۡہَا یَاۡکُلُوۡنَ ۔ وَلَہُمۡ فِیۡہَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ (۷۱ - ۷۳)

قرآن کی دعوت کی تائید میں آیاتِ ربوبیت کا حوالہ

ان آیات کا موقع و محل سمجھنے کے لیے اس سورہ کی آیات ۳۳ - ۳۵ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ جس طرح وہاں قرآن کے انذار اور اس کی دعوت توحید کا حوالہ دینے کے بعد بعض آیاتِ ربوبیت کی طرف توجہ دلائی ہے اور پھر خدا ہی کی شکر گزاری کا مطالبہ کیا ہے اسی طرح یہاں بھی قرآن کی دعوت کی تائید میں اپنی ربوبیت کی بعض نشانیوں کی طرف توجہ دلاتے کے بعد خدا ہی کی شکر گزاری کا مطالبہ کیا ہے۔ گویا تمہید کا مضمون خاتمہ میں ایک نئے اسلوب سے پھر سامنے آگیا۔

'اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَہُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ اَنۡعَامًا' فرمایا کہ کیا وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ہم نے اپنی قدرت و حکمت سے چوپائے بنائے اور پھر ان کو ان کا مالک بنا دیا۔ وہ ان پر پوری آزادی سے مالکانہ تصرف کرتے اور اپنی تمام ضروریات میں ان کو استعمال کرتے ہیں۔ 'مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ' میں وہی بات ایک دوسرے اسلوب سے فرمائی گئی ہے جو پیچھے آیت ۳۵ میں 'وَمَا عَمِلَتۡہُ اَیۡدِیۡہِمۡ' کے الفاظ سے فرمائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں خود اپنے وجود سے شاہد ہیں کہ صرف خدا ہی کی قدرت و حکمت نے ان کو وجود بخشا ہے، کسی دوسرے کی مجال نہیں تھی کہ ان کو وجود میں لا سکتا یا ان کو انسان کا مطیع و فرمانبردار بنا سکتا۔ یہ محض ربِّ کریم کی کریمی ہے کہ اس نے ان کو اپنی قدرت و حکمت سے بنایا اور پھر ان کو انسان کی غلامی میں دے دیا ـــــ مطلب یہ ہے کہ یہ صورتِ حال دعوت دیتی ہے کہ انسان غور کرے کہ قدرت کے اس بے پایاں انعام کے عوض میں اس پر کوئی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے یا نہیں؟ قرآن اسی سوال کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا اور اس کے نتائج سے آگاہ کرنا چاہتا ہے لیکن احمق لوگ حقیقت کی اس یاد دہانی کو شاعری سمجھتے ہیں۔

'وَذَلَّلۡنٰہَا لَہُمۡ الآیۃ' یعنی یہ محض خدا کی ربوبیت و رحمت ہے کہ اس نے ان چوپایوں کو انسان کی معاشی ضروریات کے لیے سازگار بنایا اور پھر ان کو اس طرح انسان کا مطیع بنا دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے ان کو استعمال کرتا ہے۔ اگر خدا نہ چاہتا تو یہ چوپائے نہ تو انسان کی ضروریات کے لیے سازگار ہوتے اور نہ وہ ان کو اپنا مطیع بنا سکتا۔ آخر دنیا میں کتنے جانور ایسے ہیں جو نہ تو انسان کی ضروریات کے لیے کارآمد ہیں اور نہ وہ ان کو چوپایوں کی طرح اپنا غلام ہی بنا سکتا ہے۔ اگر وہ ان کو مسخر بھی کرلے جب بھی وہ ایک بوجھ تو اس کے لیے بن سکتے ہیں لیکن اس کا کوئی بوجھ اٹھانے والے نہیں بن سکتے۔ فرمایا کہ ان چوپایوں ہی میں سے بعض وہ ہیں جن سے وہ سواری کا کام لیتا ہے اور بعض وہ ہیں جن سے وہ اپنی غذائی ضروریات پوری کرتا ہے۔

وَلَهُمْ فِيهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۖ أَفَلَا يَشْكُرُونَ۔ یعنی سواری اور غذا کے علاوہ اور بھی بہت سے فوائد ان سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی کھال، ان کے بال، ان کی ہڈی، ان کے بول و براز، غرض کون سی چیز ہے جو انسان کے لیے نافع نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے دودھ اور اس دودھ سے بنی ہوئی پینے کی مختلف چیزیں — دہی، لسی، چھاچھ — سب انسان کے لیے لذیذ، خوش گوار اور صحت بخش ہیں۔ أَفَلَا يَشْكُرُونَ۔ تو کیا یہ نعمتیں ان کے اوپر کوئی حق نہیں عائد کرتیں اور ان سے یہ مطالبہ نہیں کرتیں کہ جس رب کی بخشی ہوئی نعمتوں سے وہ فائدہ اٹھا رہے ہیں اس کے شکر گزار و فرماں بردار بھی بنیں! یہ نعمتیں زبانِ حال سے انسان کو یہ سبق پڑھا رہی ہیں اور اسی سبق کی یاد دہانی اللہ کی کتاب بھی کر رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی واضح حقیقت کو سمجھنے اور ماننے کے بجائے اس کو شاعری قرار دے کر اس سے گریز کی راہیں کیوں سوچ رہے ہو!

وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ ۝ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَهُمْ وَهُمْ لَهُمْ جُندٌ مُّحْضَرُونَ (۷۴-۷۵)

حقیقت سے فرار کے لیے چور دروازے

یعنی اس واضح حقیقت کا مواجہہ کرنے کے بجائے انھوں نے حقیقت سے فرار کے لیے چور دروازے پیدا کیے ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ جس رب کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو رہے ہیں اس کے حقوق و فرائض پہچانتے اور ان کو ادا کرتے لیکن انھوں نے کیا یہ ہے کہ خدا کے سوا کچھ دوسرے معبود انھوں نے ایجاد کیے ہیں اور ان کے کچھ رسوم ادا کر کے یہ توقع کر رہے ہیں کہ اگر خدا کی طرف سے کوئی گرفت ہوئی تو ان کی مدد سے وہ چھوٹ جائیں گے۔

'لَا يَسْتَطِيعُونَ الآیۃ' فرمایا کہ ان کی مدد تو وہ کیا خاک کر سکیں گے۔ البتہ یہ ہوگا کہ ان کے ساتھ یہ بھی ان کی فوج کی حیثیت سے خدا کے حضور میں حاضر کیے جائیں گے اور پھر اللہ تعالیٰ فیصلہ فرمائے گا کہ یہ کس سزا کے مستحق ہیں۔

فَلَا يَحْزُنكَ قَوْلُهُمْ ۘ إِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ (۷۶)

آنحضرت صلعم کو تسلی

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ جو کچھ بھی کہیں اس کو برداشت کرو، اس کا غم نہ کرو۔ یہ تمھیں شاعر، خبطی اور مفتری جو کچھ بھی کہتے ہیں کہنے دو اور یہ اطمینان رکھو کہ اللہ ان کی خفیہ سازشوں اور شرارتوں سے بھی اچھی طرح واقف ہے اور جو کچھ یہ علانیہ کہہ اور کر رہے ہیں اس کو بھی جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا سب کچھ جانتا ہے تو تم کیوں غم کرو! تم خدا کا کام کر رہے ہو، کرتے رہو اور یہ بھروسہ رکھو کہ تمھارے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے تمھارا رب کافی ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ ۖ قَالَ مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ (۷۷-۷۸)

'انسان' سے مراد قریش ہی ہیں جن سے یہاں بحث ہے بے التفاتی کے اظہار کے لیے لفظ عام استعمال فرمایا ہے۔

'ضربِ مثل' کوئی مثال بیان کرنے یا حکمت کی بات کہنے کے لیے بھی آتا ہے اور موقع ہو تو کسی پر طنز یا پھبتی چست کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یہاں یہ اس دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

یہ کلام اپنے ماسبق سے دو پہلوؤں سے ربط رکھتا ہے۔ اوپر کی آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تسلی دی گئی ہے اس سے بھی اس کا تعلق ہے اور اُس سے اوپر کی آیات میں قریش کو خدا کی ربوبیت کے جو مقتضیات بتائے گئے ہیں اس سے بھی اس کا ربط ہے۔

تسلی کے مضمون سے اس کا ربط یوں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے کہ جو سر پھرے لوگ خدا پر بھی پھبتی چست کر رہے ہیں اور اپنی پیدائش کو بھول کر بڑے طنطنہ سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ بوسیدہ ہڈیوں میں کون زندگی پیدا کر سکتا ہے وہ اگر پیغمبر پر طنز کریں اور اس کو شاعر و مجنون قرار دیں تو ان سے کیا بعید ہے۔

ربوبیت کے مضمون سے اس کا تعلق یوں ہے کہ ربوبیت جس طرح شکر اور توحید کو مقتضی ہے اسی طرح ایک روزِ حساب و کتاب کو بھی مقتضی ہے (اس مضمون کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے) لیکن انسان کی بلادت کا یہ حال ہے کہ وہ خدا کی نعمتوں سے متمتع ہونے کے باوجود یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کہ کوئی روزِ حساب و کتاب بھی آنے والا ہے جس دن اس سے ان نعمتوں کی بابت پرسش ہونی ہے اور اگر اس کو اس کی یاد دہانی کی جاتی ہے تو وہ ایک حریف بن کر سامنے آتا ہے اور اپنی پہلی خلقت کو بالکل بھول کر طنز یہ انداز میں سوال کرتا ہے کہ بھلا بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے! فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ ان کو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو پہلی بار پیدا کیا۔ اگر پہلی بار ان کو پیدا کرنے میں اس کو کوئی زحمت نہیں پیش آئی تو دوبارہ اس کو پیدا کرنے میں کیوں زحمت پیش آئے گی!

'وَنَسِیَ خَلْقَهٗ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ احمقانہ سوال وہی کر سکتا ہے جس کو اپنی پہلی خلقت یاد نہ رہی ہو۔ جس کو اپنی پہلی خلقت یاد ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو اسی مٹی سے وجود میں لایا ہے تو وہ یہ سوال نہیں کر سکتا اگر کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کا حریف بن کر اس سے لڑنے اٹھا ہے۔

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ (۷۹)

'وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ'۔ 'خلق' یہاں مخلوق کے معنی میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوقات کو جانتا ہے 'اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ' (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے پیدا کیا) کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ مٹی میں رل مل جانے کے بعد وہ ان کو بھول جائے گا۔ وہ ان کے وجود کے ایک ایک ذرے سے باخبر ہے۔ 'قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ' (ق — ۴) (زمین ان کے اندر سے جو کچھ کم کرتی ہے ہم اس کو جانتے رہے ہیں اور ہمارے پاس سارا ریکارڈ رکھنے والی ایک کتاب ہے)۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ (۸۰)

ضد سے ضد کا ظہور

یعنی اس بات کو مستبعد نہ خیال کرو کہ راکھ اور مٹی سے زندگی نمودار ہو جائے گی۔ ضد سے ضد کے نمودار ہونے کا کرشمہ تم برابر اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ تم سرسبز درخت کی دو شاخیں لیتے اور ان کو ایک دوسرے سے رگڑ کر ان سے آگ جلا لیتے ہو۔ جس خدا نے اپنی قدرت کی یہ شان دکھائی ہے اس کے لیے یہ کیا بعید ہے کہ وہ مٹی اور راکھ کے اندر سے زندگی نمودار کر دے۔ 'الشجر الاخضر' سے مراد وہ درخت ہیں جو عرب کے بعض علاقوں میں پائے جاتے ہیں اور صحراؤں کے مسافر ان کی شاخوں سے چقماق کا کام لیتے رہے ہیں۔

سلف میں سے بعض لوگوں نے اس آیت کی تاویل اس سے مختلف بھی کی ہے لیکن مجھے اس میں تکلف محسوس ہوتا ہے۔ یہ تاویل بالکل واضح ہے۔ عرب میں بعض درخت پائے جاتے تھے جن سے لوگ چقماق کا کام لیتے تھے۔ کتابوں میں ان کے نام بھی مذکور ہوتے ہیں۔ اگر اب یہ درخت نہ پائے جاتے ہوں یا بہت نایاب ہوں تو اس سے کچھ فرق نہیں پیدا ہوتا۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے برابر محو و اثبات ہوتا رہتا ہے۔ اگر قرآن کے مخاطبِ اول اس سے واقف تھے تو یہ استدلال بالکل برمحل ہے۔ اس کی اصل بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ ضد سے ضد کے وجود کے شواہد اس دنیا میں موجود ہیں اور یہ ایک ایسی بات ہے جس سے انکار کی گنجائش کسی کے لیے بھی نہیں ہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ سب سے زیادہ زوردار آگ پانی کے اندر پائی جاتی ہے!

اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ط بَلٰی وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ (۸۱)

سوال کا جواب ایک دوسرے پہلو سے

اسی استبعاد کو ایک دوسرے پہلو سے رفع فرمایا ہے کہ جس خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کر دیا اور اس کو اس میں کوئی مشکل نہیں پیش آئی کیا وہ ان کی جیسی مخلوق کو دوبارہ پیدا کر دینے پر قادر نہیں ہو سکتا؟ یہ سوچیں کہ ان دونوں میں زیادہ مشکل کام کون سا ہے؟ 'بَلٰی وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ' یہ اس سوال کا خود ہی جواب دیا ہے کہ ہاں، وہ پوری طرح قادر ہے کہ ان کو دوبارہ پیدا کر دے۔ اس جواب سے مخاطب کے لیے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ کتنی ہی سخن سازیاں کرے۔ 'وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ' یہ اللہ تعالیٰ کی صفات سے مذکورہ دعوے پر دلیل ہے کہ اصل پیدا کرنے والا اور علم رکھنے والا تو خدا ہی ہے۔ اوپر آیت ۷۹ میں فرمایا ہے 'وَهُوَ بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ' اسی مضمون کو یہاں زیادہ زوردار الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ خدا بڑا پیدا کرنے والا ہے، کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس دنیا کو پیدا کر کے وہ تھک گیا یا اس کی قوتِ تخلیق ختم ہو گئی بلکہ وہ اسی طرح تازہ دم ہے جس طرح پہلے تھا اور وہ اپنی ہر مخلوق کے اجزائے ترکیبی سے اچھی طرح باخبر ہے، وہ جب چاہے گا ازسرِنو اس کے پور پور اور جوڑ جوڑ کو ٹھیک کرے گا۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۸۲)

یعنی کوئی اس غلط فہمی میں بھی نہ رہے کہ کسی چیز کو پیدا کرنے کے لیے خدا کو کارخانے قائم کرنے پڑتے ہیں یا سرمایہ، میٹیریل، لیبر اور مشینوں کا اہتمام و انتظام کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کسی ارادے کی تکمیل میں کسی چیز کا بھی محتاج نہیں ہے۔ اس کا معاملہ بس یوں ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو حکم فرماتا ہے کہ وہ ہو جائے اور وہ اس کے حکم کے مطابق ہو جاتی ہے۔

فَسُبْحٰنَ الَّذِيْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۸۳)

'ملکوت' کے معنی اختیار و اقتدار کے ہیں۔ یہ آخر میں تنبیہ فرمائی کہ جس خدا کے ہاتھ میں ہر چیز کی زمام ہے اور جس کی طرف ہی تمھیں لوٹ کر جانا ہے وہ ہر نقص و عیب سے منزّہ ہے تو اس کو ہر عیب سے منزّہ مانو اور اس کی پاکی بیان کرتے رہو۔ اس کی ذات و صفات اور اس کے حقوق میں کوئی شریک نہیں، وہ ہر شرکت سے ارفع ہے، اس نے یہ دنیا عبث نہیں بنائی ہے اس وجہ سے ہر ایک کو خدا کے حضور حاضر ہونا اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے۔ اس کے لیے لوگوں کو مرنے اور سڑ گل جانے کے بعد دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ذرا مشکل نہیں، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہے: کوئی چیز بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں اور کسی کا کوئی قول و عمل بھی اس سے مخفی نہیں

اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کی رہنمائی سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ الحمد للہ علی ذٰلک۔

رحمان آباد
۸ / مارچ ۱۹۷۵ء

تدبرِ قرآن

۳۷

الصّٰفّٰت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــ سورۂ یٰسٓ ـــــ کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ توحید، قیامت اور رسالت کے اصولی مباحث جس طرح اس گروپ کی پچھلی سورتوں میں زیرِبحث آئے ہیں اسی طرح اس میں بھی زیرِبحث آئے ہیں البتہ نہجِ استدلال اور ترتیبِ بیان مختلف ہے۔ توحید جو اس پورے گروپ کی روح ہے، اس سورہ میں بھی نمایاں ہے۔ لیکن اس میں اس کے ایک خاص پہلو ـــــ الوہیتِ ملائکہ کے تصور کے ابطال ـــــ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لیا ہے۔ احوالِ قیامت کی تصویر اس میں ایسے زاویہ سے پیش کی گئی ہے جس سے مشرکین کے عوام اور ان کے لیڈروں کی باہمی تو تکار سامنے آتی ہے۔ حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی پوری تاریخ بھی اس میں اجمالاً بیان ہوئی ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جن قوموں نے رسولوں کی تکذیب کی اللہ تعالیٰ نے ان کو مٹا دیا؛ فلاح صرف رسولوں اور ان کی پیروی کرنے والوں کو حاصل ہوئی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کا اجمالی تجزیہ یہ ہے۔

(۱-۱۰) ملائکہ خدا کے حضور میں ہمیشہ اس کے احکام کی تعمیل کے لیے حاضر اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتے ہیں۔ وہ اپنے عمل سے شہادت دے رہے ہیں کہ وہ خدا کے نہایت فرمانبردار اور اطاعت گزار بندے ہیں نہ کہ اس کے شریک، جیسا کہ نادانوں نے سمجھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قرب صرف ملائکہ کو حاصل ہے، جنات و شیاطین کی رسائی ملاءِ اعلیٰ تک نہیں ہے۔ اگر وہ ملاءِ اعلیٰ کی باتوں کی کچھ سن گن لینے کی کوشش کرتے ہیں تو ملائکہ ان کو دھتکارتے اور شہابِ ثاقب ان کا تعاقب کرتے ہیں اس وجہ سے وہ غائب کی باتیں جاننے سے قاصر ہیں۔ جو لوگ ان کو علمِ غیب حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے مرتبۂ بلند سے بے خبر ہیں۔

(۱۱-۳۹) ان لوگوں کو تنبیہ جو قیامت کا مذاق اڑا رہے تھے۔ قیامت کے دن ان کا اور ان کے لیڈروں کا

جو حال ہوگا اس کی تصویر۔ مقصود اس سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ ان کے مغرورانہ رویہ کو ابھی نظر انداز کرو۔ وہ دن آنے والا ہے جب ان کے عوام اپنے لیڈروں پر لعنت کریں گے کہ انھوں نے ان کو پیغمبر کی پیروی سے روکا اور لیڈر اپنے پیرؤں کو ملامت کریں گے کہ وہ خود شامت زدہ تھے کہ انھوں نے حق کے واضح ہو جانے کے بعد اس کا انکار کیا۔

(۴۰ - ۶۱) ان اہل ایمان کا صلہ جو گمراہ کرنے والے ساتھیوں اور لیڈروں کے علی الرغم رسول کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ان کو قیامت کے دن جو سرور ابدی حاصل ہوگا اس کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ۔

(۶۲ - ۷۰) باپ دادا کی اندھی تقلید کے جنون میں رسول اور اس کے طریقہ کی مخالفت کرنے والوں کو جس انجام سے سابقہ پیش آئے گا اس کی طرف اشارہ۔

(۷۱ - ۱۴۸) تاریخ کی شہادت کہ جن قوموں کو اللہ تعالیٰ نے کسی رسول کے ذریعہ سے انذار کیا اگر انھوں نے رسول کی تکذیب کر دی تو ہلاک کر دی گئیں۔ صرف وہ لوگ خدا کی پکڑ سے محفوظ رہے جنھوں نے رسول کی پیروی کی۔ اللہ کی رحمت و برکت، اللہ کے رسولوں اور ان کی پیروی کرنے والوں ہی کے لیے ہے۔

(۱۴۹ - ۱۸۲) خاتمۂ سورہ جس میں کلام تمہید کے مضمون سے پھر مربوط ہو گیا ہے۔ حضرت جبریل علیہ السلام کی زبانی یہ شہادت دلوائی گئی ہے کہ فرشتوں کی جماعت برابر خدا کے احکام کی تعمیل اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتی ہے اور ہم خدا کے فرمانبردار بندے ہیں نہ کہ اس کے شریک و شفیع۔ آخر میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اللہ کی مدد اور غلبہ تمھارے اور تمھارے ساتھیوں ہی کے لیے ہے۔ تمھارے مخالفین لازماً ناکام ہوں گے جو پہلے تو رسول کی بعثت کے منتظر رہے لیکن جب وہ آیا تو حسد و تکبر کے سبب سے اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ تم ان سے درگزر کرو اور صبر کے ساتھ اپنا کام کیے جاؤ۔ سلامتی اللہ کے رسولوں ہی کے لیے ہے۔

سُوْرَةُ الصّٰفّٰتِ (۳۷)

مَكِّيَّةٌ ــــــــــــ اٰيَاتُهَا ۱۸۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ① فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ② فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا ③ اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ ④ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ⑤ اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۣالْكَوَاكِبِ ⑥ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ⑦ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ⑧ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ⑨ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ⑩

آیات ۱۰-۱

ترجمہ آیات ۱۰-۱

شاہد ہیں صفیں باندھے، حاضر رہنے والے فرشتے؛ پھر زجر کرنے والے (شیاطین کو)؛ پھر ذکر کرنے والے (اپنے رب کا) کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ وہی خداوند ہے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا۔ اور وہی خداوند ہے سارے اطرافِ مشرق کا۔ ۱-۵

بے شک ہم ہی نے سجایا ہے سماءِ دنیا کو ستاروں کی زینت سے اور اس کو محفوظ کیا ہے اچھی طرح ہر سرکش شیطان کی دراندازی سے۔ اور وہ ملاءِ اعلیٰ کی طرف کان نہیں لگانے پاتے اور وہ ہر جانب سے دھتکارے جاتے ہیں، کھدیڑنے کے لیے اور ان کے لیے ایک دائمی عذاب

ہے۔ مگر یہ کہ کوئی اچک لے کوئی بات تو ایک دمکتا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔ ۶-۱۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا (۱)

قسم شہادت کے لیے

'و' قسم کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو قسمیں کھائی ہیں یہ تعظیم کے لیے نہیں بلکہ مقسم علیہ پر شہادت کے لیے ہیں۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ 'الامعان فی اقسام القرآن' میں اس مسئلہ پر مفصل بحث کی ہے۔ ہمارے قلم سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو پڑھیں۔ قسم کے اس مفہوم کی روشنی میں 'وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا' کا ترجمہ 'شاہد ہیں صفیں باندھے ہوئے حاضر رہنے والے فرشتے' کیا جائے تو یہ قسم کے مفہوم کو بالکل ٹھیک ٹھیک ادا کرنے والا ہوگا۔

'صافات' فرشتوں کی صفت ہے

'صٰٓفّٰتٌ' یہاں فرشتوں کی صفت کے طور پر آیا ہے اور اس کی وضاحت اسی سورہ میں خود حضرت جبریلؑ کی زبانی ہوگئی ہے۔ ان کا ارشاد نقل ہوا ہے: 'وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ' (۱۶۴-۱۶۶) (اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے ایک معین مقام ہے اور ہم تو صف بستہ رہنے والے ہیں اور ہم تو تسبیح کرتے رہنے والے ہیں)۔

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان فرشتوں کا ذکر ہے جو ملاء اعلیٰ کے زمرے سے تعلق رکھتے اور عرش الٰہی کے اردگرد صف بستہ رہتے ہیں۔ سورۂ زمر میں ان کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: 'وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ' (۷۵) (اور تم دیکھو گے فرشتوں کو گھیرے ہوئے عرش کے اردگرد اپنے رب کی تسبیح کرتے ہوئے اس کی حمد کے ساتھ)۔

فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا (۲)

دوسری صفت

'زجر' کے معنی جھڑکنے، ڈانٹنے اور دھتکارنے کے ہیں۔ یہ انہی فرشتوں کی دوسری صفت بیان ہوئی ہے کہ اگر شیاطین ملاء اعلیٰ کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ان کو دھتکارتے ہیں۔ شیاطین کو ملاء اعلیٰ سے دور رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص انتظام بھی فرمایا ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا (۳)

تیسری صفت

یہ ان فرشتوں کی تیسری صفت ہے۔ تلاوتِ ذکر سے مراد وہی چیز ہے جو سورۂ زمر میں 'يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ' کے الفاظ سے اور اس سورہ میں 'وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ' کے الفاظ سے مذکور ہوئی ہے۔ یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔

صفات میں ترتیب

یہاں عربی زبان کا یہ قاعدہ پیش نظر رہے کہ جب صفات کا بیان اس طرح 'ف' کے ساتھ ہو جس

طرح یہاں ہے تو یہ دو باتوں پر دلیل ہوتا ہے۔ ایک اس بات پر کہ یہ تمام صفات ایک ہی چیز کی ہیں اس وجہ سے جن لوگوں نے ان صفات کے الگ الگ موصوف قرار دیے ہیں ان کی رائے ہمارے نزدیک عربیت کے خلاف ہے۔ دوسری اس بات پر کہ ان صفات میں ایک تدریجی ترتیب ہے۔ ہم نے جو تاویل کی ہے اس سے پہلی بات تو بالکل واضح ہے کہ یہ تمام صفات ملائکہ کی ہیں۔ رہی دوسری بات تو غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان صفات میں اسی طرح کی ترتیب ہے جس طرح کی ترتیب ہماری نمازوں میں ہوتی ہے جس طرح ہم خدا کے سامنے صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں، پھر شیطان سے تعوّذ کرتے ہیں، پھر اپنے رب کی حمد و تسبیح کرتے ہیں اسی طرح ملائکہ بھی عرشِ الٰہی کے اردگرد صف بستہ کھڑے ہوتے ہیں، پھر شیاطین کو زجر کرتے ہیں، پھر اپنے رب کی حمد و تسبیح کرتے ہیں۔

اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ (۴)

مقسم علیہ

یہ اس قسم کا مقسم علیہ ہے۔ فرشتوں کی اس بندگی اور اس حمد و تسبیح کو شہادت میں پیش کرنے کے بعد فرمایا کہ تمھارا رب ایک ہی ہے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ جن لوگوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں مان کر ان کو خدائی میں شریک کر رکھا ہے اور ان کی شفاعت کی امید پر ان کی پوجا کر رہے ہیں وہ بالکل حماقت میں مبتلا ہیں۔ فرشتوں کا خود اپنا طرزِ عمل ان نادانوں پر ایک کھلی ہوئی نکیر ہے۔ اس لیے کہ وہ برابر خدا کی بندگی اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم ہیں اور یہ احمق لوگ ان کو شریکِ خدا بنا کر ان کی پوجا میں لگے ہوئے ہیں۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (۵)

یہ خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔ یعنی وہی اللہ واحد تمام آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی ساری چیزوں کا خداوند ہے اور وہی تمام مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ اس نے اپنی ناپیدا کنار مملکت کے دور دراز گوشوں کا انتظام اپنے دوسرے شریکوں کے سپرد کر رکھا ہے۔ وہ کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اپنی کائنات کے ہر گوشے اور کونے کا مالک خود ہے اور خود ہی اپنے احکام کے تحت اس کا انتظام فرماتا ہے۔ اس کائنات میں فرشتوں کا اگر کوئی دخل ہے تو خدا کے شریک کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس کے فرمانبردار سفیروں اور کارندوں کی حیثیت سے ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اپنے رب کے احکام کی تعمیل میں کرتے ہیں۔

جمع کے استعمال کا ایک خاص محل

'رَبُّ الْمَشَارِقِ' میں 'مَشَارِق' جمع اپنے اطراف کی وسعت کے اعتبار سے ہے۔ سورۂ اعراف میں لفظ 'اعراف' کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ جمع بعض مرتبہ کسی شے کی وسعت اور اس کے طول کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتی ہے۔ قرآن میں 'مشارق' اور 'مغارب' کے الفاظ اسی اعتبار سے آئے ہیں۔ اسی طرح جہاں مقصود کسی شے کے دونوں کناروں کی طرف اشارہ کرنا ہو وہاں اس کو بعض اوقات تثنیہ کی شکل میں لاتے ہیں چنانچہ

قرآن میں مشرقین اور مغربین، بھی استعمال ہوئے ہیں۔ 'رَبُّ الْمَشَارِقِ' کے بعد 'رَبُّ الْمَغَارِبِ' بر بنائے وضاحت قرینہ حذف ہے۔ اس لیے کہ 'مغارب' 'مشارق' کے تحت ہیں۔ جب اصل کا ذکر آگیا تو فرع کا ذکر گویا خود بخود ہوگیا۔ بعض جگہ اس کو واضح بھی فرما دیا ہے۔ مثلاً: 'فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ' (المعارج ۔ ۴۰) (پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشارق اور مغارب کے رب کی کہ بے شک ہم قادر ہیں)۔ 'مشارق' کے خاص اہتمام کے ساتھ ذکر کرنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دنیا میں مشرکوں نے سب سے زیادہ پرستش سورج کی کی ہے جو مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨ الْكَوَاكِبِ ۙ وَحِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ (۶ - ۷)

شیاطین جن کی تردید

اوپر کی آیات میں ملائکہ کا ذکر ہوا ہے کہ نادانوں نے تو ان کو خدائی کا درجہ دے رکھا ہے اور ان کے ملاء اعلیٰ تک کا حال یہ ہے کہ وہ برابر اپنے رب کے آگے صف بستہ اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم رہتے ہیں۔ اب آگے کی آیات میں شیاطین جن کا ذکر آ رہا ہے کہ نادانوں نے ان کی نسبت یہ گمان کر رکھا ہے کہ ان کی رسائی ملاء اعلیٰ تک ہے اور وہ وہاں سے غیب کی خبریں حاصل کرتے ہیں چنانچہ اسی توقع پر ان کی پرستش کی جاتی ہے کہ یہ علم غیب کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ حالانکہ ملاء اعلیٰ تک کسی کی بھی رسائی نہیں ہے۔ اگر کوئی شریر جن وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر شہاب ثاقب کی مار پڑتی ہے۔

'وَحِفْظًا' فعل محذوف کی تاکید ہے۔ یعنی 'وَحَفِظْنٰهَا حِفْظًا' اس وجہ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آسمان کو ہم نے شیاطین کی دراندازی سے اچھی طرح محفوظ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ستارے ایک طرف تو آسمانِ زیریں کی زینت ہیں، دوسری طرف قدرت ان سے یہ کام بھی لیتی ہے کہ جو شیاطین ملاء اعلیٰ تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو انہی ستاروں کے ذریعے سے سرزنش کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ مثلاً: 'وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ' (الملک: ۵) (اور ہم نے سماء دنیا کو تاروں سے سجایا ہے اور ان کو شیاطین کے سنگسار کرنے کے لیے بھی بنایا ہے) دوسرے مقام میں ہے: 'وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۙ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۙ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ' (الحجر: ۱۶ - ۱۸)

(اور ہم نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور اس کو دیکھنے والوں کے لیے تاروں سے مزین کیا ہے اور اس کو ہر شیطانِ رجیم سے محفوظ کیا ہے اور اگر کوئی چھپ کے ملاء اعلیٰ کی باتیں سننے کی کوشش کرتا ہے تو ایک دمکتا شہاب اس کا تعاقب کرتا ہے)۔

لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَيُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ (۸ - ۹)

'لَا يَسَّمَّعُوْنَ' یہ نفی فعل، نفی فائدہ فعل کے پہلو سے ہے۔ یعنی شیاطین ملاء اعلیٰ کی باتیں سننے کی

کوشش کرتے تو ہیں لیکن وہ کان لگانے پاتے نہیں۔ جب وہ یہ کرنا چاہتے ہیں تو ہر جانب سے ان پر سنگ باری ہوتی ہے۔ 'دُحُوْرٌ' کے معنی دھتکارنے اور کھدیڑنے کے ہیں اور 'وَاصِبٌ' کے معنی دائم کے۔ یعنی اس دنیا میں تو وہ اس طرح ملعون و مرجوم رہیں گے اور آخرت میں ان کے لیے ایک دائمی عذاب ہے۔

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۱۰)

یعنی قدرت کے اس محکم انتظام کے بعد اس بات کا تو امکان ہے نہیں کہ کوئی شیطان ملاءِ اعلیٰ تک پہنچ سکے یا ان کی باتیں سن سکے۔ کوئی شریر جن اگر کچھ کر سکتا ہے تو یہ کر سکتا ہے کہ اچکوں کی طرح کوئی بات اچکنے کی کوشش کرے۔ سو اس کے سدِباب کے لیے بھی یہ انتظام ہے کہ آسمان کی برجیوں سے ایک دہکتا شعلہ اس کا تعاقب کرتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ نہ فرشتوں کو خدا کی خدائی میں کوئی دخل ہے اور نہ جنات کی رسائی ملاءِ اعلیٰ تک ہے کہ وہاں سے وہ غیب کی کوئی خبر معلوم کر سکیں اس وجہ سے جو لوگ فرشتوں کو خدا کی چہیتی بیٹیاں سمجھ کر پوج رہے ہیں وہ بھی احمق اور جو جنات کو علم غیب کا وسیلہ سمجھ کر ان سے تعلق و توسل پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ بھی احمق۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عربوں کے شرک اور ان کی کہانت کی تمام گرم بازاری انہی دو مذکورہ تصورات پر تھی۔ قرآن نے یہاں جنوں اور فرشتوں دونوں کی حقیقت واضح کر کے ان کی ضلالت کے اس سارے کاروبار کو ختم کر دیا۔

۲۔ آگے کا مضمون۔ آیات ۱۱-۴۰

آگے احوالِ قیامت کی تفصیل ہے اور مقصود اس سے یہ دکھانا ہے کہ جو لوگ اللہ کے سوا دوسری چیزوں کی پرستش کر رہے ہیں قیامت کے دن ان کا اور ان کے معبودوں کا کیا حال ہونا ہے۔ شرک کے علم بردار لیڈر اور ان کے پیرو کس طرح ایک دوسرے پر لعنت کریں گے! اور اہلِ ایمان، جو تمام مخالفتوں کے علی الرغم توحید اور قیامت کے عقیدے پر جمے رہیں گے، اللہ تعالیٰ ان کو کس فوزِ عظیم سے نوازے گا!

—— آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۱-۴۰

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا رَاَوْا اٰيَةً يَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۱۶﴾ اَوَاٰبَآؤُنَا

الْاَوَّلُوْنَ ﴿۱۷﴾ قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ
وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ یَنْظُرُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوْا یٰوَیْلَنَا هٰذَا یَوْمُ
الدِّیْنِ ﴿۲۰﴾ هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۱﴾ ع ۲۱/۵
اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا یَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰی صِرَاطِ الْجَحِیْمِ ﴿۲۳﴾ وَقِفُوْهُمْ (الربع)
اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ بَلْ هُمُ الْیَوْمَ
مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾
قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْیَمِیْنِ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا
مُؤْمِنِیْنَ ﴿۲۹﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا
طٰغِیْنَ ﴿۳۰﴾ فَحَقَّ عَلَیْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ اِنَّا لَذَآىٕقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَغْوَیْنٰكُمْ
اِنَّا كُنَّا غٰوِیْنَ ﴿۳۲﴾ فَاِنَّهُمْ یَوْمَىٕذٍ فِی الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ﴿۳۳﴾ اِنَّا
كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ ﴿۳۴﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِیْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا اللّٰهُ یَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَیَقُوْلُوْنَ اَىِٕنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ
مَّجْنُوْنٍ ﴿۳۶﴾ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۳۷﴾ اِنَّكُمْ لَذَآىٕقُوا
الْعَذَابِ الْاَلِیْمِ ﴿۳۸﴾ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا
عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۴۰﴾ اُولٰٓىٕكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۴۱﴾ فَوَاكِهُ
وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴿۴۳﴾ عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ﴿۴۴﴾
یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍۭ ﴿۴۵﴾ بَیْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ﴿۴۶﴾

لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ﴿٤٨﴾ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ ﴿٤٩﴾ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿٥٠﴾ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّیْ كَانَ لِیْ قَرِيْنٌ ﴿٥١﴾ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ﴿٥٢﴾ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴿٥٣﴾ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿٥٤﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿٥٥﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ﴿٥٦﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِيْنَ ﴿٥٧﴾ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿٥٨﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿٥٩﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٠﴾ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿٦١﴾ اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿٦٢﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿٦٣﴾ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِیْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿٦٤﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿٦٥﴾ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿٦٦﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿٦٧﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿٦٨﴾ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿٦٩﴾ فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿٧٠﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٧١﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿٧٢﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿٧٣﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿٧٤﴾

ع ٢ ٥٣ ٦

ترجمہ آیات ۱۱-۱۲

پس ان سے پوچھو کہ کیا ان کے پیدا کرنے کا معاملہ زیادہ سخت ہے یا ان چیزوں کا جو ہم نے پیدا کی ہیں! ہم نے ان کو تو چپکتی مٹی سے پیدا کیا ہے! بلکہ تم تعجب کر رہے ہو

اور یہ لوگ مذاق اڑا رہے ہیں اور جب ان کو یاددہانی کی جاتی ہے تو وہ دھیان نہیں کرتے اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس کا مذاق اڑاتے اور کہتے ہیں یہ تو بس ایک کھلا ہوا جادو ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو پھر ہم اٹھائے جائیں گے! اور کیا ہمارے اگلے باپ دادا بھی! ۱۱-۱۷

ان کو جواب دے دو کہ ہاں تم اٹھائے بھی جاؤ گے اور ذلیل بھی ہو گے۔ بس وہ تو ایک ہی ڈانٹ ہو گی پس وہ تاکنے لگیں گے۔ اور کہیں گے، ہائے ہماری شامت! یہ تو جزا کا دن ہے! یہ وہی فیصلہ کا دن ہے جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے! ۱۸-۲۱

جمع کرو ان کو جنھوں نے ظلم کیا اور ان کے ہم مشربوں کو اور ان کو جن کی یہ اللہ کے سوا پرستش کرتے رہے ہیں پھر ان سب کو دوزخ کا رستہ دکھاؤ۔ اور ان کو ذرا روکو، ان سے کچھ پوچھنا بھی ہے! کیا بات ہے، اس وقت تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کر رہے ہو! بلکہ یہ تو آج بڑے ہی فرماں بردار بنے ہوئے ہیں! ۲۲-۲۶

اور وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے، پوچھتے ہوئے۔ کہیں گے، تم ہی ہمارے پاس آتے تھے داہنے سے ...... وہ جواب دیں گے، بلکہ تم لوگ خود ایمان لانے والے نہیں تھے۔ اور ہمارا تمھارے اوپر کوئی زور تو تھا نہیں بلکہ تم خود ہی سرکش لوگ تھے۔ پس ہمارے اوپر ہمارے رب کی بات پوری ہو کے رہی۔ ہم کو اس کا مزا چکھنا ہی ہو گا۔ ہم نے تم کو گمراہ کیا، ہم خود بھی گمراہ تھے۔ پس وہ سب اس دن عذاب میں شریک ہوں گے۔ ۲۷-۳۳

ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کریں گے۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب ان سے کہا جاتا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو یہ اکڑتے اور کہتے تھے کہ کیا ہم ایک شاعر دیوانہ کے کہنے

سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں! بلکہ وہ حق لے کر آیا ہے اور وہ رسولوں کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہے۔ ۳۷، ۳۴

بے شک تم کو درد ناک عذاب چکھنا پڑے گا۔ اور یہ تو تم اسی کا بدلہ دیے جا رہے ہو جو تم کرتے رہے ہو۔ پس اللہ کے مخصوص بندے ہی اس سے محفوظ رہیں گے۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کے لیے معلوم رزق ہوگا۔ میوے، اور وہ نعمت کے باغوں میں بڑی عزت سے ہوں گے۔ تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ان کے لیے شرابِ مَعین کے جام گردش میں ہوں گے۔ بالکل صاف شفّاف، پینے والوں کے لیے لذّت ہی لذّت! نہ اس میں کوئی ضرر ہوگا اور نہ وہ اس سے نڈھال ہوں گے۔ اور ان کے پاس باحیا، غزال چشم حوریں ہوں گی گویا کہ شتر مرغ کے محفوظ انڈے ہیں۔ ۳۸ - ۴۸

پس وہ ایک دوسرے کی طرف پوچھتے ہوئے متوجہ ہوں گے۔ ان میں سے ایک کہنے والا کہے گا کہ میرا ایک ساتھی تھا جو کہا کرتا تھا کہ کیا تم بھی قیامت کی تصدیق کرنے والوں میں ہو! کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹّی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو ہم بدلہ پانے والے بنیں گے! کہے گا ذرا جھانک کے دیکھو تو سہی! تو وہ جھانکے گا اور اس کو جہنم کے بالکل بیچ میں دیکھے گا۔ کہے گا، خدا کی قسم! تم تو مجھے تباہ ہی کر دینے والے تھے! اگر میرے رب کا فضل نہ ہوتا تو میں بھی آج پکڑا ہوا ہوتا۔ ہے نا یہ حقیقت کہ اب ہم پہلی موت کے بعد کبھی مرنے والے نہیں اور نہ ہم پر عذاب ہوگا! بے شک بڑی کامیابی یہی ہے! جس کو کوشش کرنی ہو وہ اس کے لیے کوشش کرے!! ۴۹-۶۱

ضیافت کے لیے یہ بہتر ہے یا درختِ زقّوم! ہم نے اس کو ظالموں کے لیے ایک